حیاتِ سعید

۱۹۰۰ء-۱۹۹۶ء

جلد اوّل



صفیہ سعید

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب بہت ہی جاذب اور متاثر کُن شخصیّت کے مالک تھے۔ جس کسی کا بھی اُن کی زندگی سے گذر ہوا وہ ایک مثبت اثر لیے بغیر نہیں رہا۔ آپ اپنی گُوناں گُوں مصروفیات کے باوجود باقاعدگی سے ڈائری لکھتے، خط و کتابت کرتے اور رشتہ داروں اور دوست احباب کو وقت دیتے تھے۔ آپ گرد و پیش پر گہری نظر رکھتے تھے اور اپنی زندگی کے حالات اور واقعات کے علاوہ اپنے خیالات اور تجربات کو بھی تحریر میں لاتے رہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی صاحب زادی صفیہ سعید صاحبہ نے بہت محنت سے اُن کی ڈائری، خطوط، متفرق مطبوعات اور تعلق دار لوگوں سے استفادہ کرتے ہوئے اُن کی زندگی کے حالات قلم بند کیے ہیں۔

آپ کی سوانح حیات ایک بہت ہی دلچسپ اور روح پرور رُوئیداد ہے۔ آپ کی زندگی واقعی "حیاتِ سعید" تھی اور پڑھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔


بسم الله الرحمن الرحيم

Blank Page

حیاتِ سعید

حیاتِ سعید

سوانح ومجاہدات خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب (ستارہِ خدمت)

امیرِ سوئم جماعتِ احمدیہ لاہور

جلد اوّل

صفیہ سعید

نام کتاب: حیاتِ سعید۔ جلد دوئم

مؤلف: صفیہ سعید

اِدارت: محمد سعید

خط نگاری: عتیق الرحمٰن

ترتیب و آراستگی: فصیحہ جمیل

سرورق: آمنہ سعید، عبید اللہ سعید

نقش کشی: https://www.vecteezy.com

ناشر: بنتِ زینب، کیلگر ی، البرٹا، کینیڈا

بار اوّل: ڈجٹل پرنٹ فروری ۲۰۲۱ء

انتساب

میں اپنی اِس عاجزانہ کاوش کا انتساب
جماعتِ احمدیہ لاہور کے نوجوانوں اور گلاب چہرہ نونہالوں
کے نام کرتی ہوں
جن سے گلزارِ احمدیہ کی اُمیدِ بہار وابستہ ہے

پیش لفظ

''حیات سعید'' اس استدعا کے ساتھ پیشِ خدمت ہے کہ اسے سوانحی ادب کے کسی معیار پر نہ پرکھا جائے کیونکہ، ذخیرۂ اردو ادب میں اضافہ اس تحریر کا مقصد ہرگز نہیں، بلکہ اس سے اُس 'سعید مجاہدہ' کی تحریری عکاسی مقصود ہے، جس کا آغاز اُن لمحات میں ہوا، جب چھ سالہ سعید نے اپنا گھر آنگن چھوڑا، اور چھ میل کی پیدل مسافت طے کرنے کے بعد ایک پرائمری سکول میں اپنا قدم رکھا۔

''حیات سعید'' خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے نوے سالہ اس جہد مسلسل کی ترجمان ہے، جس میں آپ کہیں حصولِ تعلیم میں سرگرم اور کہیں اپنے درپے آزار جسمانی امراض سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ کہیں زندگی سے مایوس پژمردہ چہروں پر، نوید حیاتِ نو سے مسکراہٹیں بکھیرتے اور کہیں ستم رسیدہ، گھائل روحوں کے احیاء میں مصروفِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔

آپ کی زندگی کے ہر دور کے عملِ پیہم سے یہ بات روزِ روشن کی طرح آشکار ہوتی ہے کہ جب ایک انسان، اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے، اپنے ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اور اپنے عجز و انکسار کی حدود میں رہتے ہوئے کچھ کر گذرنے کا عزم لیے میدانِ عمل میں قدم رکھتا ہے تو اُس کے ذوقِ یقین کے سامنے طوفان اپنا رُخ بدل دیتے ہیں۔ چٹانیں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور سلاسل ٹوٹتے چلے جاتے ہیں۔ اور منازل قریب تر ہو جاتی ہیں۔

یہاں، ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی سوانح حیات کی تحریر کے محرکات و پس منظر کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔ یہ ۱۹۹۴ء۔۹۶ء کا زمانہ تھا، جب شعبۂ تصنیفات جماعتِ احمدیہ لاہور کے مہتمم جناب میاں فضل احمد صاحب نے بوساطت چوہدری منصور احمد صاحب، جنرل سیکرٹری انجمنِ مذکورہ، ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی سوانح حیات کے حوالہ سے فرمایا کہ وہ یہ کام کسی صاحب قلم کے سپرد کرنا چاہتے ہیں اور اِس عاجزہ سے تعاون کے خواہش مند ہیں۔ اُس وقت میں نے، کسی اور کی

معاونت کرنے کی بجائے، اس ارادہ کا اظہار کیا کہ یہ کام میں خود کرنا چاہوں گی اور اس طرح رضا کارانہ طور پر سوانح حیات کی تالیف کی ذمہ داری قبول کر لی۔

یہ وہ دور تھا، جب اپنی والدہ کی وفات کے بعد، میں زندگی کی تگ و دو میں شامل رہنے کا حوصلہ ہار بیٹھی تھی، اور ترکِ ملازمت کے بعد ہمہ وقت اپنے والدِ گرامی کی خدمت میں رہتی تھی۔ اپنے والد سے جس قدر قربت مجھے نصیب ہوئی، آپ کی اولاد میں سے کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی، اس لیے آپ کی زندگی کے بہت سے حقائق اور داستانیں میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ خود والد محترم کو میرے حافظہ پر، بالخصوص واقعات و تواریخ کے حوالے سے، بے حد اعتماد تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میرا یہ اچھا حافظہ، آپ کے چچا محترم، یعنی میرے نانا سے مجھے ورثہ میں ملا ہے۔ میری چند مختصر تحریرات آپ کی نگاہ سے گذری تھیں، جنہیں آپ نے پسند فرمایا تھا۔ اس طرح تحریر کے حوالے سے بھی مجھے آپ کا اعتماد حاصل تھا۔ میرے اس ارادہ کا بھی آپ کو علم تھا اور اکثر آپ کے بیان کردہ واقعات میں آپ کی اجازت سے تحریر کر لیا کرتی تھی۔ آپ نے اپنی خودنوشت سوانحی تحریرات بالخصوص ۱۹۷۴ء کے سانحات و واقعات سے متعلق تحریر مجھے مطالعہ کے لیے عطا فرمائی تھی۔ انہی حقائق کے پیشِ نظر مجھے یہ بھاری ذمہ داری اُٹھاتے ہوئے ذرہ بھر بھی تامل نہ ہوا تھا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے انتقال کے بعد، جب محترم جناب ڈاکٹر اصغر حمید صاحب امیرِ چہارم نے اپنے فرائضِ منصبی سنبھالے تو ایک روز میں محترم انوار احمد صاحب کی معیت میں آپ کے دفتر میں حاضرِ خدمت ہوئی اور آپ سے "حیاتِ سعید" کی تالیف کی اجازت اور سرپرستی کی درخواست کی۔ آپ نے میرے اس اِرادہ کو پسند فرماتے ہوئے، میری درخواست پر 'پیغام صلح' کے ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کا اہتمام فرمایا اور اس طرح کئی صاحب الرائے قلم کاروں کی تحریرات یکجا ہو گئیں جو سوانح نویسی کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ محترم امیرِ چہارم نے ایک خاص عنایت یہ بھی فرمائی کہ مضامین کی چھان بین کا بیشتر کام میرے سپرد کر دیا اور یہ خاص شمارہ دسمبر

۱۹۹۷ء میں شائع کر دیا گیا۔

تقریباً چار سال کا عرصہ گذر جانے کے بعد ایک روز عندالملاقات، محترم ڈاکٹر اصغر حمید صاحب نے سوانح پر کام کی پیش رفت سے متعلق استفسار فرمایا۔ میرا جواب مبہم سا تھا۔ جو آپ کی تشفی نہ کر سکا اور آپ نے قدرے تاسف سے فرمایا "وقت تو نکلا جا رہا ہے"۔ آپ کی اس بات نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اُدھر چوہدری منصور احمد صاحب مسلسل توجہ دلاتے رہتے کہ میں اس ارادہ کی تکمیل کے لیے کوئی مثبت قدم اُٹھاؤں۔ وسط ۲۰۰۱ء میں، میں نے ابواب کی تقسیم کا ایک مجمل خاکہ تیار کر کے منصور احمد صاحب کو دکھایا، جسے اُنہوں نے پسند فرمایا اور میری درخواست پر ایسی تحریری معلومات بھی بہم پہنچائیں جو بطور جنرل سیکرٹری آپ نے نوٹ فرما رکھی تھیں۔

امیرِ چہارم کی زندگی نے زیادہ دیر تک وفا نہ کی اور ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو وہ اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ اس کے بعد مجھے امیر پنجم محترم ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب کی سرپرستی اور رہنمائی میسر آتی رہی۔

جب میں نے عملی طور پر کام کا آغاز کیا تو ابتدائی مراحل ہی میں یہ احساس دامن گیر ہونے لگا کہ جس ذمہ داری کو میں سہل جان کر قبول کر بیٹھی تھی، وہ تو ایک اونچی گھاٹی کو سر کر لینے کی تمنا سے کسی طور کم نہ تھی۔ اپنی کوتاہ بینی کی بنا پر اُس وقت نہ تو مجھے اِس کی وسعتوں کا ادراک ہوا اور نہ اپنی محدود استعداد پر ہی نگاہ پڑی۔ سنگلاخ راہ پر چلنے لگی تو کبھی جسمانی ناآسودگی نے قدم روکے اور کبھی کارہائے جہاں کی رنگا رنگ کیفیات آڑے آتی رہیں۔ مگر نگاہ منزلِ مقصود پر مرکوز رکھے، گرتے سنبھلتے سفر جاری رکھا۔ اور اس طرح کئی جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی یادداشتوں، رودادوں اور دستاویزات میں بکھرے جواہر ریزوں کو سمیٹتے اور ترتیب دیتے دیتے کئی برس صرف ہو گئے۔

اس تحقیق و تحریر کے عمل میں، میں خود عجیب کیفیات اور احساسات سے دوچار رہی

ہوں۔ اپنی سوچ اور تصور میں، اور اپنے احساسات میں، ہر آن میں اپنے آپ کو اپنے والد محترم کے ہمراہ پاتی تھی۔ زندگی کے خوش گوار اور خوش کن لمحات میں بھی اور درد انگیز گھڑیوں میں بھی میں آپ کے ساتھ تھی۔ دارالسعید سے اُٹھتے ہوئے آتشیں شعلوں کی حدت اور بارود کے تعفن کو میں نے خود محسوس کیا ہے۔ فلک شگاف غلیظ نعروں اور تالیوں کی گونج کو بھی میرے کانوں نے سنا ہے۔ نقصِ اموال ونفوس کے صبر آزما لمحات میں، آپ کے رنج والم کی شدت کو بھی میں نے آپ کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ دارالسلام میں قیام اور یورپ و امریکہ کی مسافرت میں بھی میں آپ کی ہم سفر رہی۔ دورانِ تحریر کبھی میرے چہرے پر مسکراہٹ اور مسرت و انبساط کے رنگ بکھرتے رہے اور کبھی آنسوؤں کی برسات، تحریر شدہ الفاظ کو ہی دھودالتی رہی۔ تاہم ان تمام تر احساسات کے باوجود میں نے حیات سعید کی تالیف و ترتیب کو ایک عبادت سمجھا ہے، اور تمام واقعات کو، بساط بھر، غیر جانبداری سے قلم بند کیا ہے۔ عام روایات پر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی اپنی تحریرات و بیانات کو ترجیح دی ہے تاکہ روایات میں زیب داستان کے لیے شامل شدہ عناصر اس تحریر پر اثر انداز نہ ہوں۔ بعض ناموں کا اخفاء اس لیے ضروری سمجھا گیا ہے کہ کسی کی دلآزاری نہ ہو اور ستاری کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ میری تمام تر احتیاط کے باوجود بھی، اگر کسی مقام پر کسی کو دختر انہ جذبات کی کوئی جھلک نظر آئے تو اُسے نظر انداز کر دینے کی خواہش مند ہوں۔

"حیات سعید" کے خاص ماخذ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی غیر مطبوعہ سوانحی تحریرات ہیں جو تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔

۱۔ "سانحہ ۱۹۷۴ء کی سرگزشت" جو آپ نے محترم راجہ محمد افضل صاحب مرحوم کی تحریک پر سپردِ قلم کی تھی۔ یہ دستاویز تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

۲۔ "حیات سعید۔ میری مستعار زندگی کے چند لمحات" یہ ۱۹۷۴ء سے ماقبل کی زندگی کے چند اہم واقعات پر مشتمل ہے۔

۳۔ "ہزارہ پاکستان میں احمدیہ تحریک کا اثر ونفوذ اور مخالفت عامہ"۔ یہ تحریک احمدیت کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

(موخر الذکر دونوں تصنیفات کی تحریک محترم پروفیسر بشیر احمد سوز صاحب نے فرمائی تھی اور پروفیسر صاحب موصوف نے ہی کمال محنت اور لگن سے ہر سہ تحریرات کی خوشخط کتابت بھی فرمائی تھی)۔

۴۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی متعدد یادداشتیں، دستاویزات، روناچے اور سفرنامے۔

۵۔ چند دیگر تصانیف و مطبوعات جن سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ درج ذیل ہیں:

الف۔ پروفیسر خلیل الرحمان صاحب کی خودنوشت غیر مطبوعہ سوانح۔

ب۔ "جلتے بجھتے دیپ" تصنیف بلقیس چیمہ صاحبہ۔

ج۔ "کچھ یادیں کچھ باتیں" مجموعہ مضامین محترمہ رضیہ فاروقی صاحبہ۔

د۔ "حیات حسن" تصنیف عبداللہ جان نیازی۔

ھ۔ "آئینہ صدق وصفا" تحریر کردہ محترم مرزا مسعود بیگ صاحب۔

و۔ "تاریخ اعوانانِ ہزارہ" تحقیق وتحریر محبت حسن صاحب۔

ز۔ احمدیہ انجمن لاہور کے شائع کردہ رسائل، جرائد اور دیگر مطبوعات۔ اور

ح۔ "حیات سعید" کے لیے بطور خاص قلم بند کردہ تحریرات۔

۶۔ "حیات سعید" کا حرفِ اوّل ڈاکٹر سعید احمد خاں صاحب کی اپنی تحریر ہے۔

دورِ حاضر میں زبان اردو سے شغف میں ایک نمایاں کمی دیکھنے میں آئی ہے۔اس لیے اِس کو نہایت سادہ اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے، اور چونکہ فارسی دانوں کی تعداد تو تقریباً معدوم ہی ہے، اس لیے اس تحریر میں شامل فارسی اشعار اور عربی عبارات کے تراجم بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ تاہم مجھے اس بات کا بھی شدت سے احساس ہے کہ جب تک حیات سعید کا انگریزی ترجمہ شائع نہ ہو گا۔ جماعتِ احمدیہ کی اکثریت اس سے مستفید نہ ہو پائے گی۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی وفات کے چند روز بعد، کرنل محمود شوکت صاحب نے ایک خواب میں دیکھا کہ آپ سفید لباس میں ملبوس ایک گھوڑے پر سوار ہیں۔اور کرنل صاحب کو بتایا گیا کہ یہ قطب ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہی بہتر جانتا ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا روحانی مقام کیا ہو گا۔مگر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی زندگی کی مثال ایک قطب ستارے کی مانند ہے، جس سے ہر مسافر اپنی منزل کی سمت کے تعین میں رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

''حیات سعید'' کا آغاز میں نے یکم ستمبر ۲۰۰۱ء کو جامعہ ایبٹ آباد کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں کیا تھا۔ جہاں مغرب کی سمت سرسبز کوہِ حبیبہ کا منظر ذہن کو تازگی بخشتا تھا اور جب نگاہیں جھکا کر دیکھتی تھی تو سامنے وہ سجدہ گاہیں ہوتیں جنہیں کئی محترم ہستیوں کی جبینوں نے سجایا تھا۔اور اس کی تکمیل برف پوش پہاڑیوں میں گھرے، کشادہ آسمان کے نیچے آباد، کینیڈا کے شہر کیلگری میں، میرے بچوں وحید اور نسرین کی پُرسکون اور پُرآسائش قیام گاہ میں ہوئی، جہاں میں نے جولائی ۲۰۱۱ء سے جولائی ۲۰۱۴ء تک کے عرصہ میں دوتہائی سے زیادہ کام مکمل کیا۔

''حیات سعید'' کے لیے مطلوبہ معلومات، کتب، مضامین اور دستاویزات کی فراہمی کے علاوہ اِس کی ترتیب وتدوین، کتابت وطباعت تک کے تمام مراحل میں میرے تمام بہن بھائی اور عزیز میرے معاون رہے اور موجودہ صورت میں یہ پیشکش سب کی مشترکہ سعی اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ واقعات اور حالات کو الفاظ میں ڈھالنے کا کام میرے سپرد رہا، مگر اپنے عزیزوں کے اعتماد اور

دُعاؤں کے بغیر یہ کام میں کسی صورت انجام نہ دے پاتی۔ اِس کے علاوہ جدید کتابت اور طباعت کے طریقوں سے میری ناواقفیت اِس کام میں سد راہ ہوسکتی تھی، اگر میرے بھائی خاص طور پر بریگیڈیئر محمد سعید اِس کی مکمل ذمہ داری نبھانے کے لیے اپنا قیمتی وقت اور راتوں کی نیند قربان نہ کرتے۔ اس لیے "حیاتِ سعید" کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تمام اولاد کی محنت اور کوشش کا نتیجہ قرار دینے میں میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہوں۔ تاہم یہاں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے ایک کشفی نظارے کا ذکر کرنا چاہوں گی۔

دارالسلام، ۱۶ فروری ۱۹۸۱ء

اُس شب خواب کے بعد کسی وقت ایک آنی نظارہ دیکھا کہ میرے موجودہ سونے کے کمرے کی الماری (wardrobe) کا دروازہ کھلا ہے اور اُس میں جس قدر خانے ہیں (موجودہ حالت سے مختلف ہیں) کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ کتابیں نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں اور الماری نہایت صاف اور پاکیزہ حالت میں ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں میری کسی بیٹی نے یہ عمدہ کام کیا ہوگا۔ یہ منظر نہایت دِل خوش کُن تھا۔ الماری میں کتابوں کے بغیر دیگر کوئی چیز نہیں۔"

عین ممکن ہے کہ یہ محض میری خوش خیالی ہو، لیکن پھر بھی میرے لیے بے حد تسکین کا سبب ہے کہ الماری میں کتب کی آراستگی سے مراد شاید آپ کی کتابِ زندگی کی ترتیب ہے۔ جو آپ کی ہی کتب سے ماخوذ ہے۔ میری دُعا ہے کہ اگر میری یہ عاجزانہ سی کاوش اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں احسن ہے تو وہ میری خطاؤں کے سبب مجھے اس کے اجر سے محروم نہ فرمائے۔ آمین۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (پس اللہ کے لیے ہی سب تعریف ہے (جو) آسمانوں کا رب اور زمین کا رب، اور سب جہانوں کا رب ہے) (الجاثیہ ۴۵:۳۶)۔

۱۵ جولائی ۲۰۱۴ء۔ بمطابق ۱۷ رمضان ۱۴۳۵ھ

صفیہ بنتِ سعید



تشکر

حمد وثنا اُس ذاتِ بابرکات، اللہ جَلَّ شانہٗ کی جس نے اِس عاجزہ کو حیاتِ سعید کو ضبطِ تحریر میں لانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ، استعداد، صحت، عمر اور ہر طرح کی سہولیات اور افضال سے نوازا اور اپنے بہن بھائیوں، عزیزوں، بچوں اور بزرگوں کا اعتماد، حوصلہ افزائی اور عملی تعاون اور دُعائیں نصیب فرمائیں۔ دورانِ تحریر، میرے برادرِ نسبتی چوہدری منصور احمد صاحب کی، کام کی پیش رفت میں گہری دلچسپی اور برادرانہ شفقت میرے لیے خاص تقویت کا موجب رہی۔

''حیاتِ سعید'' کی کتابی صورت میں یہ پیشکش کئی دیگر ہستیوں کے عملی تعاون کی بھی مرہونِ منت ہے۔ جن میں محترمہ بشریٰ علوی صاحبہ اور محترمہ طیبہ انوار احمد صاحبہ کا مسودات کے عمیق مطالعہ اور ضروری تصحیح میں، جماعت کے ہونہار نوجوانوں عتیق الرحمٰن کا کتابت میں، سہیل احمد کا مطلوبہ مضامین و اسناد کی برقی عکاسی میں اور حلیمہ سعید کا تصاویر کے انتخاب میں تعاون حاصل رہا۔ ان کے علاوہ محترم ڈاکٹر حامد رحمان صاحب اپنے قیمتی مشوروں سے میرے کام میں آسانی پیدا فرماتے رہے ہیں۔

میں یہاں محترمہ عابدہ گل صاحبہ کا ذکر کرنا چاہوں گی جنہوں نے اپنے ''چاچا جی'' محترم جناب پروفیسر خلیل الرحمان صاحب کی خود نوشت سوانحی تحریر سے مجھے مستفید ہونے کی اجازت دی، جو اُن کی تحویل میں ہے۔

اِن سب کی اور دیگر کئی افراد کی عنایات کے اظہارِ تشکر کے لیے میرے پاس کوئی بھی ایسا موزوں لفظ نہیں، جو نوکِ قلم سے ادا ہو، اور میرے جذبات کا مکمل عکاس ہو۔ اِس لیے میں صرف اِن سب مہربانوں کے لیے دعا لکھتی ہوں۔

معذِرت

میری پیاری بہن نے ”حیاتِ سعید“ کی تصنیف جولائی ۲۰۱۴ء میں مکمل کر کے چھپائی اور اشاعت کے لیے میرے سپرد کر دی تھی۔ اُمید تھی کہ کتاب چھپ کر جلد ہی منظرِ عام پر آ جائی گی۔مگر میری نااہلی، ناتجربہ کاری اور سُستی کے نتیجے میں آپ کو چھ سال کا طویل انتظار کرنا پڑا۔اس کے لیے میں اپنے دل کی گہرائیوں سے معذرت خواہ ہوں۔ میں خصوصاً اپنے اُن عزیزوں اور بزرگوں سے شرمندہ ہوں جو اس اہم تصنیف کے انتظار میں رہے مگر اِس کی اشاعت سے پہلے ہی اپنے مولیٰ سے جا ملے۔

اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ

(اے میرے اللہ میرے عیبوں کو ڈھانپ دے)

مُعتذِر

محمد سعید

حرفِ اوّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ و نصلی علٰی رسولہ الکریم

بعض احباب نے بالعموم اور راجہ محمد افضل صاحب نے بالخصوص مجھ سے فرمائش کی کہ ۱۹۷۴ء میں رونما ہونے والی ” اینٹی احمدیہ مومنٹ “ کے دوران ہزارہ پاکستان کی جماعتوں کو دکھ درد کے جو حادثات پیش آئے، اور ایبٹ آباد کے احباب بالخصوص، ہمارے مکان پر خشت و بم باری، آتش زنی، فائرنگ، لوٹ کھسوٹ کی صورت میں ” سرفروشانِ ناموس محمدؐ “ اور ” محافظین ختم نبوت “ نے جو شورش و بلوہ کیا اور جو دہشت گردی کی اسے مَیں، ضبط تحریر میں لے آؤں۔ راجہ صاحب موصوف لکھتے ہیں:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ و نصلی علٰی رسولہ الکریم

بدوملہی ۶ مارچ ۱۹۷۵ء

مکرمی معظمی جناب خانصاحب ڈاکٹر سعید احمد صاحب،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

امید ہے آپ معہ جماعت اور دوستوں کے خیریت سے ہونگے خدا آپ کا حامی وناصر ہو۔ آپ کو علم ہے کہ جلسہ سالانہ پر آپ نے فرمایا تھا کہ میں خود اپنے حالات بیان نہیں کرنا چاہتا تو میں نے بھرے جلسہ میں آپ سے عرض کی کہ ہم لوگ آپ کے حالات سننا چاہتے ہیں پھر بھی آپ اپنے حالات سنانے

پر آمادہ نہ ہوئے تو میں نے عرض کی کہ قرآن کریم میں بیشمار ایسے حالات درج ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے لشکر سے بچ جانا اور فرعون کا غرق ہو جانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معہ صدیق اکبر کے بچ جانا۔ یہ واقعات ہمارے ایمانوں کو تازہ کرنے کے لئے ہیں آپ کے واقعات سے بھی ہمارا ایمان ہی تازہ نہیں ہوگا بلکہ آئندہ آنے والی نسلیں اس سے فائدہ اٹھائیں گی اور اپنے ایمانوں کو تازہ کریں گی۔ آپ کچھ خاموش تو ہو گئے مگر پھر بھی اپنے حالات نہیں سنائے جس پر جناب خلیل الرحمان صاحب پروفیسر نے آپ کے حالات سنائے جس سے شامل جلسہ والوں نے ضرور اپنا ایمان تازہ کیا۔ کئی روز بعد میں نے مسجد میں ہی دارالسلام جماعت کی موجودگی میں آپ سے عرض کی تھی کہ آپ کے حالات لوگوں نے جناب پروفیسر خلیل الرحمان صاحب کی زبانی سنے ہیں، مگر دو آدمی بھی جب ان حالات کو بیان کریں گے تو حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے کچھ کا کچھ بن جائے گا اس لئے آپ اگر تھوڑے تھوڑے کر کے پیغام صلح میں چھپوا دیں تو حالات محفوظ ہو سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ پروفیسر صاحب نے جو حالات بیان کیے ہیں ان کو بھی بعض باتوں کا علم نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنے گھر میں تھے میرے گھر کے حالات میں ہی خوب جانتا ہوں اور اب حالات تازہ ہیں میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں ان حالات کو لکھ کر کتابی شکل میں شائع کر دوں۔ یہ باتیں میں خطبہ جمعہ میں بھی بیان کر چکا ہوں۔ امید ہے آپ نے واقعات قلمبند کر لئے ہونگے۔ جتنا جلدی یہ شائع ہو جائیں جماعت کیلئے فائدہ مند ہیں۔ اور دوسرے زندگی کا کچھ پتہ نہیں، ہر ہفتہ کچھ ہمارے دوست خدا کو پیارے ہو کر ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ باقی خیریت ہے۔ ساری جماعت کو میری طرف سے السلام علیکم قبول ہو۔

والسلام،

راجہ محمد افضل

گورنمنٹ مسلم ہائی سکول بدوملہی ،تحصیل نارووال، ضلع سیالکوٹ

راجہ صاحب کا خیال ہے کہ کرب واضطراب کے وہ واقعات اور موت وحیات اور صبرو استقامت کے وہ لمحات تاریخی حیثیت کے حامل اور ایمان افروز ہوں گے۔ اور آنے والے لوگوں میں ان کا ذکر ضرور ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جماعتی اور قومی زندگی کے مستقبل اور اس کی تعمیر وترقی کے باب میں اس کے ماضی اور ماضی کی تاریخ وتذکرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے، جن کے حوالہ سے تازہ نسل میں اعلیٰ جذبات ابھرتے اور کچھ کر گذرنے کا ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے، پھر ہماری اپنی جماعت کی تاریخ تو بڑی منفرد ہے۔ یہ دینی خدمات، دین کے لیے ایثار وخلوص، جوش وجذبہ، صبرو استقلال اور جان و مال کی ایمان افروز قربانیوں سے مزین ہے۔ جو ہماری زبان کی پہچان اور روایت ہیں۔ وہ پہچان اور وہ روایت جس کی پاسبانی اور پاسداری کے لیے امیر مرحوم حضرت مولٰینا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جماعت کے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ایک بات میں اپنے نوجوان دوستوں سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ لوگ احمدی قوم کی روایات کو زندہ رکھیں۔ احمدی جماعت دین کو دنیا میں پھیلانے، قرآن کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ اپنی اس روایت کو کمزور نہ ہونے دو۔ شاید کسی کو خیال ہو کہ ہم دین کی تبلیغ کریں گے تو ہمیں کیا عزت ملے گی؟ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر عزت کا کوئی کام اور دنیا میں نہیں ہے۔...... میں پھر اپنے نوجوان دوستوں سے کہوں گا اور بار بار

> کہوں گا کہ اپنی قوم کی روایات کو زندہ رکھو۔........ ایک دن آئے گا کہ آپ اپنے ایک ایک بزرگ کے جسم کو اپنے ہاتھوں سے مٹی میں دفن کرو گے۔ تمہارے پیچھے آنے والے تمہارے جسموں کے ساتھ بھی یہی کریں گے۔ اے میرے نوجوان دوستو! میں تمہیں بڑی تاکید کے ساتھ کہتا ہوں اور نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنے بزرگوں کے جسموں کے ساتھ کہیں اپنی روایات کو دفن نہ کر دینا۔ ان کو زندہ رکھنا اور ترقی دینا تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ قوم مرتی چلی جاتی ہے۔ (ہفت روزہ پیغام صلح۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۸ء)

اس احساس کے پیش نظر میں نے بھی سمجھا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں جو باتیں بطور روایات سنائی لکھائی جاتی ہیں۔ ان میں کچھ مبالغہ آمیزی اور غلط بیانی کو بھی دخل ہو جاتا ہے۔ چونکہ میں اور میرے ساتھی جن میں مرد و زن، پیر و جواں اور بچے بچیاں شامل تھیں۔ گولی بارود، سنگ آگ اور بلوائیوں و شورش پسندوں کے کثیر انبوہ کے براہ راست نشانہ تھے۔ بظاہر ان کا بنیادی مقصد مجھے قتل کرنا تھا اور مَیں ان کے نرغے اور گھات میں تھا۔ ان کے غیض و غضب کی آگ میرے چہار اطراف بھڑک رہی تھی۔ اس لیے ایک عینی شاہد کی حیثیت سے میں نے راجہ صاحب موصوف سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں ان روح فرسا حالات کو حتی المقدور صحت کے ساتھ لکھوں گا۔ انشاء اللہ۔

مجھے جب کبھی فرصت اور یکسوئی کے لمحات میسر آتے میں سانحۂ کے حالات و واقعات سے متعلق یادداشتیں رقم کرتا رہتا۔ اب جبکہ ۱۹۸۵ء کے موسم گرما میں دارالسلام لاہور سے دارالسعید ایبٹ آباد میں چند ہفتوں کے لیے فروکش ہوں۔ اور قدرے سکون و سہولت بھی مجھے میسّر ہے۔ رمضان کا مہینہ ہے۔ میں نے سوچا کہ اس بے ترتیب مسودے کو مرتب کرلوں۔

ابتداً تو اس تالیف کا مقصد ہزارہ میں سانحہ ۱۹۷۴ء کی المیہ سرگذشت کا بیان تھا (جو بحمد اللہ تمام ہوئی)۔ اس کے ساتھ ہی عزیزی پروفیسر بشیر احمد کی تحریک پر دو موضوعات۔ ”تحریک

احمد یہ پر ایک نظر" اور" حیات سعید" پر کچھ لکھنا مناسب سمجھا گیا۔ اگر قدرت نے فرصت اور مہلت نصیب کی تو ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔ واللہ خیر۔

" احمد یہ تحریک پر ایک نظر" میں اس تحریک کے قیام واغراض، عقائد ونظریات، اس کا اثر و نفوذ، اس کی مخالفت عامہ اور بالخصوص ہزارہ میں اس کا اثر وغیرہ شامل ہیں۔ اسلام میں بہت سی مذہبی تحریکوں نے جنم لیا ہے۔ لیکن احمد یہ تحریک ان سب میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ اس نے اپنی انفرادی خصوصیات کے باوصف جہاں اسلام، مذاہب غیر اور اقوامِ عالم کی مذہبی اور عمرانی تاریخ میں ایک خاص مقام ومعزز شہرت پائی، وہاں اس کی مخالفت بھی بڑے زور وشور سے ہوئی۔ شدید ترین ہوش ربا مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود بھی ہزاروں مصائب وابتلاؤں سے گذرتی ہوئی اپنے نصب العین کو لیے آگے ہی آگے رواں دواں ہے۔ آخر وہ کون سے اسباب وعوامل ہیں جو مخالفانہ شورشوں اور مخاصمتوں کو ماضی میں وقتاً فوقتاً جنم دیتے رہے اور آئندہ بھی ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اور اس تحریک کے پاس وہ کونسی طاقت وقوت ہے جو ان عداوتوں کی مدافعت میں کام آتی ہے۔ چنانچہ میں زیر نظر موضوع میں ان اسباب وعوامل اور اس طاقت وقوت پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ توفیقہ تعالیٰ۔

" حیات سعید" میں راقم اپنے خاندانی اور ذاتی حالات کو اختصاراً بیان کرنا چاہتا ہے۔ اپنی مستعار فانی زندگی کا یہ بیان کسی نمود ونمائش اور خود ستائی، خود نمائی کے لیے نہیں۔ حاشا وکلا۔ واللہ اعلم ما فی الصدور و انما الاعمال بالنیات۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ قاری کو شاید میری زندگی کے کسی موڑ پر کسی زاویے پر سے کوئی عبرت وموعظت حاصل ہو۔ اور وہ اس کے محاسبہ سے اپنے لیے کسی بہتر عمل کی راہ نکال لے۔ مَیں کوئی مصنف ومورخ نہیں ہوں۔ اور نہ کوئی ''بڑا'' ہونے بننے کا زعم ودعویٰ ہے، لہذا میرے اس بیان وتحریر کو ادب وتنقید کے معیار پر پرکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے، وہی کچھ بیان کرنے کی کوشش ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

العظیم۔

آج ۱۱ جون، منگل کا دن ہے عجیب توارد ہے کہ آج کی ہی تاریخ اور آج کے ہی دن پورے ۱۱ سال پہلے، اسی مقام پر بلوائیوں نے میرے اموال اور املاک، میرے لواحقین و احباب جماعت اور خود مجھے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ ۱۱ سال کا طویل عرصہ سمٹ کر ۱۹۷۴ء کے ۱۱ جون کی تمام تر ہولنا کیوں کو چشم زدن میں میرے سامنے لے آیا ہے۔ اور آج کی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔سبحان اللہ العزیز کل امر۔

سعید احمد

۱۱ جون ۱۹۸۱ء



تعارف

از ڈاکٹر زاہد عزیز

اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَہُمُ الۡقَرۡحُ ۟ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡہُمۡ وَ اتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۷۲﴾ۚ اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡہُمۡ فَزَادَہُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ وَّ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡہُمۡ سُوۡٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۷۴﴾

وہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی، اس کے بعد کہ انہوں نے زخم کھایا۔ جنہوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقویٰ کیا، ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ وہ جن کو لوگوں نے کہا: لوگ تمہارے مقابلے کے لیے جمع ہو گئے ہیں، پس ان سے ڈرو، تو اِس (بات) نے انکا ایمان بڑھا دیا اور انہوں نے کہا: اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور کیا ہی اچھا کارساز ہے۔ پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل سے واپس آئے۔ انہیں کوئی دکھ نہ پہنچا اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (الِ عمران ۳: ۱۷۲۔ ۱۷۴)۔

اس مفید اور ضخیم کتاب کی قابلِ قدر محترمہ مصنفہ صاحبہ نے مجھے مدعو کیا ہے کہ میں اس سوانحِ مبارک کے متعلق چند الفاظ تحریر کروں۔ غالباً یہ عرض اس لئے کی گئی ہے کہ مجھے یہ سعادت ملی کہ جماعتِ احمدیہ لاہور کے کام کے سلسلہ میں میرا تعلق حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے ساتھ بہت نزدیکی سے رہا، اور یہ تعلق ۱۹۷۵ء سے شروع ہو کر آپکی زندگی کے اختتام تک قائم رہا۔

اس تبصرے کے آغاز کے لیے مندرجہ بالہ آیات نہایت مناسب معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ آپکی زندگی کا اہم ترین واقعہ اور موڑ وہی تھا جب جون ۱۹۷۴ء میں فسادی لوگ آپکے خلاف جمع ہو گئے، مگر آپ نے، بجائے اس کے کہ ڈر کر اُن کے مطالبات قبول کرتے اور حق کا دامن چھوڑتے، اللہ کو کافی سمجھا، اور اسی کی نعمت اور اسی کے فضل سے آپ اور آپ کے ساتھی بچ بچا گئے۔ مالی نقصان بیشک ہوا، اور جسمانی تکالیف پہنچیں، مگر جو لوگ اللہ کے فضل کو پہچانتے ہیں ان کے نزدیک مادی نقصانات کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اگر دین و ایمان قائم رہے۔

اس کتاب 'حیاتِ سعید' کا جب میں نے مطالعہ کیا تو مجھے ذیل کا شعر یاد آیا جو حضرت مولانا محمد علی صاحب کے حالاتِ زندگی کی کتاب 'مجاہدِ کبیر' میں مصنفین نے درج کیا ہے:

ہاں دِکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح شام تُو　　دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایاّم تُو

کتنا آرام اور کتنی بےفکری ہم نے اس مضبوط اور باخدا شخصیّت، یعنی حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب، کی رہنمائی اور قیاّدت میں پائی، کہ آپ اللہ تعالیٰ کے آگے ہماری خاطر گِر گِر روتے، اور ہماری بھلائی کا فکر ہم سے زیادہ آپ کو ہوتا، تو ہم اطمینان میں تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور، اس سے بڑھ کر، ہماری جماعت کو اپنی حفاظت میں رکھے گا۔

حضرت مرزا غلام احمد صاحبؒ کی ایک فارسی نظم میں ذیل کا شعر ہے:

لوائے ما پنہ ہر سعید خواہد بود　　ندائے فتح نمایاں بنامِ ما باشد

یعنی میرا جھنڈا ہر سعید کی پناہ ہوگا، اور فتح نمایاں میرے نام کے تحت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس شعر میں 'سعید' سے مراد سعادت مند انسان ہیں، نہ کہ کسی شخص کا ذاتی نام۔ مگر واقعات اس کو ہمارے ڈاکٹر سعید احمد صاحب پر بھی چسپاں کرتے ہیں۔ جب آپ جون ۱۹۷۴ء میں اپنے مکان میں دیگر احباب کے ساتھ مخالفینِ احمدیت اور فسادیوں کے محاصرہ میں تھے تو وہ مسیح موعود کا ہی جھنڈا تھا جس

کی زیرِ پناہ آپ اور آپ کے ساتھی تھے۔اس کے بعد آپ نے لاہور میں قیام پذیر ہوکر وہاں بھی 'دارالسلام' سے مسیح موعود کا جھنڈا لہرایا۔آپ نے زور دیا کہ تمام ممبرانِ جماعت با قاعدہ مسیح موعود کے بیعت شدہ ہوں۔گو آپ کی اس معاملہ میں مخالفت ہوئی،مگر آپ اسی موقف پر قائم رہے۔اسی طرح آپ نے بیرونی ممالک کے طویل دورے کیے اور وہاں ہماری تناظیم اور جماعتوں کے نام 'احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور' رکھے۔ان بیرونی جماعتوں کے نام عرصوں سے 'مسلم ایسوسی ایشن'، 'مسلم مشن' یا 'مسلم لیگ' کی طرز کے تھے،مگر آپ نے زور دیا کہ ہماری اپنی شناخت ہونی چاہیئے اور اشاعتِ اسلام کا کام، جو ہمارا نصب العین ہے، اس میں 'فتح نمایاں' مسیح موعود کے ہی جھنڈے تلے اور اُس کے نام تلے ہوگی۔

انگریزی زبان کی ایک کہاوت "Cometh the hour, cometh the man" ہے۔یعنی جب وقت آیا تو مرد بھی آیا۔مراد ہے کہ وقت کی ضرورت کے مطابق ایسا شخص اٹھا جو پیش آمدہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے درکار تھا۔انگلینڈ کے ایک مشہور وزیرِ اعظم نے، جنہوں نے اپنے ملک کو ایک انتہائی نازک موقعہ پر قیادت میں آ کر، جب کہ ان کی اپنی عمر بھی بڑھ چکی تھی، فوجی شکست سے بچایا، بعد میں یہ کہا کہ جب میں اس نازک وقت پر وزیرِ اعظم بنا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری گذشتہ تمام طویل زندگی نے مجھے اِسی موقعہ کے لیے ہی تیار کیا تھا۔جناب ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی زندگی مُلکی سیاست میں تو نہیں رہی تھی بلکہ خدمتِ دین اور خدمتِ خلق میں۔اور آپ کی گذشتہ زندگی نے آپ کو تقوٰی و طہارت، علم و حکمت، روحانیت اور قربانی و استقامت کے بلند دراجات پر فائز کر کے تیار کر دیا تھا۔جب وہ موقعہ آیا کہ، دشمن تو ایک طرف، اپنوں کے دلوں میں بھی وسوسے آئے اور قدم ڈگمگانے لگے، تو آپ اس طوفان کے سامنے چٹان کی طرح کھڑے ہو گئے۔اس سے دوسرے مخلصین اور جماعت کے خیر خواہوں کو بھی ایک سہارا، ایک محوَر، اور ایک مرکز مل گیا جس کے اردگرد وہ جمع ہو جائیں اور جماعت کا شیزارہ بکھرنے سے بچا لیں۔

خاکسار کی تو ملاقات ہی آپ سے پہلی مرتبہ ۱۹۷۵ء کی جولائی یا اگست میں لندن میں ہوئی۔ اس سے پہلے تو گھر میں صرف آپ کا نام ہی سنا ہوا تھا، کہ جب میری نانی مرحومہ، بدر النساء، زوجہ حضرت مولانا عبدالحق ودیارتھی، کو ٹی بی کا مرض ہوا، تو وہ ڈاڈر سینیٹوریم میں ۱۹۴۴ء میں آپ کے زیرِ علاج رہیں۔ میری والدہ اور میری خالہ بھی انکے ہمراہ ڈاڈر میں ٹھہریں۔ میرے ذہن میں آپ کے متعلق کوئی تاثر موجود نہیں تھا، نہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ میرے ماحول نے پہلے سے ہی میرے دل میں یہ خیال جما دیا ہوا تھا کہ آپ ایک بہت بڑے بزرگ ہیں۔ یہ تو آپ سے ملاقات کے بعد جب میں نے آپ کا لوگوں سے پیش آنے کا طریق، آپ کا اخلاق وخلوص، آپ کی عبادات، آپ کا جماعت قائم کرنے کا جوش اور ولولہ، اور دیگر ایسے اوصاف کا مشاہدہ کیا، تو مجھے آپ سے ایک اُنس اور آپ کی طرف ایک کشش فوراً پیدا ہوگئی جو ہمیشہ قائم رہی۔ اس زمانہ میں مَیں ایک نوجوان، یونیورسٹی طالبِ علم تھا۔ نہ دینی، نہ علمی، نہ دنیوی لحاظ سے میری آپکے مقابلہ میں کوئی حیثیت تھی، اس کے باوجود آپ میرے ساتھ ایسے پیش آئے جیسے میں آپ کے برابر کا انسان ہوں۔ آپ کی شفقت اس لیے تھی کہ خاکسار دینِ اسلام اور جماعتِ احمدیہ لاہور کی خدمت کا کچھ جذبہ رکھتا تھا۔ اور نہ صرف میرا، بلکہ دیگر احباب کا بھی آپ کے ساتھ یہی تجربہ تھا۔ جماعت بنانے کا اصول ہے ہی یہ کہ قائدین جن اشخاص کو جماعت کا اثاثہ اور جماعت کے لیے مفید سمجھیں، انکی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے انکی حوصلہ افزائی کریں اور انہیں ترقی کی راہ پر لگائیں۔

کتاب 'حیاتِ سعید' جیسی تصنیف کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے ماخذ جن کا ذکر مصنفہ صاحبہ نے اپنے 'پیش لفظ' میں کیا ہے ان میں سے پہلا، یعنی 'سانحہ ۱۹۷۴ء کی سرگزشت' جو کہ حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی اپنی بیان کی ہوئی تحریر ہے، اُس کے مسودہ کو حضرت ڈاکٹر صاحب نے خود ایک مرتبہ مجھے پڑھنے کو دیا جبکہ میں ۱۹۹۲ء یا ۱۹۹۳ء کے جلسہ سالانہ کے موقعہ پر لاہور گیا ہوا تھا، اور میری اس کے متعلق رائے طلب کی۔ میں نے اسکو بغور، بہت شوق سے پڑھ کر آپ سے عرض کیا کہ اس کو شائع کرنا انتہائی اہم ہے تا کہ ایک مستند تاریخ منظرِ عام پر آئے جو کہ ہماری جماعت کے

احباب کے لیے بہت ایمان افروز ہو۔ آپ کی وفات کے بعد میں وقتاً فوقتاً آپ کی بعض محترم اولاد سے اس واقعہ کا ذکر کرتا رہا اور اس تحریر کی اشاعت کی ضرورت کا مشورہ دیتا رہا۔ اس لیے جب کتاب 'حیاتِ سعید' کو مصنفہ صاحبہ نے قبل از اشاعت مجھے بھیجا تو خاکسار کو از حد خوشی ہوئی کہ اس میں 'سانحہ ۱۹۷۴ء کی سرگزشت' شامل ہے، اور نہ صرف یہ بلکہ حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی سوانحِ حیات کو مکمل طور پر پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

جیسا کہ اس کتاب کے 'حرفِ اول' میں درج شدہ خط میں راجہ محمد افضل صاحب نے لکھا ہے، جب ایسے واقعات ایک آدمی سے دوسرے تک صرف زبانی بیان سے پہنچیں تو حافظہ کی کمزوری سے غلطیاں داخل ہونا شروع ہو جاتی ہیں، اور اس خط کے جواب میں حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے بھی اس خدشہ کو محسوس کیا ہے کہ ایسی باتوں کی روایات میں کچھ مبالغہ آمیزی اور غلط بیانی کو بھی دخل ہو جاتا ہے۔ خاکسار کی رائے میں یہ احتمال مزید بڑھ جاتا ہے خاص طور پر ایسے واقعات کے متعلق جو انسانی جذبات کو اُبھاریں، جو ایمان افروز ہوں، اور جو اپنی قوم کے رہنماوں کے عظیم کارناموں سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہماری جماعت کی تو یہ خصوصیت ہے، جس کا سہرا زیادہ تر حضرت مولانا محمد علی صاحب کے سر جاتا ہے، کہ ٹھوس حقائق پر قائم رہنا اور جذبات کی رَو میں نہ بہنا ہمارا اصول ہے۔ حقیقت سے دور اور بڑھ چڑھ کر جذباتی بیانات محض لفظ، لفاظی رہ جاتے ہیں اور ہمیں ایک قابلِ عمل نمونہ نہیں پیش کرتے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب ہمیشہ جماعت کی توجہ اس طرف دلاتے رہے کہ قول کو کوئی پھل نہیں لگتا، عمل کو پھل لگتا ہے۔

موجودہ کتاب کی بہت ضرورت، اہمیت اور افادیت ہے، خصوصاً اس لیے کہ اس میں مستند معلومات جمع کی گئی ہیں اور معتبر ذرائع اور ماخذ کے اقتباسات اور حوالے موجود ہیں جو کہ ان زمانوں میں تحریر ہوئے جب کہ وہ واقعات ابھی تازہ تھے۔ نیز یہ کتاب نہ صرف حضرت ڈاکٹر سعید احمد خانصاحب کی ذاتی سوانح ہے، بلکہ جماعتِ احمدیہ لاہور کی تاریخ کے ایک اہم دور کے واقعات

پر بہت روشنی ڈالتی ہے۔

آخر میں مَیں اس کتاب کی مصنفہ صاحبہ اور اُن کے تمام معاونین کو مبارک دیتا ہوں کہ اُن کی محنت کے نتیجہ سے ایسی ضخیم اور مفید تحریر شائع ہو کر منظرِ عام پر آ رہی ہے، اور انشاء اللہ قارئین کے لیے حقائق سے پُر اور ایمان افروز ثابت ہوگی۔ ہماری دعا ہے کہ جن بزرگوں اور جماعتِ احمدیہ لاہور کے خادموں کا اس میں ذکر ہے، جو اب ہم میں نہیں موجود، اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے، اُن کے دراجات بلند کرے، اُن کو اپنے صالحین کی معیت میں داخل کرے، اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

زاہد عزیز، (یُو۔کے)

اکتوبر ۲۰۱۶ء



ترتیب جلد اوّل

چوتھا حصہ۔سانحات ۱۹۷۴ء

پانچواں حصہ۔دارالسلام میں قیام



پہلا حصہ



پہلا باب

خاندانی پسِ منظر

آبائی وطن

دیب گراں نامی ایک قدیم گاؤں خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب (ستارۂ خدمت) ایک جانی مانی شخصیت، ایک مشہور معالج اور جماعت احمدیہ لاہور کے تیسرے امیر کی جائے پیدائش ہے۔ صوبہ سرحد[1] (پاکستان) کے ضلع مانسہرہ کا یہ قصبہ مانسہرہ سے تقریباً چار پانچ کلومیٹر جانب غرب، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھری ہوئی ایک خوبصورت پیالہ نما وادی کے عین درمیان، ایک کھلے میدان میں ہے۔ اس کے مشرق میں مانسہرہ اور مغرب کی جانب بیدڑہ نام کا گاؤں ہے۔ شمال و جنوب میں شیخ آباد اور جلو نامی بستیاں ہیں۔ گاؤں سے تھوڑی ہی دور تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے سرن ہے جس کے پار تقسیم برصغیر سے پہلے پڑہنہ، پھلڑہ اور دوسری چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں تھیں جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔ مغرب ہی کی جانب کوہ بھینگڑا ہے جو چیڑھ کے گھنے جنگلات کے باعث نہایت پُرفضا مقام ہے۔

ا: موجودہ خیبر پختون خواہ۔

دیبگراں کا ابتدائی نام دیوی گراں یا دیوا گراں تھا۔ جو بدلتے بدلتے دیبگراں ہو گیا۔ گاؤں کے شمال میں ایک پہاڑی ہے جس پر ایک ستون نما پتھر ہے۔ اس کے قریب ہی ایک راکٹ نما پتھر، زمانۂ قدیم سے موجود ہے جسے مقامی طور پر ”کھلی گٹی“ کہتے ہیں۔ یہ پتھر اس علاقہ میں ہندوؤں کے لیے بہت متبرک سمجھے جاتے تھے بلکہ دیوی اور دیو، کا درجہ رکھتے تھے۔ مخصوص تہواروں

میں وہ اس مقام پر ان پتھروں کی پوجا اور درشن کے لیے جمع ہوا کرتے تھے، غالباً انہی دیوی اور دیو کی نسبت سے اس گاؤں کا نام 'دیوگراں' مشہور ہوا، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اِس گاؤں میں کبھی بھی کوئی ہندو گھرانہ آباد نہیں ہوا۔

گاؤں کے جنوب میں ایک چھوٹی سی ندی کے پار پہاڑی پر چھوٹا سا قلعہ نما کھنڈر ہے جسے کوٹلہ کہتے ہیں۔ یہ قلعہ سکھوں سے منسوب ہے، اور اس دور کی یادگار ہے جب اس علاقے میں سکھوں کا دور دورہ تھا۔

دیبگراں کی آبادی میں اکثریت 'اعوان' قوم کی ہے، جن کے الگ الگ خاندانی ناموں سے ان کی شناخت ہو جاتی ہے۔ گاؤں کے تمام لوگوں کی زبان 'ہندکو' ہے۔ زیادہ تر لوگ کاشتکار ہیں۔ آب وہوا معتدل ہے جو ہر قسم کی فصلوں کے لیے موزوں ہے۔ مگر فصلوں کا انحصار چونکہ بارش پر ہے اس لیے عموماً لوگ گندم، مکئی اور چند دالیں اُگاتے ہیں۔ کہیں کہیں نشیبی علاقوں میں جہاں پانی کے ذخائر ہیں، وہاں دھان کی فصل بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ یہاں باغات نہیں ہیں مگر انجیر، ناشپاتی، آڑو خوبانی اور آلوچہ وغیرہ جیسے پھلدار درخت ضرور موجود ہیں۔ ان کے علاوہ کہیں کہیں انگور کی بیلیں بھی نظر آتی ہیں۔

انیسویں صدی کے اختتام تک بھی یہاں تعلیم کا رواج عام نہ تھا اور عموماً لوگ پڑھنا لکھنا نہ جانتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ایک صالح بزرگ حافظ محمد سعید یہاں آ کر آباد ہوئے جن کی فیوض و برکات سے اِس گاؤں کو، اُس علاقہ کی بستیوں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہو گیا اور اُنہی کی برکات سے یہاں دینی اور دُنیاوی تعلیم کی ابتداء ہوئی۔ یہ بزرگ حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے دادا تھے۔

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے آباؤ اجداد

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے آباؤ اجداد کا تعلق اعوان قوم سے تھا، جن کے جدِّ امجد حضرت قطب شاہ بابا مانے جاتے ہیں۔ قطب شاہ ایک بلند پایہ مبلغ دین اور ایک جرّی جرنیل تھے۔ وہ علوی النسل تھے۔ تاریخ میں بابا قطب شاہ کے مختلف نام مذکور ہیں۔ کہیں ان کو ملک قطب الدین حسین کہا گیا ہے، کہیں قطب شاہ، قطب سالار اور کہیں میر قطب لکھا گیا ہے۔

ضلع ہزارہ میں آباد اعوان، قطب شاہی اعوان کہلاتے ہیں۔ تاریخ کے مستند حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قطب شاہ، حضرت علیؓ کی زوجہ ثانی خولہ بنت جعفر حنفیہ [۱] کے فرزند محمد الاکبر کے بیٹے علی بن محمد الاکبر کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت علیؓ کی تمام اولاد 'علوی' ہی کہلاتی رہی تھی لیکن پانچویں یا چھٹی صدی ہجری میں لکھی جانے والی تاریخوں میں حضرت علیؓ کی فاطمی اولاد کو 'سیّد' اور غیر فاطمی اولاد کو 'علوی' لکھا جانے لگا۔

۱: خولہ بنت جعفر کا تعلق قبیلہ حنفیہ سے تھا اس لیے حنفیہ کہلاتی تھیں۔

قطب شاہ عربی النسل تھے اور ہرات کے گردونواح میں آباد، اپنے قبیلہ کے سربراہ تھے۔ آپ کی اولاد، اعوان کہلاتی ہے جس کی وجہ تسمیہ تاریخ الاعوان، کے مؤلف، ملک شیر محمد خان اعوان نے اس طرح بیان کی ہے:

> سلطان محمود نے ہندوستان میں کفر و طغیان کے استیصال کے لیے ہندوستان پر لشکر کشی کا اعلان کر دیا۔ میر قطب شاہ اپنے قبیلے کے لشکر سمیت حاضر ہوئے اور سلطان محمود سے ملاقات کی اور عرض کی بندہ اپنے لشکر سمیت اس لیے حاضر ہوا ہے کہ آپ ہمیں بھی اِس جہاد میں شرکت کی اجازت بخشیں۔ سلطان نے کہا: 'قطب شاہ تم پر خدا کی سلامتی، جس طرح اہلِ مدینہ نے حضرت سرورِ کائنات

صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے کر انصار کا خطاب پایا۔ اسی طرح آپ لوگ میری اعانت کے لیے سربکف ہو کر آئے ہو، اس لیے میں آپ کو"اعوان" کا خطاب دیتا ہوں'۔[۱]

۱: تاریخ الاعوان۔مولف محبت حسین اعوان۔صفحہ ۳۳۰۔۳۳۱۔

اعوان کی وجہ تسمیہ مختصراً یہ ہے کہ جن علویوں نے محمود غزنوی کے جنگی معرکوں میں اُن کا ساتھ دیا اور مدد کی اُنہیں اعوان کا خطاب دیا گیا، جو بعد میں قطب شاہ کی اولاد کے لیے مختص ہو گیا۔

اعوان عربی النسل ہیں۔ یہ تاریخی حقائق اور تحقیقات سے ثابت شدہ امر ہے۔ اُن کی اکثر روایات، ان کے خدوخال، جسمانی اور اخلاقی خصائص اُن کے عربی النسل ہونے پر گواہ ہیں۔ صرف ہرات اور غزنی کے گردونواح میں صدیوں آباد رہنا، اُنہیں ترکی النسل، فارسی النسل یا افغان ثابت نہیں کرتا۔

برصغیر پاک و ہند میں آباد اعوانوں کے شجرہ ہائے نسب، اور تحریری و زبانی روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قطب شاہ کے گیارہ بیٹوں میں سے ایک مزمل علی کلگان تھے جو اُن کی زوجۂ اوّل بی بی زینب کے بطن سے پہلی اولاد تھے۔ انہی مزمل کلگان کی نسل سے بابا سجاول، مدفون کھرکوٹ ہوئے ہیں جنہیں ضلع ہزارہ کے اعوان اپنا جد امجد مانتے ہیں۔ اُن کا مزار واقع کھرکوٹ مرجع خلائق رہا ہے۔ بعد میں جب تربیلا ڈیم کی تعمیر ہوئی، اور مزار کے زیر آب آنے کا خطرہ لاحق ہوا تو 'اعوان قوم' کے متفقہ فیصلے اور کوشش سے یہ مزار بمقام شہیلیہ، ضلع مانسہرہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہزارہ کی، بالخصوص دیہی علاقوں کی تاریخ کے مطالعہ سے جو حقائق سامنے آتے رہے ہیں اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ اعوان زمانۂ قدیم سے یہاں آباد رہے ہیں اور اُن کے بزرگوں کی سرگرمیوں کی ہی وجہ سے اِس علاقے میں خاص اشاعتِ دین ہوئی ہے۔

بابا سجاول کی اگلی نسلیں کئی ذیلی ذاتوں میں تقسیم ہوگئیں۔ جیسے بابا سجاول کے بیٹے شادکی اولاد شدوال کہلاتی ہے۔ اسی طرح بابا سجاول کے بیٹے کی اولاد میں ایک بابا کھیہ گذرے ہیں۔ اُن سے جو خاندان چلا وہ کھیال کہلاتا ہے جو ضلع مانسہرہ کے دیہاتوں میں، خصوصاً چھانجہ، دیبگراں، جلُّو، شہیلیہ، بلہگ اور تمرکھولا وغیرہ میں آباد ہیں۔ ڈاکٹر سعید احمد خان کا تعلق اعوانوں کی اسی شاخ کھیال سے تھا۔[۱]

۱: تاریخ الاعوان کے مولف نے تحقیق کے بعد جس شجرۂ نسبِ اعوان کو درست قرار دیا ہے وہ بعینہ وہی ہے جو ڈاکٹر سعید احمد خان کی ڈائری میں تحریر ہے اور آپ کے خاندان کی شاخ جلُّو کے پاس موجود ہے۔

حافظ مولٰینا محمد سعید علیہ رحمۃ

حافظ محمد سعیدؒ کے والد ملاں خان باز، ضلع ہزارہ کے ایک گاؤں مُورت میرا میں آباد تھے۔ حافظ محمد سعید کے دو اور بھائی محمد قاسم اور محمد عاصم تھے۔ حافظ محمد سعید کو اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے خاص شہرت حاصل تھی۔ دیبگراں کے معززین کی درخواست پر آپ دیبگراں تشریف لے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے بھائی محمد قاسم قریب کے گاؤں ’جلوٗ میں آ کر آباد ہو گئے البتہ محمد عاصم اپنے آبائی وطن میں ہی رہائش پذیر رہے۔

حافظ محمد سعید، جناب سید امیر علیہ الرحمۃ المعروف ”ملاں صاحب کوٹھے والے“ کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ ملاں صاحب نے حافظ محمد سعید صاحب کے زہد و تقویٰ اور بے مثال کردار و علم و فضل کی وجہ سے انہیں اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔ آپ اُن کے چار خلیفوں میں سے ایک تھے۔ ملاں صاحب کوٹھے والے نے، دیبگراں کے قرب و جوار میں آباد اپنے مریدوں کو ہدایت جاری کر دی کہ وہ اپنی مطلب برآری اور درخواست ہائے دعا کے لیے کوٹھہ آنے اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کی بجائے حضرت حافظ صاحب کے پاس دیبگراں جایا کریں۔

آپ کے عقیدت مندوں میں صاحب مرتبہ خوانین و اکابرین شامل تھے۔ پڑہنہ اور پھلڑہ کے خوانین بھی آپ کے مرید تھے، چنانچہ خوانین پڑہنہ نے اپنی ریاست کا ایک گاؤں حضرت حافظ صاحب کے نام کر دیا تھا۔ جہاں کی تمام پیداوار اناج اور غلہ خود اپنے انتظام سے وہ آپ تک پہنچا دیتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد بہ سبب اپنے غنا کے آپ کے فرزندان نے کبھی اِس طرف توجہ نہیں کی البتہ ان خوانین اور خاندانوں کے راہ و رسم اور عقیدت مندی اِن سے اُسی طرح قائم رہی۔ آپ کے مریدوں کا دائرہ وسیع تھا۔ کشمیر اور کاغان کے علاقوں میں آپ کے مرید موجود تھے۔

کوٹھہ شریف صوبہ سرحد کے ضلع صوابی کے مقام ٹوپی کے قریب واقعہ ہے۔ کوٹھے والے ملاں صاحب کا حلقۂ اثر دور دور تک تھا۔ اور وہ ایک برگزیدہ انسان اور ولی اللہ تھے۔ بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ وہ تیرھویں صدی کے مجددین میں سے ہیں۔ آپ کا اکلِ حلال پر بہت زور تھا۔ اگر کسی کے رزق میں حلال کی کمی واقعہ ہو جاتی تو کشفی رنگ میں جان لیتے تھے۔ عموماً سرکاری ملازمین کے یہاں کھانا نہ کھاتے تھے کہ کہیں حرام کی ملاوٹ نہ ہو۔

دستورِ زمانہ کے مطابق آپؒ پر بھی کفر کا فتویٰ لگا تھا۔ آپ کے ایک خط کی نقل شامل ہے جو اُنہوں نے علماء کو خطاب کر کے لکھا تھا۔ اِس سے اُن کے عقائد کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت سید امیر صاحب کی اولاد "صاحبزادہ" خاندان کے نام سے صوبہ سرحد کے معززین میں سے ہیں۔ سرعبدالقیوم، بانیٔ اسلامیہ کالج آپ کی اولاد میں سے تھے، جو سرحد کے سرسید کہلاتے تھے۔

حافظ محمد سعید خود بھی صاحب کشف والہام، ایک ولی اللہ، ایک بلند پایہ عالم اور مرجع خلائق تھے۔ بہت سی خوارق عادت کرامات اُن سے منسوب تھیں۔ تاہم آپ اکثر اپنے مرشد سے ملاقات کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ پر اپنے مرشد کی صحبت کا رنگ بہت نمایاں تھا۔ اُن کا فہم قرآن بھی اپنے مرشد کی طرح بے مثال تھا۔ کوٹھے والے حضرت صاحب کا عقیدہ نزولِ مسیح اور ظہور

حضرت سید امیر صاحب کی تحریر کا متن اور ترجمہ

مَنْ تَمَسَّکَ بِالْعَقَائِدِ السُنِیَّۃِ فَقَدْ نَجیٰ
وَمَنْ خَالَفَ عَنْھَا فَقَدْ ضَلَّ وَ غَوَیٰ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَنَا مِنْ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ اٰخِرِالزَّمَانِ۔ وَ جَعَلَنَا مِنْ اَھْلِ السُنَّۃِ وَ الْجَمَاعَۃِ بِالْفَضْلِ و الاحْسَانِ۔ وَ اَبْعَدَنَاعَنِ الرَّفْضِ وَ التَشَیُّعِ وَ الطُّغْیَانِ۔ وَ حَفِظَنَا عَنِ الْاِعْتِزَالِ وَ الْاِلْحَادِ وَ الْمَیْلَانِ۔ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ اَرْسَلَہٗ لِکَافَّۃِ النَّاسِ لِتَبْلِیْغِ اَحْکَامِ الْقُرْآنِ۔ وَ عَلٰی آلِہٖ وَ صَحْبِہِ الَّذِیْنَ قَمَعُوْ اعرِقَ الْمُلْحِدِیْنَ وَ الْمُبْتَدِعِیْنَ بِالْسُّیُوْفِ وَ السِّنَانِ۔ اَمَّا بَعْدُمِنَ الدَّاعِیْ اِلَی اللّٰہِ وَ النَّادِ اِلیٰ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَقِیْر سَیِّد اَمِیْر قَرْیَہ کَوْءَٹَھہ ضِلْعَ یُوْسَفْ زَئی عِلَاقَہ پَیْشَاوَرْ وَفَّقَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ لِمَا یُحِبُّہٗ وَ یَرْضٰی اَنَّ عَقِیْدَتَنَا ظَاھِرًا وَّ بَاطِنًا وَ مُعْتَقِدُنَا قَلْبًا وَ لِسَانًا اَنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ وَاحِدٌ ذَاتًا وَ صِفَۃٌ لَا شَرِیْکَ لَہٗ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ۔ وَ اَنَّہٗ تَعَالیٰ لَیْسَ لَہٗ حَدٌّ وَ

لَا حَصْرٌ وَ لَا شَکْلٌ وَ لَا کَیْفِیْۃٌ وَ لَا جِھَۃٌ وَ لَا مَکَانٌ لَیْسَ جِسْمٍ وَ لَا جَوْھَرٌ وَ لَا عَرْضٌ وَ لَا مُصَوَّرٌ غَیْرُ مَوْصُوْفٍ بِصِفَاتِ الْمَخْلُوْقِیْنَ۔ صِفَاتُہٗ قَدِیْمَۃٌ کَذَاتِہٖ۔ مَوْصُوْفٌ بِجَمِیْعِ صِفَاتِ الْکَمَالِ مُنَزَّہٌ عَنِ النَّقَائِصِ وَ الْمَعَائِبِ۔ خَالِقِ الْمَوْجُوْدَاتِ بَارِیٔ اُلْبَرِیَاتِ۔ وَ اَنَّ مَا اَنْزَلَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَ سَلَّمْ فِیْ اَجْمَالًا الْقُرْآنِ حَقٌّ۔ آمَنَا بِہٖ تَفْصِیْلًا وَ اَجْمَالًا وَ اَنَّ مَا عَلَیْہِ رَسُوْلُہٗ وَ اَصْحَابُ رَسُوْلَہٗ مِنَ الْعَقَائِدِ فَھُوَ عَقَائِدُنَا۔ وَ اَنَّ اَلنَّبُوَّۃَ خَتَمَتْ عَلٰی نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَ سَلَّمْ فَلَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ اِنْ تَقُوْلَ بِہٖ فَھُوَ کَافِرٌ۔ وَ اَنَّ الْوَحْیَ قَدِ انْقَطَعَتْ عَلَیْہِ۔ وَ اَنَّ الْاَنْبِیَاءَ عَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ اَفْضَلُوْنَ عَلٰی الْاَوْلِیَاءِ فَالْقَوْلَ بِعَکْسِہٖ کُفْرٌ وَ اِلْحَادٌ۔ وَ اِنَّ الْنَّبُوَّۃَ فَضْلِیَۃٌ مَوْھُبِیْۃٌ لَا تَحْصِلُ بِسَعْیِ اَحَدٍ وَ کَسْبٍ۔ وَ اَنَّ الْمَذَاھِبَ اَرْبَعَۃٌ مَذْھَبُ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَ مَالِکَ وَ شَافِعِی وَ اَحْمَدُ بِنْ حَنْبَلَ رَضِی اَللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمْ اَجْمَعِیْنَ۔ وَ اِنَّ مَذْھَبَ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ اَوْ لٰھَا عِنْدَنَا وَ اِنَّا عَلٰی مَذْھَبِہٖ اَصُوْلًا وَ فَرُوَعًا۔ وَ اَنَّ سَبُّ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ کُفْرٌ اَجْمَاعًا وَ سَبُّ الصَّحَابَۃِ غَیْرَ الشَّیْخَیْنِ وَ سَبُّ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَ اَمْثَالِہٖ مِنْ غَیْرَ

الْاِسْتَحْلَالِ لَيْسَ بِكُفْرٍ بِالْاِتِّفَاقِ بَلْ فِسْقٌ وَ رَدَّ شَهَادَةَ وَ مَعَ الْاِسْتَحْلَالِ كُفْرٌ۔ وَ سَبُّ الشَّيْخَيْنِ مُخْتَلِفٌ فِيْهِ۔ فَعِنْدَ الْفُقَهَاءِ وَ اصْحَابُ الْفَتَاوىٰ كُفْرٌ وَ عِنْدَ الْمُتَكَلِّمِينَ لَا وَ فِيْ شَرْحَ الْعَقَائِدِ وَ شَرْحِ مَوْلٰينَا عَلِيِّ الْقَارِى لِلْفِقْهِ الْاَكْبَرِ وَ غَيْرِ هِمَا رُجِحَ عَدَمُهٗ۔ وَ قَذْفُ عَائِشَةَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهَا كُفْرٌ بِالْاِجْمَاعِ وَ اَنَّ الصَّدَقَاتِ وَ الدَّعْوَاتِ تَنْفَعَانِ لِلْمَيْتِ فَمَنْ قَالَ بِعَدَمِ نَفْعِهِمَا فَهُوَ مُعْتَزَلِىٌ۔ وَ اَنَّ رَوْيَةَ اللّٰهِ تَعَالىٰ فِيْ الْمَنَامِ مُخْتَلَفٌ فِيْهَا۔ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهَا غيْرَ جَائِزَةٍ وَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهَا جَائِزَةٌ اِنْ كَانَتْ بَلَا كَيْفٍ وَجِهَةٍ وَ مَكَانٍ وَ بِهَا لَا وَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهَا جَائِزَةٌ وَ لَوْ كَانَتْ بِصِفَا تٍ لَا تَلِيْقُ بِجَلَالِهٖ وَ كِبْرِيَائِهٖ مِنْ صِفَاتِ الْاَجْسَامِ وَ صَلَّحَ اَلنَّوَوِىْ وَ الْغَزَالِى وَ اَلشَّيْخُ عَبْدُالْحَقِّ الدِهْلَوِىْ فِيْ تَكْمِيْلِ الْاِيْمَانِ وَ فِيْ شَرْحِ عَقَائِدِ اَخَوَيْدَ جَلَالُ وَ غَيْرِهِمْ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ اَجْمَعِيْنَ۔ وَ اِنَّ زِيَارَةَ الْقُبُوْرِ سُنَّةٌ وَ اَنْعَمْدَةُ فِيْهَا الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ وَ تَذْكِرَةُ الْمَوْتِ وَ رِقَّةَ الْقَلْبِ۔ وَكَانَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ اَلصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ يَزُوْرُ الْقَبُوْرُ۔ وَ امَّا الْاِسْتَمْدَادُ مِنَ الْمَوْتٰى مُخْتَلِفٌ فِيْهِ وَ الْحَقُّ جَوَازُهٗ ۱۲ تَمَّتْ۔

فَمَنْ تَقُوْلُ عَلَيْنَا خِلَافَ هٰذَا فَقَدْ كَذِبَ و افْتَرٰى وَ عَنِ الْصِرَاطِ السَّوِيّ قَدْ ضَلَّ وَ غَوَىٰ۔ وَ السَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَ خَالَفَ الْبِدَعَةَ وَ الْهَوٰى وَ تَابَعَ اَلنَّبِیُ الْاُمِّیَ الْمُصْطَفٰى وَ اَصْحَابِهٖ ذَوِى الْعِلْمِ وَ اَلْهُدٰى وَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

مُہر، سیّد امیر

علی

ترجمہ

جس نے اہلِ سنت کے عقائد کو مضبوطی سے پکڑا وہ یقیناً نجات پا گیا

اور جس نے اس کی مخالفت کی وہ یقیناً گمراہ ہوا اور بہک گیا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تمام تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں نبی آخر زماں حضرت محمد ﷺ کا اُمّتی بنایا۔ اور اپنے فضل و احسان سے ہمیں اہلِ سنّت والجماعت میں سے بنایا اور ہمیں رافضیت، شیعت اور سرکشی سے دُور رکھا۔ اور مُعتزلہ، الحاد اور میلان طبع سے ہماری حفاظت فرمائی۔ دُرود و سلام اُس رسولِ عظیم ﷺ پر جس کو پوری انسانیت کی طرف مبعوث کیا گیا کہ اُسے قرآن کی تعلیم عطا کرے۔ دُرود وسلام اُن کی آل اور اصحاب پر جنہوں نے ملحدین اور اہلِ بدعت کا قلع قمع کیا تیروں اور تلواروں سے۔ اما بعد دعائی اِلیٰ اللہ اور سبیل اللہ کی طرف بلانے والے دعائی فقیر سید امیر علی گاؤں کوٹھہ ضلع یوسف زئی علاقہ پشاور جسے اللہ

تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی اس کی محبت اور رضا کے ساتھ۔ کہ ہمارا یہ ظاہری و باطنی عقیدہ ہے اور ہم قلب و زبان سے عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ذات اور صفات میں واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ (وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے) اور کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی حد، اور کوئی زمانہ، اور کوئی شکل، اور کوئی کیفیت، اور کوئی سمت اور نہ ہی کوئی مکان ہے۔ اللہ کا کوئی جسم اور جوہر نہیں اور نہ ہی ظاہری شکل ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مصوّر ہے۔ وہ مخلوقات کی صفات سے مُبرّا ہے۔ خدا کی صفات اس کی ذات کی طرح قدیم ہیں۔ خدا کی صفات تمام کمال کی صفات سے متّصف ہیں جو ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے منزّہ ہیں۔ خدا ہی ہر ایک شے کا خالق ہے۔ وجود عطا کرنے والا۔

اور کہ جو کچھ محمد رسول اللہ ﷺ پر قرآن میں اجمالاً نازل کیا گیا ہے حق ہے۔ ہم اس پر اجمالاً اور تفصیلاً ایمان لائے۔ اور جو عقائد خدا کے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کے ہیں وہی ہمارے عقائد ہیں۔ اور کہ نبوّت ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوگئی اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں اور جو ایسا دعویٰ کرے وہ کافر ہے۔

اور کہ وحی آنحضرت ﷺ پر ختم ہوگئی۔ اور یہ کہ انبیاءؑ اولیاء کرام سے افضل ہیں، اس کے خلاف قول اور عقیدہ رکھنا کفر اور الحاد ہے۔ اور یہ کہ نبوّت مُوہبی فضیلت ہے جسے کوئی بھی کوشش اور کسب سے حاصل نہیں کرسکتا۔ اور کہ مذاہب چار ہیں، حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ کہ ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ کا مذہب اصول اور فُرُوع میں سب سے اعلیٰ ہے۔ انبیاء کرامؑ پر سب وشتم کرنا بالاجماع کفر ہے۔ شیخین کے علاوہ صحابہ کرامؓ اور امام ابوحنیفہ، ان کی طرح دوسروں پر سب وشتم

اگر خاص وجہ سے ہوتو بالاتفاق کفرنہیں، بلکہ فسق اور گواہی کا رد کرنا ہے۔اور سب و شتم بلاوجہ ہوتو کفر ہے۔شیخین کے سب وشتم کے بارے میں اختلاف ہے۔فقہاء اور اہلِ فتویٰ کے نزدیک ایسا کرنا کفر ہے۔مگر متکلمین کے نزدیک نہیں اور شرح عقائد اور شرح مولانا علی القاری فقہ اکبر اور دوسروں کے نزدیک اس کا امکان نہیں ہے۔حضرت عائشہؓ پر قذف بالاجماع کفر ہے۔ اور یہ کہ صدقات اور دعائیں دونوں ہی میّت کو نفع پہنچاتی ہیں۔اور جو اِن کے نفع سے انکاری ہیں وہ معتزلہ ہیں۔ اللہ کو خواب یا رؤیا میں دیکھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔کچھ کے نزدیک ایسا ناجائز اور بعض کے نزدیک یہ جائز ہے، اگر یہ بغیر کیفیت، سمت اور مکان کے ہو۔اور اِن کے ساتھ جائز نہیں۔بعض کہتے ہیں کہ ایسا جائز ہے اگر وہ خدا کے جلال اور کبریائی کی صفات سے نہ ملتا ہو۔اس کو صحیح کہا امام نوّوی، امام غزالی، شیخ عبدالحق دہلوی نے تکمیل الایمان اور شرح عقائد وجلال میں اور ان کے علاوہ دوسروں نے۔اور کہ زیارت قبور سنّت ہے اس ارادہ کے ساتھ کہ میّت کے لئے دعا کی جائے اور موت کو یاد کیا جائے اور رقتِ قلب کے لئے۔ نبی کریم ﷺ قبروں کی زیارت کیا کرتے تھے۔مُردوں سے مدد مانگنے کے بارے میں اختلاف ہے۔اس کا جواز بھی حق ہے۔ختم شد۔

پس جو اس کے خلاف ہمارے بارے میں کہے اس نے کذب اور افتریٰ کیا، اور وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا۔سلامتی ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے اور جو ہوا و ہوس کی بدعات کے خلاف ہوا۔اور نبی اُمی محمد مصطفیٰ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحابؓ اور اہل علم و اہل ہدایت کی پیروی کرے۔

مہدی کے عمومی عقائد سے مختلف تھا۔ وہ امامکم منکم کے پنہاں معنی سمجھتے تھے۔ اِس سلسلہ میں ۱۲۹۲ھ میں سید امیر صاحب نے پیشگوئی بھی کی تھی کہ امام مہدی پیدا ہو چکا ہے۔ ملاں صاحب نے فرمایا تھا: "ہمارا زمانہ گذر گیا۔ اب مہدی کا زمانہ شروع ہوگا۔"

مریدوں کے دریافت کرنے پر فرمایا: "اُس کی زبان پنجابی ہوگی۔" (حیات حسن۔ صفحہ ۱۷۰۔ تحریر عبداللہ جان نیازی)۔

اُنیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں عوام الناس، ظہور مہدی اور نزولِ مسیح کے منتظر تھے۔ کیونکہ یہی زمانہ، بروئے حدیث اِن امور کے لیے مقرر تھا۔ چودھویں صدی کا آغاز ہونے کو تھا۔ حافظ محمد سعید بھی اِس کا ذکر فرماتے تھے اور امامکم منکم کے مصداق مہدی کی آمد کے منتظر تھے اور یقین رکھتے تھے کہ مہدی، اُمت مسلمہ کا ایک فرد ہوگا۔ درحقیقت یہیں سے آپ کے خاندان میں قبولیتِ احمدیت کا بیج ظہور مہدی سے پہلے ہی بو یا جا چکا تھا۔

ایک شام مولانا حافظ محمد سعیدؒ اپنے گاؤں کی مسجد میں مغرب کی نماز کے لیے وضو فرما رہے تھے کہ اُن کی نظر چاند پر پڑی یہ ماہِ محرم کا نیا چاند تھا۔ آپ نے مسجد کے مؤذن، ملاں صفدر سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> آج چودھویں صدی کا آغاز ہوتا ہے۔ ظہور مہدی کا وقت قریب آ گیا ہے۔
> شاید ہم بھی اُس کا زمانہ پاسکیں۔

آپ کی وفات ۱۳۰۷ھ میں ہوگئی اور آپ کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ البتہ حویلیاں کے قریب ڈھیری گاؤں میں رہنے والے آپ کے ایک عالم دوست نے جب آپ سے یہ ذکر کیا تھا کہ پنجاب کے ایک شخص نے اِسلام کی تائید میں ایک شاندار کتاب "براہین احمدیہ" کے نام سے لکھی ہے، جس میں تمام دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اِسلام کی سچائی ثابت کی ہے اور اُن کو مقابلہ کی دعوت

دی ہے،تو یہ سُن کرآپؒ نے فرمایا کہ:"ایسا انسان نہایت مبارک ہے اُس کی زیارت کرنی چاہئے"۔

حضرت حافظ محمد سعیدؒ کی زندگی کے دو اہم واقعات اور اولاد کو نصیحت

حافظ محمد سعید صاحب کی زندگی کے متعدد روحانی اور علمی واقعات میں سے دو واقعات ایسے ہیں جو اُن کی اولاد کے لیے احمدیت کی قبولیت کے لیے رہنما ثابت ہوئے۔طبقۂ علماء میں عام دستور تھا کہ وہ اپنے نام کی مہر بنوایا کرتے تھے جسے خطوط اور اہم مراسلوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ایک موقع پر آپ نے اپنے فرزند محمد یحییٰ سے فرمایا:

> جب تم اپنی مُہر بنواؤ تو اُس میں یہ الفاظِ قرآنی کندہ کروانا: يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ (سورۃ مریم آیت ۱۲)

دوسرا واقعہ آپ کی وصیت سے متعلق ہے۔اپنی وفات سے چند روز قبل حضرت محمد سعیدؒ مکمل طور پر دُنیا سے انقطاع کر کے ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو گئے اور توجہ سفرِ آخرت پر مرکوز کر لی۔آپ کے فرزندان نے آپ سے بار بار اِصرار کیا کہ اُنہیں کچھ وصیت فرمائیں۔اِس پر آپ نے اُن سے یہ وعدہ لیا کہ اِس کے بعد وہ دوبارہ اُن کو بولنے پر مجبور نہ کریں گے تو وہ چند باتیں کہیں گے۔

آپ نے فرمایا:

> میں نے تم دونوں کے حق میں بہت دُعائیں کی ہیں۔مجھے اُمید ہے اللہ تمہیں ضائع نہیں کرے گا۔قرآن کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور دُکانداروں کے پیچھے ہرگز نہ پھرنا (آپ کی مراد پیروں اور سجادہ نشینوں سے تھی)۔امامِ برحق کا ظہور ہونے والا ہے تم اُس کے پاس دوڑ کر جانا اور دُنیا کے لعن طعن کی پرواہ ہرگز نہ کرنا۔



حضرت میرزا غلام احمد قادیانیؒ

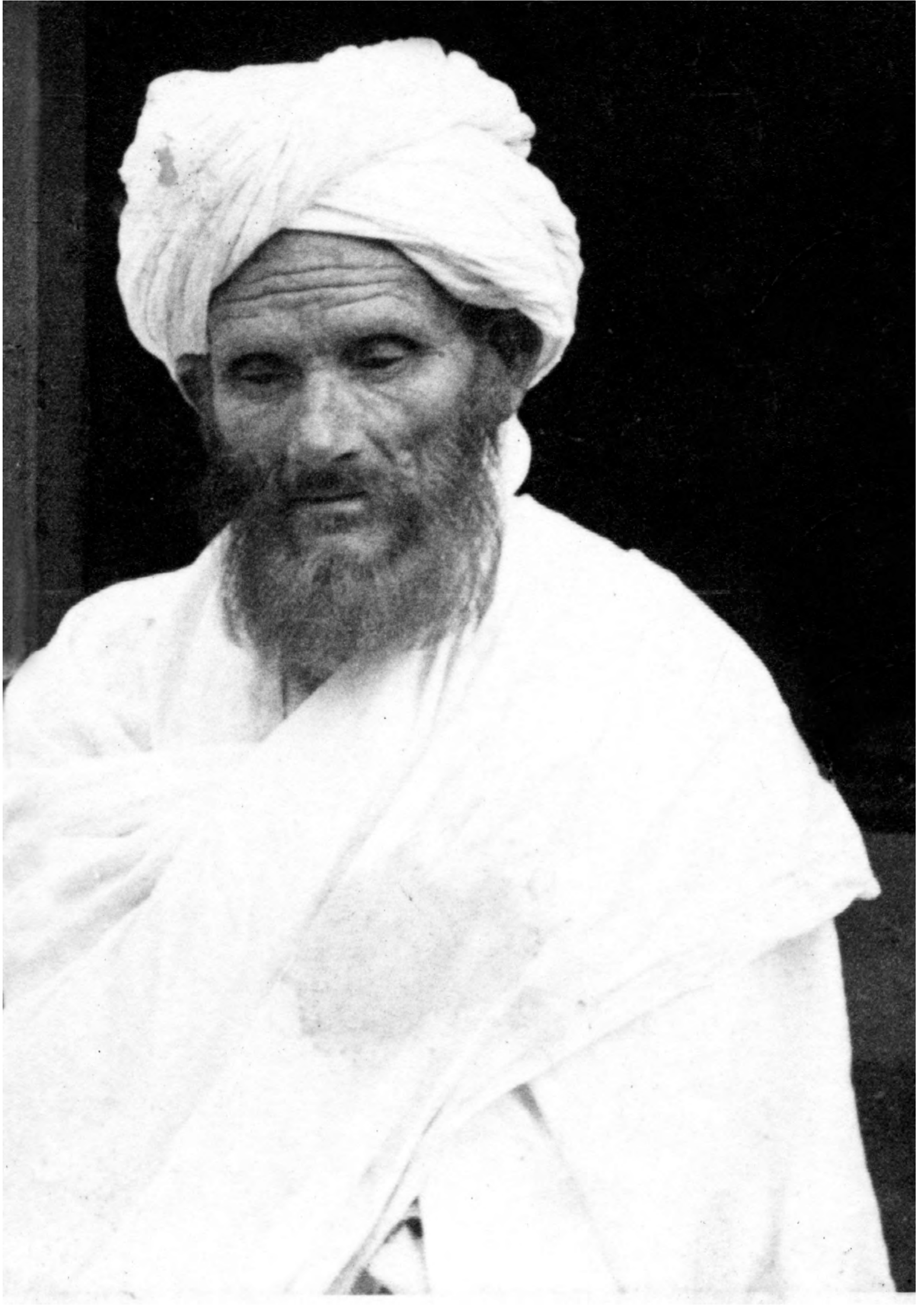
من تمسك بالعقائد السنية فقد نجى ومن خالف عنها فقد ضل وغوى

بسم الله الرحمن الرحيم

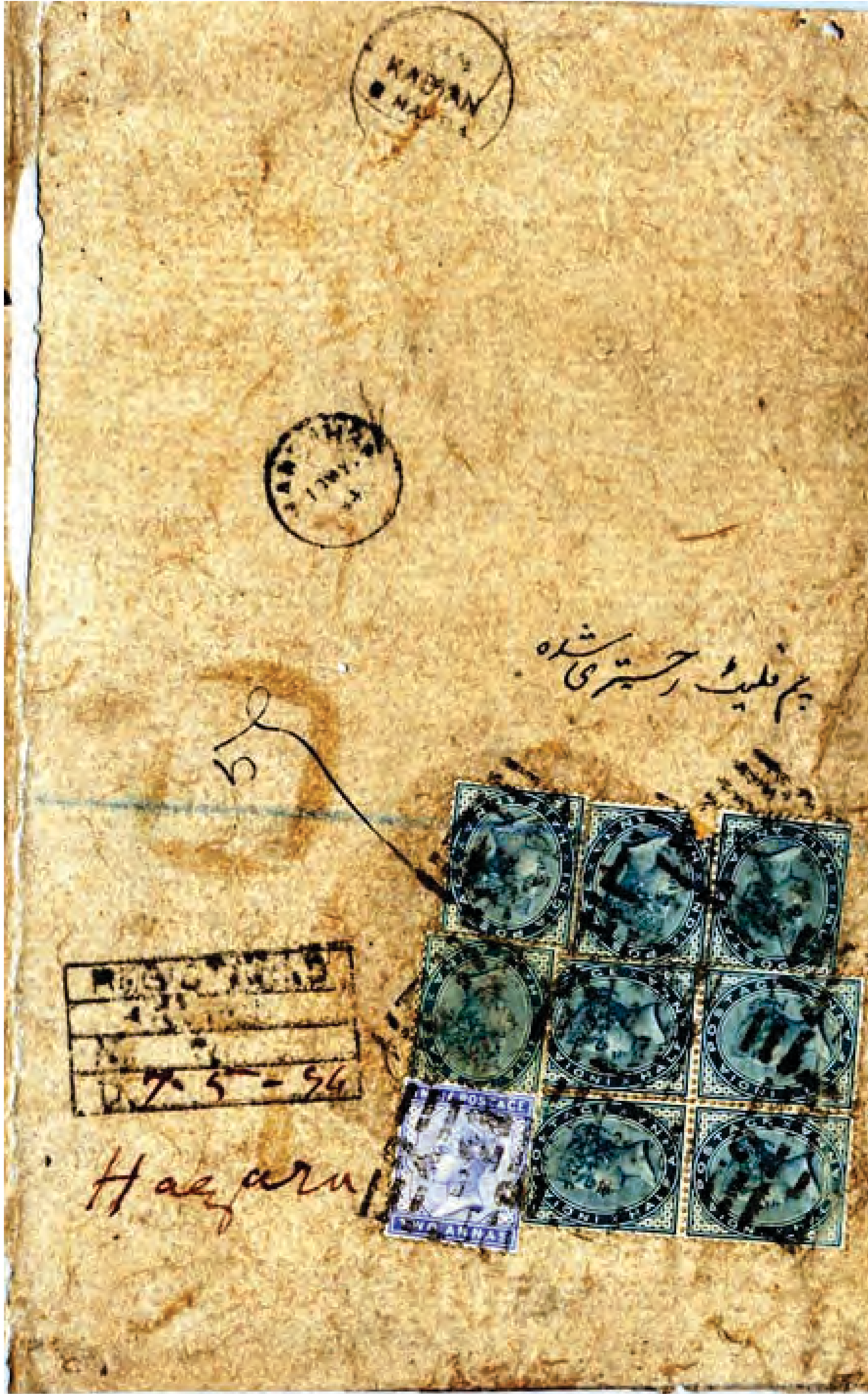
الحمد لله الذي جعلنا من امة محمد نبي آخر الزمان ـ وجعلنا من اهل السنة والجماعة بالفضل والاحسان ـ وابعدنا عن الرفض والتشيع والطغيان ـ وحفظنا عن الاعتزال والالحاد والميلان ـ والصلوة والسلام على من ارسله لكافة الناس لتبليغ احكام القرآن ـ وعلى آله وصحبه الذين قمعوا عرق الملحدين والمبتدعين بالسيوف والسنان اما بعد من الداعي الى الله والنادي الى سبيل الله فقير سيد امير [illegible] ضلع يوسف زئي علاقہ [illegible] وفقه الله تعالى لما يحبه ويرضى انا نعتقد ظاهرا وباطنا ومعتقدنا قلبا ولسانا ان الله تعالى واحد ذاتا وصفة لا شريك له [illegible] لا حصر ولا عد ولا كيف ولا جهة ولا مكان ليس بجسم ولا جوهر ولا عرض ولا متصف غير موصوف بصفات المخلوقين صفاته قديمة كذاته موصوف بجميع صفات الكمال منزه عن النقائص والمعائب خالق الموجودات بارئ البريات وان ما انزل على رسوله محمد صلى الله عليه وآله وسلم في القرآن حق ثابت بتفصيله وان ما عليه رسوله واصحاب رسوله من العقائد فهو عقائدنا وان النبوة قد ختمت على نبينا محمد صلى الله عليه وآله وسلم فلا نبي بعده [illegible] تقول به فهو [illegible] وان الوحي قد انقطعت عليه وان الانبياء عليهم الصلوة والسلام افضلون على الاولياء فالقول بالعكس كفر والحاد وان الذ[illegible] فضلية موهوبية لا تحصل بسعي احد وكسبه وان المذاهب الاربعة مذهب ابي حنيفة ومالك والشافعي واحمد بن حنبل رضي الله تعالى عنهم اجمعين وان مذهب ابي حنيفة اولها عندنا واتباعنا على مذهبه اصولا وفروعا وان سب الانبياء عليهم الصلوة والسلام كفر اجماعا وسب الصحابة غير الشيخين وسب ابي حنيفة [illegible] واما [illegible] من غير الاستحلال ليس بكفر بالاتفاق بل فسق ومردود الشهادة ومع الاستحلال كفر وسب الشيخين مختلف فيه فعند الفقهاء واصحاب الفتاوى كفر وعند المتكلمين لا في شرح العقائد [illegible] وشرح مولانا علي القاري للفقه الاكبر وغيرهما رجع عنه [illegible] وقذف عائشة رض كفر بالاجماع وان الصدقات والدعوات نفعها للميت ومن قال بعدم نفعها فهو معتزلي وان رؤية الله تعالى في المنام مختلف فيها قال بعضهم انها غير جائزة وقال بعضهم انها جائزة ان كانت بلا كيف وجهة ومكان ومثال وقال بعضهم انها جائزة ولو كانت بصفات لا تليق بجلاله وكبريائه من صفات الاجسام وصحح النووي انه [illegible] والشيخ عبد الحق الدهلوي في تكميل الايمان وفي شرح عقائد آخوند بلال وغيرهم رحمهم الله اجمعين وان زيارة القبور سنة النعمة فيها الدعاء للميت وتذكرة الموت ورقة القلب وكان النبي عليه الصلوة والسلام يزور القبور واما الاستمداد من الموتى فمختلف فيه والحق جوازه ۱۲ تمت فمن تقول علينا خلاف هذا فقد كذب وافترى وعن الصراط السوي قد ضل وغوى و

السلام على من اتبع الهدى وخالف البدعة والهوى وتابع النبي الامي المصطفى
واصحابه ذوي العلم والهدى والحمد لله رب العلمين

حضرت سیّد امیر علیؒ (کوٹھے والے) کا مراسلہ



حضرت مولوی محمد یحییٰ رح



کتابوں کا پیکٹ جس پر الفاظ ''یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّةٍ'' رقم ہیں

635

بمقام مومنع دیگران ضلع ہزارہ تحصیل مانسہرہ

بخدمت مولوی محمد یحییٰ صاحب دام عنایتہ

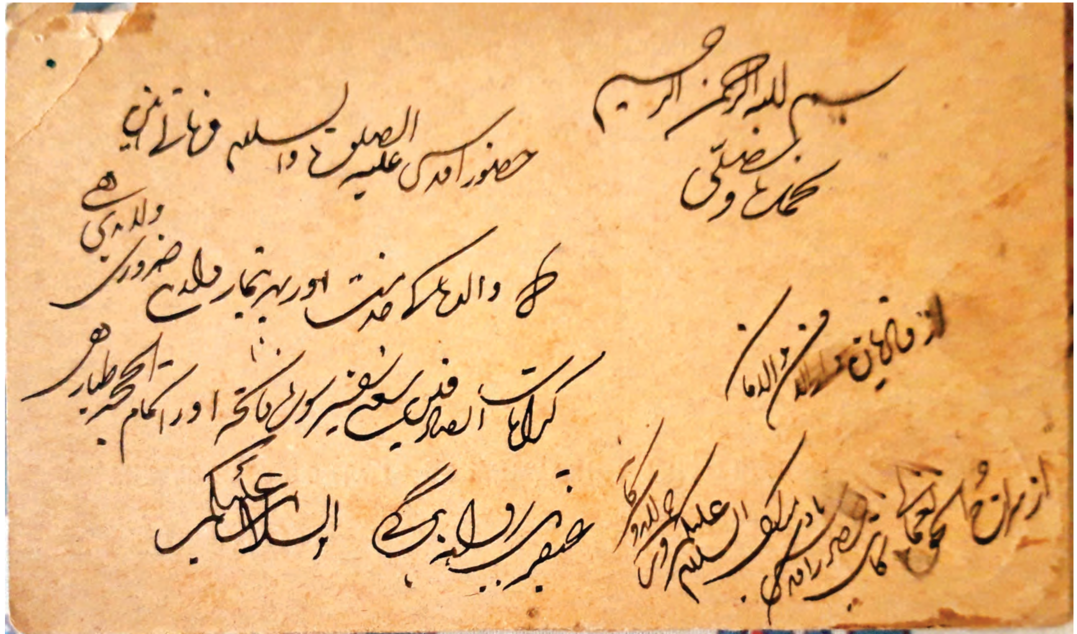
یٰیحییٰ خذ الکتٰب بقوۃٍ

المرسل مرزا غلام احمد از قادیان ضلع گورداسپور پنجاب

۵ مئی ۱۸۹۶ء

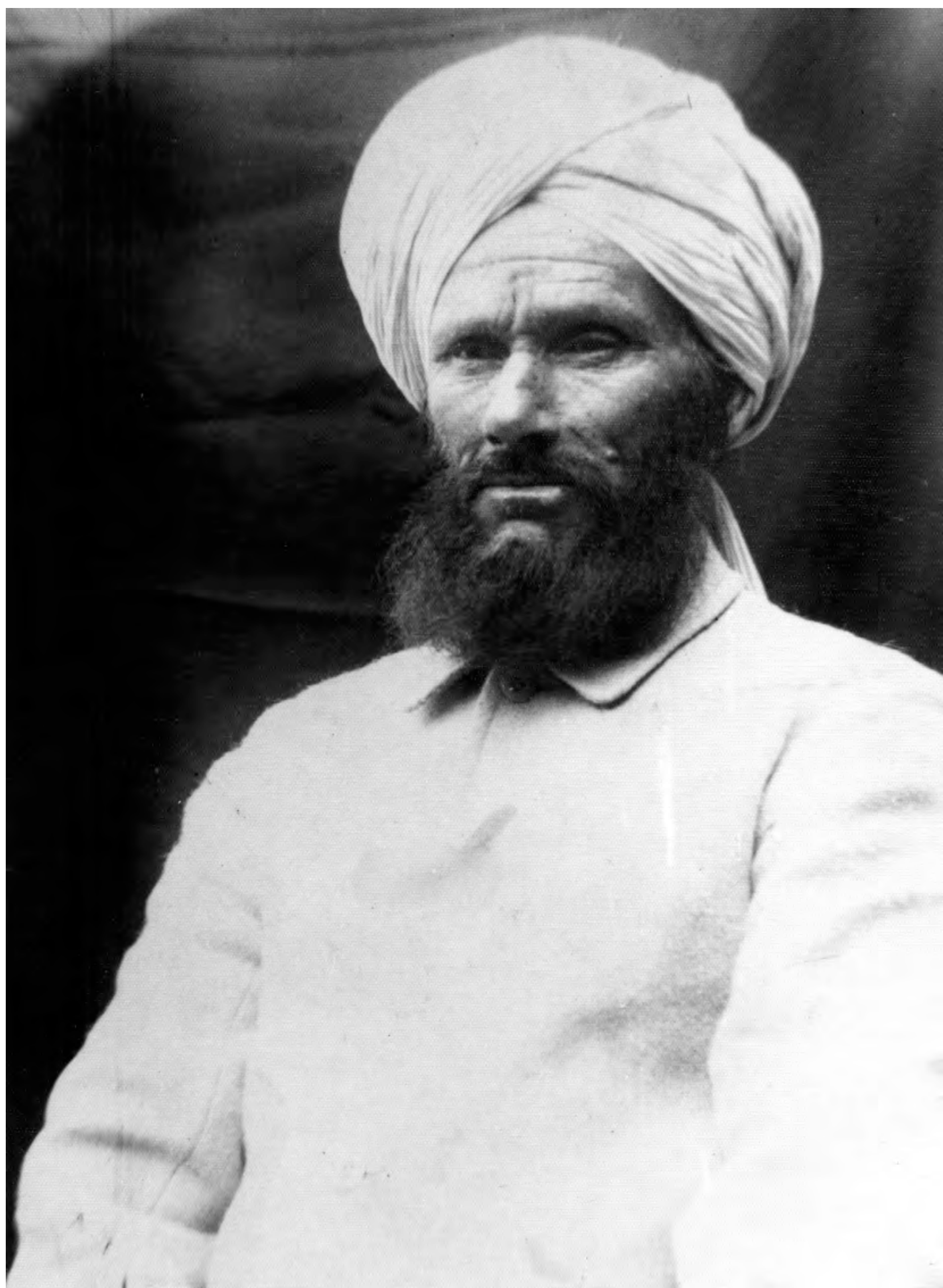
کتابوں کا پیکٹ جس پر الفاظ ”یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ“ رقم ہیں




بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلی
حضور اقدس علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں
کہ والدہ کی خدمت اور پھر تیمارداری ضروری ولابدی ہے
السلام علیکم

حضرت صاحب کا مراسلہ:

۔۔۔والدہ کی خدمت اور پھر تیمارداری ضروری ولابدی ہے۔۔۔

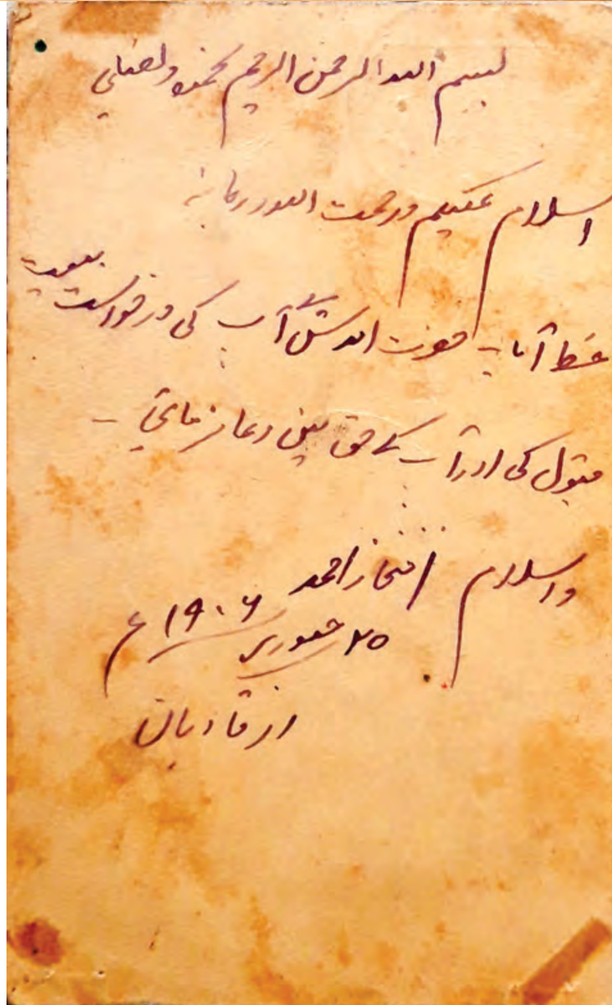


حضرت مولوی محمد یعقوبؓ



حضرت مولانا نورالدینؓ کا خط: ”اللہ تعالیٰ آپ کو پسر صالح عطا فرمائے گا“





بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

خط آیا۔ حضرت اقدس نے آپ کی درخواست بیعت قبول کی اور آپ کے حق میں دعا فرمائی۔

والسلام افتخار احمد

۲۵ جنوری ۱۹۰۶ء

از قادیان

سعید احمد کی بیعت کی درخواست کا جواب:

”خط آیا۔حضرت اقدس نے آپ کی درخوات بیعت قبول کی اور آپ کے حق میں دعا فرمائی“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی ۔ اما بعد

بخدمت شریف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔

(۱) مجھے کل بعد نماز جمعہ کے جانیکا ارادہ ہے حضرت جی سے رخصت مانگتا ہوں ۔

(۲) دو تین امر ہیں جنکے لئے خاص توجہ سے دعا ہو جاوے تو میری آرزو ہے

پس اگر اونکا بیان کرنا خاص جگہ مین ممکن نہو تو حضرت جی ارشاد

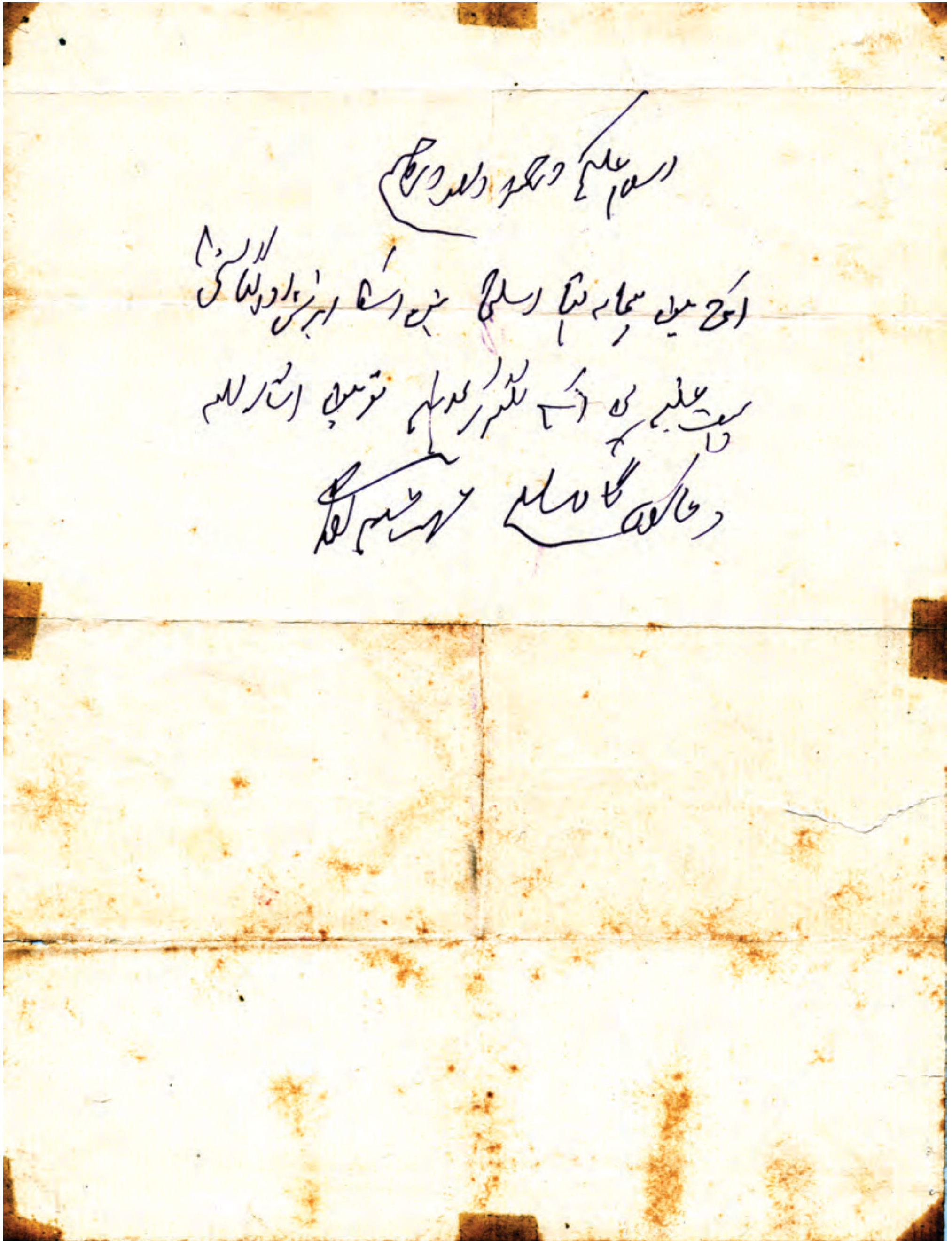
فرماوین تو لکھ کر خدمت مبارک مین بھیجدون ۔

سائل محمد یحییٰ

دکن دیگران

۱/۱/۰۵

حضرت مولوی محمد یحییٰؓ کا خط جس میں انہوں
نے حضرت صاحب سے واپسی کی اجازت چاہی اور کچھ مسائل بیان کیے



السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج میں بیمار تھا اس لیے نہیں آیا ریزش اور کھانسی کا

بہت غلبہ ہے آپ لکھ کر بھیج دیں تو میں انشاء اللہ

دعا کروں گا

حضرت صاحب کا جواب: ”آج میں بیمار تھا۔اس لیے نہیں آیا۔

ریزش اور کھانسی کا بہت غلبہ تھا۔آپ لکھ کر بھیج دیں تو میں انشاء اللہ دعا کروں گا“



حضرت مولانا محمد علیؒ



حضرت مولانا صدرالدینؒ

حضرت حافظ محمد سعید صاحب کا روحانی مقام

آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزندان نے اپنی رہائش گاہ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر اپنی اراضی سے ایک قطعہ زمین منتخب کیا، یہ جگہ سدھُو کہلاتی ہے۔ اُس جگہ کو احاطہ کر کے خاندانی قبرستان کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ آپ کی تدفین کے بعد آپ کے مریدوں نے آپ کا پختہ مزار بنانا چاہا مگر آپ کے فرزندان نے اس کی اجازت نہ دی اور قبر کو پختہ نہ کروایا اور نہ ہی کوئی کتبہ لگوایا۔

حضرت حافظ صاحب کی روحانی بلندی و رفعت کا اندازہ تو آپؒ کی زندگی میں ہی لوگوں کو تھا۔ مگر آپ کی وفات کے بعد بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر مزید شواہد قائم ہوئے۔

سلسلۂ احمدیہ کے ایک بزرگ حضرت سید اسداللہ شاہ صاحب، جو خود صاحبِ کشف و الہام تھے، دیبگراں کے اِس قبرستان میں تشریف لے گئے۔ دُعائے مغفرت کے بعد واپس لوٹے تو فرمایا "وہاں تو نُور ہی نُور ہے"۔ اس کے بعد جتنا عرصہ وہ دیبگراں میں، حضرت ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے مہمان رہے روزانہ نمازِ فجر کے بعد قبرستان تشریف لے جاتے اور حضرت محمد سعید کی قبر کے سرہانے کی طرف دیر تک کھڑے رہتے، سات مرتبہ سورۃ یٰس کی تلاوت فرماتے اور دُعائیں کرتے۔ آپ نے فرمایا: "مجھے اِس قبر میں نور نظر آتا ہے۔ میں نے بہت بڑے بڑے بزرگوں کے مقابر کی زیارت کی مگر ایسی کیفیت اور کہیں محسوس نہیں ہوئی"۔

ایک سال بعد حضرت شاہ صاحب دوبارہ دیبگراں تشریف لے گئے اور فاتحہ خوانی اور دُعائے مغفرت کے لیے قبرستان واقعہ سَدھُو میں گئے۔ واپس آ کر اُنہوں نے فرمایا: "آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں قبرستان کے قریب ابھی سڑک پر ہی تھا کہ حالتِ کشف میں میاں محمد سعیدؒ کو دیکھا کہ سامنے سے آئے اور مجھ سے بغلگیر ہو گئے اور فرمایا: 'میرے مقام اور مقامِ انبیاء میں جو فاصلہ تھا وہ آپ کی گذشتہ سال کی دُعاؤں سے پورا ہو گیا'، اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اظہارِ احسان

مندی کر رہے ہیں۔"

حضرت محمد سعید کی روحانیت کے اعلیٰ مقام کی تصدیق، ایک اور بزرگِ سلسلہ کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ کتاب "حیاتِ حسن" جس میں عبداللہ جان نیازی صاحب نے اپنے والد غلام حسن خان نیازی کی سوانح بیان کی ہے، اس میں وہ تحریر کرتے ہیں: "حکیم محمد یحییٰؒ صاحب جو خود بھی بڑے عابد اور زاہد بزرگ تھے اور دیگر اس کے رہنے والے تھے، نے والد صاحب کو (غلام حسن خان نیازی) مدعو کیا۔ جبکہ والد صاحب ایک احمدی دوست مرزا سلطان احمد کی معیت میں دیگر اس گئے اور قبرسان بھی گئے، جہاں اُنہوں نے دُعا کی اور دو قبروں کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے: 'یہ دونوں بزرگ بڑی اچھی حالت میں ہیں'۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ایک اُن کے والد بزرگوار کی قبر ہے اور دوسرے اُن کے چچا کی۔[۱]

۱: اس قبرستان میں حکیم محمد یحییٰ صاحب کے چچا کی تدفین نہیں ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ مصنف کی مراد ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے چچا حکیم محمد یعقوب صاحب سے ہو۔

حضرت مولوی حکیم حافظ محمد یحییٰؒ اور حضرت مولوی حکیم محمد یعقوبؒ

حافظ محمد سعید کو اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی لا انتہا برکات و روحانی افضال سے نوازا، وہاں اُنہیں دو یکتائے روزگار فرزند بھی عطا فرمائے جو اپنے والد کے فرمانبردار، والدہ کے خدمت گذار اور دین و دُنیا کے علوم سے بہرہ مند تھے۔ اپنی دینداری، علم و فضل اور تقویٰ و طہارت میں بے مثال تھے۔ ان کا ایک دوسرے سے محبت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی بھی رنگ میں ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوئے۔ گویا کہ ایک جان دو قالب تھے، اسی لیے ان کا ذکر ایک ساتھ ہی کرنا لازمی ہے۔ یہ دونوں بھائی ہر خاص و عام کے لیے فیوض و برکات کا سرچشمہ تھے۔ آپ بلند کردار، اولوالعزم اور جفاکش انسان تھے۔ راستبازی، دیانتداری، ایفائے عہد اور نفاستِ طبع میں بے مثال تھے۔ پھر بھی دونوں

کی اپنی اپنی ذات اپنی جگہ مکمل اور منفرد تھی۔

بڑے بھائی ذہانت، فطانت، فہم وادراک، عقل و دانش میں بے مثال ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت سنجیدہ اور کم سخن تھے۔ جبکہ چھوٹے بھائی رقیق القلب، صلہ رحم، فیاض، خوش طبع اور حاضر جواب تھے۔ بڑے بھائی نہایت نپی تلی اور مدلل گفتگو فرماتے۔ جبکہ چھوٹے بھائی کی گفتگو میں ظرافت کی چاشنی ہوتی تھی جو لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی اور چھوٹے بڑے سب آپ سے بلا تکلف گفتگو کر پاتے تھے۔

آپ کے عقیدت مندوں میں ایک صاحبِ علم و مرتبہ ہندو، بخشی جمپت رائے نے اُنہیں اپنے ایک خط میں تحریر کیا کہ:

> دیبگراں اصل میں دیوا گراں ہے اور سنسکرت میں دیوا فرشتہ کو کہتے ہیں اور گراں کے معنی ہیں گاؤں یا دیہات۔ ممکن ہے یہاں پر کبھی دیوا یا فرشتے رہتے بھی ہوں۔ کبھی کسی نے پہلے یہاں فرشتے دیکھے تھے یا نہ، مگر ہم نے اپنے زمانہ میں دو فرشتوں کو اِس گاؤں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

بخشی صاحب کی مراد حکیم محمد یحییٰ صاحب اور حکیم محمد یعقوب صاحب سے تھی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ دو انسان باوجود اِس جہان میں رہنے کے اپنے اعمال و اطوار سے دوسرے تمام انسانوں سے اس قدر مختلف اور ممتاز تھے کہ گویا کہ اس جہاں کی نہیں بلکہ کسی اور جہاں کی ہستیاں ہیں۔

پروفیسر خلیل الرحمان صاحب مرحوم و مغفور جنھوں نے ان بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی اور اُنہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ نصیب ہوا، اپنی خودنوشت سوانح (غیر مطبوعہ) میں تحریر فرماتے ہیں:

میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو اُن کے جسمانی اور روحانی سراپا کی تصویر کشی کر سکوں جنھوں نے خدا کو اپنی زندگی میں دیکھ لیا ہو۔ اُن کی حیات طیبہ کی گہرائی کون پا سکتا ہے۔ وہ عام انسانوں کی نظر میں کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، دُنیا کے کاروبار میں مصروف انسان تھے، لیکن وہ اِس دُنیا کے بندے نہیں تھے۔ ہر دو کا رنگ اپنا اپنا تھا، اُن کے حسین چہروں پر کیا نور تھا، اُن کی پیشانیوں سے ایک ماورئی روشنی کی کرنیں پھوٹتی تھیں، اُن کی رفتار میں تواضع اور انکسار تھا اور اُن کی گفتگو میں کیا شیرینی اور حلاوت تھی، جیسے کسی نے شہد گھول دیا ہو۔ وہ علم کے ایسے بحر ذخار تھے، جس کی سطح بڑی پُرسکون ہو لیکن اُس کی تہہ میں بیش قیمت گوہرِ تابدار پوشیدہ ہوں۔ وہ خود زندہ تھے اور دوسروں کو جسمانی اور روحانی زندگی بخشی۔ وہ زمین پر چلتے پھرتے فرشتے تھے۔

حکیم محمد یحییٰ صاحب کی عمر جب قریباً چھ سال کے لگ بھگ تھی تو اُن کے والد محترم حافظ محمد سعیدؒ آپ کو اپنے مرشد، حضرت سید امیر کوٹھے والے ملاں صاحب کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت سید صاحب حالتِ مراقبہ میں مریدوں کو توجہ دیا کرتے تھے، چنانچہ آپ نے کم عمر یحییٰ کو توجہ دی اور بے ساختہ بآواز بلند پشتو زبان میں فرمایا:

"یحییٰ ڈیر لوئے استعداد لری"۔ (یحییٰ بڑی استعدادوں کا مالک ہے)

خدا تعالیٰ نے اس بزرگ ہستی کی زبان سے نکلی ہوئی بات کو حرف بحرف سچ ثابت کر دیا اور حکیم محمد یحییٰ صاحب استعداد و کمال، فہم و تدبر اور عبادت و ریاضت میں یکتائے روزگار ثابت ہوئے۔

حکیم محمد یحییٰ، بڑے عابد اور شب بیدار بزرگ تھے۔ پندرہ سال کی لگاتار ذاتی کاوش سے قرآن پاک حفظ کیا۔ نماز تہجد بالالتزام ادا کرتے، گھنٹوں حالتِ قیام میں رہتے، اور سجدہ ریز

ہوتے تو سجدہ گاہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ اُن کے اِس عجز والحاح سے رحمتِ خداوندی جوش میں آتی تو دُعاؤں کے جواب ملتے اور التجائیں قبولیت پاتیں۔ آپ کے فرزند ڈاکٹر سعید احمد خان آپ کی عبادات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ایک دفعہ وہ (والد صاحب) بیمار ہو گئے تو ایک سال تک اُن کے ساتھ کمرے میں سویا، جونہی آدھی رات گذر جاتی تو اُن کے قرآن پڑھنے اور رونے کی آواز آنے لگتی، اور مجھے اپنی کمزوری پر ندامت محسوس ہوتی اور میں بھی اُٹھ بیٹھتا۔

کچھ ایسا ہی احوال، مولوی محمد یعقوبؒ کی عبادات کا بھی تھا۔ وہ طبعاً رقیق القلب تھے اور نہایت خشوع وخضوع سے نماز ادا کرتے اور گریہ وزاری کرتے تھے۔ اکثر اوقات وہ فجر کے بعد کا وقت ندی کے کنارے نوافل ونماز اشراق میں گذارتے۔ اِس ندی کے کنارے بڑی بڑی چٹانیں، اب بھی اُن کی اور اُن کے والد محترم حافظ محمد سعیدؒ کی صلوٰۃ وتسبیحات کی گواہ ہیں۔ عوام الناس اُنہیں اب بھی "نمازی گٹے" یا "نمازی پتھر" کہتے ہیں۔

سُسَّل گاؤں کے ڈاکٹر مبارک صاحب نے ایک مضمون بعنوان "دیبگراں کا معالج خاندان" تحریر فرمایا۔ جس میں آپ نے تحریر فرمایا:

> مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم اپنے زمانہ کے نہ صرف حکیم حاذق تھے، بلکہ انسانی خدمت کے بلند تر اور اچھوتے اقدار کے مالک تھے۔ اِس خاندان کے متعدد حکماء معالجوں کا ریاست امب دربند سے انتہائی قریبی اور گہرا تعلق رہا ہے۔ ماضی کے والیان امب دربند، پھلڑہ اور خوانین تناول علاج معالجہ کے سلسلہ میں دیبگراں کے اسی معروف معالج خاندان پہ انحصار کیا کرتے تھے۔ اِس خاندان کے دستِ شفا کا شہرہ عام تھا۔ گذشتہ ایک صدی سے علمِ طبِ یونانی

اورفن ڈاکٹر ایلوپیتھی کے میدان میں اس عہد آفرین خاندان کے متعدد معزز افراد یکتائے روزگار حیثیت کے مالک ہوتے چلے آرہے ہیں۔

یہ دونوں بزرگ ہستیاں جہاں اپنی خاندانی وجاہت، دینداری، علم وفضل اور امانت و دیانتداری کے لیے شہرت رکھتی تھیں، وہاں اُن کا شہرہ بطور حاذق طبیب اور مستجاب الدعوات بھی دور دور تک تھا۔ بلاامتیاز مذہب وقوم عوام الناس اور خواص وامراء، سلاطین وخوانین آپ کے حلقۂ اثر میں تھے، اور روحانی وجسمانی طبابت کے لیے آپ کے زیرِ احسان تھے۔ لوگ دور دراز سے سفر کر کے آپ کے پاس حاضر ہوتے اور خود آپ بھی دوسرے علاقوں میں بغرضِ علاج معالجہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ یہ سفر حضرت مولوی محمد یحییٰ صاحب زیادہ اختیار کرتے۔ جبکہ مولوی محمد یعقوب صاحب گھر پر رہ کر تمام انتظام وانصرام کی نگرانی فرماتے۔ یتامیٰ کی پرورش اور دیکھ بھال بھی آپ ہی کے سپرد تھی۔ جن کا اپنا کوئی پرسانِ حال نہ ہونے کے سبب آپ ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتے تھے۔ آپ کا گھر ایک ایسی پناہ گاہ تھی جہاں بے آسرا مرد وزن آکر پناہ لیتے اور اپنے ایام کرب وبلا اس امن وسلامتی کے گہوارے میں بسر کرتے۔

آپ اپنے گاؤں کے لوگوں، غرباء اور عزیز واقارب سے کبھی دوا دارو کا معاوضہ نہ لیتے تھے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے کبھی آپ کو احتیاج میں نہیں چھوڑا۔ علاقے کے امراء وخوانین، نواب اور سرکردہ افسران آپ کو اپنے علاج کے لیے بلاتے اور تحائف، رقوم اور اناج آپ کے ہمراہ بھجواتے۔ اور اکثر اوقات دیگر مواقع پر بھی آپ کی خدمت میں تحائف ارسال کرتے۔

ڈاکٹر مبارک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی زبانی یہ واقعہ سُن رکھا ہے کہ ایک مرتبہ ریاست امب کے نواب خان زمان خان صاحب بیمار پڑ گئے تو اُن کے لیے لاہور سے ایک انگریز ڈاکٹر بمع ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب کے تشریف لائے۔

جلدی افاقہ نہ ہوا تو نواب صاحب نے اِصرار کیا کہ دیبگراں والے حکیم صاحب کو بلایا جائے۔ چنانچہ ایلچی سرپٹ گھوڑے دوڑاتے دیبگراں پہنچے اور شام ڈھلنے تک لمبا سفر طے کر کے بمعہ مولوی صاحب امب پہنچے۔ اُس وقت تک نواب صاحب اپنی خواب گاہ میں جا چکے تھے۔ چنانچہ آپ سے رات آرام کرنے کو کہا گیا۔ حکیم صاحب رات بھر نوافل پڑھتے اور اپنے رب سے گریہ وزاری کرتے رہے کہ جہاں ڈاکٹروں کے جدید علاج سے خاطِر خواہ افاقہ نہ ہوا۔ وہاں اُن کی طبابت کی عزت رکھنے والا تو ہی ہے۔ اللہ نے آپ کی عاجزانہ پکار سُن کر جواباً الہام فرمایا "مرمن" اور "انفلوئنزا"۔

گویا مرض کی تشخیص بھی اور علاج بھی دونوں بتا دیئے گئے۔ حکیم محترم علی الصبح باہر کھلے علاقے میں چلے گئے۔ اِس علاقے میں خود رو یہ مرمن نامی بوٹی ہر طرف بافراط نظر آئی۔ اکٹھی کر کے لے آئے۔ اچھی طرح صاف کر کے پیس کر دوا تیار کر لی۔ نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ علاج شروع ہوا اور نواب صاحب نے شفا پائی۔ نواب صاحب نے معذرت کے ساتھ کچھ رقم پیش کی جو اُن کے اپنے خیال میں کم تھی۔ کیونکہ اِس سے پہلے وہ بہت مہنگا علاج کرواتے رہے تھے۔

خود مولوی صاحب فرماتے تھے کہ اُن کا تو دوا پر ایک پیسہ نہ لگا تھا اور سینکڑوں اللہ نے عطا کر دیئے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جب گھر واپس آئے تو آپ کے فرزند سعید احمد کا لاہور سے خط آیا ہوا تھا۔ کالج کے اخراجات کے لیے یک مشت کچھ رقم درکار تھی۔ مطلوبہ رقم نواب صاحب کی دی گئی رقم کے برابر تھی۔ آپ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ غیب سے یہ بندوبست نہ ہوتا تو اتنی رقم گھر میں

کہاں تھی، کوئی مویشی، غلہ یا زمین کا قطعہ فروخت کرنا پڑ جاتا۔

انہی نواب صاحب کی ایک اور شدید بیماری کا ذکر سسل کے ڈاکٹر مبارک صاحب نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مضمون "دیبگراں کا معالج خاندان" میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بیماری سے شفایاب ہونے پر نواب صاحب نے بہت سے تحائف اُن کی نذر کیے۔ اور نواب بیگم کی طرف سے الگ تحائف بھیجے گئے۔ یہ سامان تین خچروں پر لاد کر گاؤں پہنچایا گیا جس میں قیمتی ملبوسات، نقدی اور دیگر سامان شامل تھا۔

ڈاکٹر مبارک صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں:

دیبگراں کے اطباء کا یہ گھرانہ بھی جدی پُشتی طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی روشنی سے بھی منور تھا۔ اِس خاندان نے نہایت خاموش انداز میں اپنے علاقے میں خدمتِ خلق کرتے ہوئے علم کی قندیل بھی روشن کیے رکھی اور یہ گھرانہ علم کی روشنی پھیلانے کے لیے ابتدائی مکتب اور تربیت گاہ کا درجہ رکھتا چلا آ رہا تھا۔ چنانچہ حکیم مولوی محمد یحییٰ صاحب "اُستاد بڑے دیبگراں والے" نے بھی اپنے بزرگوں کی اِس روایت کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ خدمت خلق کو نیا اسلوب بھی عطا کیا۔ اپنے علاقہ بھر کے اُن یتیم، بے آسرا اور بے سہارا بچوں کو جن کا کوئی وارث یا پرسانِ حال نہ تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے کر ان کے سروں پر اپنا دستِ شفقت رکھا۔ اور اُن کی پرورش کی ذمہ داری قبول کی۔ اُنہیں دینی تعلیم دی اور اُن کی اخلاقی تربیت خود فرمائی۔ الغرض ان یتیم بچوں کو دینی و دنیاوی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے ہوئے مروجہ علوم سے بہرہ مند کیا۔ اور اُن کے روزگار کے حصول میں بھی مددگار رہوئے۔ آپ خدمتِ خلق

کے اس اچھوتے اور پیارے انداز کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک نبھاتے رہے۔

ایسے لاتعداد افراد ہیں جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ اُنہوں نے اِس جہان آب وگل میں اپنی حیات مستعار کی تاریک راہوں پر آگے بڑھنے کے لیے روشنی اسی خانوادۂ علم وحکمت کے فانوس سے حاصل کی ہے۔

اِن بزرگوں کو اپنے علاقہ کی سماجی حالت سدھارنے کی بھی فکر رہتی، اکثر اوقات اپنے خرچ پر رفاہ عامہ کے کام کرتے۔ وہ دینی اور علمی فروغ کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ گاؤں کی مسجد میں طلباء کی رہائش کا معقول انتظام کرنے کے علاوہ خود اپنے خرچ سے ایک حجرہ بنوایا اور پختہ کنواں بنوایا۔ اس کے علاوہ اپنے اثر ورسوخ سے عوام کے مسائل حل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

قبول احمدیت

حضرت حافظ محمد سعیدؒ کی وصیت کے مطابق آپ کے دونوں فرزند مولوی محمد یحییٰ اور مولوی محمد یعقوبؒ ظہور مہدی کے منتظر اور ذہنی طور پر قبولیت کے لیے آمادہ اور تیار تھے۔ چنانچہ حضرت صاحب کے دعویٰ مجددیت پر اطلاع پاتے ہی یکے بعد دیگرے دونوں بھائی انشراح صدر سے اس سلسلہ سے منسلک ہو گئے۔

حضرت مرزا صاحب کے ایک قرابت دار، مرزا اعظم بیگ بوجہ عقیدت وارادت حضرت مولٰینا محمد سعید صاحب کے یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس خاندان سے متعارف اور حافظ محمد سعید کے دونوں بیٹوں کی مذہبی استعداد اور علم وفراست سے متاثر تھے۔ مرزا اعظم بیگ نے حضرت صاحب سے اِن بھائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کا پتہ بتایا۔ حضرت مرزا صاحب کا یہ دستور

تھا کہ اہل علم کو براہِ راست تبلیغ فرماتے۔ آپ نے ایک تحریر کے ساتھ اپنی دو کتابوں (آئینہ کمالات اسلام اور حمامۃ البشریٰ) کا ایک پیکٹ مولوی محمد یحییٰ کے نام ارسال فرمایا۔ پیکٹ کے اوپر یہ الفاظ تحریر تھے:

یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ ؕ

حضرت صاحب کا اِس آیت کا منتخب کر کے پیکٹ پر لکھنا، اور حضرت محمد سعید کا اپنے فرزند کو اپنی مہر کے نگینہ میں یہ آیت کندہ کروانے کا مشورہ دینا، کوئی معمولی اتفاق نہ تھا۔ مولوی محمد یحییٰؓ نے اِن دونوں واقعات کے باطنی تعلق کو محسوس کیا اور اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت صاحب کی صداقت کا واضح اشارہ سمجھا۔ صرف آدھی کتاب پڑھنے پر ہی آپ کو اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔ فوراً بیعت کی تحریری درخواست بھیجی کیونکہ والدہ کی علالت خود حاضرِ خدمت ہونے میں مانع تھی۔ حضرت صاحب نے تحریری بیعت قبول فرمائی اور والدہ کی خدمت کو مقدم ٹھہراتے ہوئے تحریر فرمایا کہ جب تک والدہ کی صحت کے متعلق اطمینان نہ ہو جائے، عازمِ سفر نہ ہوں۔ والدہ محترمہ طویل عرصہ علیل رہیں۔ اُن کی وفات کے بعد ہی مولوی صاحب ۱۸۹۶ میں حضرت صاحب کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوئے اور آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف حاصِل کیا۔

مولوی محمد یعقوب صاحب ابتداء میں کچھ عرصہ متردد رہے۔ وہ مزید اطمینان چاہتے تھے، لیکن ۱۸۹۶ء میں جب برادرِ بزرگ قادیان سے لوٹے تو حضرت صاحب کی چند روزہ صحبت نے جو اثر اُن کی شخصیت پر کیا تھا، مولوی محمد یعقوبؓ اُسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اور فوراً حضرت صاحب کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ دِل موم کی طرح پگھلنے لگا اور حقیقت کُھل کر سامنے آ گئی۔ چنانچہ ۱۸۹۷ء میں اپنے بیٹے حکیم محمد اسحاق کو ہمراہ لیتے ہوئے قادیان پہنچے اور سلسلۂ بیعت میں داخل ہو گئے۔ کچھ عرصہ قادیان میں رہے اور مسیح زمانہ کے سچے دِل سے عاشق ہو گئے۔ مولوی محمد یعقوب صاحب رقیق القلب تو تھے ہی، اب تو نمازوں میں اور بھی گریہ وزاری ہونے لگی۔ آپ کی

انکساری، عجز اور رقیق القلبی سے حضرت مرزا صاحب بہت متاثر تھے۔ ایک موقعہ پر حضرت صاحب نے نہایت محبت سے حکیم محمد یعقوبؓ سے بغلگیر ہوتے ہوئے فرمایا:

"خدا تمہیں وہ مرتبہ اور عزت عطا فرمائے گا کہ نواب تمہاری جوتیاں سیدھی کریں گے"۔

حضرت صاحب کے یہ الفاظ معنوی اور حقیقی دونوں رنگوں میں پورے ہوئے۔ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ، مولوی محمد یعقوبؓ ریاست امب تشریف لے گئے۔ نواب صاحب، والیٔ امب مولوی محمد سعید صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ نواب صاحب اور مولوی محمد سعیدؓ کے فرزندان کے درمیان ہمیشہ اچھا راہ و رسم برقرار رہا اور آمدورفت کا سلسلہ رہتا تھا۔ مولوی صاحب دستور کے مطابق دروازے کے باہر جوتے اُتار کر اندر تشریف لے گئے۔ نواب صاحب سے ملاقات کے بعد اُٹھے، تو نواب صاحب خود دروازے تک رُخصت کرنے ہمراہ آئے۔ اور خود اپنے ہاتھ سے جوتے سیدھے کر کے سامنے پہننے کے لیے رکھ دیئے۔ مولوی یعقوبؓ صاحب کے ذہن میں حضرت مرزا صاحب کی پیشگوئی کے الفاظ تازہ ہوئے، تو بے اختیار آنکھیں نم ہو گئیں۔ نواب صاحب سے تمام واقعہ بیان کیا۔ نواب صاحب بھی آبدیدہ ہوتے ہوئے اُن سے بغلگیر ہوئے اور رخصت کیا۔ حضرت صاحب کی بیعت سے مشرف ہونے کے بعد دونوں بھائی ایک خاص جوش و ولولہ کے ساتھ تبلیغِ سلسلہ میں مصروف ہو گئے۔ جلدی ہی وہ تمام لوگ جو پہلے ہی ان بزرگوں کے زہد و تقویٰ اور صداقت سے متاثر تھے، سلسلۂ احمدیت میں داخل ہو گئے۔ ایک طرف ضلع ہزارہ میں گھر گھر احمدیت کا نور پھیلنے لگا تو دوسری جانب مخالف گروہ بھی رونما ہونے لگے۔ چنانچہ آپ کی راہ میں ہر طرف رکاوٹیں کھڑی کی جانے لگیں۔ آپ کی راہ میں آگ کے دریا بھی آئے اور تند و تیز طوفان بھی، مگر آپ کی استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی۔ کئی ایک جان لیوا حملے بھی ہوئے اور لوگ آپ کو جسمانی گزند پہنچانے سے بھی نہ چوکے۔

مولوی محمد یعقوب صاحبؓ ایک سفر سے واپس آ رہے تھے، مخالفین نے تنہا پا کر، یکبارگی

حملہ کر دیا، اور زخم پہنچائے، آپ کی جان بچ گئی، مگر پیشانی پر گہرا زخم لگا۔ گاؤں والے جوابی حملے کو تیار تھے مگر آپ نے روک دیا اور تھانے میں رپورٹ بھی درج نہ کروائی۔ آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کی عدالت میں رپورٹ کر دی ہے“۔ زخم کا نشان تا حیات رہا۔ ایک دفعہ فرمایا: ”جب میں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہوں گا اور میرا حساب کتاب ہوگا تو میں جواباً اپنا یہ زخم دکھاؤں گا اور کہوں گا یہ دیکھ تیرے مرزا کی خاطر یہ زخم کھایا ہے۔ میرے پاس یہی ایک سرٹیفکیٹ ہے اور کچھ نہیں“۔

آپ کو حضرت مرزا صاحب سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ نہایت رحم دل اور نرم مزاج ہونے کے باوجود حضرت مرزا صاحب کے خلاف ایک لفظ نہ سُن سکتے اور آپ کی توہین کو ناقابلِ برداشت پاتے تھے۔

مولوی محمد یعقوبؒ صاحب کا ایک واقعہ، مدِمقابل کو حاضر دماغی اور موقع محل کے مطابق برجستہ جواب سے شکست فاش دینے کا ہے۔ مانسہرہ میں اکثر عیسائی مشنری، احمدیوں سے بحث مباحثہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دِن پروفیسر خلیل الرحمان صاحب نے مولوی صاحب کو بتایا کہ مانسہرہ میں قادیانیوں اور عیسائی پادریوں کے درمیان ”الوہیتِ مسیح اور کفارہ“ پر مناظرہ ہوگا۔ پروفیسر صاحب اُس وقت ساتویں جماعت میں مانسہرہ ہائی سکول میں زیرِ تعلیم تھے، چنانچہ مولوی صاحب اُن کے ساتھ ہی صبح مانسہرہ چلے گئے۔ پروفیسر صاحب اسکول چلے گئے اور مولوی صاحب وہاں میدان میں بیٹھ گئے جہاں مناظرہ ہونا تھا۔ اِس مناظرہ کا حال پروفیسر صاحب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> مولوی صاحب ایک کونے میں زمین پر لوگوں کے قدموں میں خاموش بیٹھے سوال و جواب سُن رہے تھے۔ اُس وقت بحث اپنے عروج پر تھی۔ دونوں جانب سے گرما گرمی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ جب

عیسائیوں کے پاس دلائل کا جواب نہ رہا تو ایک پادری، 'آلٹر' اُٹھا اور نہایت گستاخی سے غصہ بھرے لہجے میں بولا:

'دیکھو تمہارا مرزا کہتا ہے میرے ساتھ خدا باتیں کرتا ہے اور وہ مسیح بنتا ہے۔ لیکن اُس نے کہا تھا کہ محمدی بیگم میرے نکاح میں آئے گی، پر اُسے ایک دوسرا آدمی لے گیا۔'

میں نے دیکھا کہ یہ سُن کر میرے حلم وانکسار کے پیکر باجی (مولوی یعقوب) کا چہرہ مبارک غصے اور غیرت سے سُرخ ہو گیا۔ وہ اپنے پیر کی شان میں، جنہیں وہ نہایت پیار سے اپنی میٹھی میٹھی ہندکو زبان میں "مَڑ امرزا" (یعنی میرا اپنا مرزا) کہا کرتے تھے۔ یہ بے ادبی اور گستاخی برداشت نہ کر سکے۔ ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے اور مولوی عبدالرؤف مرحوم کو جو جماعتِ قادیان کی طرف سے مناظر تھے اور پادری کو جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے تھے کہنے لگے 'عبدالرؤف اِس کا جواب پادری صاحب کو میں دوں گا'۔ یہ کہہ کر فرمایا:

'پادری صاحب مرزا کو نہ ہم خدا مانتے ہیں اور نہ نبی۔ ہم اُنہیں مجدد مانتے ہیں۔ آپ تو عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور خدا مانتے ہیں۔ اُس کی ماں کو ایک ترکھان لے گیا تھا اُس پر آپ کو کیوں غیرت نہیں آتی۔'

یہ سُننا تھا کہ پادری صاحبان کے مُنہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اور وہ کتابیں سمیٹ کر بھاگنے لگے۔ لوگ پوچھنے لگے: 'یہ جواب دینے والا کون تھا؟' کسی نے کہا: 'یہ دیبگراں والے نِکڑے اُستاد ہیں' (وہ لوگوں میں اسی طرح جانے جاتے تھے)۔ لوگ اُن کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ لوگوں کی زبان سے بے ساختہ یہ نکل رہا تھا کہ آج اُنہوں نے مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔ آپ نے اپنے

ترکش سے ایسا تیر پھینکا تھا کہ اُس کی زد سے عیسائی پادری نہ بچ سکے۔ یہ آپ کی غیرت تھی اسلام کے لیے، احمدیت کے لیے اور اپنے پِیر کے لیے۔ وہ حقیقت میں "فنافی المرزا" تھے۔ اُنہوں نے جان لیا تھا کہ یہی وہ چشمہ ہے جس کے پانی سے زندگی ملتی ہے اور وہ جی بھر کے اس سے سیراب ہوئے۔

حوالہ: پروفیسر خلیل الرحمان صاحب کی غیر مطبوعہ سوانح حیات

یہ دونوں بزرگان ہر طرح سے دِل و جان سے سلسلہ کی خدمت کے لیے حاضر رہتے۔ حضرت صاحب کی صداقت کے ثبوت جمع کرنے کے لیے مولوی محمد یحییٰ صاحب نے دوردراز کے سفر کیے۔ مولوی صاحب اپنے والد بزرگوار سے مہدی کے ظہور کے بارے میں حضرت ملاں صاحب کوٹھہ والے کی پیشگوئی سُن چکے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اُن کے ایسے مریدوں سے ملنے کا ارادہ کیا جو ابھی تک حیات تھے، وہ کوٹھہ شریف اور اُس کے ملحقہ علاقوں میں گئے اور کچھ بزرگوں سے ملے۔ جن میں سے دو کا بیان آپ نے اپنے خط میں مرزا صاحب کو لکھ کر بھیجا۔ جو آپؑ کی کتاب "تحفہ گولڑویہ" (صفحہ ۳۵۔۳۶) میں شائع ہوا۔

حضرت صاحب تحریر فرماتے ہیں:

......ان دونوں بزرگوں کی چشم دید روایت بذریعہ محبّی مولوی حکیم محمد یحییٰ صاحب دیبگرانی مجھے پہنچی ہے۔ مولوی صاحب موصوف ایک ثقہ اور متقی آدمی ہیں۔ اور حضرت کوٹھہ والے صاحب کے خلیفہ کے خلف الرشید ہیں۔ اُنہوں نے ۲۳ جنوری ۱۹۰۰ء کو میری طرف خط لکھا تھا جس میں دونوں بزرگوں کے بیانات اپنے کانوں سے سُن کر مجھے اس سے اطلاع دی ہے۔ خدا تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے آمین۔ اور وہ خط یہ ہے:

بخدمت شریف حضرت امام الزمان بعد از السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ معروض ۔کہ میں موضع کوٹھہ علاقہ یوسف زئی کو گیا تھا اور چونکہ سُنا ہوا تھا کہ حضرت صاحب مرحوم کوٹھہ والے فرماتے تھے کہ مہدیٔ آخرالزمان پیدا ہوگیا ہے مگر ظہور ابھی نہیں ہوا تو اس بات کا مجھ کو بہت خیال تھا کہ اس امر میں تحقیق کروں کہ فی الواقع کس طرح ہے۔ جب میں اس دفعہ کوٹھہ کو گیا تو اُن کے مریدوں میں سے جو کوئی باقی ماندہ ہیں ہر ایک سے میں نے استفسار کیا۔ ہر ایک یہی کہتا تھا کہ یہ بات مشہور ہے۔ہم نے فلاں سے سُنا فلاں آدمی نے یوں کہا کہ حضرت صاحب یوں فرماتے تھے۔مگر دو آدمی ثقہ مُتَدَیِّن نے اس طرح کہا کہ ہم نے خود اپنے کانوں سے حضرت کی زبان مبارک سے سُنا ہے اور ہم کو خوب یاد ہے، ایک حرف بھی نہیں بھولا۔ اب مَیں ہر ایک کا بیان بعینہٖ عرض خدمت کرتا ہوں۔ (ا) ایک صاحب حافظ قرآن نور محمد نام اصل متوطن گڑھی امازئی حال مقیم کوٹھہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت (کوٹھہ والے) ایک دن وضو کرتے تھے اور مَیں روبرو بیٹھا تھا۔فرمانے لگے کہ ’ہم اب کسی اَور کے زمانہ میں ہیں‘۔ مَیں اس بات کو نہ سمجھا اور عرض کیا کہ کیوں حضرت اس قدر معمر ہو گئے ہیں کہ اب آپ کا زمانہ چلا گیا۔ابھی آپ کے ہم عمر لوگ بہت تندرست ہیں۔اپنے دنیوی کام کرتے ہیں۔فرمانے لگے کہ تو میری بات کو نہ سمجھا۔میرا مطلب تو کچھ اور ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ جو خدا کی طرف سے ایک بندہ تجدید دین کے لیے مبعوث ہوا کرتا ہے وہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری باری چلی گئی۔ مَیں اس لیے کہتا ہوں کہ ہم کسی غیر کے زمانہ میں ہیں۔ پھر فرمانے لگے کہ وہ ایسا ہوگا کہ مجھ کو تو کچھ تعلق مخلوق سے بھی ہے۔اُس کو کسی کے ساتھ تعلق نہ ہوگا۔اور اُس پر اس قدر شدائد ومصائب آئیں گے جن کی نظیر زمانہ گذشتہ میں نہ ہوگی مگر اس

کو کچھ پروا نہ ہو گی ۔ اور سب طرح کے تکالیف اور فساد اس وقت ہوں گے اُس کو پرواہ نہ ہو گی ۔ زمین آسمان مل جائیں گے اور الٹ پلٹ ہو جائیں گے اُس کو پرواہ نہ ہو گی ۔ پھر مَیں نے عرض کی کہ نام ونشان یا جگہ بتاؤ ۔ فرمانے لگے نہیں بتاؤں گا ۔ فقط ۔ یہ اس کا بیان ہے ۔ اِس میں مَیں نے ایک حرف زیر و بالا نہیں کیا ۔ ہاں اُس کی تقریر افغانی ہے یہ اس کا ترجمہ ہے ۔ دوسرے صاحب جن کا نام گلزار خاں ہے جو ساکن موضع بڈا بیر علاقہ پشاور ہیں اور حال میں ایک موضع میں کوٹھہ شریف کے قریب رہتے ہیں اور اس موضع کا نام ٹوپی ہے ۔ یہ بزرگ بہت مدت تک حضرت صاحب کی خدمت میں رہے ہیں انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ ایک دن حضرت صاحب عام مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اور طبیعت اس وقت بہت خوش وخرم تھی ۔ فرمانے لگے کہ میرے بعض آشنا مہدئ آخرالزمان کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے (اشارہ یہ تھا کہ اسی ملک کے قریب مہدی ہو گا جس کو دیکھ سکیں گے) اور پھر فرمایا کہ اُس کی باتیں اپنے کانوں سے سُنیں گے ۔ فقط ۔ اُس بزرگ کو جب کہ مَیں نے اس راز سے مطلع کیا کہ آپ کے حضرت کی یہ پیشگوئی سچی نکلی ۔ اور ایسا ہی وقوع میں آ گیا ہے (یعنی پیشگوئی کے منشاء کے موافق مہدی پنجاب میں پیدا ہو گیا ہے) تو وہ بزرگ بہت رویا اور کہنے لگا کہ کہاں ہیں مجھ کو کسی طرح اُن کے قدموں تک پہونچاؤ اور مَیں بہ سبب ضعف بصارت کے جا نہیں سکتا کیا کروں ۔ پھر کہنے لگا کہ میرا اسلام اُن کو پہنچانا اور دُعا کرانی ۔ پھر مَیں نے اُس سے وعدہ کیا کہ ضرور تمہارا اسلام پہنچا دوں گا ۔ اور دعا کا سوال بھی کروں گا ۔ مَیں امید کرتا ہوں کہ ضرور اُس کے واسطے دعا کی جائیگی ۔

والسلام خیر ختام واللہ ثم تاللہ کہ ان دونوں شخصوں نے اِسی طرح گواہی دی

ہے۔ محمد یحییٰ از دیبگراں

۱۸۹۶ء میں بیعت سے مشرف ہونے کے بعد مولوی محمد یحییٰ صاحب کی ہر وقت یہ خواہش رہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت قادیان میں حضرت صاحب کی صحبت میں گذاریں۔ جب بھی قادیان جاتے کئی کئی مہینے قیام فرماتے۔ بعض اوقات رمضان کے روزے وہیں رکھتے اور حضرت صاحب کی صحبت سے براہِ راست فیض یاب ہوتے۔ حضرت صاحب خود بھی پسند فرماتے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت قادیان میں گذاریں۔ اکثر اجازت طلبی پر مزید رُکنے کا ارشاد فرماتے۔ فروری ۱۹۰۱ء میں گئے اور دو ماہ قیام کے بعد واپسی کی اجازت چاہی اور زمینداری کے کاموں کا حوالہ دیا تو حضرت صاحب نے فرمایا: "فصل تو بَوآئے ہیں۔ کٹائی کب ہوگی"؟ جواب دیا: "مئی میں"۔ اِس پر حضور نے فرمایا: "مئی تو ابھی دُور ہے"۔

چنانچہ مولوی صاحب مزید رُک گئے۔ یہ سلسلہ حضرت مرزا صاحب کی وفات کے بعد مولٰینا حکیم نورالدین کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔

حضرت مولٰینا نورالدین سے تعلقِ خاطر

مولٰینا نورالدین سے مولوی محمد یحییٰ کا ایک خاص تعلقِ خاطر تھا۔ حضرت صاحب کی وفات کے بعد جب مولٰینا نورالدینؓ جماعتِ احمدیہ کے سربراہ ہوئے تو اِس محبت میں عقیدت کا رنگ شامِل ہو کر مزید مضبوطی اختیار کر گیا۔ مولٰینا نورالدین گھوڑی سے گرنے کے سبب بہت عرصہ تک علیل رہے۔ اِس زمانۂ علالت میں مولوی محمد یحییٰ صاحب پورے چھ ماہ تک اُن کی تیمارداری کرتے رہے اور اُن کے پاس رہ کر ہر قسم کی خدمت بجالاتے رہے۔ ایک دن مولوی محمد یحییٰؒ نے عرض کی کہ اگر اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم۔ اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اَلْجَوَّادُ الرَّحِیْم پڑھ کر دُعا مانگیں تو قبول ہوتی ہے۔ مولٰینا نورالدین نے فرمایا: "تو پھر آپ میری

صحت کے لیے اسی طرح دُعا فرمائیں"۔

مسلسل تیمارداری، دوا اور دُعا کی بدولت اللہ تعالیٰ نے مولٰینا نورالدین کو شفا بخشی۔ اِس طرح اِن دونوں بزرگوں میں باہمی محبت کا رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔

مولٰینا نورالدینؒ کی وفات پر جماعت میں اختلاف 1914ء

مولٰینا نورالدین کی وفات کے بعد جماعت میں خلافت کے مسئلہ پر اختلاف ہوا، اور بہت سے بزرگ اور عام احمدی میاں محمود کے خود ساختہ عقائد کو درست ماننے لگے۔ اُس وقت مولٰینا محمد علیؒ نے حضرت صاحب کے صحیح عقائد کو پیش کیا۔ اور حضرت صاحب کے صحیح دعویٰ کو سامنے لائے۔ ایک حلفیہ بیان اُس وقت جماعت کے ستر بزرگوں کی طرف سے جاری ہوا۔ مولوی محمد یحییٰ اور مولوی محمد یعقوب اُن ستر بزرگوں میں سے تھے۔ آپ صحیح عقیدہ پر قائم رہے اور لاہور جماعت احمدیہ کے اولین ارکان میں سے تھے۔

حلفیہ بیان

ہم دستخط کنندگانِ ذیل حلفی شہادت ادا کرتے ہیں کہ بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جب ۱۸۹۱ء میں یہ اعلان کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وفات پا جانا قرآن کریم سے ثابت ہے اور حدیثوں میں جس ابن مریم کے اُمت محمدیہ میں آنے کا ذکر ہے وہ مَیں ہوں۔ تو اس وقت آپ نے نبوّت کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہاں بعض علماء نے لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالا۔ اور ان کو مدعیٔ نبوّت قرار دیکر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ جس کے بعد حضرت موصوف نے صاف طور پر کئی مرتبہ یہ اعلان کیا جیسا کہ آپ کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ آپ کی طرف دعوئٰ نبوّت منسوب کرنا محض افترا ہے۔ اور آپ نبوّت کو آنحضرت صلیٰ اللہ علیہ وسلم پر

ختم سمجھتے ہیں۔اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدعی نبوّت کوکاذب اور کافر یقین کرتے ہیں۔اورآپ کےبعض الہامات میں جو مرسل یا رسول یا نبی آیا ہے یا حدیث میں آنیوالےمسیح کی نسبت جولفظ نبی کا آیا ہےتو اس سے مراد فی الحقیقت نبی نہیں۔ بلکہ مجازی، جزوی،ظلّی نبی ہے جسے محدّث کہا جاتا ہے۔اور خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا نہ نیا نہ پرانا۔

ہم یہ بھی حلفی شہادت ادا کرتے ہیں کہ ہم نے نومبر ۱۹۰۱ء سے پہلے حضرت مسیح موعود کی بیعت کی اور میاں محمود احمد صاحب سرگروہ احمدی فریق قادیان نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت مرزا صاحب کا دعویٰ ابتداء میں نبوّت کا نہ تھا۔مگر نومبر ۱۹۰۱ء میں آپ نے اپنا دعویٰ تبدیل کرلیا اور نبوّت کے مدعی بن گئےاور انکار نبوّت کی دس گیارہ سال کی لگاتار تحریریں منسوخ ہیں۔یہ محض غلط اور سراسر خلافِ واقعات ہے۔ہم اللہ جل شانہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ کبھی ہمارے وہم وگمان میں یہ بات نہیں آئی کہ ۱۹۰۱ء میں حضرت مسیح موعود نے اپنے دعویٰ میں تبدیلی کی۔یا آپ کی سابقہ تحریریں جو انکار دعویٰ نبوّت سے بھری پڑی ہیں منسوخ ہوگئیں۔نہ ہم نے اپنےعلم میں کبھی ایسے لفظ کسی ایک شخص کے بھی منہ سے سنے جب تک کہ میاں محمود احمد صاحب نے ان کا اعلان نہیں کیا۔ واللّٰہ علیٰ ما نقول شھید۔

دستخط۔ محمد علی۔سابق اڈیٹر رویو آف ریلیجنز قادیان۔ پریزیڈنٹ احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور

دستخط ستر بزرگانِ جماعت

(۱)(مولوی) سید محمد احسن امروہی......(۷)(مولوی) محمد یحییٰ (دیبگراں)

(۸)(مولوی) محمد یعقوب (دیبگراں)۔......................

(۷۰)عبدالحق (راولپنڈی)

حج

مولوی محمد یحییٰؓ کو ۱۹۳۳ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ کے بھتیجے حکیم محمد اسحاق صاحب بھی آپ کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ اِن کے علاوہ ایک اور دوسرے احمدی شخص منشی محمد زمان اور گاؤں کے ایک زمیندار حاجی عبداللہ آپ کے شریک سفر ہوئے۔ اُس زمانے میں آپ کے فرزند ڈاکٹر سعید احمد خان مانسہرہ میں اسسٹنٹ سرجن تھے۔ آپ کے حج کا اجازت نامہ اُن کے دستخط سے جاری ہوا۔

مولوی محمد یعقوبؓ کی وفات۔ اپریل ۱۹۳۴ء

مولوی محمد یعقوبؓ صاحب قریباً چوہتر سال کی عمر پا کر ۱۹۳۴ء میں مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے۔ آپ مانسہرہ کے سول ہسپتال میں اپنے بھتیجے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے زیرِ علاج تھے۔ نمونیہ کا مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ مولوی محمد یعقوبؓ صاحب کو آپ کی خواہش کے مطابق دیبگراں کے آبائی قبرستان میں اُن کے والد حافظ محمد سعیدؓ کے قدموں میں دفن کیا گیا۔

مولوی محمد یحییٰ صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی سے بے انتہا محبت تھی۔ اُن کی دائمی مفارقت آپ کے لیے نہایت صبر آزما تھی، مگر آپ نے اپنے اِس ذاتی صدمے کو اپنی جدوجہد اور سلسلۂ احمدیت کو تقویت دینے کی کوششوں میں کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔ وہ کام جو دونوں بھائی مِل کر کیا کرتے تھے، اب اکیلے آپ کے کندھوں پر تھا۔ آپ مزید گیارہ سال تک جماعت کے مخالفین کے سامنے ایک مضبوط چٹان کی طرح سینہ سپر رہے۔

مولوی محمد یعقوبؓ کی وفات کے وقت اُن کے دونوں چھوٹے فرزند عبدالرحمان اور عبدالغفور کم سِن تھے۔ اِن دونوں کی پرورش آپ کے ہی سایۂ عاطفت میں ہوئی۔

مولوی محمد یحییٰ صاحب کی وفات ۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۵ء

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ۱۷ جنوری ۱۹۴۵ء کو ایک سفر سے واپس لوٹے تو مولوی محمد یحییٰؒ صاحب تندرست تھے اور اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ اُن پر فالج کا حملہ ہوا، جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور چند دِن کی علالت کے بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۵ کو بعداز عصر اپنے مولیٰ حقیقی سے جا ملے۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔ اِس موقعہ پر ڈاکٹر سعید احمد خان نے اپنے اہلِ خانہ کو صبر وتحمل سے کام لینے کی نصیحت کی جس پر سب نے عمل کیا اور آپ نے خود بھی اعلیٰ صبر کا نمونہ دکھایا۔ اُن کی نماز جنازہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے ہی پڑھائی۔

والدہ محترمہ، بی بی فاطمہ نور

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے آباء کا ذکر اُس خاتونِ باصفا کے ذکر کے بغیر نامکمل ہوگا، جن کی آغوش میں آپ نے پرورش پائی۔ حافظ محمد سعید صاحب نے اپنے دونوں فرزندان کی شادی ایک ہی وقت میں کر دی تھی۔ چھوٹے صاحبزادے محمد یعقوب کی زوجہ اُن کی خالہ زاد تھیں جن کا تعلق پُرجاں نامی گاؤں سے تھا۔ مولوی محمد یحییٰ کی زوجہ محترمہ دیبگراں کے نمبردار ملک میر احمد خان کی بھتیجی بی بی فاطمہ نور تھیں۔ اُن کے والد کا نام ملک عبداللہ تھا۔ شادی کے وقت وہ بہت کم عمر تھیں اور گاؤں میں تعلیم کا رواج بھی نہ تھا، اس لیے کچھ پڑھی لکھی نہ تھیں۔ اپنے شوق اور ماحول کے اثر سے دین کی طرف راغب اور مائل ہوگئیں۔ چنانچہ جب آپ کی اپنی صاحبزادی سات آٹھ سال کی ہوگئیں اور قرآن پاک ناظرہ پڑھ لیا، تو اُن سے قرآن پڑھنا سیکھا۔

آپ نہایت پاکباز اور عبادت گذار خاتون تھیں۔ آپ نہایت بردبار، متحمل مزاج، صابر و شاکر اور فیاض تھیں۔ اُن کی ہمدردی ہر خاص و عام سے یکساں تھی۔ آپ گاؤں کے ہر کس و ناکس

کے دُکھ سکھ میں بلاامتیاز شریک ہوتیں، اُن کی دلجوئی کرتیں اور ہر طرح کی خدمت گذاری کے لیے تیار رہتیں۔ ذات، برادری اور معاشی اونچ نیچ اُن کی نگاہ میں بے معنی تھیں۔ ڈاکٹر سعید احمد خان اُن کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے گاؤں کے ایک خادم پیشہ کے گھر میں، جنہیں عرفِ عام میں 'مصلی' کہتے ہیں، چیچک کے وبائی مرض سے کوئی فوت ہوگیا۔ میری ماں وہاں گئیں اور اُن کے ساتھ رات گذاری۔ میں نے اِس موقعہ پر اُن سے کہا کہ وہ مرنے والا شخص تو وبائی مرض میں مبتلا تھا، آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ اُنھوں نے فرمایا 'یہ ہمدردی کا تقاضا تھا جو میں نے پورا کیا'۔

آپ کی فیاضی کی بہت سی مثالیں گاؤں میں مشہور تھیں۔ سُنا ہے کہ گھر میں پکی دال سبزی کو پتلا کر دیتی تھیں کہ مانگنے والوں کے لیے گنجائش ہو جائے۔ آپ 'اُمِّ سعید' تو تھیں ہی مگر لوگ اُن کو 'اُمّ المساکین' بھی مانتے تھے۔

بی بی فاطمہ نور نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا تو ایک دیندار ماحول اپنے اردگرد پایا۔ اپنے خسر حافظ محمد سعید کی خدمت کرنے اور اُن کے روحانی فیوض سے برکتیں حاصِل کرنے کا آپ کو بھرپور موقع میسر آیا۔ اپنی فطری سعادت کی بدولت آپ نے حافظ محمد سعید صاحب کی عبادت وریاضت سے بہت جلد اثر قبول کر لیا اور اپنے آپ کو اُسی رنگ میں رنگین کر لیا۔ حضرت حافظ محمد سعیدؒ ایّامِ بیض یعنی ہر چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ بی بی فاطمہ نور بھی اسی عمل پر کاربند ہوگئیں اور تادمِ آخر اس پر عمل رہا۔

آپ کی وفات ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو ہوئی۔ آپ اپنے فرزند ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے پاس کچھ عرصہ رہنے کے لیے پشاور تشریف لے گئی تھیں۔ اُن کی صحت زیادہ اچھی نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار کے باوجود آپ نے ایّامِ بیض کے روزے ترک نہ کیے۔ جس شام اُن کی وفات

ہوئی وہ دِن بھر روزے سے تھیں۔ روزہ افطار کرنے کے معاً بعد طبیعت خراب ہوئی اور لمحوں میں ہی وہ مولیٰ ءِ حقیقی سے جا ملیں۔ اُن کے جسدِ خاکی کو دیبگراں لایا گیا اور اپنے محترم خسر کے پہلو میں جگہ پائی۔

سید اسداللہ شاہ صاحبؒ جب دیبگراں کے قبرستان میں جاتے تو بالخصوص حافظ محمد سعید صاحب کی قبر پر دُعا فرماتے۔ ایک دن قبرستان سے واپس آنے پر فرمایا کہ اُنہوں نے قریب کی قبر میں بھی وہی نور اور روشنی دیکھی ہے جو اُس بزرگ کی قبر میں نظر آتی ہے۔ یہ قریبی قبر بی بی فاطمہ نور یعنی ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی والدہ کی ہے۔ شاہ صاحب کچھ متعجب ہوئے۔ اور خدا تعالیٰ سے دُعا کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات وہ نہیں سمجھ پا رہے کہ ایک طرف ایک ولی اللہ ہے جس کی عبادت و ریاضت کا شہرہ تمام علاقے میں ہے اور دوسری طرف ایک عام گھریلو عورت۔ عبادت میں اُن کی ہم پلہ ہونا ممکن نہیں ہوسکتا، کیونکہ ایک تسلسل سے کوئی عورت عبادت کر ہی نہیں سکتی۔ حضرت شاہ صاحب کو الہاماً خبر دی گئی کہ اُس خاتون کو اُس کی عبادت کا ثمر ملا ہے اور آسمان پر اُس کا نام "مہتاب بی بی" ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب اُنہیں اُن کے ایامِ بیض کے روزوں کی پابندی سے جناب الٰہی سے عطا ہوا ہے۔

مہتاب بی بی یعنی اُمِ سعید کی پاکبازی اور پاک باطنی کی گواہی پروفیسر خلیل الرحمان صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔ پروفیسر صاحب جن کا اپنا بچپن اور زندگی کا کافی عرصہ اُن کے زیرِ سایہ گذرا وہ تحریر کرتے ہیں:

> مجھے اپنی زندگی میں تین خواتین کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے ایک حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی والدہ محترمہ مرحومہ اور دوسری آپ کی ہمشیرہ محترمہ مرحومہ اور تیسری اپنی ما بی بی مرحومہ۔ (بی بی عالم نور مرحومہ پروفیسر صاحب کی خوشدامن تھیں اور جناب احمد صادق صاحب کی والدہ

محترمہ۔ناقل)۔

میں نے اِن تینوں کو ہی تقویٰ اور طہارت کے ایک نہایت اعلیٰ مقام پر پایا ہے۔ ہم نے حضرت رابعہ بصری کی کہانیاں سنی ہیں لیکن اِن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ رابعہ بصری کی ہم پلہ تھیں۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے درجات میں کون زیادہ اور کون کم ہے۔لیکن میں کم از کم یہی سمجھتا ہوں۔ ہزاروں میں بیٹھی ہوں، تب بھی اُن کے چہرے اِس بات کی غمازی کرتے تھے کہ یہ معمولی عورتیں نہیں ہیں۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْد۔ (خود نوشت سوانح پروفیسر خلیل الرحمان صاحب۔غیر مطبوعہ)

بی بی فاطمہ نور کو جس پیمانے پر بھی پرکھا جائے آپ بے مثال تھیں۔آپ کی زندگی کے واقعات جو سننے میں آئے ہیں اُن سے آپ کی تسلیم و رضا،حلم و بردباری، عجز و انکساری،صبر وتحمل، ایثار و ہمدردی،محبت وشفقت جیسی صفات سامنے آتی ہیں۔ دیکھنے والوں نے آپ کو راضی برضا اور خدمت گذار بہو اور بیوی پایا۔ وہ ایک مشفق اور جان نثار ماں تھیں جن کے سایۂ عاطفت میں اپنے دو بچوں نور جہاں بیگم اور سعید احمد کے علاوہ بیسیوں بے سہارا یتیم و یسیر پلے بڑھے (اِن ہی میں سے ایک پروفیسر خلیل الرحمان صاحب بھی تھے)۔خدا تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے۔آمین۔



دوسرا باب

علاقہ ہزارہ میں تحریک احمدیت کی مختصر تاریخ

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی حیاتِ بابرکات کا پسِ منظر تمام تر حالات کے ساتھ سامنے لانے کے لیے علاقہ ہزارہ میں تحریکِ احمدیت کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہزارہ، پاکستان کے صوبہ سرحد کا ایک ضلع تھا۔ جسے اب ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ یہ ایک خوبصورت سرزمین ہے جس کے نشیب و فراز میں قائم بستیوں کے بسنے والے قدامت پسند اور مخصوص روایات کے غلام رہے ہیں۔ دُنیاوی اور مذہبی لحاظ سے وہ خوانینِ علاقہ اور ملاؤں کے زیرِ اثر ہیں۔ ظاہری رسوم اور قدروں کے شیدائی ہیں۔ لہٰذا ایسے ماحول میں تفہیم دین اور تجدیدِ اسلام کا کام نہایت دشوار اور ناممکنات میں سے نظر آتا ہے۔ مگر جب تائیدِ الٰہی شامِل ہو تو ہر ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ وہ جو کام، جہاں اور جس سے لینا چاہتا ہے، اُس کے لیے راہیں استوار کر دیتا ہے۔

حضرت امامِ زمان کے دعاوی کی بازگشت، جب اِن وادیوں میں سُنائی دی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے چند سعید روحوں کو اِس طرف مائل کر دیا اور ایک جماعت کھڑی کر دی۔ اس تحریک پر اولاً لبیک کہنے والے مولوی محمد یحییٰ صاحب دیہگرائیں تھے۔ باقاعدہ بیعت میں شمولیت کے بعد، مولوی صاحب نے نہایت جوش اور ولولہ کے ساتھ یہ پیغام دوسروں تک پہنچانے کی عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے آپ اپنے والد حافظ محمد سعید صاحب کے عقیدت مندوں اور شاگردوں سے فرداً فرداً ملے اور حق کو قبول کرنے کی دعوت دی۔ جیسا کہ حق کو قبول کرنا ہر دور میں اپنے لیے مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف رہا ہے، اِسی طرح اِس دور کی مشکلات بھی کچھ کم نہ

تھیں۔ ہر طرف مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ تاہم مولوی صاحب کی کوششوں کو خدا تعالیٰ نے قبول فرمایا اور چند نفوس سلسلۂ احمدیت میں داخل ہوئے جو نہایت استقلال کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کرتے رہے اور ہر قسم کی قربانیوں کے لیے ہمیشہ تیار رہے اور س پر استقامت دکھائی۔

اِن بزرگوں کا کچھ ذکر حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی تحریر "ہزارہ میں احمدیہ تحریک کا اثر و نفوذ اور مخالفتِ عامہ" میں کیا ہے۔ جو اختصار کے ساتھ یہاں پر تحریر کیا جاتا ہے۔

مولٰینا سید سرور شاہ

مولٰینا سید سرور شاہ کھوڑی علاقہ کشمیر کے رہنے والے ایک بڑے عالمِ دین تھے۔ اور ایبٹ آباد صدر کی جامع مسجد کے امام تھے۔ ابتداء میں اُنہیں مولوی محمد یحیٰی صاحب نے ہی پیغامِ حق پہنچایا۔ جلد ہی وہ پشاور چلے گئے اور وہاں مشن کالج میں عربی پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ اُن کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے قبولِ حق کے لیے کھول دیا۔ بعدہٗ وہ قادیان جا کر اقامت پذیر ہو گئے اور مدرسہ احمدیہ کے استادِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے اپنی ساری عمر وہیں گذار دی۔

داتہ میں قیامِ جماعت

داتہ، ہزارہ کا مشہور گاؤں ہے۔ وہاں مولوی محمد یحیٰی صاحب تبلیغ کے لیے گئے، تو ایک نوجوان طالب علم محمد یمین [1] کو پہلے ہی اِس تحریک کا حامی پایا۔ وہ نوجوان تین ماہ پہلے بیعت کر چکے تھے، چنانچہ یہ دونوں ایک دوسرے کی تقویت کا موجب ہوئے گاؤں کے نمبردار فتح علی شاہ کا بیٹا سید حیات علی شاہ اور بھتیجا سید سرور شاہ داخلِ جماعت ہوئے۔ اور بڑی جرأت سے ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرتے رہے۔

۱: مولوی محمد یمین، ماسٹر ابراہیم کے والد اور بشیر احمد ڈی ایس پی پشاور کے دادا تھے۔

اِن کے علاوہ داتہ کے حاجی احمد دین ایک آسودہ حال زمیندار نے بھی بیعت کر لی۔ اسی

گاؤں کے علماء کے خاندان میں سے مولوی عبدالغنی اور اُن کے نوجوان بھتیجے محمد اکبر کو قبولیتِ حق کی توفیق ملی۔ علاوہ ازیں میاں سعید احمد دکاندار، میاں گل حسن، میاں دین محمد، منشی محمد اکرم، بابا اللہ دین اور میاں خیرُ اللہ عرف خیرو ڈاکٹر داخل جماعت ہو گئے۔ اِس طرح اِس گاؤں میں ایک مختصر جماعت قائم ہو گئی۔

مولوی محمد یمین صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم صاحب نے یادِرفتگان میں شامل ایک مضمون میں اُن کا واقعہ قبولیتِ احمدیت بیان کیا ہے جو مختصراً یوں ہے کہ مولوی محمد یمین صاحب داتہ میں بطورِ طالب علم مقیم تھے، کہ ایک موقعہ پر اُنہوں نے مانسہرہ کے مشن ہاؤس کے باہر ایک پادری صاحب کو دو تصویریں عوام کو دکھاتے دیکھا۔ ایک حضرت عیسٰیؑ کی نہایت خوبصورت تصویر اور دوسری حضرت محمد ﷺ کی نہایت ہتک آمیز تصویر۔ پادری صاحب اِس طرح حضرت عیسٰیؑ کی آپﷺ پر برتری ثابت کر کے لوگوں کو عیسائیت کی طرف مائل کر رہے تھے۔ مولوی محمد یمین صاحب سے یہ توہینِ رسالت برداشت نہ ہوئی اور پادری صاحب سے بحث میں اُلجھ گئے۔ ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اور شام تک سلسلہ چلا۔

آخر، پادری صاحب نے دس سوال لکھ کر دیئے کہ اگلے روز مولوی محمد یمین اِن کے جواب دیں۔ اگر وہ جواب نہ دے

سکے تو اُن کو عیسائی ہونا پڑے گا اور فیصلہ ہوا کہ اگلے روز رئیس اعظم مانسہرہ جمعہ خان صاحب کی ڈیوڑھی میں مباحثہ ہو اور جمعہ خان ثالت کے فرائض انجام دیں۔ مولوی یمین صاحب نے اپنے اُستاد مولوی عبدالکریم سے مدد چاہی۔ سوال دکھائے تو اُنہوں نے مولوی یمین صاحب کو ایک کتاب دی کہ اِس میں تمام جوابات لکھے لکھائے موجود ہیں۔ مولوی یمین نے وہ جوابات یاد کر لیے۔

اِس طرح مباحثہ میں پادری کو شکست فاش ہوئی اور مسلمانوں کو فتح۔ چونکہ مولوی عبدالکریم صاحب نے کتاب کا سرِورق پھاڑ کر کتاب مولوی یمین کو دی تھی۔ اس لیے مولوی یمین نے اپنے اُستاد مکرم سے مصنف کا نام اور کتاب کا نام معلوم کرنا چاہا۔ معلوم ہوا کہ یہ مولوی نورالدین صاحب کی تصنیف "فصل الخطاب" ہے جو مرزائی ہیں۔ مولوی محمد یمین نے مولوی نورالدین صاحب کو خط لکھا اور پھر خود قادیان جا کر حالات سے اطمینان حاصل کیا اور ۱۸۹۶ء میں حضرت مجددِ وقت کی بیعت سے مُشرف ہوئے۔

موضع منگلور

موضع منگلور کے ابتدائی امدادی مدرسہ کے بانی اور مدرس مولوی سعیداللہ صاحب تھے،

جنہیں آج بھی اُن کے علمی فیوض کی وجہ سے اِس گاؤں کا 'سرسید' کہا جاتا ہے۔ جب مولوی محمد یحییٰ صاحب نے تبلیغ کی، تو اُنہوں نے فوراً حق کو پہچان لیا۔ اپنے گاؤں میں اُنہیں کوئی جماعت میسر نہ آ سکی اس لیے وہ ہمیشہ جمعہ ادا کرنے کے لیے آٹھ میل کا پہاڑی سفر طے کر کے دیبگران آتے اور واپس جایا کرتے تھے۔

موضع کچھی

موضع کچھی تحصیل ایبٹ آباد (موجودہ تحصیل ہری پور) میں ہے۔ وہاں کے مولوی احمد جی اور اُن کے ساتھ چند دیگر اشخاص، میاں صفدر، فضل، کالو، عمردین، میاں وارث، شیر خان، کرم خان، رحمت اللہ، یعقوب خاں اور میرزمان وغیرہ نے حق کو شناخت کیا اور وہاں ایک جماعت قائم ہوگئی۔

حضرت مولوی محمد یحییٰؓ کی تبلیغی مساعی کے سلسلہ میں ایک خط جو اکتوبر ۱۹۰۶ء میں اخبار بدر میں چھپا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم

سلسلہ حقّہ کے نئے ممبر۔

اما بعد شرائط بیعت۔

از خاکسار محمد یحییٰ ساکن دیب گراں ڈاک خانہ مانسہرہ ہزارہ حال وارد موضع کچھی تحصیل ایبٹ آباد ڈاکخانہ بیڑ۔

بخدمت شریف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

موضع کچھی کے لوگ بہت نیک و صالح ہیں ان کا مولوی صاحب مولوی احمد جی صاحب ایک باوقار اور مستقیم مزاج و ثابت قدم انسان ہے۔ آہستہ آہستہ عرصہ ۲سال ان کو حضرت کے دعویٰ کی نسبت عرض کیا گیا آخر وہ اس بھید کو سمجھ گئے اور اس دعویٰ کو انہوں نے تسلیم کیا۔ پھر اُن میں سے سب سے پہلے سبقت کر کے مولوی عبدالرحمٰن خلف الرشید مولوی احمد صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر دو ماہ رہ کر واپس آیا۔ ان کے واپس آنے سے ان لوگوں کے دل کو زیادہ ہی اطمینان ہوا۔ اب یہ سب لوگ بیعت کرنے کو، بلکہ خدمت مسیح موعود میں حاضر ہونے کو تیار ہیں۔ اب جو اس وقت حاضر ہیں ان کے بیعت لکھے گئے۔ حضرت منظور فرما کر بواپسی ان کو جواب سے اور دعاء استقامت سے یاد فرماویں۔ انکے لیے حضرت ضرور ثابت قدمی کی دعا کریں۔ ان کے اردگرد کے لوگ بلکہ چند اشخاص گاؤں میں بھی بہت کچھ شرارت کرتے ہیں۔

اسماء گرامی بیعت کنندگان برادران کے مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مولوی احمد جی صاحب خلف رشید مولوی محمد جی مرحوم ساکن کچھی تحصیل ایبٹ آباد ڈاکخانہ بیڑ۔

(۲) فضل ولد حسن علی خان ساکن کچھی

(۳) یعقوب خاں ولد سمندر خاں نمبردار ساکن کچھی۔

(۴) داؤد خان ولد یعقوب خاں ساکن کچھی۔

(۵) سید جمعہ شاہ ولد شاہ نورحسین ساکن کچھی

(۶) محمد وارث ولد متولے ساکن کچھی۔

(۷) فیض نور زوجہ محمد وارث ساکن کچھی۔

(۸) یوسف ولد محمد وارث ساکن کچھی۔

(۹) صاحب جان بنت محمد وارث۔

(۱۰) زینب بنت محمد وارث ساکن کچھی۔

(۱۱) مریم بنت محمد وارث ساکن کچھی۔

(۱۲) صابرہ بنت محمد وارث ساکن کچھی۔

(۱۳) شیر خان ولد سید خان ساکن کچھی۔

(۱۴) خانم جان زوجہ شیر خان ساکن کچھی۔

(۱۵) عبدالکریم ولد اللہ دین ساکن کچھی۔

(۱۶) شرف نور زوجہ عبدالکریم ساکن کچھی۔

(۱۷) شیرگل طالب علم ولد عبداللہ ساکن کچھی۔”یہ شیرگل عرض کرتا ہے میرے واسطے حضرت ازدیاد علم کی دعا فرماویں“۔

(۱۸) ملاں امان اللہ ولد ہاشم علی خان ساکن کچھی۔

(۱۹) محمد عرفان ولد امان اللہ ساکن کچھی۔

(۲۰) شیرخاں ولد امان اللہ ساکن کچھی۔

(۲۱) عبدالرحمٰن ولد شیرخاں ساکن کچھی۔

(۲۲) امیرخاں ولد شیر خاں ساکن کچھی۔

(۲۳) گل زماں ولد شیرخاں ساکن کچھی۔

(۲۴) گل جان بنت شیر خاں ساکن کچھی۔

(۲۵) کرم نور بنت شیر خاں ساکن کچھی۔

(۲۶) نور جہاں زوجہ شیر خاں ساکن کچھی۔

(۲۷) میر زمان ولد مندا خان ساکن موضع ٹاہلی۔

(۲۸) حبیب نور زوجہ فضل ساکن کچھی۔

(۲۹) عبداللہ ولد فضل ساکن کچھی۔

(۳۰) الٰہی نور بنت فضل ساکن کچھی۔

(۳۱) کالا ولد میرزماں ساکن کچھی۔

راقم۔

محمد یحییٰ از دیب گراں مانسہرہ ۔ ہزارہ

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء



موضع چھہڑ

موضع چھہڑ اور دیب گراں کے دو مذہبی گھرانوں کا تعلق بہت دیرینہ تھا۔ یہ دونوں خاندان حضرت صاحب کوٹھے والے کے مرید اور اِس طرح پیر بھائی تھے۔ جب حضرت حکیم محمد یحییٰؓ اور حضرت محمد یعقوبؓ نے حضرت مرزا غلام احمدؑ کی بیعت کر لی تو دونوں گھرانوں میں کچھ اختلاف اور کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اخونزادہ حمید اللہ [1] اور اُن کے صاحبزادے مولوی عبدالرحمٰن جو بذاتِ خود ایک بلند پایہ عالم تھے، دیب گراں والوں سے اُن کی قبولیتِ احمدیت کی وجہ سے سخت ناراض تھے، اور بہت بحثیں ہوتی تھیں۔ دیب گراں والے حکیم محمد یحییٰ صاحب نے تجویز کیا کہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب خود قادیان جائیں اور حضرت مرزا صاحب سے ملیں۔ چنانچہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب قادیان تشریف لے گئے۔ خود چھان بین کی اور نتیجتاً بیعت کر کے واپس لوٹے۔ البتہ اخونزادہ حمید اللہ اپنی مخالفت پر اڑے رہے۔ اور بیٹے سے قطع تعلق بھی کر لیا۔ مگر بیٹے کے مسلسل اصرار پر آپ اپنے ایک معتقد اور گاؤں کے ساتھی حافظ شرف الدین کے ہمراہ قادیان گئے۔ وہاں رہے اور حالات معلوم کرنے کے بعد احمدی ہو گئے۔ واپس آ کر آپ نے گاؤں کی مسجد کی امامت چھوڑ دی۔ اس طرح یہ دونوں باپ بیٹا ہزارہ میں احمدیت کے قیام کے لیے تقویت کا موجب ہوئے۔

۱: اخنزادہ حمید اللہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے خسر اور حبیب الرحمٰن صادق صاحب کے والد تھے۔ آپ ارجمند صادق و برادران و ڈاکٹر نظیر الاسلام کے دادا تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن ڈاکٹر نظیر الاسلام کے والد تھے۔

موضع تھاتھی

موضع تھاتھی کے مولوی ابراہیم صاحب اور اُن کے فرزندان محمد عرفان، عبدالغنی، عبدالرحمان اور محمد جان نے بھی احمدیت قبول کر لی۔ مولوی ابراہیم صاحب کا واقعہ قبولیت احمدیت اُن کے بیٹے عبدالرحمان نے یوں بیان کیا ہے کہ:

”جب مولوی محمد یحییٰ صاحب، اُن کے والد صاحب کے ہاں تبلیغ کے لیے گئے، تو رات وہاں (تھاتھی میں) گذاری۔ اور بعد از نماز فجر تبلیغِ احمدیت کے سلسلے میں گفتگو شروع کی۔ تھوڑی دیر بات سننے کے بعد اُن کے والد محمد ابراہیم نے کہا کہ آپ اِس قدر تکلیف کیوں فرماتے ہیں۔ اگر آپ، صبح اُٹھ کر یہ فرماتے کہ ابراہیم! آج نماز مشرق کی طرف منہ کر کے پڑھنی ہے۔ تو ابراہیم کیسا مسلمان ہے کہ آپ کی یہ بات بھی صحیح نہ جانتا۔ آپ نے جس بات کو حق پا کر قبول کیا ہے۔ وہ یقیناً حق ہے۔ میرے لیے یہ ہی سند کافی ہے۔ جلدی کیجئے اور میری بیعت کی درخواست بھیجئے“۔

صوابی میرا کے سید فضل شاہ اور موضع چریاں کے حاجی محمد دین عرف محمدی۔ موضع لنگر کے محمد عباس بھی اسی ابتدائی زمانہ میں داخِل سلسلہ ہوئے۔

مانسہرہ

محمد مطیع اللہ خان صاحب، جو اُس وقت محکمہ مال میں ملازم تھے۔ داخلِ بیعت ہوئے اور نہایت جرأت سے ہر مشکل کا مقابلہ کرتے رہے۔ تحصیلداری کے عہدہ سے پنشن حاصِل کی۔ مانسہرہ میں سکونت رکھتے تھے اور نوے سال کی باعزت و بامراد زندگی پا کر اُنہوں نے ۱۹۶۰ میں وفات پائی۔

مولوی محمد یحییٰ صاحب کے بعض شاگرد بھی حضرت مرزا صاحب کی بیعت میں شامل ہوئے جن کے نام یہ ہیں: مولوی حیات اللہ ساکن مدسری، مولوی عبداللہ ساکن بانڈہ خیر علی خان، مسیر احمد عرف جی ملاں ساکن دمتوڑ، ملا شیر گل ساکن کچھی، منشی عبدالغفار ساکن پھلڑہ، عبداللہ، حکیم عطاء الرحمان اور عبدالقادر، ہر سہ برادران امب، عبدالطیف، محمد شریف و محمد سعید، ہر سہ برادران سکنہ کھیری۔

بعض دیگر ہستیاں

چند ایسی ہستیاں جو ملک کے دوسرے علاقوں سے آ کر ضلع ہزارہ میں آباد ہوئیں اور اسی عرصہ کے دوران احمدیت قبول کی، اُن میں خان محمد عجب خان، زیدہ ضلع مردان کے معزز خوانین میں سے تھے اور مانسہرہ میں بطور تحصیلدار متعین تھے۔ وہ اپنی عظیم شخصیت، جرأتِ ایمانی اور بلند کرداری میں فقید المثال تھے۔

شیخ ضیاء اللہ صاحب

مانسہرہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ملازمت کے سلسلہ میں یہاں آئے اور کافی عرصہ یہاں قیام کا موقعہ ملا۔ وہ گجرات کے قانون گوشیخوں میں سے تھے اور حضرت شیخ رحمت اللہ مالک انگلش ویئر ہاؤس کے بہنوئی تھے۔ بہت نیک، خوش مزاج اور با اخلاق بزرگ تھے۔ اُن کی وجہ سے اِس نازک دور میں علاقہ مانسہرہ کے احمدیوں کو بڑی روحانی تقویت حاصِل تھی۔

شیخ نور احمد صاحب (وکیل)

۱۹۰۱ء میں ایک اور قیمتی وجود، حضرت شیخ نور احمد صاحب نے ضلع ہزارہ کے صدر مقام ایبٹ آباد میں ورود فرمایا اور اِس شہر کی قسمت جاگی۔ شیخ صاحب نے اپنے پیشۂ وکالت کے لیے اِس شہر کو منتخب کیا۔ آپ کا اصل وطن دھرم کوٹ رندھاوا ضلع گرداسپور (مشرقی پنجاب) تھا۔ تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ ایبٹ آباد آنے سے پہلے وہ حضرت مسیح موعودؑ کی بیعت میں شامل ہو کر فیضِ صحبت حاصل کر چکے تھے۔ وہ ایک قابل مقرر، صاحبِ درد انسان اور بڑے متقی تھے۔ احمدیت کے لیے جوش رکھتے تھے۔ اپنے اخلاق اور ہمدردانہ روش کی بدولت اپنے ماحول میں اُنہوں نے عزت کا مقام پیدا کر لیا تھا۔ باوجود مذہبی اختلاف کے، ضلع بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ایبٹ آباد کے مسلمانوں کے لیڈر مانے جاتے تھے۔ ہر مشکل کے موقعہ پر لوگ اُن کی طرف رجوع

کرتے اور وہ خدمت سے کبھی بھی گریز نہ کرتے تھے۔ شیخ نور احمد صاحب ۱۹۲۱ء میں لاہور میں دِل کے عارضہ سے وفات پا گئے اور میانی صاحب کے اُس قطعۂ زمین میں جس میں احمدیت کے آسمان کے کئی دیگر ستارے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے، وہیں شیخ نور احمد صاحب بھی مدفون ہیں۔

آپ کی اولاد میں سے آپ کے چاروں صاحبزادے اور صاحبزادیاں مدارجِ دنیا اور اخلاق کے اعتبار سے اونچے مقامات پر پہنچے۔ آپ کے دونوں بڑے صاحبزادے پروفیسر شیخ عزیز احمد اور شیخ محمد احمد، تادمِ حیات احمدیت سے وابستہ رہے۔ شیخ عزیز احمد اسلامیہ کالج پشاور میں زوآلوجی کے پروفیسر تھے اور اپنے عمل، علم وفضل، ہنرِ تعلیم اور اخلاق کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ شرافت، متانت اور انکساری میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ نے ۱۹۶۲ء میں بعارضۂ قلب کالج میں ہی اچانک وفات پائی۔

شیخ محمد احمد، اپنے والد مرحوم کے جانشین کی حیثیت سے وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ عرصہ تک سرکاری وکیل رہے۔ اپنے والد مرحوم کی طرح بہت بلند حوصلہ اور مخیر انسان تھے۔ احمدیت کے لیے بڑی غیرت رکھتے تھے اور نہایت جری اور نڈر تھے۔ اپنے اخلاق اور قوتِ ایثار کی بدولت، وسیع حلقہ میں اُنہیں بڑی عزت کا مقام حاصل تھا۔

جامعہ ایبٹ آباد کی تعمیر سے پہلے آپ کی رہائش گاہ پر ہی نمازِ جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہوتی تھیں۔ آپ کی وفات بھی ۱۹۶۲ء میں ہی ہوئی۔

خان بہادر سعید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

جن لوگوں کا تذکرہ یہاں ہو چکا ہے، یہ سب کے سب اپنی زندگی میں ایمان و استقامت دکھا کر لمبی عمریں پا کر اپنے اپنے وقت پر اپنے مولیٰ کریم سے جا ملے۔ اور اُن میں سے اکثر آسودہ حال اولادیں چھوڑ گئے۔ جن میں سے بعض

’الباقیات الصالحات‘ کا درجہ رکھتے ہیں۔ مجھے اِن سب غیر معمولی انسانوں کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور اُن میں ایسی خصوصیات کا مشاہدہ ہوا ہے، جو ایک انسان کو اپنے ہم جنسوں میں ممتاز کر دیتی ہیں۔ ان لوگوں کی زندگیاں حضرت صاحب کی ایک شہادت کو کس قدر ایمان افروز ثابت کرتی ہیں جو آپ نے فرمایا تھا:

؎ لوائے ماپنہِ ہر سعید خواہد بود

ندائے فتحِ نمایاں بنامِ ما باشد

(ہمارا جھنڈا ہر خوش قسمت انسان کی پناہ ہوگا۔ اور کھلی کھلی فتح کا شہرہ ہمارے نام پر ہوگا)

ہزارہ میں تحریکِ احمدیت کو پیش آمدہ ابتدائی مشکلات

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی تحریر ”ضلع ہزارہ میں احمدیہ تحریک کا اثر ونفوذ اور مخالفتِ عامہ“ سے اقتباس:

ابتدائی زمانہ میں احمدیت قبول کرنا ہاتھ میں انگارہ لینا تھا۔ چاروں طرف فتنہ کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ لیکن حق میں کچھ تاثیر ہوتی ہے کہ ہر تلخی شیرینی بن جاتی ہے۔ اور کوئی مشکل، مشکل نظر نہیں آتی۔ مامور الٰہی کی موجودگی تقویت قلب کا موجب تھی۔ کوئی مصیبت پیش آتی تو حضرت صاحب کی خدمت میں خط لکھا جاتا۔ ان کی طرف سے تسلی آمیز جواب آنے پر دلوں کو طمانیت نصیب ہو جاتی تھی۔ اور کوئی خوف یا غم باقی نہ رہتا تھا۔ اس دور کے چند ایک واقعات کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ اور قاری کے لیے ازدیادِ ایمان کا موجب ہوگا۔

دیب گراں میں قیامِ جماعت اور مخالفین کی سرگرمیاں

دیب گراں میں جہاں مخلصین کی ایک جماعت قائم ہو چکی تھی اور ایک گروہ نوجوان احمدی طلباء کا مسجد میں زیر تعلیم رہنے لگا تھا، وہاں مخالف گروہ بھی پیدا ہو چکا تھا، جس کے سرغنہ گاؤں کے نمبردار ملک میر احمد خان تھے۔ جو مولوی محمد یحییٰ کے بلحاظ رشتہ خسر تھے اور ان کے خاندان کے لوگ تھے۔ مسجد مشترک تھی۔ کبھی کبھی باہر سے مولویوں کو بحث کے لیے بلالاتے تھے۔ ایسا ایک بڑا مباحثہ ۲۸ اگست ۱۹۰۴ء کو ہوا۔ قاضی عزیز الرحمن ہندوستان سے دستارِ فضیلت باندھ کر آیا ہوا تھا۔ اس کی بڑی شہرت تھی۔ اس مباحثہ میں سخت لاجواب ہوا۔ بھاری ذلت اٹھانے کے بعد کچھ بہانہ بنا کر فرار ہو گیا۔ باہر جا کر اس نے ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ اور لوگوں کو مشتعل کرتا رہا۔ جس کے نتیجہ میں ۱۴ جون ۱۹۰۵ء کی شام کو مسجد دیب گراں میں ایک بڑا فتنہ پیش آیا۔ غیر احمدی جماعت کے امام، ہدایت اللہ اور ایک احمدی طالب علم کے درمیان کسی معمولی تکرار پر بات بڑھ گئی اور بلوہ ہو گیا۔ احمدی اگرچہ تعداد میں کم تھے، لیکن جوشِ ایمان اور تائید الٰہی ان کے آڑے آئی اور زخمی زیادہ فریق مخالف میں سے ہی ہوئے۔ دوسرے روز پولیس آ گئی اور مقدمہ کی صورت بن گئی۔ مسٹر پاول، ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے فریقین کو طلب کیا۔ وہ خود ایک لمبے دورے پر جا رہا تھا۔ دق کرنے کے لیے وہ اپنے ساتھ ساتھ پھراتا رہا۔ بالآخر بمقام بالاکوٹ پیشی ہوئی۔ شروع شروع میں اس بات پر زور دیتا رہا کہ احمدی اپنی علیحدہ مسجد بنالیں۔ اور مثال کے طور پر انگلستان میں ایک عیسائی فرقہ کے علیحدہ گرجے بنانے کا ذکر کیا۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب نے اپنے حقوقِ مسجد سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا تو اسے غصہ آ گیا اور ہتھکڑی لگانے کا حکم دیا۔ ہتھکڑی موقعہ پر موجود نہیں تھی۔ سپاہی تھانے کی طرف دوڑا۔ اسی اثناء میں مولوی صاحب نے مسٹر پاول کے سامنے تقریر کی۔ جس میں ملکہ وکٹوریہ کے مشہور اعلان دربارہ انصاف و آزادی مذہب وعقیدہ کا حوالہ دیا۔ اہل برطانیہ کے حق و انصاف پسندی کا ذکر کیا۔ اور پنجاب چیف کورٹ کا فیصلہ پیش کیا، اور سیالکوٹ و جہلم وغیرہ میں احمدیوں کو

مسجد یں ملنے کا بھی ذکر کیا۔ جب سپاہی ہتھکڑی لگانے لگا تو مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا کہ یہ میرے لیے فخر ہے۔ اس پر مسٹر پاول نے سپاہی کو روک دیا اور بڑے جوش سے کہا: "میں تم سے مسجد نہیں لینا چاہتا"۔ پھر فریقین کو پابند ضمانت کر کے حکم دیا کہ دونوں جماعتوں کا مسجد پر مساوی حق ہے۔ جو فساد کرے گا، اس کی ضمانت ضبط کی جائے گی۔ اس کے بعد کوئی واقعہ شرارت کا اس گاؤں میں پیش نہ آیا۔

مباحثۂ داتہ

ضلع ہزارہ کی تاریخِ احمدیت میں مباحثۂ داتہ بھی ایک اہم واقعہ ہے جو بے حد ایمان افروز ہے۔ یہ واقعہ ۱۲ اگست ۱۹۰۳ء کو پیش آیا۔ داتہ کا ایک باشندہ ضیاء الدین موضع کوکل میں پٹواری تھا۔ اُس نے مولوی محمد ابراہیم، امام مسجد کوکل، جو اس وقت علماء ہزارہ میں چوٹی کا عالم شمار ہوتا تھا، سے کہا کہ داتا میں بڑا فتنہ کھڑا ہو گیا ہے۔ اگر آپ علماء نے توجہ نہ کی، تو تمام گاؤں گمراہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ضیاء الدین پٹواری کی ریشہ دوانیوں سے میر جی فتح علی شاہ، نمبردار داتہ کی دعوت پر مولوی صاحب کوکل داتہ میں وارد ہوئے۔ میر جی فتح علی شاہ کے فرزند حیات علی شاہ صاحب احمدی ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب کوکل نے مقامی مولوی عبدالکریم صاحب سے مشورہ کیا۔ اس نے، جو ایک فہیم اور زیرک انسان تھا، سوال کیا: "آپ احمدیوں سے کیا بحث کریں گے"۔ مولوی صاحب نے کہا کہ نحو اور اصول وغیرہ پر بحث کریں گے، تو انہوں نے کہا کہ احمدی تو وفات وحیات مسیح کے علاوہ دوسری بحث ہرگز نہ کریں گے۔ کیونکہ متنازع فیصلہ مسئلہ صرف یہی ایک ہے۔ اس میں تم کیا جواب دو گے۔ اس پر مولوی کوکل نے کہا: "حسینی اور قادری تفاسیر موجود ہیں وہ ہمارے حق میں ہیں"۔ مولوی عبدالکریم نے کہا: "حسینی اور قادری کو آگے رکھ کر پیچھے سے پتھر مارو۔ قرآن کی آیت کے مقابل پر آیت قرآنی پیش کرنی ہوگی"۔ اس پر مولوی کچھ پریشان ہوا۔ تاہم اس نے مولوی محمد یمین صاحب احمدی سے کچھ بحث شروع کی۔ لیکن ابھی کچھ زیادہ بات نہ ہوئی تھی کہ خود ہی کہا کہ محمد یمین نے کوئی باقاعدہ علم

حاصل نہیں کیا، دستارِ فضیلت نہیں باندھی۔ محض اردوخوان ہے۔ مباحثہ کے لائق نہیں۔ ہاں، اگر مولوی یحییٰ مباحثہ کیلیے تیار ہو جائیں تو وہ بات کرے گا۔ چنانچہ انہیں دعوت دی گئی۔ وہ فوراً معہ اپنے بھائی محمد یعقوب اور حیات اللہ اور محمد دین رفیقان وشاگردان کے داتہ کے لیے چل پڑے اور مولوی حمید اللہ (چھہڑ والے) صاحب کو اطلاع دی۔ وہ بھی پہنچ گئے۔ یہ لوگ حاجی احمد جی کے مکان پر فروکش ہوئے۔ محمد اسماعیل کوکلی کی امداد کے لیے قاضی عزیز الرحمن اور مولوی محمد اسحاق مانسہروی پہنچ گئے۔ اگلی صبح مباحثہ ہونا تھا۔ رات کو مخالف مولوی مباحثہ کی مشق کرنے لگے۔ چنانچہ عزیز الرحمن اور محمد اسحاق "احمدی" کا پارٹ ادا کرنے لگے۔

دلیل پیش کی: "وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اس سے سب انبیاء کی موت ثابت ہوتی ہے"۔

مولوی کوکلی: "الرُّسُلُ پر الف لام ہے جو عہد ذہنی ہے نہ استغراقی۔ اس لیے سب رسولوں کی وفات نہیں ہوسکتی۔ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں"۔

احمدی: "مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ پھر یہاں بھی الف لام عہد ذہنی ہے اس لیے مسیح سے پہلے بھی کچھ رسول زندہ ہوں گے۔

مولوی کوکلی: لاجواب۔

یہاں تک مشق ہوئی تھی کہ کسی نے بتایا کہ مولوی حیات اللہ احمدی بھی مجلس میں بیٹھا ہے۔ چنانچہ گفتگو بند کر دی گئی۔

اگلی صبح مولوی محمد یحییٰ صاحب نے شرائط مباحثہ لکھ کر دیں جو مولوی حیات اللہ، محمد دین اور میر جی حیات علی شاہ کو لے کر، مولوی صاحبان کے پاس گئے۔ اس وقت تک چھ سات دیگر علماء بھی پہنچ چکے تھے۔ جن میں مشہور مولوی خلیل الرحمن مسوالی بھی تھے۔ یہ کاغذ چھ شرائط پر مشتمل تھا۔ باری

باری چھ مولویوں نے دیکھا۔ اور کچھ جواب مولوی مسوالی نے اس پر لکھا۔ مولویوں کی گھبراہٹ دیکھ کر سید غلام حسین شاہ عرف پلیڈر شاہ نے جو حاضر مجلس تھے کہا: ”مولوی یحییٰ کے ساتھ دو معمولی شاگرد اور ان کا چھوٹا بھائی ہے جو کوئی بڑا عالم نہیں۔ جب تم اس چھوٹے سے کاغذ سے اس قدر گھبرا گئے ہو تو اس کے علم کا کیا مقابلہ کرو گے۔ وہ دریائے علم ہے۔ جب وہ عربی عبارت پڑھے گا تو تم کیا خاک سمجھو گے؟“

اُس کی اس صاف گوئی نے مولوی صاحب کی اس رہی سہی ہمت کو بھی ختم کر دیا۔ اور انہوں نے بجائے مباحثہ کے طریقِ فساد کو اپنے حق میں سہل سمجھا۔ چنانچہ بعد از صلاح و مشورہ میر جی فتح علی شاہ، میر جی انور شاہ، مولوی عبدالکریم اور پلیڈر شاہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کے پاس گئے اور کہا: ”آپ لوگوں کی جان کو خطرہ ہے۔ بہتر ہے آپ چلے جائیں“۔ ان کا خیال تھا کہ ان لوگوں کا چلا جانا، ان کے فرار اور مولویوں کی فتح کا نشان ہوگا۔

مولوی صاحب نے کہا کہ ہمیں مباحثہ کے لیے حیات علی شاہ صاحب نے بلایا ہے اور امن کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ جب تک وہ نہ کہیں ہم نہیں جا سکتے۔ پھر یہ چار اشخاص مسجد کے اس حجرے کی طرف گئے جہاں مولوی محمد یمین صاحب رہتے تھے۔ ان کے مقابل مسجد میں ہزاروں جہلاء کا ہجوم تھا۔ مولوی محمد یمین صاحب کو بلایا۔ ”باہر نکلو۔ مولوی یحییٰ بحث کے لیے آ گئے ہیں۔ اور بحث شروع ہونے والی ہے“۔ وہ مسجد کے باہر میدان میں نکلے تو لوگ ان پر پل پڑے۔ ابھی دو چار دھکے ہی لگے تھے، کہ اچانک دو سپاہی گھوڑوں پر سوار مجمع میں داخل ہوئے اور اسے منتشر کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سوار یا تو آسمان سے اترے ہیں یا زمین کے اندر سے نکلے ہیں۔ اس اچانک حملہ سے لوگ اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ ہو کر بھاگنے لگے کہ آن کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔ اسی اثناء میں سید حیات علی شاہ و سید سرور شاہ کے قتل کے منصوبہ کو اللہ تعالیٰ نے محض تائید غیبی سے ناکام بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ حیات علی شاہ صاحب کی جان بانڈی ڈھونڈا اس کے رئیس امیر خان کی مداخلت سے

بچ گئی اور جب سید سرور شاہ کی گردن پر ایک شخص سیدن شاہ نے ہاتھ رکھا ہوا تھا، تو بَندُ وکھتری کو اللہ تعالیٰ نے ان کے بچاؤ کا ذریعہ بنا دیا۔ ان دو سپاہیوں کے موقعہ پر پہنچنے کے اسباب یوں پیدا ہو گئے کہ امیر خان رئیس بانڈی ڈھونڈاں، سید حیات علی شاہ صاحب کا گہرا دوست تھا۔ وہ پیش آنے والے خطرات سے باخبر تھا۔ اس نے اپنے طور پر تھانہ مانسہرہ میں خفیہ اطلاع بھیج دی تھی۔ تھانہ کے انچارج سعید اللہ خان' چھڑ کے مولوی حمید اللہ صاحب سے کچھ تعلق قرابت رکھتے تھے۔ اس لیے فرائض منصبی کے علاوہ ان کے دل میں ہمدردی بھی پیدا ہوئی۔ دو سوار فوراً روانہ کر دیئے اور خود بعد میں پہنچے۔ اور یہ غیبی کمک ان عاجز بندگان خدا کو اس وقت پہنچی جب اس کی انہیں اشد ضرورت تھی۔

جب فتنہ کا طوفان تھم گیا تو سید حیات علی شاہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کے پاس ہنستے ہنستے آئے، اور کہنے لگے، کہ آج ہمارے قادر خدا کی قدرتوں کے اظہار کا دن ہے۔ اور اس کا نشان ظاہر ہوا ہے۔ پھر فرمایا کہ میں رات بہت غمگین تھا، خدا کے حضور سجدے میں پڑا دعا کرتا رہا۔ آخر یہ آواز آئی۔ "وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ" (اور یقیناً اللہ نے تم کو بدر میں مدد دی جب تم کمزور تھے)۔ (ال عمران ۳: ۱۲۴)۔ آج ہم نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ پھر اس چھوٹے سے مجمع پر رقت کا عالم طاری ہوا اور جو روحانی کیفیات اور لذات انہوں نے محسوس کی ہوں گی، وہ کچھ ان کے دل ہی جانتے ہوں گے۔ سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

دیب گراں کے گردونواح کے علاقوں کے لوگ احمدیت کے سخت مخالف تھے اور کوئی موقع کسی احمدی کو اذیت پہنچانے کا ملتا، تو اس میں خوشی محسوس کرتے۔ وہاں کے ایک گاؤں کے رئیس اکثر گھوڑی پر سوار ہو کر ادھر اُدھر جاتے تھے۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب بتاتے تھے کہ جب بھی رئیس مذکور سے ان کا آمنا سامنا ہوتا، وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ یہ بات کئی بار ان کے مشاہدے میں آئی۔ وہ شاید یہ خیال کرتا تھا کہ احمدی کی شکل دیکھنے سے ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ بہت مدت نہ گذری تھی

کہ رئیس مذکور اندھا ہو گیا اور" اندھا میاں" کہلانے لگا۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہو گا تمہیں آنکھیں بند کرنے کی تکلیف ہوتی ہے۔ ہم خود ہی بند کر دیتے ہیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ چھچھ کے ایک شخص شرف الدین نامی کو پیش آیا۔ یہ شخص مولوی حمیداللہ صاحب چھچھ والوں کے ہمراہ قادیان گیا اور واپس آ کر عوام میں مشہور کر دیا کہ مرزا اندھا ہے۔ نعوذباللہ۔ اُس کی اِس گستاخی کو اللہ تعالیٰ نے شاید پسند نہ فرمایا ہو گا۔ کچھ عرصہ بعد اُس کی بینائی مکمل طور پر جاتی رہی اور باقی زندگی اندھیرے میں گذری۔(راوی: طاہر صادق صاحب)

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر:

ایک دوسرے گاؤں کا ایک رئیس بظاہر بڑا عابد تھا۔ صائم الدھر ہونے کے علاوہ ایک ہزار نفل روزانہ پڑھنے کی منت مان رکھی تھی۔ ایک دِن میں ہزار رکعت نماز پڑھنے کا جو انداز تھا، وہ مرغ کے دانے چگنے کا نقشہ سمجھ لیجئے۔ احمدیت کی مخالفت اور احمدیوں کی ایذادہی میں وہ اس علاقہ میں سب سے سبقت لے گیا تھا۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب کئی روز خدا کے حضور استغاثہ پیش کرتے رہے، تو ایک رات الہام ہوا۔ اَفَرَءَيۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ سِنِيۡنَ ﴿۲۰۵﴾

ثُمَّ جَآءَهُمۡ مَّا کَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ۝ مَآ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ مَّا کَانُوۡا یُمَتَّعُوۡنَ۝ (تو کیا تو نے دیکھا اگر ہم انہیں سالوں تک فائدہ اٹھانے دیں۔ پھران کے پاس وہ آ جائے جس کا انہیں وعدہ دیا جاتا ہےتو جس سامان سے فائدہ اٹھاتے رہے ان کے کسی کام نہ آئے گا)۔ (الشعراء ۲۶:۲۰۵۔ ۲۰۷)۔

یہ الہام سنانے کے بعد مولوی صاحب نے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ سِنِیۡنَ کا لفظ جمع سالم ہے جو نو سال کی میعاد تک بولا جاتا ہے۔ ہمیں نو سال صبر کرنا پڑے گا۔ اس الہام کے بعد تسلی ہوئی۔ تاریخِ الہام سے ٹھیک نویں سال، یہ شخص حالت سفر میں تنہائی کی حالت میں وفات پا گیا۔ بڑی مشکل سے اس کی میت کی شناخت ہوئی اور اس کا انجام بڑا ہی عبرت ناک ہوا۔ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ تَوۡصِیَۃً وَّلَاۤ اِلٰۤی اَهۡلِهِمۡ یَرۡجِعُوۡنَ۔ (پس نہ وہ وصیت کرسکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جائیں گے)۔ (یٰس ۳۶: ۵۰)

گذشتہ صفحات پر درج حالات و واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب نے اپنی مخصوص کشش سے ضلع ہزارہ کی چند سعید روحوں کو اپنی طرف کھینچا اور اُن کی زندگیوں میں ایک صالح انقلاب برپا کر دیا۔ اُنہوں نے دین کو دُنیا پر مقدم کرتے ہوئے اور لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خدمتِ دین کے لیے سخنے، قلمے، اور درہمے حصّہ لیا اور حتی المقدور اپنی تمام تر صلاحیتوں اور وسائل کو بروئے کار لا کر اِس ربانی تحریک کی خدمت کی اور اشاعتِ اسلام میں ایثار و قربانی اور جرأت و استقلال کے وہ نمونے دکھائے جو تاریخِ احمدیت میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ حضرتِ اقدسؑ کے الہام ”میں تیرے خالص اور دلی محبوں کا گروہ بھی بڑھاؤں گا اور اُن

کے نفوس واموال میں برکت دوں گا" کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اِن پر خاص فضل کیے، اُن کی دستگیری فرمائی، اُن کو حسناتِ اوّل وآخر سے نوازا، اُن کے نفوس واموال میں برکت ڈالی۔ الحمدُ للہ۔

سچ تو یہ ہے کہ ہزارہ کی گمنام بستیوں کے چند نفوس کو نام اور شناخت امامِ زمان کی برکات سے ہی نصیب ہوئی۔ حضرت مسیح موعود کے منجانب اللہ معجزہ کے طفیل ہی اِن احباب کی زندگیوں میں باطنی انقلاب برپا ہوئے۔ وہ خدا کے ہو گئے اور خدا اُن کا ہو گیا۔ وہ دین اور دُنیا میں نامور ہوئے۔

اللہ تعالیٰ اِن پاکیزہ ہستیوں کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔





تیسرا باب

ابتدائی زندگی اور تعلیم

ولادت وایام طفولیت

(نو)۹۔اکتوبر ۱۹۰۰ء(بمطابق ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ) کوحضرت مولوی محمد یحییٰؒ اور اُن کی زوجہ محترمہ بی بی فاطمہ نور کو اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند سے نوازا۔ یہی وہ فرزندِ بلند اقبال تھا جس کی نوید نُورالدین اعظم نے دی اور خود مسیح وقت نے ”سعید احمد“ نام پسند فرمایا۔ یہ نومولود اسم بامسمّٰی ثابت ہوا۔اس نام کا اثر اور عکس اُن کے زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہا ہے۔

موضع دیب گراں میں واقع جس گھر میں سعید احمد خان صاحب کی ولادت ہوئی اُس کا نقشہ اُس زمانے میں کچھ یوں تھا کہ گھر میں داخلے کا راستہ ایک ڈیوڑھی سے تھا جو اندر ایک وسیع صحن میں کھلتا تھا۔اس کے دونوں اطراف دو علیحدہ علیحدہ، ایک ایک کمرے اور برآمدے پر مشتمل بڑے بڑے مکان تھے۔ایک الگ اسی طرح کا بڑا سا مکان بغیر برآمدے کے، اور تھا۔صحن میں دوسری سمت چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں، جن میں ایندھن اور گھاس پھوس اور زمینداری سے متعلق دیگر سامان رکھے رہتے تھے۔ایک اور کوٹھڑی میں بڑی بڑی الماریاں رکھی گئی تھیں جن میں ادویات، قیمتی نسخہ جات اور دیگر قیمتی اشیاء اور امانتیں رکھی جاتی تھیں۔گھر کی چاردیواری کے باہر، جانبِ غرب پتھروں کا بنا ایک مضبوط چبوترا تھا، جس پر کھلنے والے کمروں میں سے ایک میں مولوی محمد یحییٰؒ اور مولوی محمد یعقوبؒ کا مطب تھا اور دوسرے کمروں میں مہمانوں کی رہائش کے لیے بندوبست تھا۔

مٹی اور گارے سے بنے ہوئے اِن مکانوں میں مکین چند نفوس پر مشتمل، اِس کنبے کے ہر

فرد کا دِل نورِ ایمان سے روشن تھا۔ احمدیت کی شمع اس گھر میں ڈاکٹر سعید احمد خان کی پیدائش سے پہلے ہی اپنا نور پھیلا چکی تھی۔ اس لیے جب آپ نے اِس دُنیا میں آنکھ کھولی تو اپنے گھر کو اِسی نور سے معمور پایا۔ اور اولاً کان جس آواز سے مانوس ہوئے وہ تسبیحِ کردگار اور ذکرِ رسولؐ تھا۔

سعید احمد اپنے والدین کے اکلوتے فرزند اور دوسری اولاد تھے۔ آپ کی ہمشیرہ نور جہاں بیگم آپ سے سات، آٹھ سال بڑی تھیں۔ آپ گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھے۔ ایک طرف والد اور چچا کی محبت اور توجہ اور دوسری طرف ماں اور بہن کی ناز برداریاں تھیں۔ اس کے باوجود آپ کی تعلیم و تربیت کا ہر لحاظ سے خیال رکھا گیا تھا۔ آپ کی پرورش اور نگہداشت بھرپور خواہشوں، فطری تمناؤں اور شب و روز کی دُعاؤں کے ساتھ کی گئی۔ اِس طرح ایامِ طفولیت ہی میں آپ کے مضبوط کردار اور ہشت پہلو شخصیت کی داغ بیل پڑ گئی۔ جہاں آپ نے اپنی فطرتِ سعید کے ساتھ ساتھ اپنے والد کی علم و حکمت، ذہانت، عقل و دانش، فہم اور عشقِ قرآن وراثت میں پایا، وہاں صبر و تحمل، بردباری، خدمت گذاری اور کشادہ دلی ماں سے ورثہ میں ملی۔ خوش طبعی، صلہ رحمی، انکساری اور انسان دوستی کا جذبہ اپنے چچا سے حاصِل کیا۔

ابتدائی تعلیم

آپ کی تعلیم و تربیت کا آغاز بہت ہی کم عمری میں ہو گیا تھا جب وہ مسلسل اپنے والد اور چچا کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ موسمِ سرما کی لمبی راتوں میں اکثر یہ دونوں بزرگ اپنے گھر میں تندور کے بجھتے ہوئے انگاروں کی تپش سے حرارت حاصِل کرنے کے لیے دیر تک بیٹھ کر محوِ گفتگو رہتے۔ دین کی باتیں اور مسیح موعودؑ کا ذکر ہوتا اور قرآن و اشاعتِ قرآن کی تڑپ ہوتی۔ اِس طرح گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے دینِ اسلام، قرآن اور احمدیت کی محبت آپ کے دل و دماغ میں رچ بس گئی تھی۔ آپ کے والد حافظِ قرآن تھے اور خود قرآن کی تعلیم دیتے تھے مگر اس خیال سے کہ اُن کو اکثر سفر درپیش رہتے ہیں اور تعلیم میں بے قاعدگی نہ ہو، آپ کو قرآن پڑھانے کے لیے مولوی

حیات اللہ صاحب ۱ المعروف 'گلاّ والے اُستاد' ایک احمدی بزرگ کے سپرد کر دیا۔ اُنہوں نے نہایت توجہ سے آپ کو قرآن پڑھایا۔ اِس کے علاوہ ابتدائی دینی اور دنیوی تعلیم خود آپ کے والد محترم نے دی۔ اور ابتداء سے ہی اردو اور حساب کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ مولوی محمد یحیٰی صاحب ۱۹۰۱ء کے زمانہ میں کچھ عرصہ لاہور کے اورینٹل کالج میں انگریزی کی تعلیم حاصِل کر چکے تھے۔ اس ابتدائی تعلیم کے بعد، گاؤں میں کوئی مدرسہ نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو اپنے گاؤں سے کوئی پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ایک دوسرے گاؤں داتہ بھیج دیا گیا۔ داتہ میں ایک پرائمری سکول تھا، اور وہاں کے کچھ معتبر لوگ احمدی ہو چکے تھے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی احمدی تھے اور مولوی محمد یمین صاحب، ایک نیک بزرگ بھی وہاں مقیم تھے، جو ایک درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ ماحول، اس کم عمر بچے کے لیے موزوں تریں سمجھا گیا۔ آپ کی دیکھ بھال کے لیے ایک نوجوان طالب علم کو آپ کے ہمراہ بھیجا گیا۔ جبکہ آپ کی سرپرستی وہاں کے احمدیت سے وابستہ سید خاندان کے بزرگوں کو سونپی گئی۔ آپ وہاں دو سال رہے۔ ہر ہفتے کے آخر میں ایک دِن کے لیے گھر آیا کرتے، اور جاتے ہوئے، ضرور ضد کرتے اور نہ جانے پر اصرار کرتے، مگر والدین آپ کو سمجھا بجھا کر کسی طرح راضی کر کے روانہ کر دیتے۔ ایک مرتبہ گھر آئے تو والد صاحب گھر پر موجود نہ تھے، والدہ کے کہنے پر ضد نہ چھوڑی، لاکھ کوشش کی مگر جانے کو تیار نہ ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ والد صاحب موجود نہیں والدہ صاحبہ کہاں تک سختی کر سکیں گی۔ اِسی طرح ایک دو دِن چھٹی ہو جائے گی۔ مگر والدہ جانتی تھیں کہ اِس وقت نرمی دکھائی تو پھر تعلیم رہ جائے گی۔ اس لیے مولوی حیات اللہ صاحب کو بلوا بھیجا۔ جب مولوی صاحب بھی کہہ سُن کر نہ منوا سکے تو اپنی سخت گیری پر اُتر آئے اور ننھے سعید کو بیری کی خاردار جھاڑیوں پر لٹا دیا۔ کہ "آگ لگا دوں گا"۔

۱: مولوی حیات اللہ، المعروف 'گلاّ والے اُستاد' بعد میں جماعتِ قادیان سے وابستہ رہے لیکن اُن کی خواہش کے مطابق اُن کی نمازِ جنازہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھائی اور آپ کے ہی آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔ گل والے استاد اس لیئے کہلاتے تھے کیونکہ وہ گاؤں کے واحد شخص تھے جن کے پاس سلائی کی مشین تھی اور

اس سے سلائی کرتے تھے۔

آپ کو مانتے ہی بنی۔ آپ بتاتے تھے کہ عرصہ تک پیٹھ پر کانٹوں کے نشان رہے۔ ماں نے آنسوؤں کی جھڑی میں، خاموشی سے ”سعیدی“ کو تیار کر کے سکول کے لیے روانہ کر دیا۔

آپ کے بچپن کے ابتدائی ایام ہی میں، آپ کے والد محترم اپنے فرزند کو مجالس میں تلاوت قرآن اور خطاب کی ترغیب دلانے لگے۔ ایک موقع پر گاؤں میں جماعت کے افراد جمع تھے، کچھ لوگ باہر سے بھی آئے ہوئے تھے اور چھوٹا سا جلسہ تھا۔ آپ کے والد صاحب نے آپ سے تلاوتِ قرآن کے لیے کہا۔ آپ نے زبانی یاد کی ہوئی سورۃ التحریم کی آیت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا ‘‘ کی تلاوت کی۔ اُس وقت آپ اتنے کم عمر تھے کہ ”نارا“ کو صحیح ادا نہ کر سکتے تھے اور ”ناڑا“ کہتے تھے۔ حاضرین میں سے ایک بزرگ نے ایک ’چوّنی‘ انعام میں دی۔

ابھی آپ کی عمر کوئی پانچ چھ برس کی تھی کہ ایک مرتبہ والد صاحب نے خطبۂ جمعہ کے بعد فرمایا ’اب سعید خطبہ دے گا‘۔ سعید احمد اُٹھے اور چھوٹی چھوٹی باتیں حاضرین کو بتانے لگے، جو زیادہ تر عام آداب سے متعلق تھیں، جیسے چھت سے دوسرے گھروں میں کوڑا نہ پھینکیں، گلی میں نہ تھوکیں اور اِسی طرح کی دوسری چند باتیں۔ اس طرح آپ کے سلسلۂ خطابت کا آغاز ہو گیا۔

بیعت بذریعہ خط

سعید احمد خان صاحب کی عمر کوئی چھ برس کی تھی جب آپ نے بذریعہ خط حضرت صاحب کی بیعت کی۔ اُس دور میں دیب گراں کی مسجد میں بہت سے احمدی بچے تعلیم حاصِل کرتے تھے اُن طالب علموں نے اور دیگر لوگوں نے بذریعہ خط بیعت کی۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی بیعت کا جوابی کارڈ بھیجا گیا جس کا جواب آیا: ”بیعت قبول ہوئی۔“

قادیان کا پہلا سفر دسمبر ۱۹۰۷ء

سعید احمد خان صاحب دسمبر ۱۹۰۷ء میں اپنے والد اور چچا کے ہمراہ قادیان گئے۔ آپ کے والد آپ کی کم عمری اور وہاں کے قیام میں دیکھ بھال کی مشکلات کے پیشِ نظر آپ کو ہمراہ نہ لے جانا چاہتے تھے۔ مگر آپ کے کاکا جی (چچا محترم) نے آپ کی حمایت کرتے ہوئے اصرار کیا کہ "اس بار ساتھ لے جائیں پھر موقع ملے نہ ملے"۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب فرماتے تھے:

> "میں اپنے کاکا جی کا احسان مند ہوں کہ اُن کی بدولت حضرت صاحب کا دیدار نصیب ہوا، ورنہ واقعی یہ موقعہ پھر کبھی نہ ملتا۔ حضرت صاحب کچھ عرصہ بعد ہی وفات پا گئے تھے"۔

حضرت صاحب کے ہاتھ پر بیعت

دسمبر ۱۹۰۷ء سے مارچ ۱۹۰۸ء تک آپ قادیان میں رہے۔ اس سے پہلے آپ چھ سال کی عمر میں بذریعہ خط بیعت کر چکے تھے۔ اب آپ کو حضرت مسیح موعودؑ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کا موقعہ میسر آیا۔

قادیان پہنچنے پر والد صاحب نے نصیحت فرمائی: "دیکھو! ہم یہاں حضرت صاحب کی صحبت سے فیض پانے کے لیے آئے ہیں۔ تفریح کے لیے نہیں۔ کھیل کود میں نہ لگ جانا۔ اور جس وقت بھی موقعہ ہو حضرت صاحب کی خدمت میں رہنا"۔

فرزندِ سعادت مند نے باپ کی نصیحت پلے باندھ لی، اور جب بھی کسی ہم عمر نے باہر کھیلنے کے لیے بلایا تو یہی جواب دیا: "ہم کھیلنے کے لیے یہاں نہیں آئے، ہم تو حضرت صاحب کے لیے آئے ہیں"۔

اس عرصہ میں سعید احمد خان صاحب کا معمول رہا کہ در سے لگے بیٹھے، حضرت صاحب کی راہ تکتے، جونہی آپ تشریف لاتے، کم سن سعید دامنِ مسیح کو تھام کر آپ کے نقشِ پا پر چلتے ہوئے آپ کی نشست گاہ تک آتے اور آپ کے قریب بیٹھ جاتے۔ ڈاکٹر صاحب حضرت صاحب کے اس دیدار کا تأثر بیان کرتے ہوئے اکثر فرماتے تھے: ”حضرت صاحب مسجد میں داخل ہوتے تو محسوس ہوتا کہ نور کا ایک لپکا سا کوندا ہے۔ اور پھر ہر طرف اُجالا سا پھیل جاتا اور آپ کے وہاں موجود رہنے تک اُس نور، اُس اُجالے کے پھیلے رہنے کا احساس قائم رہتا۔ گفتگو کے دوران آپ کا چہرہ اور بھی پُرنور اور روشن ہو جاتا“۔

حضرت ڈاکٹر صاحب کے اِن احساسات کا اظہار جناب جنرل محمود الحسن صاحب کے اِس شعر سے بخوبی ہوتا ہے:

ان کا چہرہ تھا یا مہِ کامل وہ اک سیلِ نور تھا، کیا تھا

حضرت مسیح موعود تشریف رکھتے تو آپ کے مرید ارد گرد بیٹھ جاتے۔ آپ محبت اور التفات سے متوجہ ہوتے۔ مریدوں کی گفتگو، پاسِ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بے تکلف ہوتی، اس کے علاوہ کوئی حدِ فاصل نظر نہ آتی تھی۔ لوگ بیعت کرتے تو سعید احمد بھی ہر بیعت کرنے والے کے ساتھ اپنا ننھا سا ہاتھ آگے بڑھا دیتے۔ کئی بار آپؑ کے پاؤں دبانے کا شرف بھی حاصل کیا۔

والد صاحب نے ایک دِن روپئے کا سِکہ سعید احمد کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ”یہ روپیہ تم حضرت صاحب کے ہاتھ میں دینا“۔ حضرت صاحب جب تشریف فرما ہوئے، تو سعید احمد نے ہاتھ بڑھایا اور روپیہ آپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ حضرت صاحب متوجہ ہوئے اور پوچھا: ”یہ بچہ کون ہے؟“ مولوی محمد یحییٰ صاحب قریب ہی تھے بولے: ”یہ حضور کا غلام زادہ ہے“۔ حضرت صاحب نے نام پوچھا تو مولوی صاحب بولے: ”سعید احمد نام ہے، جو خود آپ نے پسند فرمایا تھا“۔ اس پر حضرت صاحب نے سعید احمد خان کے لیے کچھ دُعائیہ کلمات ارشاد فرمائے۔

لفظ 'غلام زادہ' سعید احمد کے لیے نیا اور عجیب سا تھا۔ جب مجلس ختم ہوئی اور باپ بیٹا تنہائی میں ملے تو پوچھا: "غلام زادہ کسے کہتے ہیں"۔ والد صاحب نے سمجھایا: "میں حضرت صاحب کا غلام ہوں اور تم میرے بیٹے ہو تو اِس طرح تم حضرت صاحب کے غلام زادے ہو، یعنی غلام کے بیٹے"۔ یہ بات سعید احمد کو تمام عمر یاد رہی۔

قادیان کے دو تین ماہ کی اِن ملاقاتوں میں سعید احمد خان اس روح پرور ماحول اور فیوض کے آبِ رواں سے، جو حضرت صاحب کی ذات سے جاری تھا، خوب سیراب ہوئے اور مسیح وقت کی نگاہِ سحر انگیز نے ایسا مسحور کیا کہ تا حیات اس غلامی کو باعثِ فخر جانا۔

اسی قیامِ قادیان میں سعید احمد خان کو حضرت مسیح موعود سے ہم طعامی کا موقعہ بھی میسر آیا۔ دیب گراں سے قادیان آنے والوں میں ایک خاتون بھی تھیں جو حضرت صاحب کے گھر کے اندر ہی قیام پذیر تھیں۔ اکثر آپ کے والد آپ کو اُن خاتون کی خبر گیری کے لیے گھر کے اندر بھیجا کرتے تھے۔ ایک دِن سعید احمد اندر تشریف لے گئے تو حضرت مسیح موعود اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ آپ کو پاس بلایا اور اپنے ساتھ کھانے میں شامِل فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے: "اُن چاولوں کی لذت میں کبھی نہیں بھول پایا۔ ایسے خوش ذائقہ اور خوشبودار، باریک چاول نہ میں نے کبھی اِس سے پہلے کھائے تھے اور نہ کبھی بعد میں"۔

حضرت صاحب کی زندگی میں سعید احمد کا یہ پہلا اور آخری قیامِ قادیان تھا۔ اور آپ کے ساتھ کھانا کھانے کا بھی یہ واحد موقع ان کو ملا۔ اس لیے وہ لذتِ طعام، جو اُس روحانی کشش کی بدولت تھی آپ کو اور کہاں میسر آ سکتی تھی۔ اسی لیے وہ اِس لذت کو کبھی بھول نہ پائے۔

مانسہرہ میں طالب علمی کا زمانہ

داتہ کے پرائمری سکول میں دو سال گذارنے کے بعد، آپ کے والد صاحب نے آپ کو

مانسہرہ کے مڈل اسکول میں داخل کروادیا، جو دیب گراں سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر روزانہ گھر آنے جانے کی مشقت اور وقت کے زیاں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مولوی محمد یحییٰ صاحب نے آپ کی رہائش کا بندوبست اپنے ایک معتقد ہندو دوست سائیں داس کے گھر پر کر دیا۔ آپ کو رہنے کے لیے لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی ایک کمرہ نما جگہ دے دی گئی۔ جو عموماً اناج وغیرہ رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور ہندکو زبان میں اسے "تونڑی" یا 'انبار" کہتے ہیں۔ یہاں دِن کے وقت بھی دیا جلا کر روشنی کرنا پڑتی تھی۔

اسکول سے واپس آ کر آپ کا زیادہ تر وقت اسی جگہ پر گذرتا جہاں دیئے کی روشنی میں آپ پڑھتے لکھتے رہتے۔ گھر کے لوگ آپ کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل نہ کرتے، بلکہ چھوٹی سی کھڑکی نما جگہ سے آپ کے برتنوں میں کھانا ڈال دیا جاتا، جسے آپ خاموشی اور صبر وشکر سے کھا لیتے۔ آپ اِس سلوک پر حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لائے اور نہ کبھی والدین ہی سے احتجاج کیا کہ اپنے گھر کے کشادہ صحنوں اور کھلے کھلیانوں کی فضا اُن کے نصیب میں کیوں نہیں۔

مانسہرہ کے بورڈنگ ہاؤس میں قیام

جب سعید احمد چھٹی جماعت میں ہوئے تو آپ کو مانسہرہ مڈل اسکول کے ساتھ منسلک بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں شیخ ضیاء اللہ صاحب سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بورڈنگ کی نگہداشت اُن کی نگرانی میں ہوتی۔ شیخ صاحب احمدی تھے اور مولوی محمد یحییٰ صاحب سے خصوصی تعلقات رکھتے تھے، اس لیے سعید احمد پر خاص توجہ دیتے تھے۔ ویسے بھی شیخ صاحب کی نگرانی کی وجہ سے بورڈنگ کا ماحول بہت اچھا اور معیاری تھا۔ سعید احمد ہمیشہ احمدیت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے اس لیے اپنا نام سعید احمد احمدی لکھتے تھے۔ یہ بات تو ویسے بھی کسی سے چھپی نہ تھی کہ آپ احمدی ہیں، اس لیے بعض شریر ہم مکتب آپ کو چھیڑنے سے گریز نہ کرتے اور آپ کی تضحیک کے لیے آپ کو "تہتر" کہتے (یہ نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے خیال میں احمدیت ایک تہترواں فرقہ

ہے)۔ آپ ایسی توہین وتضحیک سے کبھی گھبرائے نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ دل لگا کر محنت اور لگن سے اعلیٰ نتائج حاصل کر کے شریروں پر اپنی برتری ثابت کی۔

گھر کے باہر کا ماحول جیسا بھی تھا، گھر کے اندر کے ماحول نے آپ کو باریک تر تقویٰ کی راہوں پر بچپن سے ہی گامزن کر دیا تھا، جو عمر کے ساتھ مزید پختہ ہو گیا۔ اِس سلسلے میں سعید احمد خان کے بچپن کے دو واقعات باعثِ دلچسپی ہوں گے۔

یہ دونوں واقعات ایک طرف تو آپ کے چچا محترم مولوی یعقوبؒ صاحب کے باریک تقویٰ کے عکاس ہیں اور دوسری طرف، اس ماحول کے دوررس اثر کی عکاسی کرتے ہیں جو ڈاکٹر سعید احمد خان کی زندگی میں نمایاں رہا۔

آپ کے چچا محترم روزے سے تھے اور مانسہرہ سے گاؤں آتے ہوئے راستے میں افطار کا وقت آ گیا۔ آپ نے ایک پودے کے ترش پتے مُنہ میں ڈال کر چبا کر روزہ افطار کر لیا، حالانکہ اُس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی جس میں مٹھائی تھی۔ وہ مٹھائی اس لیے استعمال نہ کی تھی کیونکہ وہ سائیں داس بزاز نے سعید احمد کے لیے دی تھی۔ آپ نے اِسے امانت میں خیانت جانا کہ سعید احمد تک پہنچانے سے پہلے استعمال کر لیں۔ حالانکہ وہ جانتے بھی تھے کہ اُس نے یہ صرف رسماً کہا تھا کہ بچے کے لیے کچھ مٹھائی ہے۔ اُس کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ صرف بچے کے لیے ہے۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ اسکول کی تعطیلات کے دوران سعید احمد گھر میں بیٹھ کر کچھ لِکھ پڑھ رہے تھے، آپ کے کاکا جی کا اُس طرف گذر ہُوا تو دیکھا کہ بھتیجے کے پاس مٹھی بھر نِب رکھے ہیں، جو کسی صورت خریدے نہیں گئے۔ سعید احمد سے استفسار پر پتہ چلا کہ ایک ہم جماعت نے کتب فروش کی دُکان سے پورا ڈبہ اٹھا لیا تھا اور سب ہم جماعتوں کو بانٹ دیئے تھے۔ چچا نے بھتیجے کا ہاتھ تھاما اور تپتی دوپہر میں چھ میل دور داتہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے اور نِب واپس کروائے۔ بھتیجے کو نصیحت کرتے ہوئے سمجھایا:

"چوری کے نب سے جو لکھو گے اُس کا حرام تمہاری کمائی میں شامل ہوتا رہے گا"۔

شفیق چچا کی عملی تربیت کیسے رائیگاں جاتی۔ نتیجتاً سعید احمد خان کی شخصیت مجسم تقویٰ تھی۔

قادیان میں دوسری مرتبہ

۱۹۱۲ میں مولوی محمد یحییٰؒ صاحب نے اپنے فرزند، سعید احمد کو اپنے گاؤں کے چند بزرگوں کی معیت میں قادیان بھیجا، تاکہ وہاں کے ماحول سے وہ فیض یاب ہو سکیں۔ کچھ ایسے ہی مقاصد کے پیش نظر اکثر لوگ وہاں جا کر اُس روح پرور ماحول میں وقت گذارتے تھے۔ یہ دور مولٰینا نورالدینؓ کی قیادت کا تھا۔ سعید احمد خان ساتویں جماعت کے طالب علم تھے اور اچھی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ مولٰینا نورالدینؓ، بعد از نمازِ ظہر مسجد مبارک میں بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے۔ سعید احمد خان باقاعدگی سے اِس درس سے مستفید ہوتے۔ آپ کا یہ انہماک، شوق اور باقاعدگی مولوی نورالدینؓ صاحب کو متوجہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک روز کسی سے استفسار کیا کہ یہ نوعمر لڑکا کون ہے؟ دیب گراں کے ایک بزرگ امیر اللہ نے کہا: "مولوی محمد یحییٰؒ دیب گراں والے کا بیٹا ہے"۔ یہ سُنا تو مولوی نورالدینؓ نے محبت سے ہاتھ بڑھا کر آپ کو اپنے سینے سے لگایا اور بوسہ دیتے ہوئے فرمایا: "یہ تو ہمارے پیارے دوست کا بیٹا ہے۔ اُس دوست کا، جس نے ہماری بیماری میں چھ ماہ تک ہماری چارپائی سے لگ کر ہماری دِن رات خدمت کی ہے۔ ایسی خدمت جیسی نہ کوئی بہن کر سکتی ہے، نہ بھائی، نہ بیوی اور نہ اولاد"۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اِس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے: "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ایک ولی اللہ نے فرطِ محبت سے مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ جب کبھی اس گذرے وقت کو یاد کرتا ہوں تو مولوی صاحب کی داڑھی کو اپنے چہرے سے چھوتا ہوا محسوس کرتا ہوں"۔

قادیان کا تیسرا سفر اور تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں داخلہ

سعید احمد خان بچپن کے اُس دور میں قادیان کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کچھ نقوش حضرت صاحب کی زندگی میں وہاں چندروزہ قیام کے تھے، کچھ حضرت مولٰینا نورالدین کی شفقت اور صحبت کی کشش نے ایسا نقش دل و دماغ پر ثبت کیا کہ آپ نے دِل میں یہ ٹھان لی کہ اگر تعلیم حاصِل کرنا ہے تو یہی قادیان وہ جگہ ہے جہاں وہ پڑھیں گے۔ مانسہرہ اسکول کے احمدی ہیڈ ماسٹر، شیخ ضیاء اللہ کا تبادلہ ہو گیا تھا اور وہاں کا نظام اب ایسا ستھرا نہ رہا تھا۔ سعید احمد اِس بازاری ماحول سے بیزار ہو گئے تھے جہاں اُنہیں احمدی ہونے کے سبب استہزاء کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔

جب ساتویں جماعت کا امتحان پاس کیا تو والد صاحب سے قادیان میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر وہ رضامند نہ تھے۔ لیکن آپ دِل میں ٹھان چکے تھے کہ وہیں پڑھیں گے۔ چند دنوں میں والد صاحب، مولوی محمد یحییٰؓ، ماہِ رمضان قادیان میں گذارنے کے لیے روانہ ہوئے۔ سعید احمد خان اُس وقت مانسہرہ اسکول میں تھے۔ آپ کو معلوم ہوا تو اگلے روز بغیر گھر میں اطلاع کیے، اپنا مختصر سامان اور کتابوں کا بستہ اُٹھا کر چل پڑے۔ رات کو ایبٹ آباد شیخ نور احمد صاحب کے گھر پر قیام کیا۔ شیخ صاحب متعجب ضرور ہوئے کہ مولوی صاحب ایک روز قبل صاحبزادے کو ہمراہ کیوں نہیں لے گئے، مگر دخل اندازی نہ کی۔

جیب میں چند روپے تھے جو ایبٹ آباد سے ٹیکسلا اور پھر آگے بٹالہ سے قادیان پہنچنے تک کے لیے کافی ہوتے مگر ٹیکسلا کے قریب ایک جگہ پر، بارش کی وجہ سے نالے میں بہت پانی تھا۔ وہ ٹانگہ جس میں آپ بمع دوسرے سواروں کے سفر کر رہے تھے، اُس نالہ میں پھنس گیا۔ وہاں سے ایسے موقعوں پر 'پہلوان' ٹانگہ اُٹھا کر پار کرواتے تھے، اور تمام ٹانگہ سوار اُنہیں ادائیگی کرتے۔ اِس طرح پیسے زائد خرچ ہو گئے۔ تاہم بٹالہ تک کا ٹکٹ خرید لیا اور اب جیب خالی۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ تھا کہ کوئی سبب بن جائے گا۔ ایک سِکھ آپ کا ہم سفر تھا۔ اُس کے لباس پر چھینٹے پڑ گئے تھے، جس سے وہ پریشان ہو رہا تھا۔ ایک سٹیشن پر اُس نے سعید احمد خان کو ایک اکنی دی کہ صابن لا دو۔ صابن خریدنے کے بعد ایک پیسہ بچ گیا، تو سکھ نے کہا: ”یہ تم رکھ لو“۔ صبح سویرے گاڑی بٹالہ سٹیشن پر رُکی۔ ٹانگہ کے کرایہ کے لیے پیسے نہ تھے، اس لیے پیدل روانہ ہو گئے۔ ایک پیسے کے مٹھی بھر میٹھے چنے لے کر جیب میں ڈال لیے اور راستہ بھر دانہ دانہ کر کے مُنہ میں ڈالتے رہے۔ اِس طرح بارہ میل کی پیدل مسافت طے کر کے قادیان پہنچے تو بھوک اور سفر کی تکان سے نڈھال تھے۔ بازار سے گذرے، تو ایک دُکاندار، نظام جان جو ہزارہ کے تھے، نے پہچان لیا کہ یہ تو مولوی محمد یحییٰ کا بیٹا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھیں تو سمجھ گیا کہ صاحبزادے بغیر کچھ کھائے پیئے اتنا سفر طے کر کے آئے ہیں۔ گرم گرم دودھ میں پھینیاں ڈال کر کھلائیں اور خود ہمراہ جا کر مولوی صاحب کے پاس پہنچا آیا۔

والد صاحب سخت ناراض تھے۔ فرزند سے نہ کچھ کہا سُنا اور نہ کوئی بات ہی کی۔ البتہ سحری، افطاری پر خورد و نوش کا اچھی طرح بندوبست کر دیتے تھے۔ سعید احمد خان، جو لگن دِل میں لے کر آئے تھے، اُس کی تکمیل کے اسباب خود ہی تلاش کرنے لگے۔ موسمِ گرما کی تعطیل کے سبب اسکول بند تھا۔ مگر ایک نومسلم طالب علم عبدالرحمان وہیں بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھا۔ اُس سے کچھ رہنمائی ملی۔ عربی ابھی تک لکھی پڑھی نہ تھی، وہ پڑھنے لگے۔ اور اتنا پڑھ لیا کہ آٹھویں جماعت کے باقی طالب علموں کے ساتھ چل سکیں۔ والد صاحب نے عید کے روز، پہلی مرتبہ بات کی اور ناراضگی دور ہو گئی۔ واپس روانہ ہونے سے پہلے نہایت نرمی سے سمجھایا، گھر سے دوری، اور والدہ کی پریشانی کا حوالہ بھی دیا۔ مگر سعید احمد خان یہ پاکیزہ ماحول چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ اکلوتے بیٹے کی آرزو کی تکمیل کے لیے مولوی صاحب کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ آپ کو تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں داخل کروا دیا گیا۔ اِس سلسے میں سعید احمد خان صاحب مولوی صدرالدین صاحب سے مل چکے تھے اور اُن

سے ایک سفارشی خط بھی حاصِل کر لیا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانہ میں تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسکول کا اعلیٰ تعلیمی معیار اور غیر نصابی سرگرمیاں آپؓ کے اعلیٰ نظم ونسق کی آئینہ دار تھیں۔ آپ کا سلوک طالب علموں سے نہایت مشفقانہ اور محبت آمیز تھا، اس لیے سعید احمد خان کو اِس نئے ماحول میں ڈھلنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ اور آپ کا شمار اچھے طالب علموں میں ہونے لگا۔



زمانہ طالب علمی میں مولیٰنا صدرالدینؒ صاحب کے بارے میں سعید احمد خان کے تاثرات

مجھے آپ کو ۱۴-۱۹۱۳ء میں بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، کیونکہ آپ اُس زمانہ میں تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے ہیڈماسٹر اور میں اس سکول کا طالب علم تھا۔ آپ کی پرکشش شخصیت کے جو گہرے اثرات اس مختصر سے عرصہ میں میرے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے، وہ آج تک نہیں مٹ سکے اور نہ مٹ سکیں گے۔ میں اگر یہ کہوں کہ اُس زمانے کا تعلیم الاسلام ہائی سکول جو آپ کی راہنمائی میں چل رہا تھا اِس زمانے کے انگلِش میڈیم پبلک سکولوں کی نسبت کئی لحاظ سے بدرجہا بہتر تھا، تو مبالغہ نہ ہو گا۔ آپ کا نظم و ضبط مثالی تھا لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ اپنے سکول کے کسی طالب علم سے کبھی سختی اور درشتی سے پیش نہیں آئے بلکہ ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ وہ میرے ہی

شفیق اور مہربان باپ ہیں۔ آپ کو اپنے طلباء سے اس قدر پیار ہوتا تھا کہ چھوٹے بچوں کے کھیلوں میں شامل ہو کر اُن کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ یہی وجہ تھی کہ سکول کی نصابی اور غیرنصابی سرگرمیوں کا معیار بہت بلند تھا۔ آپ سکول کے تمام عملہ اور طلباء کی صرف دنیوی تربیت کا ہی اہتمام نہیں فرماتے تھے بلکہ اُن کی اخلاقی اور دینی تربیت کا خاص خیال فرماتے تھے۔ سکول سے ملحقہ، مسجد نور میں پانچوں نمازیں بالالتزام ادا کی جاتی تھیں اور عصر کے وقت حضرت مولانا نورالدینؓ کے درسِ قرآن میں شامل ہونے کے لیے طلباء قطار باندھ کر آتے تھے۔ حضرت مولانا مرحوم و مغفور کی شخصیت اور اس طرح کی تربیت کا ہی اثر تھا کہ اس اسکول کی شہرت دُور دور تک پھیل گئی اور علامہ اقبالؒ جیسے انسان نے اپنے بیٹے آفتاب احمد کو کسی پبلک سکول میں بھیجنے کی بجائے قادیان کے سکول میں بھیجنا پسند کیا۔ آفتاب احمد صاحب میرے ہم جماعت تھے۔

اس تربیت کا ایک ناقابل فراموش نظارہ کھیل کے میدان میں بھی دیکھنے میں آیا۔ ایک بار کھیلوں کا مقابلہ امرتسر میں منعقد ہوا۔ اسے سرکل کی کھیلوں کا مقابلہ کہتے تھے۔ بہت سے سکول شریک ہوئے۔ ہاکی کا آخری مقابلہ قادیان سکول اور خالصہ ہائی سکول امرتسر کے درمیان ہوا۔ ہماری ہاکی کی ٹیم جیت گئی۔ جب آخری وِسَل بجی تو ہمارے کھلاڑی

میدان میں جہاں کہیں بھی تھے سب کے سب خدا کے سامنے سجدۂ شکر میں گر گئے۔ تماشائیوں پر اس منظر کا بہت گہرا اثر ہوا۔ آج بھی ہماری قومی ہاکی ٹیم کے کھلاڑی، بین الاقوامی میچوں میں کوئی فائنل میچ جیتتے ہیں تو وہ سجدہ شکر میں گر جاتے ہیں۔ یہ رسم بھی قادیان سے ہی چلی۔

(پیغام صلح خاص نمبر۔ مورخہ ۱۶ / ۲۳ دسمبر ۱۹۸۱ء)



دورانِ تعلیم، قادیان میں قیام آپ کے لیے بہت سی فیوض و برکات کا موجب ہوا۔ جہاں مولیٰنا نورالدینؓ کے علمِ قرآن و حدیث سے آپ نے بھرپور فائدہ حاصِل کیا۔ وہاں آپ کو جماعت کے دوسرے بزرگوں کی صحبت بھی نصیب ہوئی، سعید احمد مولیٰنا محمد علی، سید محمد احسن امروہی، مولیٰنا غلام حسن خان پشاوری، شیخ رحمت اللہ اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ سے بالخصوص متاثر تھے اس طرح آپ کی فطری صلاحیتوں کو جلا ملی۔



مولیٰنا محمد علیؒ کے متعلق سعیداحمد خان کے زمانہ طالب علمی کے تاثرات

میں قادیان سکول میں پڑھتا تھا۔ میری عمر ۱۳، ۱۴ سال کی تھی۔ مجھے اس قدر یاد ہے کہ ایک شخص، مجسمّہ انکسار، خاموشی سے اوقات نماز میں مسجد نور میں آتا اور نہایت توجہ اور خشوع سے نماز ادا کرتا اور چپ چاپ واپس

چلا جاتا، جلسۂ سالانہ آیا تو اس خاموش شخص کو میں نے تقریر کرتے اور قوم سے چندہ کی اپیل کرتے سُنا۔ کس قدر قوّت اور شوکت اس کے الفاظ میں تھی اور اس مجمع نے کس محبت اور عاجزی سے اس کی آواز کو سُنا اور اس پر لبیک کہا۔ ایسے نظارے بعد میں کئی بار دیکھنے نصیب ہوئے۔ مگر اس پہلے واقعہ کا ایک خاص اثر دل پر رہ گیا ہے۔

(مجاہدِ کبیر مصنفہ ممتاز احمد فاروقی)

حفظِ قرآن کا شوق

سعید احمد خان کے ایک ہم جماعت حافظ عزیز اللہ شاہ تھے جو قرآن کریم خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ اُن سے متاثر ہو کر جہاں آپ نے سورۃ الکھف جیسی لمبی سورتیں حفظ کرنا شروع کر دیں وہاں خوش الحانی سے ادائیگی کی طرف بھی مائل ہوئے۔

امامتِ صلوٰۃ

موسم گرما کی تعطیلات میں، دیب گراں میں آپ کو نمازوں کی امامت کا بھی موقع ملا۔ عموماً مولوی محمد یحییٰ صاحب خود امامت فرمایا کرتے تھے۔ لیکن ایک دِن نمازِ عصر کے وقت وہ کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے تو جماعت کے بزرگوں نے آپ کو امامت کے لیے کھڑا کر دیا۔ آپ لکھتے ہیں: یہ پہلا دن تھا میں کم سن لڑکا بڑے بوڑھوں کی امامت کروا رہا تھا۔ مغرب کی نماز کے لیے مولوی محمد یحییٰ ؒ تشریف لائے تو ملک امیر اللہ نامی بزرگ نے عصر کی امامت کا تذکرہ کیا۔ مولوی صاحب نے اظہارِ مسرت وتشکر کرتے ہوئے آپ کو ہی مغرب کی امامت کا کہا۔ والد کی موجودگی میں کچھ ہچکچاہٹ تو تھی

مگر تعمیلِ حکم میں آگے کھڑے ہو گئے۔ والد صاحب نے حکم دے دیا کہ دورانِ تعطیل سعید احمد ہی ہمارا امام ہو گا۔ چنانچہ ۱۴ سال کی عمر سے امامت کا آغاز ہوا جو تمام عمر جاری رہا۔ اس طرح حفظِ قرآن کی مزید تحریک بھی ہوئی۔

قادیان میں درسِ قرآن کے معمول سے آپ متاثر تھے۔ دل میں خواہش تھی کہ یہ سلسلہ دیب گراں میں بھی ہو یہاں یہ سلسلہ شروع کیا تو خواہش ہوئی کہ قادیان کی طرح خواتین بھی اِس سے مستفید ہوں۔ آپ کے رشتہ کے نانا (والدہ کے چچا) نمبر دار تھے۔ اُن سے اجازت مانگی کہ مسجد کا ایک چھوٹا دروازہ گلی میں کھلوا دیں تاکہ خواتین اُس راستہ سے مسجد میں داخل ہو سکیں۔ ملک صاحب موصوف خود احمدی نہ تھے۔ یہ کہہ کر اجازت دے دی: "تم ہمارے لاڈلے ہو، تمہاری بات کیسے ٹالیں۔ مگر کسی وجہ سے اِس پر عمل نہ ہو سکا۔

والد صاحب کے ساتھ عہد

اُسی زمانۂ تعطیل کی ایک اہم بات وہ خاص عہد ہے جو مولوی محمد یحییٰؒ صاحب نے اپنے فرزندِ سعید سے لیا اور وہ یہ تھا کہ آپ تمام نمازیں پابندی سے ادا کریں گے اور ترکِ صلوٰۃ نہ کریں گے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان تحریر فرماتے ہیں: "وہ دِن اور آج کا دِن، میں نے اُن سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کوئی نماز ترک کی ہو۔ اِلّا ما شاء اللّٰہ"۔

ایک ایسا ہی عہد خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اِسی عمر کے (تقریباً ۱۴ سال) اپنے پوتے مجاہد احمد سعید سے لیا تھا۔ جس کی پابندی وہ اُسی جذبہ سے کر رہے ہیں

جس طرح اُن کے دادا نے کی تھی۔

مولٰینا نورالدینؒ کی وفات اورقادیان سے واپسی

مولٰینا نورالدین کا دورِ قیادت بے شمار فیوض و برکات کا حامِل تھا۔سعید احمد خان اِس ماحول سے متاثر بھی تھے اوراس چشمۂ علم وعرفان سے سیراب بھی ہورہے تھے، اورنہایت اطمینان سے جی لگا کر دینی اور دُنیاوی تعلیم حاصِل کررہے تھے۔تاہم حضرت مولٰینا کی وفات سے کچھ عرصہ قبل چندعناصِر نےتخریبی تحریکوں کا آغاز کردیا تھاجس سے ماحول کچھ مکدر ہونے لگا۔سعید احمد خان جیسا فطرتی طور پر باشعور،نوعمرلڑکا حالات کی اِس تبدیلی کومحسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔کوئی نہ کوئی بات کان میں پڑ جاتی تومحسوس ہوتا کہ کوئی غیر معمولی سلسلہ چل رہاہے،لیکن اِس کی تہہ تک نہ پہنچ پاتے تھے۔ ۱۳ مارچ ۱۹۱۴ء کوحضرت مولوی نورلدینؒ رحلت فرما گئے۔اُن کی وفات کے معاً بعد جو واقعات پیش آئے سعید احمد خان نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔مولوی صاحب کی تدفین سے پہلے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ اُٹھایا گیا۔مرزا بشیرالدین محمود کا نام تجویز ہوا، اورفوراً بیعت کرنے کوکہا گیا۔لوگوں نے اپنی پگڑیاں کھول کر پھینکیں اور دورتک بیٹھے یا کھڑے لوگوں نے، پگڑی کے کسی حصے کو ہاتھ سے پکڑ لیا اور یوں نئے خلیفہ کی بیعت عمل میں آ گئی، اور یکبارگی ہرطرف ”مبارک مبارک، میاں صاحب کوتختِ خلافت مبارک۔ ایوانِ خلافت مبارک“ کےنعرے بلند ہوئے، اور ایک بازاری ساماحول پیدا ہوگیا۔ ہرطرف شوروغل مچ گیا۔

مولوی محمد علیؒ صاحب کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہوئےتو چندلوگوں نے شور مچا دیا ”بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ“ اورکچھ بھی بولنے نہ دیا۔ یہ واقعہ مسجدِ نور میں پیش آیا۔ چندلوگوں نے اُس وقت بیعت نہ کی۔ ڈاکٹرسعید احمد خان اُنہی لوگوں میں سے تھے۔کم عمری کے باوجودصحیح اور غلط طریقوں کا شعور







دوستوں کے ساتھ

BELI RAM LAMONT
MEDAL

YEAR	NAME
1908	J.C. DEWAN
1909	KARTAR SINGH
1910	JAGDISH CHANDRA
1911	GANESH DAS KAPUR
1912	RAGHU NATH
1913	PREM NATH DOGRA
1914	MOOL SINGH BAZAZ
1915	VASU DEVA
1916	JAGAN NATH MADAD
1917	HARBHAJAN SINGH
1918	MOHKAM CHAND
1919	BHAGWANT SINGH
1920	SAEED AHMAD
1921	HARBANS SINGH
1922	RAM NATH KHHPUNANI
1923	MOHAMMAD ABDUS SAMI
1924	BALDEV SINGH
1925	MIR NAEEM MAHMOOD
1926	PARTAP SINGH BASSALVI
1927	SUR JIT SINGH B.sc.
1928	JAGDISH RAM VAID
1929	TILAK RAM SINGLA
1930	RAM PARKASH.

بیلی رام لیمانٹ میڈل کا آنر بورڈ

۷۸۶

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

ح۔ اور اگر تمکو شک ہے اسکی بابت جو ہمنے اپنے رسول پر اتارا۔ تو اسکی مثل ایک سورت لے آؤ

※

صداقتِ قرآن مجید

جسمیں

عقلی دلیلوں اور فطرتی شہادتوں سے قرآن شریف کا منجانب اللہ ہونا اور اس کا
تمام کتب سابقہ الہامیہ پر فضیلت رکھنا ثابت کیا گیا ہے۔

از

سعید احمد خاں متعلم میڈیکل کالج لاہور پریزیڈنٹ سٹوڈنٹس اشاعت اسلام یونین

※

سٹوڈنٹس اشاعتِ اسلام یونین نے شائع کیا

سنہ ۱۹۲۳ء

باہتمام ملک دین محمد مینیجر دین محمدی پریس لاہور میں طبع ہوا:۔

پہلی تصنیف کا سرورق

Name of Officer Saeed Ahmad M.B.B.S.

Caste or Race Awan (Qoraishi)

Residence Dehgaran, District Hazara.

Father's name and residence M. Mohammad Yahya of Dehgaran

Date of birth by Christian era as nearly as can be ascertained 9th Oct, 1900.

Exact height by measurement 5 feet 9½ inches.

Personal marks for identification (1) A mole on the upper lip
(2) a dog bite scar on the posterior aspect of the left calf.

Signature of Officer Saeed Ahmad

Captain
Civil Surgeon

Signature of the Head of Office.

I do hereby declare that I have not at any time been pronounced unfit for Government employment by the Medical Board at the India Office or any other duly constituted Medical authority.

Saeed Ahmad
Signature of Officer.

(*Punjab Government letter* No. 2353, *dated* 23-8-86.)

پہلا میڈیکل سرٹیفیکیٹ

Nathiagali 10.6.31

Dear Said Ahmad.

I write to tell you how very much I hope for your recovery. I did not know till Major Hubau informed me the other day that there was a suspicion of Phthisis in your case. I knew of course that there was a danger of this developing. However I was also informed that no bacillus had been found which is indeed good news. Kindly write me a line & let me know how you are going on. My wife & I will most certainly pray for your recovery & your ability to return to your work in Peshawar but you must not be in a hurry. I shall keep your appointment open for you. With very kind regards & all good wishes for your safe recovery from us both.

Yours Sincerely

C Brierley

کرنل بریئرلے کا ذاتی خط

Jaipur,

11/8/32.

Dear Saeed Ahmad,

I am so sorry for having delayed so long in answering your letter of *6th, July. I was out on tour for ten days, with the result that all my correspondence is behind time.

I am very pleased to hear of your latest improvement, and hope that the net gain in weight will be considerable by the time you finish your leave.

The Coloidal Calcium with Vit. D is a preparation of the Glaxo Laboratories, and you will have no difficulty in getting it. I would recommend 12 daily injections combined with the usual sod. morrh. course. Then when this is finished you might have another course of Lopion injections.

I hope you will get Mansehra as perhaps it will suit you better than Peshawar. The only objection I have to it is that you will have to carry out your treatment independently without the help of K.B. Hakimulla. But this is not impossible.

I cannot understand why my poor successor in Peshawar should have met with such a fate. It is very sad. I have had no details as to what was really behind it. Have you heard anything ?

I have sent your message to my memsahib as I know that she also is interested in your welfare.

My best wishes to you and all members of the family.

Yours sincerely,

[signature]

کرنل ہیوبن کا ذاتی خط

Telephone No. 51.

LADY READING PROVINCIAL HOSPITAL,

NORTH WEST FRONTIER PROVINCE:

Peshawar, 31. Jan 1934.

Dear Saeed Ahmed:

I am writing to congratulate you on your honour. I am very pleased about it & I sincerely hope you will live long & have a happy life - You have done very well - It only seems a few years ago since I promoted you as assistant surgeon in Nathiagali - and now you are a Khan Sahib & well deserved honour. I hope you are keeping good health.

Yours sincerely

[illegible signature]



P E S H A W A R,

The 2nd: January 1935.

Dear Khan Sahib

This is to congratulate you warmly on the title you have received in the New Year Honours' List. I am delighted to see that your services to Government have thus been recognised.

Yours sincerely

G Cunningham

Khan Sahib Doctor Saeed Alam Khan,
Assistant Surgeon, Mansehra.

خان صاحب کے اعزاز کی مبارک باد



GOVERNMENT HOUSE.
PESHAWAR.
NORTH WEST FRONTIER PROVINCE.

1st January, 1944.

Dear Khan Bahadur

I have learned with great pleasure that His Excellency the Viceroy has conferred the title of "Khan Bahadur" upon you. I am glad to know that your services to Government have thus been recognised, and I send you my warm congratulations.

Yours sincerely,

G Cunningham

Khan Bahadur Saeed Ahmad Khan, M.B., B.S.,
S u p e r i n t e n d e n t,
Provincial Tuberculosis Sanatorium,
D A D A R (Hazara District),
N. W. F. P.

خان بہادر کے اعزاز کی مبارک باد

THE VICEROY'S HOUSE.
NEW DELHI.

30th April, 1942.

Dear Doctor Saeed Ahmad,

I would like to let you know how very much I enjoyed my visit to the lovely Dadar Sanatorium. I feel so strongly that such valuable work is being done. I liked the buildings very much and the situation is superb, and I have complete confidence that you and Miss Young between you will make the very best of your opportunities.

With best wishes to you, the Staff and to all the patients,

Yours sincerely,

Doreen Linlithgow

Khan Sahib
Dr. Saeed Ahmad Khan,
Medical Superintendent,
Government Sanatorium,
Dadar,
N.W.F.P.

لیڈی لنلتھگو کا مراسلہ

INSPECTOR-GENERAL OF CIVIL HOSPITALS
AND
INSPECTOR-GENERAL OF PRISONS,
NORTH-WEST FRONTIER PROVINCE.

D.O.No.20/N.

~~Peshawar~~ Nathiagali the 14th May, 1942.

314
15/5/42

My dear Saeed Ahmed,

Reference your demi-official letter No.699/,dated the 6/7-5-1942.

Many thanks for sending a copy of Her Excellency's letter. It is obvious that she must have been very much impressed with her visit since she has singled you out for a special personal letter.

I shall visit Dadar, accompanied by Mr.Lawley on the evening of Tuesday 26th May. As we shall spend the night there I shall be much obliged if you will kindly have the Forest Rest House reserved for us.

Yours sincerely,

[signature]

Khan Sahib Dr.Saeed Ahmad Khan,MBBS.,PCMS.,
Superintendent,
Govt.Tuberculosis Sanatorium,
Dadar.

'SSAID'14/5

لیڈی لنلتھگو کے دورہ کے بارے میں آئی جی کا خط

Nathiagali
31. 6 35

My dear Saeed Ahmad
My wife & I were delighted with your dear kind letter - Today we also received your wonderful present - I don't think you could have thought of anything in this world that I would value more. I have always intended getting an English translation of the 'Koran' & now it has come like a heaven sent gift - Neither my wife nor I will ever forget you - I hold you in the greatest esteem & respect not only for your ability as a doctor but also for your honesty & kindly nature - May God bless you & give you health & strength to continue the great humanitarian work which you are doing. Please keep in touch with me & write & tell me all your doings. With kindest regards from my wife & myself to you & your wife
Yours very sincerely
C. Brierley

قرآن کریم کے تحفہ کا شکریہ

رکھتے تھے۔ قادیان کی فضا اب بالکل بدل چکی تھی۔ نئی خلافت اور اُس کے نتیجہ میں رونما ہونے والی تبدیلیاں سعید احمد کی طبیعت کے موافق نہ تھیں۔ نہ تو مولٰینا نورالدین کی ذاتی شفقت و محبت باقی رہی اور نہ وہ محافلِ قرآن و حدیث۔ بہت سے بزرگ قادیان چھوڑ چکے تھے اور یہ بستی مولوی محمد علی صاحب کے فیوض و برکات سے محروم ہو چکی تھی۔ آپ کا دِل قادیان سے اُچاٹ ہو گیا۔ نویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور والد صاحب سے واپسی کی اجازت طلب کی۔ گھر آنے پر آپ کو ایبٹ آباد کے ہائی اسکول میں دسویں جماعت میں داخل کروادیا گیا۔

ایبٹ آباد میں تعلیمی دور

تعلیم الاسلام اسکول قادیان کے نظم و نسق اور اعلیٰ تعلیمی معیار نے سعید احمد کو ایک پُر اعتماد اور پُر وقار شخصیت عطا کی جس کی وجہ سے آپ، اپنے نئے اسکول کے ہم جماعتوں میں بہت منفرد اور ممتاز نظر آتے تھے۔ ایک موقعہ پر ایک انگریز افسر نے اسکول کے معائنہ کے دوران آپ کے عمدہ انگریزی تلفظ اور مؤدبانہ طرزِ گفتگو کو سراہتے ہوئے آپ سے پوچھا کہ اِس اسکول سے پہلے کہاں زیرِ تعلیم تھے، 'تعلیم الاسلام' سکول قادیان کا نام لیتے ہوئے سعید احمد کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ آپ سکول سے ملحق بورڈنگ ہاؤس میں رہائش رکھتے تھے۔ آپ کے والد کے عزیز دوست، شیخ نور احمد صاحب (وکیل) آپ کے سرپرست تھے۔ شیخ صاحب نہایت بلند کردار اور ہمدرد انسان تھے اور سعید احمد سے خصوصی محبت رکھتے تھے۔ سعید احمد خان کو اکثر اُن کے دولت خانہ پر جانے کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ وکیل صاحب کے ہاں بھی باجماعت نمازیں ادا ہوا کرتی تھیں۔ اُن کے وسیع مکان کے احاطہ میں ایک کمرہ اس مقصد کے لیے مختص تھا جو بطورِ مسجد استعمال ہوتا تھا۔ نمازِ جمعہ میں سعید احمد خان ضرور شامل ہوتے۔ اِس کے علاوہ اتوار کی چھٹی کا دِن بھی اکثر اُن کی رہائش گاہ پر گذرتا۔ شیخ صاحب کے دونوں بڑے فرزند آپ کے دوست تھے اور تا عمر یہ دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ اُن کے چھوٹے بیٹے اور بیٹیاں آپ کو بڑا بھائی سمجھتے تھے اور "بھائی جان" کہہ کر بلاتے تھے۔

آپ کے طالب علمی کے اِس دور میں جماعت کی چند بزرگ ہستیاں موسمِ گرما ایبٹ آباد میں بسر کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء اور اُس کے چند سال بعد تک چلتا رہا۔ حضرت مولیٰنا محمد علیؒ، حضرت خواجہ کمال الدینؒ اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگؒ صاحب کی تشریف آوری سے ایبٹ آباد کی رونق میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اور سعید احمد اُن کی مجالس میں شامِل ہو کر مستفید ہوتے تھے۔ ایبٹ آباد کے اس قیام کے دوران ایک اور ہستی جس نے آپ کو متاثر کیا، وہ ایک احمدی بزرگ شیخ مظفر الدین خان صاحب تھے۔ وہ یہاں پر بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تعینات تھے۔ اُن کے بابرکت وجود اور عبادات میں عارفانہ رنگ سعید احمد خان کے لیے خصوصی کشش کا موجب تھا۔

اسلامیہ کالج پشاور کا تعلیمی دور

سعید احمد خان کو ایبٹ آباد کے ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کرنے پر ۲۲۵ روپے سالانہ کا وظیفہ ملا۔ اور آپ اسلامیہ کالج پشاور میں داخل ہو گئے جہاں سے آپ نے ایف۔ایس۔سی (پری میڈیکل) کیا۔

اس دور کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے تھے کہ ایف ایس سی کے عملی امتحان میں اُن کو ایک لال بیگ (Cockroach) دیا گیا، جسے (dissect) کاٹ کر اُس کا تجزیہ کرتے ہوئے اعصابی نظام کو نمایاں طور پر دکھانا تھا۔ جب وہ میز پر اپنے کام میں مصروف تھے، تو شیخ لطیف نامی ایک شخص جو غالباً طالب علم تھا، نے نہایت استہزاء سے کہا کہ یہ تو لیمانٹ میڈل کے قابل ہے۔ ابھی کام مکمل نہ ہوا تھا، اس لیے شاید وہ اُسے اتنا صاف سُتھرا نہ لگا ہوگا۔ کام مکمل ہونے پر آپ نے تجزیہ شدہ لال بیگ کو نہایت صفائی سے صحیح طریقہ پر رکھ کر مُمتحن کے سامنے پیش کیا تو انگریز مُمتحن چونک پڑا اور بے ساختہ کہا:

"Junior has brought a beautiful dissection"۔ یہ بچہ ایک نہایت

اعلیٰ dissection کر کے لایا ہے۔

سعید احمد خان کی یہ خوش نصیبی تھی کہ آپ اپنی نوعمری اور تعلیمی ادوار میں جہاں جہاں رہے آپ کو صحبتِ صالحین میسر رہی۔ یہاں پر مولوی محمد حسن خان نیازی پشاوری کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ مولوی محمد حسن خان کے بڑے صاحبزادے عبدالرحیم خان نیازی (جو عام طور پر لالہ عبدالرحیم کہلاتے تھے) اسلامیہ کالج میں بطور پروفیسر تعینات تھے۔ وہ خاندانی مراسم اور جماعت کے تعلق کی بنا پر آپ کی خاص نگہداشت کرتے۔ اس عرصہ میں لالہ عبدالرحیم کو اپنی جماعت کے اِس ہونہار اور نیک خصال طالب علم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، اور آپ سے ایک خاص محبت کا تعلق پیدا ہو گیا۔ اُن کے دِل میں اِس تعلق کو رشتے میں بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی تو مولوی محمد یحیٰیؒ سے بذریعہ خط اِس کا اظہار کرتے ہوئے اپنی چھوٹی بہن کے رشتہ کی پیشکش کی، جسے وہ اپنی ذاتی وجوہات کی بناء پر قبول نہ کر سکے۔ تاہم نیازی خاندان[۱] سے محبت اور دوستانہ تعلقات تا حیات رہے۔

۱: مولوی محمد حسن خان نیازی کے دوسرے صاحبزادے مولوی عبدالرحمٰن نیازی آپ کے ہم عمر تھے اور دوست تھے۔ وہ عموماً موسمِ گرما ایبٹ آباد، آپ کے یہاں گزارتے تھے۔ ۱۹۷۴ء کے سانحہ میں نیازی صاحب بھی دارالسعید میں موجود تھے۔

ایک واقعہ

ایک ایسا واقعہ جو سعید احمد خان کی زندگی کے معمولات پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوا اسی دور کا ہے۔ ایک رات کو وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ سرکس کا تماشہ دیکھنے چلے گئے۔ رات گئے لوٹے تو صبح دیر تک سوتے رہے، دِن چڑھے آنکھ کھلی۔ نمازِ فجر قضا ہوئی بلکہ کالج کا بھی وقت گذر گیا۔ دِل میں اضطراب پیدا ہوا۔ وضو کر کے قضا نماز ادا کی اور قرآن کھولا۔ سورۃ الانبیاء کی پہلی آیت سامنے

تھی۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝

(لوگوں کے لیے اُن کا وقتِ حساب قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں مُنہ پھیرے ہوئے ہیں)

یہی ایک آیت قلب نصیحت آموز کو کافی تھی۔ عمر بھر کے لیے رات گئے کی تماشہ بینیوں سے تائب ہو گئے اور تاعمر اِس پر عامل رہے۔

شادی

سعید احمد خان کی شادی اِسی دورِ طالب علمی میں چھچھ کے اخونزادہ حمید اللہ کی صاحبزادی اُمِ کلثوم بی بی سے ہو گئی۔ آپ کی زوجہ آپ کی تعلیم کی تکمیل اور ملازمت کے آغاز کے زمانہ تک دیہات میں آپ کے والدین کے ساتھ مقیم رہیں۔ آپ کی بڑی صاحبزادی عائشہ بیگ اِسی زمانہ میں پیدا ہوئیں۔

لاہور میں تعلیمی دور۔ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۴ء

سعید احمد خان تعلیمِ طب کے حصول کے لیے لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے، اور اِس طرح وہ ایک مرتبہ پھر ایک ایسے مرکز میں آن پہنچے جہاں آپ کو مولٰینا محمد علیؒ اور آپ کے پاک رفقاء کی صحبت عین عالم شباب میں میسر آئی، جس کا آپ کی کردار سازی میں ایک نمایاں ہاتھ نظر آتا ہے۔

آپ کی دینی اور جماعتی سرگرمیاں

سعید احمد خان میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب اور ڈاکٹر

عبدالعزیز خان، دو دوسرے احمدی طالب علم، آپ کے رفیقان خاص تھے۔ میڈیکل کالج کی سخت اور محنت طلب پڑھائی آپ کی دینی سرگرمیوں میں کبھی حائل نہ ہوئی تھی۔ اپنے دونوں رفیقوں کے ساتھ مِل کر پنج وقتہ نمازوں کا سلسلہ آپ نے قائم رکھا ہوا تھا۔ ہر شام کو احمدیہ بلڈنگس میں درسِ قرآن میں شمولیت، نماز جمعہ، ماہانہ اور سالانہ اجتماعات اور تقاریب میں شمولیت آپ کا معمول تھا۔ قرآن پاک کی تلاوت میں سوز وگداز کالج کی مجالس میں بھی لوگوں کو مسحور کیے بغیر نہ رہتا تھا۔ آپ سلسلہ کا تازہ بہ تازہ لٹریچر نہ صرف خود ذوق وشوق سے پڑھتے بلکہ دوسرے طلباء میں بھی تقسیم کرتے اور اُنہیں تحریکِ احمدیت سے متعارف کراتے تھے۔ ڈاکٹر مرزا رفیق بیگ صاحب اپنے زمانۂ طالب علمی میں سعید احمد خان کے ذریعہ سے ہی احمدیت سے متعارف ہوئے اور سلسلہ میں شمولیت فرمائی۔

اُس دور کے احمدی طلباء دینی جذبہ، ارکانِ دین و شعائرِ اسلام کی پابندی و پاسداری، خدمت و اشاعتِ اسلام، مذاہب غیر کے بارے میں علم وآگاہی اور مخالفِ اسلام تحریکوں کے بطلان اور اسلامی غیرت کے حوالے سے جماعت کی ایک پہچان ہوا کرتے تھے۔

کالج ہاسٹل کا ایک واقعہ

ہوسٹل میں مقیم مسلمان طالب علم اذان دیا کرتے تھے۔ اس پر ہندو طلباء نے جھگڑا کھڑا کر دیا۔ شکایت انگریز پرنسپل کے پاس پہنچی اور اذان دینے پر پابندی لگ گئی۔ اذان دینے والے کچھ دبک گئے اور کمزوری دکھائی۔ سعید احمد خان اپنے چند دوستوں کے ہمراہ مولانا محمد علیؒ کی خدمت میں مشورے کے لیے حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا نے فرمایا: ”مسلمان کس طرح اذان بند کرنے کا حکم مان سکتے ہیں۔ ایسی معمولی بات پر کمزوری دکھائی تو پھر اسلام کی اور کیا خدمت آپ کر سکیں گے؟“ آپ واپس گئے تو پرنسپل کے فیصلہ کے خلاف ڈٹ گئے اور مضبوطی دکھائی تو پرنسپل کو اپنا حکم منسوخ کرنا پڑا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی زمانہ طالب علمی میں تبلیغی مساعی کے متعلق ایک مضمون سے اقتباس، جو پیغام صلح، ۹ مارچ ۱۹۲۴ءمیں شائع ہوا تھا:

بیعت کا خط

اخویم مکرم سعید احمد خان صاحب متعلم میڈیکل کالج لاہور ایک سلیم الطبع، نیک اور قابل نوجوان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضرت مسیح موعود اور سلسلہ احمدیہ کی محبت اور اخلاص کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ انہیں ہر وقت سلسلہ کی ترقی اور استحکام کی فکر لگی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ سے وہ علیل ہو کر اپنے وطن دیب گراں میں گئے ہوئے ہیں۔ خداتعالیٰ کا شکر ہے کہ انہیں ایک خطرناک بیماری سے صحت نصیب ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے علاقہ میں تبلیغِ احمدیت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اور یہ سن کر ہمیں مسرت حاصل ہو رہی ہے کہ ان کی کوششیں بار آور ہونے لگی ہیں۔ چنانچہ ان کے گاؤں کے امام غیراحمدیاں بہت کچھ بحث مباحثہ اور سوچ بچار کے بعد سلسلہ عالیہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کا بیعت کا خط اس قابل ہے کہ ناظرینِ کرام اسے پڑھ کر فائدہ حاصل کریں۔ ضرورت ہے کہ ہمارے دوسرے جوان بھی برادر سعید احمد کی طرح ہمت اور جوش

اپنے دلوں میں پیدا کریں تاکہ سلسلہ کی ترقی کا موجب ہوں۔

بخدمت فیض درجات فیض موہبت فیض رسان جناب مولانا مولوی صاحب آدام اللہ اقبالہُ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ، و آداب، واجب علینا، آنکہ یہ خاکسار رحمتہ اللہ ولد مولوی سید احمد ساکن دیب گراں درخواست بیعت کرتا ہے، جلسہ سالانہ میں شامل ہوا۔ میں سلسلہ احمدیہ کے سخت مخالفین میں سے تھا۔ بعض سجادہ نشینوں کے ہاں قبل ازیں جاتا رہا ہوں، لیکن جو احمدیہ بلڈنگس لاہور میں دیکھا کہیں نہ دیکھا تھا۔ دل کے اندر جو نقشہ لے کر گیا تھا، ہر بات کو اس کے برعکس پایا۔ اشاعتِ اسلام اور حمایتِ اسلام کی جو روح اس جگہ دیکھنے میں آئی، وہ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ قصہ کوتاہ اینکہ ایک مخالف کی حیثیت میں داخل ہوا، اور مداح بن کر رخصت ہوا۔

صرف اعمال پر نظر ہوتی تو میں بغیر بیعت کئے وہاں سے رخصت نہ ہوتا لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بعض ایسے لوگوں میں بھی خاص جوش عمل نظر آتا ہے جن کے اصول اور عقائد بالکل ناقص ہوتے ہیں۔ میری علمی واقفیت سلسلہ کے متعلق نہایت ہی قلیل تھی، اس لیے یہ ارادہ ساتھ لے کر لاہور سے واپس ہوا کہ علمی تحقیقات کی جاویگی۔ وفات و حیات مسیح کے مسئلہ کو کئی ایک روز میں اخویم

سعید احمد کی معرفت طے کیا، اور وفات کا قائل ہونے کے بعد میں نے تمام بحث کو تین سوالات کی صورت میں............

...................ان تین سوالات کو لے کر میں قریہ قریہ پھرا مگر مولوی صاحبان کو ان کے جواب سے عاجز پایا۔ اور ایسے مولویوں کے پاس بھی گیا جو علاقہ میں فاضل اجل مانے جاتے ہیں، لیکن ان کے ہاں بھی بجز تعصب اور ضد کے کچھ نہ پایا۔ ....

اس خط کے ذریعہ میں ایک جہان پر اتمام حجت کرتے ہوئے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوتا ہوں، اور درخواست کرتا ہوں کہ میرے واسطے دعا فرماویں کہ خدا وند کریم مجھے استقامت بخشے، اور کئی سعید روحوں کو میرے ذریعہ ہدایت کرے۔

والسلام، خاکسار

رحمت اللہ از دیب گراں۔ ہزارہ

بیلی رام لیمانٹ میڈل کا اعزاز

امتحان کے دِن قریب تھے، موسمِ گرما کی شدت میں رمضان کے روزے بھی مشقت طلب تھے، مولٰینا محمد علیؒ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر اِن حالات میں روزے سے رُخصت کا

مسئلہ پوچھا، مولٰینا نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں فرمایا:

''شوربے میں دھنیا ڈال لیا کریں، پیاس کم لگے گی''۔

یہ اشارہ کافی تھا، چنانچہ روزہ ترک کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ خدا تعالیٰ نے امتحان میں شاندار کامیابی سے نوازا اور 'بیلی رام میڈل' کے حقدار ٹھہرے۔ یہ میڈل ۱۹۰۸ء سے جاری ہوا تھا۔ اور ۱۹۲۰ء سے پہلے یہ میڈل کسی بھی مسلمان طالب علم نے حاصِل نہیں کیا تھا۔ اِس طرح اناٹومی (anatomy) کے مضمون میں اول نمبر پر آ کر آپ نے یہ تمغہ حاصل کیا، اور پہلی دفعہ کالج کے بورڈ آف آنرز پر ایک مسلمان کا نام لکھا گیا۔ مسلمانوں نے اِس واقعہ کو بہت اہم قرار دیا اور خوب دھوم دھام سے خوشی کا اظہار کیا۔ الحمد للہ۔

يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اس میڈل سے متعلق ایک واقعہ یوں بیان فرماتے تھے، کہ کالج کے اینٹمی ہال میں ایک بورڈ آف آنرز نسب تھا، جس پر بیلی رام لیمانٹ میڈل حاصل کرنے والے طلباء کے نام درج تھے۔ یہ میڈل ہر سال اُس طالب علم کو دیا جاتا تھا جو اینٹمی کے امتحان میں اوّل آئے۔ آپ کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ اس بورڈ پر اب تک کسی مسلمان کا نام نہ تھا۔ اس لیے آپ نے اس میڈل کے لیے مقابلے کا ارادہ کر لیا۔ جب ہندو طالب علموں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ وہ کہتے پھرتے تھے: ''مُسلا میڈل جِنتڑ یں دا سوچدے''۔ اس استہزا سے سعید احمد خان اتنے رنجیدہ ہوئے کہ برُوم ہوسٹل کی چھت پر گئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لیے سجدہ میں گر گئے۔ آپ فرماتے تھے کہ آپ اتنا روئے کہ چھت کی مٹی تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپ نے انتہائی محنت سے پڑھائی شروع کر دی کیونکہ آپ کا مقابلہ ''بودی باندھ کر پڑھنے والے'' ہندوؤں سے تھا۔ آخر امتحان کا دن آیا۔ آپ بیان کرتے تھے کہ روایت یہ تھی کہ مُمتحن امتحان دینے والوں سے پوچھتے تھے کہ وہ اینٹمی کے کس حصہ سے امتحان دینا پسند کریں گے۔ جب آپ سے یہی سوال ہوا تو آپ نے پورے اعتماد سے جواب دیا:

"انسانی جسم کے کسی بھی حصے کے بارے میں پوچھ لیں"۔ اس کے نتیجے میں مُمتَحِن نے اینٹمی کا سب سے پیچیدہ حصہ، یعنی انسانی کھوپڑی آپ کو تھما دی اور اس کے بارہ میں مشکل ترین سوالات کیے۔ آپ کو تمام فورامینا[۱] (foramina) کی نشاندہی اور نام بتانے کا کہا گیا۔ سعید احمد نے مکمل اعتماد سے تمام نام سہی بتا دیے۔ مُمتَحِن بہت متاثر ہوئے اور اس کے نتیجے میں آپ بیلی رام لیمانٹ میڈل حاصل کرنے والے پہلے مسلمان ٹھہرے۔ اس سے ہندو طالب علموں کا غرور ٹوٹا اور آپ ایک بار پھر اللہ کے حضور سجدہ میں گر پڑے۔ شکر گزاری کے سجدہ میں۔

۱: فورامینا انسانی کھوپڑی کے وہ متعدد سوراخ ہیں جن کے ذریعے دماغ میں سے تمام نسیں اور رگیں باہر جاتی ہیں۔

سٹوڈنٹس اشاعت اسلام یونین

حضرت امیر مولانا محمد علیؒ کی زیرِ سرپرستی، احمدی نوجوان طلباء کے لیے ایک ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا، اس کے پہلے صدر ڈاکٹر سعید احمد خان بنائے گئے۔ یہ ایسوسی ایشن جو ابتداء میں سٹوڈنٹس اشاعت اسلام یونین کہلاتی تھی اور جسے بعد میں احمدیہ ینگ مین ایسوسی ایشن کا نام دیا گیا بہت جلد عملی طور پر جماعت کے کاموں میں حصہ لینے لگی اور سلسلہ کے نوجوانوں کی تربیت و تنظیم میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ بحیثیت صدر سعید احمد خان صاحب کو خود اِس سے بہت فائدہ ہوا اور جماعت کے لیے بہت کچھ کرنے کا شوق دِل میں اُجاگر ہوا۔

یہی ایسوسی ایشن جس کے ابتدائی صدر اور اسے کامیاب بنانے والے سعید احمد خان تھے، آج کل 'شبان الاحمدیہ' کے نام سے قائم اور سرگرم عمل ہے۔

کتاب کی تصنیف

زمانۂ طالب علمی میں سعید احمد خان صاحب نے، پچیس صفحات پر مشتمل ایک مختصر مگر جامع

کتاب بنام ”صداقت قرآن مجید“ لکھی جس میں آپ نے عقلی دلیلوں اور فطرتی شہادتوں سے قرآن شریف کا منجانب اللہ ہونا اور اُس کی تمام کتب سابقہ الہامیہ پر فضیلت کو ثابت کیا۔ یہ کتابچہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اِس کے اختتام پر آپ نے یہ بھی واضح کیا کہ اِس کتاب میں جو بھی لکھا گیا ہے اُس کا سرچشمہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب کی کتاب براہین احمدیہ ہے۔ کتاب کے ابتداء میں تعارفی نوٹ میں اِس بات کا ذکر بڑے پرجوش انداز میں کیا ہے کہ ”سٹوڈنٹس اشاعت اسلام یونین“ جو احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور کی زیرِ نگرانی بنائی گئی ہے، اُس کا اولین مقصد دنیا میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا ہے، اور لکھا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ ہی وہ پاک حربہ ہے جس میں مذہب اسلام کی فتح و نصرت کا راز مضمر ہے، اور سٹوڈنٹس یونین کے سامنے یہی مقصد ہے اور اِس امر کی طرف توجہ دلائی کہ تمام نوجوان اپنے دینی فرض کو پہچان کر اللہ کی راہ میں قدم اٹھائیں تاکہ خدا کا فضل اُن کی طرف متوجہ ہو۔

ہمشیرہ کی وفات ۱۹۲۳ء

سعید احمد خان کی اکلوتی ہمشیرہ نور جہاں بیگم، دو کم سن بچے چھوڑ کر عین عالمِ جوانی میں داغِ مفارقت دے گئیں۔ آپ کو اِس سے بہت صدمہ پہنچا۔ آپ کی تعلیم بھی اِس سے متاثر ہوئی۔ آپ کا معمول تھا کہ امتحان کی تیاری کے لیے لارنس گارڈن میں چلے جایا کرتے تھے، تاکہ کھلی فضا میں تنہائی میں سکون سے پڑھ سکیں۔ بہن کی وفات کے بارے میں آپ فرمایا کرتے تھے:

> بہن کی وفات کے بعد جب میں لارنس گارڈن جاتا، کتاب کھولتا تو چھوٹی سی مینڈکی رقیہ ' (آپ کی بھانجی جو ابھی سال بھر کی بھی نہ تھی) کی شکل نگاہ میں پھر جاتی، اور پڑھائی سے دھیان ہٹ جاتا، دِل اچاٹ ہو جاتا۔ اور یہی صدمہ دل و جان پر طاری ہو جاتا کہ یا اللہ یہ ننھی سی جان ماں کے بغیر کیسے جی پائے گی۔

۱: سعید احمد خان صاحب کی بھانجی رقیہ بھی عین جوانی میں تپِ دق کا شکار ہوئیں، مگر خود آپ نے علاج اور آپریشن کیئے اور خدا نے شفاء دی۔ بیاہی گئیں، نیک اولاد اللہ نے عطا کی اور تقریباً اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

آپ کی ہمشیرہ کی وفات تپ دق سے ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا: ”میں دُعا کرتا تھا کہ یا اللہ یہ مرض پھر کبھی کسی کو نہ ہو، خاص طور پر میرے کسی اپنے کو۔ ایک سال بعد ہی میں خود اِس مرض میں مبتلا ہو گیا“۔

خدا تعالیٰ نے آپ کو اِس مرض سے نہ صرف شفا دی بلکہ خود اِسی مرض کے ہزاروں مریضوں نے آپ کے علاج سے شفا پائی۔ یہ سوچ کر آپ کو آخری عمر تک تاسف سا ہوتا تھا اور فرماتے تھے:

> سینکڑوں مریض خدا کے فضل سے میرے ہاتھ سے شفا یاب ہوئے۔ اور میری بہن کے لیے کوئی علاج تھا ہی نہیں۔

موسم گرما کی تعطیلات میں امتحان کی تیاری

موسم گرما کی تعطیلات میں امتحان کی تیاری کی غرض سے وہ بجائے دیب گراں جانے کے ایبٹ آباد میں قیام فرماتے۔ وہاں آپ شیخ نور احمد صاحب کے مکان کے ایک کمرے میں مقیم ہوتے۔ صبح ناشتے کے بعد ایک خوبصورت باغیچہ میں چلے جاتے، جس کے قریب ہی پانی کا وہ تالاب تھا جس سے شہر بھر کو پانی مہیا ہوتا تھا۔ آپ ہمیشہ کھلی فضا میں رہنا پسند فرماتے تھے۔ لاہور کا لارنس گارڈن (باغِ جناح) اور ایبٹ آباد کا وہ باغیچہ خصوصاً آپ کو امتحان کی تیاری کے لیے پسند تھے۔ دوپہر کا کھانا آپ کا ملازم وہیں لے آتا۔ کبھی کبھار تھاتھی کے بزرگ، بابو محمد صادق بھی کھانا پہنچانے چلے آتے اور کچھ دیر آپ کے ساتھ رہتے۔ بابو صادق صاحب بھی شیخ نور احمد صاحب کے مکان پر ہی رہا کرتے تھے اور ایبٹ آباد میں ملازمت کرتے تھے۔ سعید احمد خان صاحب شام کے بعد گھر

تشریف لاتے تھے۔

میڈیکل کی تعلیم کا آخری سال اور سعید احمد خان کی علالت

میڈیکل کالج کی تعلیم کے آخری سال کے دوران آپ علیل ہو گئے تھے۔ اُس زمانے میں، میڈیکل کے آخری سال میں، بچے کی پیدائش سے متعلق عملی تعلیم کے لیے طالب علموں کو مدراس جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب بھی وہاں گئے اور تربیت مکمل کرنے کے بعد واپسی کے سفر سے ہی آپ بیمار رہنے لگے۔ بخار اور کھانسی کافی بڑھ گئے۔ ایک دن خون تھوکا تو سیدھے کالج کے پرنسپل کے پاس چلے گئے۔ معائنہ پر مرض کی تشخیص تپ دق ہوئی۔ کرنل صدر لینڈ (کالج کے پرنسپل) نے مشورہ دیا کہ چھٹیاں پہاڑی علاقے میں گذاریں۔ کوئی ورزشیں بھی تجویز کیں۔ اور سمجھایا کہ ہوادار کھلی فضا میں رہنا ہی اِس مرض کا علاج ہے۔ لاہور کی آب و ہوا اور گرمی میں رہنا چنداں مناسب نہ تھا، چنانچہ آپ لمبی رخصت پر دیب گراں تشریف لے آئے، اور احتیاط کے طور پر گھر میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہائش اختیار نہ کی بلکہ اپنی ہی اراضی میں ایک سرسبز پہاڑی مقام ٹھلاں میں خیمہ لگوا لیا۔ جب بخار سے کچھ افاقہ محسوس کرتے تو نصابی کتب کا مطالعہ کرتے۔ آپ کے والد اور چچا آپ کی تیمارداری کے لیے آجایا کرتے تھے، مگر والدہ، زوجہ یا دیگر اہل خانہ کو اپنے قریب آنے کی اجازت بہت کم دیتے تھے۔

والد محترم خود آپ کا علاج فرماتے۔ کچھ جدید ادویات لاہور سے منگوا لیتے تھے۔ مگر تپِ دق کا کوئی خاص علاج اُس وقت تک دریافت نہ ہوا تھا۔ کھلی فضا آرام اور خوراک ہی شفایابی میں معاون ثابت ہوتی تھیں۔ خدا کے فضلِ خاص اور والدین اور دوسرے بزرگوں کی دُعائیں قبول ہوئیں اور آپ کو شفا ہوئی۔

مولٰینا محمد علیؒ اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی شفقت اور ہمدردی

سعید احمد خان صاحب کا مولٰینا محمد علی صاحب سے سلسلۂ خط و کتابت رہتا تھا۔ مولٰینا کے خطوط اور دُعاؤں سے آپ کو بہت تسلی رہتی۔ اس زمانے کا ایک واقعہ سعید احمد خان صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اِس طرح تحریر کیا ہے:

> میں ابھی میڈیکل کالج کا طالب علم تھا، بیماری کے باعث رخصت پر تھا اور اپنے وطن کے ایک پہاڑ پر رہتا تھا۔ مجھے حضرت مولٰینا محمد علیؒ باقاعدہ خط لکھتے تھے۔ اور اُن کے خطوط اور دُعاؤں سے مجھے بہت تسلی ملتی تھی۔ ایک مرتبہ مجھے لکھا کہ فلاں قسم کے ٹیکوں سے، جو ڈلہوزی کے سول سرجن نے ایک اور عزیز کو لگائے ہیں، اُنہیں پورا فائدہ پہنچا ہے، تم بھی وہ ٹیکے ضرور لگواؤ۔
>
> ابھی چند روز ہی گذرے تھے کہ حضرت ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب مرحوم نے اِن ٹیکوں کا ایک بکس مجھے بذریعہ ڈاک لاہور سے بھیج دیا۔ میں نے مرزا صاحب کو شکریہ کا خط لکھا تو اُنہوں نے جواب میں لکھا کہ حضرت امیر کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کیونکہ اُنہوں نے ہی ٹیکے بھیجنے کا حکم دیا تھا اور اُنہوں نے اس کی قیمت بھی ادا کر دی ہے۔ قدرتی طور پر اِن باتوں کا اثر میرے دِل سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔

بزرگوں کی دُعا اور دوا، دونوں کارگر ثابت ہوئیں اور جلد ہی مرض سے افاقہ ہوا تو تعلیم کی تکمیل کے لیے آپ لاہور تشریف لے آئے۔

امتحان کی تیاری اور تائیدِ الٰہی کے واقعات

جب وطن سے لاہور واپس پہنچے تو امتحان بالکل قریب تھے۔ کورس تمام پڑھا ہوا تھا۔ مگر

ایک تعلیمی سال ضائع ہو گیا، آپ امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ ڈاکٹر اللہ بخش، جو آپ کے ہم جماعت تھے، سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے: ”پرچے تو کر لو گے، مگر پریکٹیکل کا کیا بنے گا“۔ ڈاکٹر اللہ بخش کی اس بات سے سعید احمد خان کچھ مغموم سے ہو گئے۔ ذہن میں کشمکش سی پیدا ہو گئی۔ ہوسٹل کی چھت پر نماز پڑھی اور رو رو کر دُعا مانگی۔ حالتِ اضطراب میں والد اور چچا کو دُعا کے لیے کہا۔ دونوں نے روزے رکھنے شروع کر دیئے اور دُعا کرتے رہے۔ چند روز بعد چچا نے خط میں لکھا کہ اُنہیں الہام ہوا ہے:

”اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط“ (روح القدس کے ساتھ اس کی تائید کی)

سعید احمد خان خود بھی عجز و الحاح کے ساتھ زاری کرتے رہے۔ ایک دِن عالم خواب میں دیکھا کہ کمرۂ امتحان میں ایک بڑی میز پر پریکٹیکل امتحان کے لیے تمام آلات اور دیگر سامان رکھا ہے، اور آپ امتحان دے رہے ہیں۔ آپ نے اس خواب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اشارہ سمجھ کر وہی ابواب اچھی طرح سے دیکھ اور سمجھ لیے۔ اور امتحان میں وہی پریکٹیکل آپ کو کرنے کو آیا جو خواب میں دیکھا تھا۔

اسی عرصے میں آپ کے والد صاحب نے بھی اپنا ایک رویا آپ کو لکھ کر بھیجا ۔کہ آپ کے والد صاحب نے آپ کو ایک فانوس دیا۔ آپ نے کہا کہ مجھے تو اِس کی ضرورت نہیں رہی آپ اللہ بخش کو دے دیں اُسے ضرورت ہے۔ اس رویا کی یہ تعبیر ہوئی کہ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب ایک پرچہ میں پاس نہ ہو سکے اور دوبارہ امتحان دینا پڑا۔

تحریری امتحان کا یہ حال رہا کہ آپ محسوس کرتے تھے کہ کوئی غیبی طاقت آپ کی مدد کر رہی ہے۔عموماً وہی سوال سامنے آئے جو آپ کو اچھی طرح یاد تھے اِس طرح آپ کو اپنے چچا محترم کا الہام پورا ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔

بزرگان سلسلہ کی خصوصی شفقت اور محبت کا ایک واقعہ

مولانا محمد علیؒ کے متعلق مضمون ”ناقابلِ فراموش“ میں سعید احمد خان صاحب ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹری کے امتحان کے آخری ایک پرچہ میں، میرا ایک ساتھی اور میں چند منٹ دیر سے پہنچے۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے غیر ہمدردانہ اور متعصّبانہ رویہ سے ہمیں کافی پریشانی پیدا ہوگئی تھی اور ایک تعلیمی سال ضائع ہوجانے کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ہم حضرت امیر کے پاس حاضر ہوئے کیونکہ ہم دُنیا میں اپنی ہر مشکل میں اُنہیں اپنا غمخوار اور قوت کا مرکز یقین کرتے تھے تو آپ نے ایک خط حضرت مرزا یعقوب بیگ صاحب مرحوم کے لیے دیا جو ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا: اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ (احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے)(القصص ۲۸:۷۷)۔

حضرت مرزا یعقوب بیگ صاحب پر اس آیت کریمہ کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ کام چھوڑ کر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی موٹر میں بٹھا کر ہمیں پہلے سنڈیکیٹ کے ایک رُکن کے پاس لے گئے جو مسلم عمائدین میں بڑا اونچا درجہ رکھتے تھے۔اُن سے مایوس کُن جواب سُن کر ڈاکٹر صاحب موصوف کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ پھر میڈیکل کالج کے انگریز پرنسپل کی کوٹھی پر پہنچے جو یونیورسٹی کی میڈیکل فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔اُنہوں نے ہماری

امداد کی پوری کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے ہماری مشکل آسان کر دی۔

جزاھا اللّٰہ عنا احسن الجزاء۔ وجعل اللّٰہ الجنۃ شواھا

اس واقعہ کو مرزا مسعود بیگ صاحب نے اپنی کتاب "آئینہِ صدق و صفا" جو مرزا ایوب بیگ صاحب اور مرزا یعقوب بیگ صاحب کی سوانح پر مشتمل ہے، میں اِس طرح بیان فرمایا ہے:

جن دنوں ہمارے محترم دوست خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان لاہور میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے ان کے امتحان کا ایک پرچہ ایک ہندو کے متعصبانہ رویہ کی وجہ سے ضائع ہو رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب کے فیل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ آپ گھبرائے ہوئے حضرت امیر مرحوم و مغفور کے پاس آئے اور اپنی داستان سنائی۔ حضرت امیرمرحوم نے انہیں مرزا صاحب مرحوم کے نام ایک خط لکھ کر دیا اور اس پر قرآن مجید کے یہ الفاظ لکھے: "اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ"۔ حضرت مرزا صاحب نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اسی وقت شیخ سر عبدالقادر، خلیفہ شجاع الدین، مولوی محمد شفیع اور دوسرے سرکردہ مسلمانوں کے پاس، جو یونیورسٹی کے سینٹ یا فیکلٹیوں کے ممبر تھے لے گئے................

قیام لاہور کے زمانۂ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

قیام لاہور کے دوران احمدیہ بلڈنگس لاہور میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے امیر و صدر حضرت مولانا محمد علیؒ کے درس قرآن کریم میں شمولیت کا کثرت سے موقعہ ملا۔ جمعہ، ماہوار اور سالانہ اجتماعات اور دیگر تقاریب میں شمولیت سے حضرت امیرؒ اور دیگر بزرگانِ سلسلہ کو دیکھنے اور اُن سے روحانی طور پر فیض یاب ہونے کے بیش قیمت مواقع میسر آئے۔ اُنہوں نے انجمن کی سرپرستی میں ہم احمدی طلباء کی ینگ مینز احمدیہ ایسوسی ایشن قائم کی جس کا پہلا صدر مجھے بنایا گیا۔ اِس ایسوسی ایشن نے سلسلہ کے نوجوانوں کی تربیت و تنظیم کے لیے بھرپور کام کیا، جنہوں نے آگے چل کر جماعت کے مقاصد کو آگے بڑھانے میں مفید کام کیے۔ چنانچہ لاہور کا یہ قیام میری تربیتی زندگی کا اہم حصہ ہے۔

امتحانات سے فراغت کے بعد آپ دیب گراں واپس تشریف لے گئے۔ امتحان کا نتیجہ آیا اور خدا تعالیٰ نے آپ کو کامیابی دی۔ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب نے آپ کو بذریعہ تار یہ خوشخبری بھیجتے ہوئے مبارکباد دی۔ خدا تعالیٰ کی تائید، بزرگوں کی دُعاؤں، ہمدردانہ سلوک، شفقت، مونست اور سعی سے آپ نے اپنی تعلیم کا یہ دور کامرانی اور کامیابی کے ساتھ ۱۹۲۴ء میں مکمل کیا اور بحیثیت سند یافتہ ڈاکٹر عملی زندگی میں قدم رکھا۔



دوسرا حصہ

سرکاری ملازمت

Medical Department, N.W.F.Province-

Appointment.

No.3249-M dated Peshawar the 1st April 1926.

M. Said MX Ahmad M.B., B.S., is appointed temporarily as a Sub Assistant Surgeon on the cadre of Civil Sub Assistant Surgeons in the N.W.F.Province with effect from the 23rd March 1926 in the vacancy caused by the temporary promotion of Assistant Surgeon K.S. Mohammad Hakimullah Khan to the rank of Assistant Surgeon. He is placed on general duty at the Egerton Hospital, Peshawar, from the same date.

C.I. Brierley,
Lt.Col.I.M.S.,
Chief Medical Officer, N.W.F.Province.

****

No.3253-M dated Peshawar the 1st April 1926.

Copy forwarded to the Civil Surgeon, Peshawar for information in continuation of this Office Memo. No.1224-M, dated the 3rd February 1926 and favour of communication to Sub Assistant Surgeon Said Ahmad who should be asked to fill in the enclosed form of roll and thereafter sent to this Office.

Sd/- C.I. Brierley,
Lt.Col.I.M.S.,
Chief Medical Officer, N.W.F.Province.

No. 7
Office of the Civil Surgeon,
Dated Peshawar, the 5/4/1926

Copy forwarded to the Assistant Surgeon incharge Egerton Hospital, Peshawar for communication to M. Said Ahmad M.B., B.S., and return of the roll duly filled in.

[signature]
Capt: I. M. S.,
(A.L) Civil Surgeon, Peshawar.

To Dr Said Ahmad kindly [illegible] is [illegible] from there. [illegible] 6.3.26

چوتھا باب

سرکاری ملازمت

دورِ اول۔ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء

میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد، ڈاکٹر سعید احمد خان نے سرکاری ملازمت کے حصول کے لیے درخواست دی۔ لیکن اِس سے پہلے کہ آپ کی کہیں تقرری ہوتی، آپ نے ایبٹ آباد میں کرائے پر ایک جگہ لے کر اپنا ذاتی مطب کھول لیا جو جلد ہی چل نکلا۔ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ آپ کو ضلع ہزارہ میں ہی ایک عارضی سرکاری ملازمت کی پیشکش ہوئی جو کوٹ نجیب اللہ کے قریب ایک قصبہ میں تھی۔ آپ نے یہ پیشکش قبول کر لی اور ذاتی مطب بند کر دیا۔

ایجرٹن ہسپتال پشاور میں تین ماہ

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے کاغذاتِ تقرری سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی پہلی ملازمت ۶ جنوری ۱۹۲۶ء سے ۲۸ فروری ۱۹۲۶ء تک کے لیے، ایجرٹن ہسپتال پشاور میں بطور سول سب اسسٹنٹ سرجن کے ۷۰+۲۰ روپے یعنی کل ۹۰ روپے ماہانہ مشاہرہ پر ہوئی۔

یکم مارچ ۱۹۲۶ء سے ۲۳ مارچ تک کا عرصہ اُسی ہسپتال میں آپ نے، بلا مشاہرہ کام کیا۔ یہ ملازمت بھی عارضی نوعیت کی تھی، اِس طرح آپ کل تین ماہ کا عرصہ پشاور ایجرٹن ہسپتال سے منسلک رہے اور شہر میں ایک چوبارہ (موجودہ دور کے فلیٹس کی طرح کا مکان) کرائے پر لے لیا۔

حفظِ قرآن کا موقعہ

قرآن کی محبت آپ کے رگ و ریشہ میں اِس قدر سرایت کر چکی تھی کہ آپ جہاں بھی گئے اور جتنا عرصہ بھی رہے، آپ کی توجہ اِن امور سے کبھی نہیں ہٹی۔ آپ کی رہائش گاہ سے ہسپتال تک کے راستہ میں ایک مقام پر ایک حافظ صاحب بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ آپ نے اِس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے حافظ صاحب کی شاگردی کر لی اور ہسپتال جاتے ہوئے سبق لے لیتے اور آنے جانے کے سفر کے دوران یاد کر لیتے اور واپسی پر سُنا لیتے۔ اِس مختصر عرصہ میں آپ نے تیسواں سپارہ (پارہ عم) حفظ کر لیا۔

مستقل ملازمت اور نتھیا گلی میں تقرری

۲۳ مارچ ۱۹۲۶ء کو آپ کو ایک عارضی نوعیت کی ملازمت پر نتھیا گلی بھیج دیا گیا۔ لیکن تقریباً ایک ماہ بعد ہی ۱۷ اپریل ۱۹۲۶ء کو آپ کی مستقل ملازمت کا حکم جاری ہو گیا۔ نتھیا گلی کا یہ ہسپتال موچی ڈھارا نامی مقام پر تھا۔ ہسپتال کے حدود میں آپ کی چھوٹی سی بنگلہ نما رہائش گاہ تھی۔ آپ نے اپنے اہل خانہ کو بھی یہاں بلا لیا۔

نتھیا گلی ایک پُر فضا مقام ہے۔ موسم گرما میں سرکاری مرکزی دفاتر یہاں عارضی طور پر منتقل ہو جاتے تھے۔ آپ کے افسرِ اعلیٰ انسپکٹر جنرل صحت صوبہ سرحد، کرنل بریئرلے (Brierley) بھی وہاں تشریف لاتے تھے۔ ان انگریز افسر کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو یہاں کام کرتے ہوئے قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ وہ آپ کی قابلیت، ذوق وشوق اور انتظامی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ آپ کی خوش خلقی کے باعث آئی جی صاحب سے آپ کے اچھے مراسم پیدا ہو گئے جو ایک عرصہ تک رہے۔ اِسی طرح انسپکٹر جنرل صاحب کے پی۔ اے محمد حسن خان صاحب سے بھی آپ کے ذاتی تعلقات تا عمر رہے۔ محمد حسن خان کو اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔

نتھیا گلی میں ملازمت کے دوران اکثر آپ کو ایبٹ آباد کا سفر درپیش رہتا۔ ذرائع آمدورفت بہت محدود تھے۔ آپ کو گھڑسواری کا شوق بھی تھا، اس لیے آپ اپنی آمدورفت کے لیے یہی سواری پسند فرماتے تھے۔ اِس سفر میں رات کو راستے میں قیام کرنا ہوتا تھا، جس کے لیے ایک ڈاک بنگلے کی سہولت موجود تھی۔ یہ علاقہ قدرتی، حسین مناظر میں بے مثال ہے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان جیسے حساس طبع شخص کے لیے یہ مناظر خاص طور پر کشش رکھتے تھے۔ اِن مناظر سے متاثر ہوکر آپ کے دِل میں حفظِ قرآن کی تحریک ہوتی اور آپ نے اِس زمانہ میں بالخصوص قرآن پاک کے وہ حصے اور آیات حفظ کیں جو کائنات کی تخلیق اور اُس کے جمال وحسن کاری کے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر سعید احمد خان کی خودنوشت سوانح سے اقتباس:

> اِس سحر آفریں ماحول میں مجھے قرآن کے اُن مقامات اور حصص کو یاد کرنے کا موقع مل گیا جو کائنات کی تخلیق اور اُس کے جمال وحسن کاری سے متعلق ہیں۔ الفاظِ قرآنی کے حفظ کرنے میں، گویا یہاں کا سارا سراپا میری مدد کرتا۔

سول ہسپتال ایبٹ آباد میں تبادلہ۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۶ء تا ۱۴ اپریل ۱۹۲۸ء

یکم اکتوبر ۱۹۲۶ء کو آپ کا تبادلہ ایبٹ آباد سول ہسپتال میں بطور اسسٹنٹ سرجن کے ہو گیا، جہاں آپ تقریباً دوسال تک مقیم رہے۔ ہسپتال میں سرکاری رہائش گاہ آپ کو دی گئی۔ آپ کی لگن اور محنت سے ہسپتال کا معیار کافی بہتر ہوگیا۔ آپ کی انتظامی صلاحیت اور پیشہ ورانہ قابلیت سے آپ کا شمار ضلع ہزارہ کے بہترین معالجوں میں ہونے لگا اور دور دراز کے علاقوں سے لوگ آپ کے پاس علاج کی غرض سے آنے لگے۔ اِس علاقہ میں آپ کے والد حکیم محمد یحییٰ صاحب کی حاذق طبیبی کو بھی شہرت حاصِل تھی۔ اور لوگ آپ کی طبی صلاحیتوں کے مداح تھے۔ جدید طِب سے فائدہ اُٹھانے کے لیے، عوام الناس کو آپ کے فرزند سے بڑھ کر اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔ آپ کی مقبولیت اور آپ

سے عوام کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ہسپتال میں بغرضِ علاج آنے والی عورتیں اکثر آپ کی رہائش گاہ پر چلی آتیں تاکہ اِس ہونہار اور خوش اطوار ڈاکٹر کی ماں کو سلام کر سکیں۔ آپ کے اعلیٰ کردار کی شہرت کی وجہ سے لوگ اپنے بچے بچیوں کو حفاظت اور سرپرستی کے لیے آپ کی تحویل میں دے دیتے تھے۔

آپ کے انگریز افسرانِ بالا آپ کی کارکردگی اور ایمانداری سے بہت متاثر تھے اور اکثر بذریعہ خطوط آپ سے خوشنودی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

ایبٹ آباد میں درسِ قرآن کا سلسلہ

ایبٹ آباد میں شیخ نور احمد صاحب کے دو فرزند شیخ عزیز احمد اور شیخ محمد احمد موجود تھے، جو ڈاکٹر سعید احمد خان کے لیے تقویت کا باعث تھے۔ اُن کی حوصلہ افزائی سے آپ نے یہاں درس اور با قاعدہ باجماعت نمازوں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس کا انتظام انہی برادران کی رہائش گاہ پر ہوتا تھا۔ یہاں کا ماحول بہت سازگار تھا اور سلسلۂ درس کے لیے موزوں بھی۔ بہت جلد ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا جس سے لوگ مستفید ہونے لگے۔

لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور

اپریل ۱۹۲۸ء میں آپ پشاور تشریف لے گئے اور سول ہسپتال میں بطور میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کام کیا۔ پھر جنوری ۱۹۲۹ سے ستمبر ۱۹۳۲ء تک لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں خان بہادر ڈاکٹر حکیم اللہ خان جیسے نامور، قابل سینئر ڈاکٹر کے ماتحت آپ کو کام کرنے کو موقعہ ملا۔ پشاور کے دو مشہور ڈاکٹر، ڈاکٹر عبدالصمد صاحب اور ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب بھی آپ کے ہم عصر تھے، جن سے تاعمر دوستانہ مراسم رہے۔ اپنی ملازمت کے اِس دور کے کچھ واقعات آپ کے لیے شہرت اور عزت کا باعث ہوئے، جن سے نہ صرف آپ کو حکامِ اعلیٰ سے داد و تحسین ملی بلکہ عوام و خواص میں آپ کی شہرت بطور ایک قابل، ہنر منداور شریف النفس ڈاکٹر کے دور دور تک پھیل گئی۔ اُس زمانے

کے چند واقعات باعث دلچسپی ہوں گے۔

ریاست دِیر کے نوابزادہ کا علاج

ریاست دِیر کا نوابزادہ بیمار تھا۔نواب صاحب نے آئی جی صاحب سے پشاور سے کسی قابل اور تجربہ کار ڈاکٹر کونواب زادے کے علاج کے لیے بھیجنے کو کہا۔آئی جی صاحب کی نظرِ انتخاب ڈاکٹر سعید احمد خان پر پڑی۔آپ سرکاری حکم کے تحت اِس سفر پر روانہ ہوگئے۔آپ ابھی سفر میں ہی تھے کہ نواب صاحب کے دربار سے اِس پر احتجاج ہوا، کہ کسی زیادہ تجربہ کار ڈاکٹر، یعنی خود خان بہادر حکیم اللہ خان کو کیوں نہیں بھیجا گیا۔جس کے جواب میں انگریز انسپکٹر جنرل صاحب نے ۲۳ مئی ۱۹۲۹ کے ایک مراسلہ میں لکھ بھیجا:

> "I have sent an execeptionally good man to attend the Nawab's son." (میں نے ایک غیر معمولی طور پر اچھے انسان کو نوابزادہ کے علاج کیلیے بھیجا ہے)۔

دراصل یہ معاملہ کافی حد تک سیاسی اہمیت کا حامِل تھا، جس کا خوش اسلوبی سے انجام پانا نہایت اہم تھا، مگر خدا تعالٰی کی خاص تائید آپ کے شاملِ حال رہی۔آپ نے اپنی خاص حکمتِ عملی اور دانائی سے نواب زادے کے مرض کی تشخیص کی اور علاج کے بعد اُسے تندرست اور خوش وخرم چھوڑ کر آئے۔نواب صاحب تمام عمر کے لیے آپ کے حسنِ اخلاق اور پیشہ ورانہ قابلیت کے گرویدہ ہو گئے۔ ۱۶ جون ۱۹۲۹ء کو آپ واپس پشاور پہنچے تو آئی جی صاحب نے مسکراتے ہوئے آپ کا استقبال کیا اور کہا: "نواب صاحب آپ سے یقینا بہت متاثر اور خوش ہیں۔"

نوابزادہ دِیر کے علاج کی تفصیل بہت دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب، دِیر روانہ ہوتے ہوئے نواب زادہ کے علاج میں درپیش مشکلات سے واقف تھے۔نواب زادہ لاڈ پیار سے بگڑا ہوا

تھا۔ کسی بھی معالج کو ہاتھ نہ لگانے دیتا تھا اور واویلا مچا دیتا تھا۔ نہ معائنہ کرنے دیتا نہ ہی دوا مُنہ میں ڈالنے دیتا۔ اس کی ہنگامہ آرائی سے نواب صاحب برہم ہو جاتے اور معالج پر بگڑتے، تو معالج علاج ادھورا چھوڑ کر واپس چلے جاتے۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے، گھوڑے پر سوار ڈاکٹر سعید احمد خان راستہ بھر دُعائیں مانگتے رہے۔ ایک بات جو دورانِ سفر آپ کے مشاہدہ میں آئی، وہ وہاں کے اکثر بچوں کی زرد رنگت اور آنکھوں کا خاص تاثر تھا، جو آپ کے اپنے تجربہ کے مطابق پیٹ کے کیڑوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ یہ حقیقت آپ کے لیے نوابزادہ کے مرض کی تشخیص میں معاون ثابت ہوئی۔

نواب محل میں پہنچے تو آپ نے منتظمین سے کہہ کر نواب زادے کی چارپائی کمرے کے وسط میں دروازے کے قریب کروالی اور خود برآمدے میں دروازے کے قریب لاتعلق سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ بچے کو متوجہ کرنے کے لیے آپ نے اپنی جیبی گھڑی کو ہاتھ میں لے کر پنڈولم کی طرح گھمانا شروع کر دیا۔ نواب زادہ آپ کے اس عمل کو تعجب سے دیکھتا رہا۔ پھر دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر گھڑی لینا چاہی۔ ڈاکٹر صاحب نے قریب ہو کر گھڑی اُس کے کان سے لگا دی۔

بچہ گھڑی کی ٹک ٹک سے محظوظ ہوا اور اس کھیل میں محو ہو گیا۔ اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ نے سٹیتھسکوپ نکال کر اُسے دکھائی۔ اور فرمایا: ”اِس سے ٹِک ٹِک سنو گے؟“ بچہ متعجب ہوا۔ آپ نے آلہ نواب زادے کے کان میں لگا کر دوسرا حصہ اپنے دِل پر رکھ دیا۔ آپ کے دِل کی دھڑکن سُن کر وہ حیران بھی تھا اور متجسس بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: ”اب میں سُنوں؟“ بچے نے اجازت دے دی۔ اور اس طرح کھیل کھیل میں آپ نے اچھی طرح اس کا معائنہ کر لیا۔

ڈاکٹر صاحب کچھ چاکلیٹ اور ٹافیاں ساتھ لائے تھے۔ ایک ایک نکال کر بچے کو دی۔ اِس طرح معالج اور مریض دوست بن گئے، تو پورا ڈبہ بچے کو تھما دیا۔ اب تو ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے دوا پی لینا بھی کوئی مسئلہ نہ رہا۔ بچے کو مسرور دیکھ کر نواب صاحب بھی مطمئن ہو گئے۔ دوا سے جلد

ہی نواب زادے کے پیٹ کے کیڑے ختم ہو گئے۔ وہ کھانے پینے لگا، زرد رنگت گلابی سیب جیسی ہو گئی۔

بچے کا علاج مکمل ہونے پر نواب صاحب نے آپ کو عزت وتکریم اور تحائف کے ساتھ رُخصت کیا۔نواب صاحب دِیر، تمام عمر آپ کے احسان مند رہے۔

علاقہ دِیر میں آپ کی دیانتداری اور قابلیت کو بے انتہا شہرت حاصِل ہوئی۔ اورعوام و خواص سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے، آپ کے پاس آ کر آپ کے طبی مشورے حاصِل کرنے لگے۔

ماہرانہ تشخیص کا ایک واقعہ

یہ واقعہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں زیرعلاج ایک مریضہ سے متعلق ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اُس کی علامات سے اندازہ لگایا کہ اِسے پاگل کتے نے کاٹا ہے۔اُس کی میڈیکل ہسٹری میں یہ درج نہ تھا اور دوسرے ڈاکٹر، جو کہ وہاں کے انچارج تھے، کی یہ تشخیص نہ تھی۔آپ نے اپنی تشخیص درست ثابت کرنے کے لیے مریضہ کے مُنہ میں دوا یا پانی ڈالا جو اُس نے تھوک دیا اور وہ آپ کے چہرے پر اور آنکھوں میں پڑ گیا۔ وہ پانی نگل نہ سکی اِس سے تشخیص تو درست ثابت ہو گئی مگر خود آپ کو ٹیکے لگوانے مری جانا پڑا۔(اُس زمانے میں کسولی یا مری ہی میں ایسے ٹیکوں کا بندوبست تھا)۔

مری میں جماعت احمدیہ کے بزرگ، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب خود آپ کے استقبال کے لیے بس کے اڈے پر تشریف لائے۔ جماعت کے دیگر احباب بھی ہمراہ تھے۔آپ جناب شاہ صاحب کے مہمان رہے۔ جسے آپ اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتے تھے۔

آپ کی اخلاقی جرأت کا ایک واقعہ

پشاور میں طبی قانونی (Medico Legal) معاملات بھی آپ کے پاس آتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بااثر شخص کے بھتیجے کا کسی دوسرے فریق سے جھگڑا ہو گیا۔ فریق مخالف کا ایک شخص شدید زخمی حالت میں ہسپتال لایا گیا۔ بارسوخ شخص نے آپ پر ہر طرح سے خود بھی دباؤ ڈالا اور ڈلوایا بھی، کہ رپورٹ میں "ضرب خفیف" یا معمولی چوٹ لکھی جائے تاکہ مقدمہ کمزور ہو جائے۔ آپ نے کسی قسم کا بھی دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ درست رپورٹ لکھی گئی جس پر مجرم کو سزا ہو گئی۔ اس اہم شخصیت نے اپنے پیشے سے دیانتداری اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے آپ کو کبھی بھی معاف نہیں کیا۔ اور کسی نہ کسی رنگ میں آپ کو دِق کرتا رہا اور ہمیشہ نقصان پہنچانے کے درپے رہا۔ اپنے ذاتی فائدے کے لیے آپ نے عمر بھر کبھی کسی لالچ یا اثر و رسوخ یا کسی دباؤ میں آ کر کبھی کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا۔ اور خدا تعالیٰ نے آپ کو ہمیشہ عزت ہی دی اور کوئی آپ کو اپنا من چاہا نقصان نہیں پہنچا سکا۔

والدہ کی وفات ۹ جنوری ۱۹۲۹ء

۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی والدہ آپ کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ وفات سے چند ایام قبل، وہ اپنے فرزند سے ملنے پشاور آئی تھیں۔ آپ نفلی روزے رکھا کرتی تھیں۔ اُس دِن بھی روزے سے تھیں۔ افطار کے بعد معمولی کھانا کھایا، عشاء کی نماز کے لیے کھڑی ہوئیں تو اچانک طبیعت خراب ہو گئی اور قے آئی۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب بمعہ قبلہ والد صاحب کے خان بہادر حکیم اللہ خان کے یہاں گئے ہوئے تھے جہاں وہ کھانے پر مدعو تھے۔ اُنہیں بلایا گیا۔ فرزند کو دیکھ کر بس اتنا کہا: "آ گئے ہو"۔ اور اِس سے پہلے کہ پاس موجود، قابل معالجین کوئی تشخیص کرتے یا علاج کرتے آپ بہشتِ بریں میں جا بسیں۔ آپ کو اِس کا بہت صدمہ ہوا۔ لیکن ایک مومنانہ شان

سے برداشت کیا۔

خرابیٔ صحت۔ ۱۹۳۰ء

ابتداء ۱۹۳۰ء سے آپ کو ہلکی حرارت رہنے لگی۔ آہستہ آہستہ علالت بڑھتی گئی اور تھائیسس (phthisis) تشخیص ہوا۔یعنی ایسا مرض جو اندر ہی اندر جسم کو لاغر اور کمزور کر دیتا ہے، خصوصاً پھیپھڑوں کا تپ دق۔یعنی کہ آپ کا وہی طالب علمی کے زمانہ کا پرانا مرض عود کر آیا۔ ڈاکٹر خان بہادر حکیم اللہ خان نہایت شفقت اور محبت سے آپ کا علاج کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً چھٹی درکار ہوتی تو اعتراض نہ کرتے تھے۔ خان بہادر صاحب آپ سے بہت مخلص تھے اور آپ کے قدر دان بھی تھے۔ اُدھر آئی جی صاحب بھی آپ سے متاثر اور آپ کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ وہ نہ چاہتے تھے کہ اتنا قابل ڈاکٹر ضائع ہو جائے۔ اِس لیے کام میں بہت تخفیف کر کے آپ کو معمولی ڈیوٹی دیئے رکھی۔ اور علاج بھی ہوتا رہا۔

وسط سال میں جب پشاور کی گرمی آپ کے لیے نا قابل برداشت ہو گئی تو آپ نے لمبی چھٹی کی درخواست دی، جو منظور ہو گئی۔ اور آپ نے ایبٹ آباد کے لیے رخت سفر باندھا۔

آپ کے رفقائے کار میں کیپٹن ڈاکٹر خالق داد صاحب آپ کے اچھے دوست تھے۔ اُن ایام میں اُن کے خُسر میاں نجم الدین صاحب بمعہ اہل وعیال ایبٹ آباد کے مشہور ”بخارا پیلس“ میں مقیم تھے۔ کیپٹن صاحب نے تجویز کیا کہ چونکہ آپ کا اپنا کوئی ذاتی مکان ایبٹ آباد میں نہیں ہے اس لیے آپ اُن کے اہل خانہ کے ساتھ بخارا پیلس میں رہائش اختیار کریں۔ ڈاکٹر صاحب کی وساطت سے میاں نجم الدین صاحب سے تعارف ہوا، اور آپ شہزادہ بخارا کی محل نما کشادہ کوٹھی کے وسیع و عریض باغ میں ایک خیمہ لگوا کر رہائش پذیر ہو گئے۔ میاں نجم الدین اور دیگر اہلِ خانہ آپ سے نہایت مروت اور محبت سے پیش آتے رہے۔ اور آپ اپنی شدید بیماری کے چند ایام ایسے اچھے

لوگوں کے ساتھ سکون سے گذار پائے جو سراپا محبت وشفقت تھے۔ آج بھی اُن ایام کی محبت کی یاد دونوں خاندانوں کے موجود افراد میں باقی ہے اور دوستانہ مراسم قائم ہیں۔

"بخارا پیلس" شہزادہ بخارا کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔وہ اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں انگریز حکومت کی تحویل و حفاظت میں تھے۔ اُنہوں نے اپنی جلاوطنی کا تمام تر زمانہ ایبٹ آباد میں گذارا۔ وہ محل اب ابتدائی شکل میں قائم نہیں ہے مگر بخارا ہاؤس کے نام سے موجود ہے۔ البتہ محل کے بالمقابل مسجد جو اُن کے نام سے موسوم ہے اور شہزادہ مسجد کہلاتی ہے، کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مسجد سے ملحق مختصر سے قبرستان میں شہزادہ صاحب اور اُن کے لواحقین مدفون ہیں۔

نوٹ: یہ معلومات محترمہ ثریا اقبال صاحبہ نے فراہم کی ہیں۔ ثریا اقبال صاحبہ جناب ڈاکٹر خالق داد صاحب کی صاحبزادی ہیں اور شہزادہ مسجد سے ملحق کوٹھی میں رہائش رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی اولاد سے گہرے مراسم ہیں۔ اور وہ خود ڈاڈر سینیٹوریم میں اُن کے زیرِعلاج رہ چکی ہیں۔

ابھی صحت مکمل طور پر بحال نہ ہوئی تھی مگر ڈاکٹر سعید احمد صاحب دوبارہ پشاور تشریف لے گئے اور فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ علاج بھی کرواتے رہے۔ ۱۹۳۱ء کے موسم گرما میں آپ نے دوبارہ لمبی چھٹی کی درخواست دی۔ آپ کے افسرِ اعلیٰ نے چھٹی کی درخواست منظور کرتے ہوئے اشارتاً یہ بھی بتادیا کہ چھٹی کے اختتام پر آپ کو مانسہرہ تعینات کردیا جائے گا جو آپ کی صحت کے لیے زیادہ موزوں ہوگا۔ اگرچہ آپ کو خان بہادر حکیم اللہ خان سے براہِ راست علاج کروانے کی سہولت نہ رہے گی، لیکن یہ ناممکن بھی نہ ہوگا اور بذریعہ خط وکتابت ہدایات لی جاسکیں گی۔

دیب گراں پہنچنے پر گھر کے اندر ٹھہرنے کے بجائے آپ نے گاؤں سے مغرب کی جانب بھینگڑہ نامی پہاڑ پر چیڑھ کے گھنے جنگل میں اپنے لیے ایک مقام پسند فرمایا۔ یہ پہاڑ ریاست پھلڑہ کے علاقہ میں ہے۔ وہاں کے خوانین کی وساطت سے آپ کی رہائش کا مناسب بندوبست ہوگیا۔ آپ کی اہلیہ اور بچے بھی وہیں آپ کے ساتھ منتقل ہوگئے۔

آپ کے وہاں مقیم ہونے کی خبر اردگرد پھیل گئی تو لوگ آپ کے پاس علاج معالجہ کے لیے بھی آنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ نے وہاں قیام کے دوران آنکھوں کے سفید موتیا کے کئی کامیاب آپریشن کیے۔ یہ ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کی آنکھوں میں موتیا ہے ڈاکٹر صاحب نے موتیا کے اپریشن کے لیے درکار آلات لاہور سے منگوا لیے۔ ایک بڑے سے تختہ نما پتھر پر مریض کو لٹا کر جنگل کی کھلی، صاف اور جراثیم سے پاک فضا میں آپ نے کئی کامیاب اپریشن کیے اور خدا کے فضل سے ایک بھی اپریشن خراب نہیں ہوا۔

موتیا کے اپریشن کا محرک واقعہ

بھینگڑہ کے جنگلوں میں قیام کو ابھی چند ایام ہی ہوئے تھے

کہ آپ نے محسوس کیا کہ اس خاموشی میں لگاتار ایک صدا "اللہ ھُوْ، اللہ ھُوْ" کی بلند ہوتی رہتی ہے، جو تمام علاقے میں گونجتی ہے۔ آپ کے استفسار پر پتہ چلا کہ ایک اندھا شخص ہے جس کے لواحقین اسے کھلی جگہ پر بٹھا جاتے ہیں، اور وہ دِن بھر اور رات کو بھی اکثر یہ صدا بلند کرتا رہتا ہے۔ آپ کی خواہش پر آپ کے خدمت گار، ایک اندھے شخص کو جسے عام لوگ "اللہ ھُوْ بابا" کہتے تھے، آپ کے پاس لے آئے۔ آپ نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں موتیا ہے، جس کا علاج اپریشن سے ہو سکتا ہے۔ اسی خیال سے آپ نے آلاتِ جراحی منگوا لیے۔ اور "اللہ ھُوْ بابا" کا کامیاب اپریشن کیا۔ وہ بینا ہو گیا۔ کام کاج کرنے لگا۔ بہت سے دیگر نابینا بھی کُشاں کُشاں چلے آئے تاکہ اِس نابینائوں کو بینائی بخشنے والے مسیحا کی مسیحائی سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اِس طرح سے اپنی بیماری کے دوران بھی عوام الناس کی خدمت کا موقعہ ملتا رہا۔

بزرگوں اور دوستوں کی دُعائیں اور بشارات

ڈاکٹر سعید احمد خان کے والد، چچا بزرگوار اور اکابرینِ جماعت اور کئی دوسرے مہربان اور محب، مسلسل آپ کی صحت یابی کے لیے نیم شبی دُعاؤں میں گریۂ وزاری کرتے، اور دیگر اوقات میں بھی انفرادی اور اجتماعی دُعائیں ہوتیں۔

امیر جماعت مولانا محمد علیؒ کی دُعا اور بشارت

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے مولانا محمد علیؒ صاحب کی خدمت میں دُعا کی درخواست کی تو آپ نے جواباً لکھا:

تمہاری صحت کے لیے دُعا کرنا تو اب میرے لیے ایک وِرد ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان حضرت مولانا کے بارے میں ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ میں سجدہ میں دُعا کر رہا تھا تو بے ساختہ میرے مُنہ سے یہ الفاظ یوں نکل گئے: 'اللہ میرے بیٹے سعید کو شفا بخش'۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو اپنے آپ کو ہمیشہ آپ کا بچہ ہی سمجھتا تھا۔ اچھا ہوا کہ اللہ میاں نے اپنے الہام سے اس پر مُہر تصدیق ثبت فرما دی۔ مجھے اِس بات سے بڑی خوشی ہوئی، میں اسے اپنی زندگی کی بہت بڑی قیمتی دولت سمجھتا ہوں کہ آپ کو میرے ساتھ اِس قدر محبت تھی۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے مرتے دم تک اِس تعلقِ فرزندی کو قائم رکھا۔ وہ آپ کی زوجہ محترمہ کو 'اماں جی' کہتے تھے اور آپ کی دُختران سے فرماتے کہ آپ تو میری بہنیں ہیں۔ روحانی طور پر آپ کی فرزندی خدا تعالیٰ نے جماعتِ احمدیہ لاہور کی امارت آپ کو سونپ کر ثابت کر دی۔

مولوی محمد یحییٰ صاحب کی دُعا اور بشارت

اپنے اکلوتے فرزند کی طویل علالت، مولوی محمد یحییٰ صاحب کے لیے تشویش اور مسلسل پریشانی کا باعث تھی۔ ایک مرتبہ دُعا کرتے ہوئے گڑگڑا، گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے فریاد کی: "اے اللہ سعید احمد کو کب شفا ہو گی؟" اللہ تعالیٰ کی رحمت نے جوش فرمایا اور فریاد کے جواب میں یہ تسلی آمیز الفاظ الہام ہوئے: " جب بخاری ختم ہو گی۔"

مولوی محمد یحییٰ صاحب نے اُسی روز سے بخاری شریف پڑھنا شروع کر دی۔ خود ڈاکٹر صاحب سے بھی پڑھنے کو کہا۔ آپ نے بھی عمل کیا۔ لیکن بخاری جیسی ضخیم کتاب پڑھنے میں کئی سال لگے۔ اور یہ الہام ۱۹۳۸ء میں بخاری، ختم ہونے پر پورا ہوا۔

مولوی عبدالرحمان صاحب (تھاتھی والے) کی دُعا اور بشارت

مولوی عبدالرحمان صاحب سے مولوی محمد یحییٰ صاحب کے خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ مولوی صاحب نے آپ سے بھی اپنے فرزند کی صحت کے لیے دُعا فرمانے کو کہا۔ مولوی عبدالرحمان صاحب ایک رات اپنے گھر کی چھت پر نمازِ تہجد ادا کر رہے تھے، اور ڈاکٹر سعید احمد خان کی صحت کے لیے دُعا فرما رہے تھے۔ "یا باری تعالیٰ ڈاکٹر سعید احمد کو جو نافع الناس ہے مکمل صحت عطا فرما"۔ مولوی صاحب یہ الفاظ بار بار دُہرا رہے تھے کہ ایک کشفی نظارہ میں دیکھا کہ مغرب کی جانب ایک عورت "الٰہی نور" نامی جھولی پھیلائے کھڑی ہے اور ہر بار جب آپ یہ فقرہ دُہراتے ہیں، وہ بلند آواز میں "آمین" کہتی ہے۔ مولوی عبدالرحمان صاحب نے مولوی محمد یحییٰ صاحب سے اِس کشفی روداد کا ذکر کیا تو آپ نے دُعا جاری رکھنے کو کہا۔ مولوی عبدالرحمان مزید سوز و گداز سے دُعائیں فرماتے رہے۔ التجائیں عرش تک پہنچیں تو جواب ملا:

"بَل جی ہو گیا ہے" (ہندکو) یعنی تندرست تو ہو گیا ہے۔

مانسہرہ سول ہسپتال میں تقرری۔ ستمبر ۱۹۳۲ء

لمبی رُخصت کے اختتام پر ستمبر ۱۹۳۲ء میں آپ مانسہرہ کے سول ہسپتال کے انچارج مقرر ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا سا پچیس بستروں کا غیر معروف سا ہسپتال تھا جہاں طبی آلات بھی واجبی ہی سے تھے۔ آپ کی فطرتی نفاست پسندی اور لگاتار کاوش سے یہ ایک صاف ستھرا اور اچھا ہسپتال بن گیا۔ مریضوں کی تعداد بڑھنے لگی تو آپ نے برآمدے میں بستر لگوا کر، داخل ہونے والے مریضوں

کے لیے سہولت پیدا کر دی تا کہ کوئی مایوس نہ لوٹے۔

تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ہسپتال اِس قابل ہو گیا کہ عام نوعیت کے اپریشن آپ خود وہاں کرنے لگے۔ اکثر مریضوں کا یہ تقاضا ہوتا تھا کہ آپ خود اپریشن کریں اور کسی بڑے ہسپتال میں نہ بھیجیں۔ لوگوں کو یقین اور بھروسہ تھا کہ آپ کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔ اور حقیقتاً آپ ایک ماہر سرجن تھے اور معمولی ساز و سامان اور آلات سے بھی اپنی خود اعتمادی کی بنا پر بطورِ احسن ہر قسم کے اپریشن کر لیتے۔

اِس دور کا ایک واقعہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب کا اپنا بیان کردہ ہے۔ علاقے کا ایک معتبر شخص، سخت زخمی حالت میں سول ہسپتال مانسہرہ میں لایا گیا۔ جسم پر بے شمار زخم ہونے کے علاوہ پیٹ پھٹ کر آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آپ نے بغیر وقت ضائع کیے۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اُس کے زخم سینا شروع کر دیئے اور ابتدائی طبی امداد پہنچائی۔ زخم سیتے سیتے ہسپتال میں موجود ٹانکے لگانے کا مخصوص دھاگہ بالکل ختم ہو گیا۔ آپ نے حاضِر دماغی سے کام لیتے ہوئے اپنے گھر سے کڑھائی میں استعمال ہونے والا ریشمی دھاگہ منگوا کر، اور جراثیم سے صاف کر کے زخم سیئے۔ کئی گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد تمام زخم سل گئے۔ چند دِن بعد مریض تندرست و توانا ہو کر گھر چلا گیا۔ یعنی اِس حادثہ سے اُس شخص کا بچ جاناکسی معجزہ سے کم نہ تھا۔

خداتعالیٰ کی تائید آپ کے اس جرأت مندانہ اقدام میں شامل تھی۔ کوئی دوسرا ڈاکٹر ایسے زخمی کو شاید ہاتھ بھی نہ لگاتا۔آپ نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص بعد میں ایک مرتبہ آپ سے ملا تو اپنی ایک انگلی دکھا کر کہنے لگا : "واہ ڈاکٹر واہ! میری انگلی تو تم نے ٹیڑھی ہی چھوڑ دی"۔ یعنی اُس کو اپنی انگلی قدرے ٹیڑھی رہ جانے کا تو غم تھا، لیکن اِس بات کو وہ بھول ہی گیا کہ وہ کیسے معجزانہ طور پر بچ پایا تھا اور زندہ تھا۔ یہ ناشکرگذاری کی بہت نمایاں مثال ہے۔ یہ واقعہ سُنا کر ڈاکٹر سعید احمد صاحب سننے والوں کو یہ تلقین فرماتے تھے کہ نیکی کرتے ہوئے خدا کی رضا مدِّنظر رکھنی چاہئے نہ کہ بندوں کی خوشنودی یا احسان مندی۔

ایک مخصوص طبقہ کی ریشہ دوانیاں اور ڈاکٹر صاحب کا استقلال

علاقہ کے بااثر لوگ عموماً اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے، اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کے عادی ہوتے ہیں، خصوصاً مقدمات کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحبان سے ایسی شہادتیں دلوانا چاہتے ہیں جو حقیقت کے خلاف ہوتی ہیں۔ آپ تک بھی ایسی گواہیوں کے لیے رسائی حاصل کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ لیکن آپ نے حقیقت کے برخلاف کچھ کرنے سے جب انکار کر دیا تو ایسی مراعات کے عادی لوگ آپ کے خلاف ہو گئے۔ آپ سے مایوس ہو کر حکامِ بالا تک آپ کی شکایات پہنچانے سے بھی نہ چونکتے تھے۔ علاج معالجہ بھی آپ سے کرواتے اور "بدلحاظ" اور "مغرور"

جیسے خطابات سے نوازتے ہوئے آپ کے تبادلہ کی کوشش بھی کرتے، تاکہ اُن کا کوئی من پسند ڈاکٹر وہاں آجائے، جو اُن کی ہاں میں ہاں ملائے اور کاروائی اُن کے حکم سے ہو۔

ضلعی انتظامیہ کے ایک انگریز افسر نے ایک بار برسبیل تذکرہ آپ سے کہا کہ فلاں فلاں خوانین آپ سے سخت ناراض ہیں۔ اُس افسر کا ارادہ اشارتاً یہ تھا کہ اُن کا کام اُن کی مرضی کے مطابق کردیا جائے۔ اِس پر ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: ” جب میرا اللہ مجھ سے خوش ہے تو کسی کی ناخوشی کی مجھے پرواہ نہیں“۔

آپ کے اِس دلیرانہ جواب پر وہ افسر مزید سفارش نہ کرسکا۔ ایسے موقعوں پر ’ملاں‘ لوگ بارسوخ لوگوں کا خوب ساتھ دیا کرتے ہیں وہ بھلا ایسا موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیتے۔ اُن کے خطبات کا موضوع اکثر ”مرزائی ڈاکٹر اور اُس کی من مانیاں“ ہوا کرتا تھا۔ اِس طرح وہ عوام الناس کو اُکساتے اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

درس قرآن اور نماز باجماعت کا اہتمام

مانسہرہ میں احمدی احباب کی محدود سی سرگرمیاں تھیں۔ آپ کی تحریک پر درسِ قرآن کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ جس کے لیے مطیع اللہ خان صاحب اور آپ کے فرزند خان بہادر غلام ربانی خان کی رہائش گاہ کا ایک بیرونی حصہ مخصوص تھا۔ آپ کا کردار اپنی جماعت کے لیے ہمیشہ مثالی رہا ہے۔ بچے اور بزرگ سب آپ کی صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔ آپ کے مانسہرہ کے قیام کے دوران ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۷ء جماعت مانسہرہ ایک مثالی اور فعال جماعت بن گئی، جو دوسری جماعتوں کے لیے قابل تقلید تھی۔ یہ آپ کی ذاتی کاوشوں کا ثمر تھا۔ قیام مانسہرہ کے دور ہی میں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب مجلس معتمدین کے دوامی ممبر بنائے گئے۔ مولٰینا محمد علی نے خطبہ جمعہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ) میں آپ کی صحت یابی کی دعا کی تحریک کرتے ہوئے فرمایا:

آخر پر میں جماعت کے ایک نہایت مخلص و نیک نوجوان کے لیے دعا کرنا چاہتا ہوں جو بیمار ہیں۔ یعنی ڈاکٹر سعید احمد صاحب از مانسہرہ۔ یہ اسم بامسمّٰی نوجوان ہیں۔ جن کو دیکھ کر میری روح اس قدر خوش ہوتی ہے کہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے نوجوان جگہ بہ جگہ پیدا کردے۔ اس شخص میں نیکی و اخلاص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مانسہرہ کی جماعت اس وقت ہماری سب جماعتوں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مرکز سے جماعتوں میں آدمی نہیں بھیجے جاتے، اس لیے وہ سست ہوگئی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ خود ہی ایسے آدمی بن سکتے ہیں۔ اور اصل میں جماعتوں میں قوتِ عمل تب ہی پیدا ہوگی جب ان کے اندر سے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ اس سعید نوجوان کے لیے تمام دوست اس وقت بھی اور دوسرے اوقات میں بھی دعا کریں۔ خدا اسے تندرستی اور عمر دراز دے۔ بعض اور دوست بھی بیمار ہیں۔ وزیر آباد میں شیخ عبدالرحمن صاحب۔ (یہ تحریر پیغام صلح ۲۳ نومبر ۱۹۳۶ء کو چھپی۔ حوالہ: +خطبات محمد علی ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۳۰)

عقدِ ثانی۔ ۱۹۳۳ء

۱۹۳۳ء میں آپ کا عقدِ ثانی، آپ کی عم زاد زینب بی بی سے نہایت سادگی سے انجام پایا، اور آپ کے والد مولوی محمد یحییٰ صاحب خود زینب بی بی کو بمعہ آپ کی کم عمر بھتیجی رقیہ بیگم اور ایک اُسی عمر کی خادمہ کو، آپ کے گھر میں بسا گئے۔

خان صاحب کا خطاب۔ ۱۹۳۴ء

آپ کی زیرِ نگرانی مانسہرہ کا ہسپتال دِن دُگنی، رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ ڈاکٹر سعید احمد

خان صاحب کو اپنے آبائی وطن کے عوام کی خدمت کا بہت عمدہ موقع ملا اور آپ نے ہر طرح سے ممکن خدمات انجام دیں۔ دو تین سال کے عرصہ میں بستروں کی تعداد بھی بڑھ گئی، اور انتظامات بھی بہتر ہو گئے۔

ضلع ہزارہ کے سول سرجن کرنل اے۔ کے صاحبزادہ اور سرحد کے محکمہ صحت کے افسرِ اعلیٰ انسپکٹر جنرل، دونوں آپ کی خدمات کے معترف تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آپ کے پشاور کے زمانۂ ملازمت ہی سے آپ کے افسرانِ اعلیٰ آپ کی صلاحیتوں کے مداح تھے اور اُن کی بہت سی توقعات آپ سے وابستہ تھیں۔ آپ کی خدمات کی وجہ سے آپ کو جون ۱۹۳۴ء میں حکومت نے "خاں صاحب" کے خطاب سے نوازا۔

یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو پشاور کے وکٹوریہ میموریل ہال کی ایک خصوصی تقریب میں آپ کو صوبہ سرحد کے گورنر نے تمغہ عطا کیا۔

انسپکٹر جنرل صاحب نے آپ کو مبارک باد کے خط میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے:

"It only seems few years ago, since I promoted you Assistant Surgeon in Nathiagali and now you are a Khan Sahib."

ترجمہ: ابھی چند سال کی تو بات ہےکہ میں نے آپ کو نتھیاگلی کا اسسٹنٹ سرجن مقرر کیا تھا۔ اور اب آپ خان صاحب ہیں۔

ایک انگریز افسر کو انگریزی ترجمۃ القرآن کا تحفہ

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو جب بھی اللہ تعالیٰ نے تبلیغ اسلام کا موقعہ دیا، آپ نے اِس سے ضرور فائدہ اٹھایا اور خدا تعالیٰ کے اِس آخری پیغام کو دوسروں تک پہنچانے میں کوشاں رہے۔ آپ کے اپنے انگریز افسران سے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ اکثر افسروں کو آپ نے انگریزی ترجمۃ القرآن بطورِ تحفہ دیا۔ ایک افسر نے اِس تحفہ پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

.....I have always intended getting an English translation of the "Koran" & now it has come as a heaven sent gift - neither my wife nor I will ever forget you. I hold you in the greatest esteem & respect not only for your ability as a doctor but also for your honesty & kindly nature. May God bless you & give you health & strength to continue the great humanitarian work which you are doing.....

ترجمہ:

میرا ہمیشہ سے قرآن کا انگریزی ترجمہ حاصِل کرنے کا اِرادہ تھا۔ آپ کا تحفہ، ایسے لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ میری بیوی اور میں آپ کو کبھی بھی بھلا نہ پائیں گے۔ میں آپ کو نہ صرف آپ کی طبی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، بلکہ آپ کی دیانتداری اور ہمدردانہ فطرت کی وجہ سے بھی آپ کی عزت کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ آپ پر برکات

نازل فرمائے اور آپ کو اپنے انسانی ہمدردی کے کاموں کی تکمیل کے لیے زندگی اور صحت سے نوازے۔

سینیٹوریم کے قیام کی تجویز

۱۹۳۴۔۳۵ء میں اعلیٰ سرکاری سطح پر فیصلہ ہوا کہ ضلع ہزارہ میں کسی مقام پر یورپی طرز کا ایک سینیٹوریم قائم کیا جائے۔ ضلع ہزارہ کی صحت افزا آب وہوا کے مدِّ نظر اس علاقہ کو پسند کیا گیا تھا۔ محکمہ صحت کے اعلیٰ حکام ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی صلاحیتوں سے بکلی واقف تھے۔ اس لیے ہسپتال کی تمام تر منصوبہ بندی اور مجوزہ پروگرام سے آپ کو مطلع رکھتے اور آپ سے مشورہ کرتے تھے۔

چچا محترم کی وفات کا صدمہ۔ اپریل ۱۹۳۴ء

آپ کے چچا محترم، مولوی محمد یعقوبؒ صاحب اپریل ۱۹۳۴ء میں اِس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ آپ کے چچا اپنی مختصر علالت میں مانسہرہ ہسپتال میں آپ کے ہی زیرِ علاج رہے۔ مگر نمونیہ سے جانبر نہ ہو سکے۔ اپنے چچا کے انتقال سے آپ بہت آزردہ خاطِر تھے۔ اُن کی دائمی جدائی آپ کے لیے ایک سانحہ سے کم نہ تھی۔ آپ کے چچا آپ کے جاں نثار تھے اور آپ سے اپنی اولاد سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔ آپ کو تا حیات اِس بات کا صدمہ رہا کہ وہ خود اپنی بیماری اور تیز بخار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اپنے چچا کی میت کو کاندھا نہ دے سکے۔

ایبٹ آباد سول ہسپتال میں تبادلہ اور سینیٹوریم کی تعمیر۔ ۱۹۳۷ء

۱۹۳۷ء میں آپ کا تبادلہ ایبٹ آباد ہو گیا اور آپ نے اپنی ذاتی کوٹھی "دارالسعید" میں اقامت اختیار کی۔ ضلع ہزارہ کے سول سرجن، کرنل اے۔ کے صاحبزادہ نے آپ کی ہسپتال کی

ڈیوٹی میں خاصی تخفیف کر دی تا کہ سینیٹوریم کی تعمیر کے سلسلہ میں آپ زیادہ سے زیادہ وقت دے سکیں۔ اُس وقت سینیٹوریم کے لیے جگہ کا انتخاب بمقام ڈاڈر ہو چکا تھا۔ اور تعمیر کا کام ابتدائی مراحل میں تھا۔ اِس سلسلہ میں آپ کو متعدد بار ہدایت لینے یا مشورہ لینے کے لیے پشاور کا سفر درپیش رہتا تھا۔ آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے تمام انتظامی امور سرانجام دیئے، جن میں سٹاف کی بھرتی، سٹورز کی فراہمی، کچن کا انتظام، دھوبی کا انتظام اور سب سے بڑھ کر صاف ستھرے پانی کا انتظام اور متعدد چھوٹے بڑے کام تھے۔ اس طرح کی بھاگ دوڑ کا اثر آپ کی کمزور صحت کے لیے چنداں مناسب نہ تھا۔ تاہم آپ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

پوسٹ گریجویٹ کورس میں شمولیت جنوری ۔ ۱۹۳۸ء

متحدہ ہندوستان کے شہر کلکتہ کے ”آل انڈیا انسٹیٹیوٹ آف ہائیجین اینڈ پبلک ہیلتھ“ (All India Institute of Hygiene and Public Health) میں تپ دق سے متعلق ایک کورس کا انعقاد ہوا، جہاں آپ کو اِس مرض کی ماہرانہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ کورس ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء سے شروع ہوا اور ۸ فروری ۱۹۳۸ء کو ختم ہو گیا۔ کورس کا دورانیہ مختصر تھا مگر بہت اہمیت کا حامِل تھا۔ آپ وہاں کئی قابل ماہرینِ دِق سے متعارف ہوئے، اور اُن کی صلاحیتوں اور علم سے مستفید ہوئے۔

اِس کورس کے دوران آپ نے اپنے ایکسرے ایک قابل ماہر ڈاکٹر کو دکھائے، جنہوں نے بتایا کہ اپریشن کے ذریعہ آپ کی بیماری کا علاج ممکن ہے، جس کا انتظام مدنا پلی کے سینیٹوریم میں موجود ہے۔ آپ نے ارادہ کرلیا کہ وہ وہاں علاج کی غرض سے جائیں گے۔

ترکِ ملازمت کا ارادہ ۔ ۱۹۳۸ء

۱۹۳۸ء کے اوائل میں آپ محسوس کرنے لگے کہ آپ کی کمزور صحت آپ کو زیادہ محنت و

مشقت کی اجازت نہیں دیتی۔ ڈاڈر سینیٹوریم کی تعمیر میں جتنی تگ ودو آپ کو کرنا پڑی، آپ کا کمزور جسم اُس کا متحمل نہ ہوسکا اور دِق کا مرض پھر عود کر آیا، جس سے آپ پریشان ہو گئے۔ آپ نے ملازمت ترک کر دینے کا ارادہ کیا اور کرنل صاحبزادہ سے درخواست کی کہ آپ کو ملازمت سے فارغ کر دیا جائے، اور کہا کہ اُن کے سپرد سینیٹوریم کی منصوبہ بندی اور تعمیر کا جو کام تھا وہ مکمل ہو چکا ہے۔ کرنل صاحبزادہ نے آپ کے اِس خیال سے اتفاق نہ کرتے ہوئے فرمایا: ”آپ یہ خیال دِل سے نکال دیں۔ محکمہ صحت کو آپ جیسے شخص کی اس وقت بہت ضرورت ہے“۔ اور صحت کے بارے میں تسلی آمیز الفاظ سے آپ کا حوصلہ بڑھایا۔

آئی۔جی صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی تو اُنہوں نے بھی آپ کو صحت کے بارے میں تسلی دیتے ہوئے ترکِ ملازمت کے خیال کو ناپسند کیا اور آپ کے کام میں مزید تخفیف کر دی۔

نامزدگی بطور میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاڈر سینیٹوریم

دس مئی ۱۹۳۸ء سے آپ کو ڈاڈر سینیٹوریم کا ایم۔ایس نامزد کر دیا گیا۔

رُخصت بغرضِ علاج۔ جون ۱۹۳۸ء

افسران اعلیٰ کی حوصلہ افزائی اور کام میں تخفیف اور تعاون کی وجہ سے آپ نے ملازمت ترک کرنے کا اِرادہ چھوڑ دیا۔ تاہم بغرضِ علاج، مدنا پلی جانے کا پکا اِرادہ کر لیا اور چھٹی لے لی۔

۱۲ جون ۱۹۳۸ء کو آپ نے سول ہسپتال ایبٹ آباد کا چارج دے دیا اور دیگر اں چلے گئے۔ اپنے والد اور اہلِ خانہ سے رُخصت ہو کر ۱۶ جون ۱۹۳۸ء کو بمع اپنی بڑی بیگم صاحبہ کے ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گئے۔ بس اور ریل کا سفر کر کے لاہور تک پہنچے، جہاں سے بذریعہ ریل دہلی، اور دہلی سے بذریعہ ”گرینڈ ٹرنک ایکسپریس“ روانہ ہوئے۔ راستہ میں دو اور مقامات پر ریل بدلنا پڑی۔ ۲۱ جون ۱۹۳۸ء کو آپ مدنا پلی پہنچ گئے۔

آروگیاورم سینیٹوریم میں علاج

مدراس کے علاقہ چتوڑ میں ایک مقام مدنا پلی ہے، جہاں برطانوی دورِحکومت میں مشہور یورپین یونائیٹڈ مشن نے تین سو بستروں پر مشتمل ایک (انسٹی ٹیوشن) ادارہ قائم کیا تھا۔ یہ متحدہ ہندوستان کا واحد ادارہ تھا جس میں تپ دق کا علاج معالجہ ہوتا تھا، اور ملک بھر کے ڈاکٹر اِس مرض کے علاج کی خصوصی تربیت حاصل کرنے یہاں آتے تھے۔ اس کے سربراہ ایک معمر ڈینش (ڈنمارک کا رہنے والا) مشنری ڈاکٹر بنجمن تھے، جو اِسے مغربی طرز پر چلا رہے تھے۔

سینیٹوریم کا نام "آروگیاورم" تھا جس کے معنی ہیں تندرست ہونے کی جگہ۔ آپ ۲۱ جون کو تقریباً تین بجے ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ ابتدائی ضروری معائنہ، ایکسرے، مزید ٹیسٹ وغیرہ ڈاکٹر مولر (Mollar) کی زیرِنگرانی ہوئے۔ ڈاکٹر انچارج، ڈاکٹر بنجمن ایک ہفتہ بعد رخصت سے واپس لوٹے۔ تھوریکوپلاسٹی (thoracoplasty) کرنے کا فیصلہ کیا اور اگلے ہی دِن آپ کو وارڈ سے اپریشن بلاک میں منتقل کر دیا گیا۔

اپریشن اور تندرستی کی بشارت

۲۹ جون ۱۹۳۸ء، بروز بدھ آپ کا اپریشن ہوا۔ اپریشن روم میں داخل ہوئے تو آپ کے لبوں پر یہ دُعا جاری تھی:

حَسْبِیَ اللّٰہ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَولیٰ وَ نِعْمَ النَّصِیْر۔

یہ دُعا آخر تک آپ کے لبوں پر رہی۔

اپریشن مکمل ہونے کے بعد، تقریباً صبح کے نو بجے کے وقت، جب آپ کو سٹریچر پر ریکوری روم میں لائے اور بستر پر منتقل کیا جا رہا تھا، تو نیم غنودگی کی حالت میں آپ کے لبوں پر الہاماً یہ الفاظِ

قرآنی جاری ہوئے:

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (اور کیا وہ جو مُردہ تھا، پھر ہم نے اُسے زندہ کر دیا)

اس کے بعد آپ کو مکمل بیداری ہوگئی اور آپ نے خود بے ساختہ آیت کو بآواز بلند مکمل کیا:

وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (اور اُسے روشنی دی جس کے ساتھ وہ لوگوں مین چلے) (الانعام ٦:١٢٢)۔

آپ کا یہ الہام آپ کی آخری آرام گاہ کے کتبہ کی زینت بنا، کیونکہ آپ کی باقی ماندہ زندگی اسی آیت کی تفسیر تھی۔ ایک ایسا شخص جو زندگی سے مایوس ہو کر ترکِ ملازمت کا اِرادہ کر چکا تھا۔ خداتعالیٰ نے اِس مردہ شخص کو زندگی عطا کی اور زندگی میں ایسے مواقع فراہم کیے کہ وہ خداتعالیٰ کے عطا کردہ نور، نورِ فرقاں کو لے کر قریہ قریہ پھرا اور دُنیا کے کناروں تک اُس کو پہنچایا۔ خداتعالیٰ کی کہی ہوئی بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آپ کی زندگی کو اگر ”اعجاز خداوندی“ کہیں تو مبالغہ نہ ہو گا۔ اور یہ بھی خداتعالیٰ کی مشیت تھی کہ تقریباً سینتیس (۳۷) برس کی عمر میں خدا کے دیئے ہوئے وعدہ کو پورا ہونے میں مزید سینتیس برس کا عرصہ لگا اور اس دور کا آغاز ۱۹۷۴ء میں ہوا۔

سینیٹوریم کے معالج اور دیگر عملہ آپ سے بہت عزت و احترام کا سلوک کرتے۔ بحیثیت ڈاکٹر اور ملک کے دوسرے بڑے سینیٹوریم کے نامزد ایم ایس آپ کو خاص اہمیت دی جاتی اور علاج پر خصوصی توجہ ہوتی۔ دیگر لوگ بھی بہت مروت برتتے۔ ڈاکٹر مولر (Dr Mollar) کی اہلیہ نے آپ کے لیے گلدان میں پھول سجا کر بھیجے تو آپ کو بہت خوشی اور اطمینان ہوا۔

رخصت میں توسیع کی درخواست

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب روبصحت تھے، مگر آپ کے معالج ڈاکٹر بنجمن کا مشورہ تھا کہ آپ کو مزید آرام کی ضرورت ہے، اور شاید ایک اور اپریشن کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے آپ نے ۹ جولائی کو رخصت میں مزید اضافے کی درخواست بھیجی اور خود کرنل ڈائمنڈ کو، جو اُس وقت محکمہ صحت کے افسرِ اعلیٰ تھے، ایک ذاتی خط بھی لکھا۔ آپ کی درخواست منظور کر لی گئی۔

ڈاڈر سینیٹوریم کے افتتاح کی اطلاع اور نئے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کی نامزدگی

مزید چھٹی ملتے ہی آپ کو اطمینان ہو گیا تھا کہ اچانک آپ کو ایک اور سرکاری خط ملا۔ جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ حکومت سینیٹوریم کا افتتاح جلد کرنا چاہتی ہے، اس لیے افتتاح کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے۔ چونکہ آپ کو اپنے علاج کے لیے مزید وقت درکار ہے، اس لیے ڈاکٹر نذیر احمد بھٹہ کو میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نامزد کر دیا گیا ہے۔ مزید یہ بھی اطلاع دی گئی کہ اس موقع پر محکمہ صحت کے افسران کے علاوہ حکومت کے دیگر شعبوں کے افسران اور معروف شخصیات ڈاڈر جائیں گی اور افتتاحی تقریب کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منانے کے انتظام کیے جا رہے ہیں، کیونکہ حکومت کا یہ ایک عظیم الشان اور قابلِ فخر کارنامہ ہے۔

اِس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے خان صاحب خود یوں تحریر فرماتے ہیں:

اِس خلاف توقع عمل پر میرا دل کچھ افسردہ سا ہوا اور یہ طبعی امر تھا۔ ہر انسان کی

کچھ حوصلہ افزاء امیدیں ہوتی ہیں، جن کو پروان چڑھتا دیکھ کر اُس کی روح کو سکون وقرار ملتا ہے۔ میں نے اپنے تخیل کو ڈاڈر سینیٹو ریم کا وجود بخشا تھا۔ اپنی تمام تر صلاحیتیں مرکوز کی تھیں۔ اس لیے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ میں اپنے آپ کو اِس سینیٹو ریم کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سمجھتا تھا اور یہاں کے ڈاکٹر صاحبان اور دوسرے لوگ مجھے اسی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے۔ اِس خبر سے میرے دِل کی یہ طبعی حالت کچھ وقفہ تک تو رہی، لیکن پھر میں سنبھل گیا اور مجھے اطمینان حاصل ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھ سے اِس سے الگ کوئی اور کام لینا چاہتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقدر ہے۔ اِس طرح میرے دِل پر چھایا ہوا افسوس کا غبار بالکل چھٹ گیا اور مجھ پر کامِل ذہنی سکون اور طمانیت قلب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ البتہ میری بیوی کو، جو میرے ساتھ تھی، بہت صدمہ ہوا اور آبدیدہ ہوگئی۔ میں نے اُسے بھی تسلی دی۔

مدناپلی سینیٹو ریم کے ڈاکٹر اور دیگر عملہ بھی، آپ کو بحیثیت ڈاڈر کے ایم۔ ایس کے ہی جانتے تھے۔ اِن لوگوں نے سُنا تو اس خبر کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے آپ سے ہمدردی اور افسوس کا اظہار کیا۔

سینیٹو ریم کے افتتاح میں التواء

آروگیاورم سینیٹو ریم میں ایک خاتون زیرِعلاج تھیں۔ اُن کے شوہر خان صاحب اکثر ڈاکٹر سعید احمد خان کے پاس، شام کو آ کر بیٹھ جاتے اور اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتے رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈاڈر سینیٹو ریم کے افتتاح کی اطلاع کا خط کچھ تاخیر سے ہی ۲۹ جولائی کو پہنچا تھا۔ ۳۰ جولائی کو یہ شخص جب آپ کو ملا تو باتوں باتوں میں ذکر آیا کہ اُس نے سُنا ہے کہ ندی سرن میں طغیانی کے باعث سینیٹو ریم کی سڑک تباہ ہوگئی ہے۔

اگلے ہی روز یہ خبر وہاں کے مشہور اخبار "ہندو" میں تفصیل سے شائع ہوئی اور اِس بات کی تصدیق ہوگئی۔لکھا تھا کہ ۲۳ جولائی کو سرن میں طغیانی کے اور شدید بارشوں کے سلسلہ کے باعث، شنکیاری ڈاڈر روڈ تباہ ہوگئی ہے، اور وہاں پہنچنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ڈاڈر کا علاقہ دُنیا سے کٹ کر رہ گیا ہے، بہت سے مویشی اور ساز وسامان کو پانی بہا کر لے گیا ہے۔اور آسمانی بجلی گرنے سے جانی نقصان کے ساتھ ساتھ عمارات کو بھی نقصان پہنچا ہے، اس لیے صوبہ سرحد کے نئے تعمیر شدہ سینیٹوریم کا افتتاح ملتوی کرنا پڑا ہے۔

یہ مشیت ایزدی تھی۔کسی انسان کو اِس میں کیا دخل ہوسکتا ہے۔یہ خدائی سامان ہیں اور اُس کو ہی یہ قدرت حاصِل ہے کہ انسانی تدابیر کو یکسر بدل کر رکھ دے۔

آپ کا دوسرا کامیاب آپریشن

پہلے اپریشن کے تقریباً چھ ہفتے بعد ۱۰ اگست کو آپ کا دوسرا بڑا اپریشن (thoracoplasty) ہوا۔اپریشن کے ایک ہفتہ بعد ۱۷ اگست کو جب ڈاکٹر نے ٹانکے کھولے تو خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "آپ کی تندرستی نے تو ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے"۔

رُخصت ختم ہونے کو تھی مگر ڈاکٹر بنجمن کا یہی مشورہ تھا کہ مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے لیے مزید آرام اور اُن کی ذاتی نگرانی کی ضرورت ہے۔خود بھی آپ کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ڈاکٹر بنجمن نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ دیا اور آپ نے مزید ساڑھے تین ماہ کی اضافی چھٹی کی درخواست بھیج دی۔آپ نے ارادہ کرلیا کہ اِس رخصت کے دوران آپ آرام کے ساتھ ساتھ تربیت حاصِل کرنے کے لیے ہسپتال میں کام بھی کریں گے۔

تپِ دق کے آپریشن کی تربیت

ڈاکٹر بنجمن جو آپ کے معالج تھے، تھوریکو پلاسٹی کے بہترین سرجن مانے جاتے تھے۔خان

صاحب نے اِس تین ماہ کی رخصت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ڈاکٹر بنجمن سے تربیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ ۲۱ جون ۱۹۳۸ء سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۸ء تک آپ نے تپ دق کی تشخیص اور علاج کے متعلق کورس میں شمولیت کی۔ اِس سے قبل صوبہ سرحد میں کوئی بھی آپ کا ہم عصر اس طرح کے طریقہ علاج میں تربیت یافتہ نہ تھا۔

صحت یابی اور مراجعت

۲۴ نومبر ۱۹۳۸ءکو آپ مدنا پلی سے عازمِ سفر ہوئے (آپ کی ڈائری میں ۲۴ تاریخ کو یہ الفاظ لکھے ہیں "Started for home" (گھر کے لیے سفر کا آغاز)۔تقریباً پانچ ماہ کا لمبا قیام آپ کے لیے اور آپ کے اقارب کے لیے صبر آزما ضرور تھا مگر جب آپ واپس لوٹے تو اپنی اذیت ناک بیماری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں چھوڑ آئے۔ آپ کے والدمحترم کے ۱۹۳۲ء کے الہام کے پورا ہونے کا بھی یہی وقت مقرر تھا۔آپ کو یہ بشارت دی گئی تھی کہ مکمل صحت جب ہو گی "جب بخاری ختم ہو گی" اُسی وقت سے ڈاکٹر سعید احمد، بخاری کا مطالعہ کر رہے تھے جو ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ءکو مکمل ہوا۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

آپ کا واپسی کا سفر خوش کُن تھا۔صحت کے ساتھ واپس لوٹنا،عزیزوں سے ملنا بہت معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ گھر کے ہر فرد کے لیے تحفے تحائف لے کر آپ دیبگراں پہنچے۔ اور چند دِن تک وہاں قیام کیا۔

پشاور میں چند ماہ

رُخصت کے اختتام پر خان صاحب سعید احمد خان پشاور تشریف لے گئے اور محکمہ صحت کے افسرِ اعلیٰ سے ملاقات کی۔ سرِ دست، اُن کے پاس آپ کے لیے کوئی موزوں جگہ نہ تھی۔ لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں جنرل ڈیوٹی پر لگا کر اپنے دفتر میں کچھ کام سپرد کر دیا، جو پرانے گرد آلود دفتری

کاغذات کو درست کرنے اور ترتیب دینے سے متعلق تھا۔ یہ کام چنداں آپ کے مناسبِ حال نہ تھا اور نہ آپ کے مزاج کے مطابق تھا۔ آپ کا دِل خوش نہ تھا۔ مگر آپ نے "نوکری کیا اور نخرہ کیا" کا مقولہ سامنے رکھتے ہوئے کام ہاتھ میں لے لیا۔ منتشر ریکارڈ، گرد سے اٹی ہوئی فائلیں، اُن کو یکجا کرنا اور درست حالت میں لانا کافی صبر آزما تھا۔ مگر آئی جی کی توقع سے بہت کم مدت میں آپ نے تمام کام مکمل کر لیا اور اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آئی جی صاحب پھر متردد کہ اب آپ کو یہاں کیا کام دیا جائے۔

پشاور کے اِن چند ایام میں آپ کے ایک خواب کی تعبیر نظر آتی ہے، جو آپ نے ۹ نومبر کو مدنا پلی میں دیکھا تھا، جو آپ کی ڈائری میں تحریر ہے:

> "میں چھٹی سے واپس گیا ہوں۔ ہزارہ میں ایک دیسی ہندو سول سرجن مجھے مدنا پلی گاؤں میں ٹی بی کے چھوٹے سے ہسپتال میں جنرل ڈیوٹی پر لگاتا ہے جو مجھے پسند نہیں۔ بادلِ ناخواستہ تیار ہوں۔ پھر میں نے بتلایا کہ مجھے تو ڈاڈر سینیٹوریم میں لگایا ہے۔ جس پر وہ حیران ہوا اور اپنا خیال ترک کر دیا"۔

ڈاکٹر صاحب اپنی صحت کے بارے میں متفکر تھے۔ اپریشن کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا۔ پشاور کی گرم اور گرد آلود آب و ہوا آپ کے لیے سخت ناموزوں تھی۔ آئی جی کے سوال کے جواب میں آپ نے ڈاڈر سینیٹوریم کے نامکمل کام مکمل کرنے کی تجویز کی اور فرمایا:

> ڈاڈر سینیٹوریم کے افتتاح کے لیے قدرتی طور پر کچھ مہلت مِل گئی ہے۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے باقی کام بھی جلد از جلد مکمل کر لیے جائیں۔ مثلاً تعمیرات پر رنگ و روغن، لانوں اور پلاٹوں پر سبزہ کاری، رَوِشوں کی درستگی، شجرکاری، اور ان سے بڑھ کر وہاں کے بجلی پانی کا انتظام، فرنیچر کی آراستگی اور مشینوں اور آلات کی تنصیب اور وہاں کے عملہ اور کارکنوں کا تقرر اور دیگر ایسے

انتظامات اور یہ کام وقت طلب ہے۔آج ہی سے شروع کیا جائے تو دوتین ماہ لگ جائیں گے۔

آئی جی نے آپ کی تجویز کوسراہتے ہوئے کہا:"یہ کام آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں اوراس کواپنےحسبِ منشاءپورا کریں"۔

آپ پشاور سے رُخصت ہوکر ڈاڈر سینیٹوریم تشریف لے گئے۔ ۱۰فروری ۱۹۳۹ءکو وہاں کا چارج سنبھالا۔اورکام کی تکمیل میں مصروف ہوگئے۔آپ کی ملازمت کا دورِاوّل یہاں ختم ہوتا ہے۔اِس دورمیں آپ نے کئی مقامات پرکام کیا،زندگی کے لاتعدادنشیب وفرازدیکھے۔زیست وموت کی لمبی کشمکش سےنبردآزمارہے،کئی صدمات دیکھےاوربہت سی مسرتوں سےہمکنار ہوئے۔ لیکن ایک بات، ایک حقیقت، جوکبھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئی، وہ دین اور ایمان، جماعتی سرگرمیاں اورفرائض منصبی ہیں۔

آپ خودتحریرفرماتے ہیں:

سرکاری ملازمت کے دوران جہاں بھی رہا، میں نے اللہ تعالیٰ کےفضل وکرم سے ایسے انتظامات کو ضرور پیشِ نظر رکھا، جن کے ذریعہ پنجوقتہ باجماعت نمازوں کا اہتمام رہے۔درسِ قرآن وحدیث اورملفوظاتِ حضرت مسیح موعود کے سننے سنانے کا سلسلہ،مرکز سےعملی تعلق،سلسلہ کےاخبارورسائل اورتازہ لٹریچر سےآگاہی،احباب جماعت سےمیل ملاپ اوربچوں کی دینی تربیت کا سلسلہ جاری رہے۔چنانچہ اِس طرح ایک اجتماعی ماحول پیدا ہوتا رہااوراس ماحول میں ہمیں ایک دوسرے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کے بیشترمواقع ملتے رہے۔


DADAR
SANATORIUM
— 1939 —

پانچواں باب

سرکاری ملازمت

بحیثیت میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاڈر سینیٹوریم ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۶۴ء

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی پیشہ ورانہ زندگی کا سنہری زمانہ اسی ادارہ سے منسوب ہے، جسے ڈاڈر سینیٹوریم کے نام سے، بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ آپ اِس ادارہ کے بانی اور پہلے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ تھے۔ سینیٹوریم کا بہترین ہسپتالوں میں شمار، آپ کی محنت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا مرہون منت تھا۔ اُس زمانے میں ڈاڈر سینیٹوریم اور ڈاکٹر سعید احمد، یہ دو نام ایک دوسرے کے بغیر نامکمل سمجھے جاتے تھے۔

سینیٹوریم کی قیام کی تجویز اور جگہ کی تلاش

ڈاڈر سینیٹوریم کا چارج، بطور میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، آپ نے فروری ۱۹۳۹ء میں سنبھالا، مگر آپ اِس کے ساتھ اُس زمانے سے وابستہ تھے جب آپ ابھی مانسہرہ میں اسسٹنٹ سرجن کے عہدے پر فائز تھے۔ مانسہرہ میں آپ کی کارکردگی اور انتظامی صلاحیتوں نے افسرانِ اعلیٰ کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اس لیے جب اس علاقے میں ایک معیاری سینیٹوریم کے قیام کی تجویز ہوئی تو اُن کی نظرِ انتخاب آپ پر پڑی۔ اس لیے اس منصوبے میں قدم بہ قدم آپ کو ساتھ لے کر چلے۔ بلکہ اِس کے لیے سکیم تیار کرنے کی مکمل ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی گئی۔

ابتداء میں ہری پور کے نواح میں ایک جگہ دیکھی گئی، مگر وہاں کی گرمی اور میدانی گرد وغبار

کی آلودگی کسی طرح بھی دِق کے مریضوں کے لیے سازگار نہ ہوسکتی تھی۔ لہذا، آب وہوا کے لحاظ سے بہتر جگہ کی تلاش شروع ہوئی تو ضلع کے مختلف مقامات دیکھے گئے اور آخر مانسہرہ سے بالاکوٹ جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر بٹراسی کے جنگلات میں ایک جگہ کا انتخاب ہوا۔ لیکن پہلے مرحلے پر ہی اسے ترک کرنا پڑا، کیونکہ اُس جگہ پر دو تین مقامات پر گہری کھدائی کرنے کے باوجود پانی برآمد نہ ہوا تھا۔ اب مزید تلاش کا مرحلہ جاری تھا کہ اتفاقاً ڈاکٹر سعید احمد خان کو، ایک سفر کے دوران یہ جگہ بھا گئی، جہاں بالآخر ڈاڈر سینیٹوریم بنایا گیا۔ اس دریافت کا حال خود آپ نے ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے:

ڈاڈر کی اتفاقیہ دریافت

جگہ کی تلاش جاری تھی کہ اِس اثناء میں مجھے ایک غیرمعمولی حسنِ اتفاق پیش آیا اور مجھے ڈاڈر جانے کا موقع ملا۔ میں نے پہلے ڈاڈر کا گاؤں نہیں دیکھا تھا۔ ہوا یوں کہ ہندو لوگ زندگی کا بیمہ کروایا کرتے تھے۔ اِس سلسلہ میں ان کو میڈیکل سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک بیمہ ایجنٹ میرے پاس آیا، جس کو اپنے کسی عزیز کے لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ کی ضرورت تھی اور وہ مانسہرہ ہسپتال میں کسی وجہ سے نہ آسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے پانچ چھ اور لوگوں کا بھی میڈیکل سرٹیفکیٹ لینا تھا۔ وہ مجھے اپنے گاؤں لے گیا اور آمدورفت کے بارے میں مجھے اس نے بہت تسلیاں دیں۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ میرا سب سے بڑا لڑکا عبدالحی سعید بھی بعمر سات آٹھ سال میرے ہمراہ تھا۔ گاؤں جا کر معلوم ہوا کہ وہ شخص گاؤں میں موجود نہیں ہے اور اسے دوسرے گاؤں بھوگڑمنگ سے بلانا پڑے گا۔ علاوہ ازیں انہوں نے کہا کہ چار پانچ دوکاندار بھی ہیں، وہ یہاں نہیں آسکیں گے۔ اس بہانے سے وہ

مجھے چھ میل کچی سڑک پر لے گئے اور کہا کہ ڈاڈر کے پاس ایک ریسٹ ہاؤس محکمہ جنگلات کا ہے۔ آپ وہاں ٹھہریں۔ اور انتظار کریں۔ وہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر بھوگڑ منگ گاؤں ہے۔ وہاں سے میں اس شخص کو بلا لاؤں گا۔ ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ شام ہو چکی تھی۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ مجھے بھی شام کی اس تاریکی میں واپس لوٹنا مشکل تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے مجھے پہچان لیا۔ وہ میرا مریض رہ چکا تھا۔ اس نے اصرار کے ساتھ مجھے یہیں رات گذارنے کے لیے کہا۔ میں نے وہیں رات گذاری۔ اس نے میری بڑی خاطر مدارت کی۔ اور آرام کی ہر سہولت فراہم کی۔

علی الصبح، میں نماز سے فارغ ہو کر ذرا چہل قدمی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ گرد و پیش پر نظر ڈالی، یہاں کا ماحول مجھے بڑا سہانا دکھائی دیا۔ اطراف ونواح کی حسن کاری نے دل پر خاص اثر کیا۔ یہ ڈاڈر کا گاؤں تھا اور یہاں پر وہ تمام ضروریات فراہم ہو کر میرے آگے بکھری پڑی تھیں جو مجوزہ سینیٹوریم کے قیام اور اس کی تعمیر کے لیے ضروری تھیں۔ چیڑ کے درختوں کا جنگل تھا۔ میں نے اسے موزوں ترین مقام خیال کیا۔ پہاڑوں کے جنگل میں کافی ہموار زمین تھی۔ پہاڑی نالے، سرن کا صاف وشفاف پانی بھی بہہ رہا تھا۔

یہ اتفاقیہ دریافت میرے لیے خوشی ومسرت کا موجب بنی۔ میں نے اس مقام و ماحول کا ذکر اپنے افسروں سے کیا۔ انہوں نے اسے دیکھ کر پسند کیا اور سینی ٹوریم بنانے کے لیے اس جگہ کو حتمی طور پر منظور ومنتخب کر لیا۔

اس اتفاقی سفر کے دوران میرا خورد سال بیٹا عبدالحی سعید میرے ہمراہ تھا۔ اِس وقت وہ مرض ٹی بی کے مشہور ترین بین الاقوامی شہرت کے چند چوٹی کے

ماہرین میں سے ایک ہے۔

ڈاڈر سینیٹوریم کی منصوبہ بندی اور تعمیر

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی خودنوشت سوانح سے اقتباس:

انسپکٹر جنرل ہیلتھ صوبہ سرحد اس منصوبہ پر خصوصی توجہ دے رہے تھے، اور اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے، انہوں نے اس کی تعمیرات کا ایک نقشہ بنوا کر میرے پاس بھجوایا کہ آپ اس پر غور کریں اور اپنی تجاویز دیں۔ ان کا میرے بارے میں خیال تھا کہ مجھے تعمیرات سے بھی شغف ہے۔

ایبٹ آباد میں، پی ڈبلیو ڈی کے محکمہ میں، خان بہادر غلام ربانی خان مرحوم کے بھائی فضل حق خان مرحوم بطور ایس ڈی او تعینات تھے۔ ان کے ماتحت ڈرافٹ مین، عبدالحکیم نامی تھے جو میرے سابقہ مریض تھے۔ انہوں نے اس نقشہ کو دیکھا۔ اس میں کچھ ترمیم وتبدیلی کی۔ میرے مشورے اور ہدایت کو بھی انہوں نے پیش نظر رکھا۔ اور بڑی محنت و کاوش کے بعد نیا نقشہ بنا کر اور ضروری تجاویز کے ساتھ یہ نقشہ جب آئی جی کے پاس پہنچا تو وہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور اس کے مطابق تعمیرِ عمارات کا حکم دیا اور یہ سمجھ کر کہ مجھے تعمیرات کا بھی، تجربہ ہے، مجھے سینی ٹوریم کے کام میں لگا دیا گیا۔

ڈاڈر سینیٹوریم پر ایک طائرانہ نظر

سرزمینِ پاکستان کو 'کشورِ حسین' کہنا کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں۔ یہ ارض پاک درحقیقت حسین وادیوں اور گلپوش مرغزاروں کی سرزمین ہے، مگر قدرت نے ضلع ہزارہ کو جس فیاضی سے دلفریب مناظر سے نوازا ہے وہ اپنی جگہ بے مثال ہے۔ ایسی ہی ایک دلکش وادی میں ڈاڈر سینیٹوریم

واقع ہے۔ علاقہ ہزارہ میں دو حسین وادیاں ایک دوسرے سے متوازی واقع ہیں، جو ایک سلسلہ کوہ سے ایک دوسرے کو جدا کرتی ہیں۔ پہاڑوں کے اِس سرسبز سلسلہ کے مشرقی جانب وادی کُنہار رہے اور مغربی جانب وادی سرن۔ یہ دونوں وادیاں اِن کے بیچوں بیچ بہنے والی ندیوں کے ناموں سے موسوم ہیں۔ برفانی یخ بستہ پانی کی یہ ندیاں اپنا اپنا رنگ لیے ہوئے ہیں۔کنہار کا پانی نیلگوں اور کبھی گدلہ سا نظر آتا ہے اور سرن کا پانی اتنا شفاف کہ تہہ میں رنگ برنگے سنگریزے اور تیرتی ہوئی مچھلیاں صاف نظر آتی ہیں۔ دونوں وادیوں کے درمیانی پہاڑ کی بلندترین چوٹی پر ایک ڈاک بنگلہ، کنڈ بنگلہ کے نام سے مشہور ہے۔ چوٹی پر پہنچ کر، ایک سیاح کو دونوں وادیاں حدنظر تک اپنے قدموں تلے بچھی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ایک طرف وادی کنہار میں بالاکوٹ کی تاریخی بستی ہے، جس نے تیرھویں صدی کے مجدد، سید احمد شہید اور اُن کے جان نثاروں کے قدم چومے اور اُن کی آخری آرام گاہ بن کر تاریخی اہمیت کی حامِل ٹھہری اور دوسری جانب وادی سرن میں ملک کا مشہور ترین سینیٹوریم ہے، جس کو چودھویں صدی کے مجدد مرزا غلام احمد کے ایک غلام نے اپنے خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا ہے اور اُنہی کے نام سے اِس نے شہرت پائی۔ اُسے ایک حسنِ اتفاق کہیں یا مشیت ایزدی کہ یہ دونوں وادیاں دو مجددوں کے فیض سے بہرہ منداور فیض یاب ہوئیں اور وہی حسن اتفاق ان دونوں وادیوں کی وجہ شہرت ٹھہرے۔

مانسہرہ سے چندکلومیٹر کے فاصلے پر ایک مقام شنکیاری ہے، جسے دریائے سرن چُھوتا ہوا نکل جاتا ہے۔ مخالف سمت میں سرن کے ساتھ ساتھ سفر کریں تو اندازاً سات آٹھ کلومیٹر کے بعد ڈاڈر کی حدود کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاڈر کے داخلی دروازے سے ذرا قبل وہ خوبصورت ڈاک بنگلہ ہے جہاں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب شب بسری کے لیے رُکے تھے، اور یہی مختصر قیام سینیٹوریم کے لیے اِس مقام کے انتخاب کا سبب بنا تھا۔ سڑک کی بائیں جانب نشیبی جگہ پر، دریا کے بالکل قریب کچے

مکانوں کی ایک صاف ستھری بستی ہے۔ یہ درحقیقت ایک کیمپ جیل ہے، جہاں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن سے ڈاڈر کی تعمیر میں مشقت کا کام لیا جاتا تھا۔

ڈاڈر سینیٹوریم کا داخلی دروازہ ایک محراب کی صورت میں ہے۔ اِس محراب کے اوپر "ڈاڈر سینیٹوریم یکم مئی ۱۹۳۹ء" تحریر ہے۔ یہ سینیٹوریم کے افتتاح کی تاریخ ہے۔ اندر کی جانب ایک فارسی شعر تحریر ہے۔

؎ تنت بہ نازِ طبیباں نیاز مند مباد

وجودِ نازکت آزردۂ گزند مباد

(تیرے بدن کو طبیبوں کی ناز برداری کی حاجت نہ رہے

تیرا نازک وجود کبھی بھی کسی تکلیف سے آزردہ نہ ہو)

حافظ شیرازی کے اِس شعر کو اندر کی جانب تحریر کروانے کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے تندرست ہوکر جانے والے افراد اِس دُعا کے ساتھ رُخصت ہوں کہ وہ ہمیشہ تندرست رہیں اور پھر کبھی کسی معالج کی ضرورت اُن کو پیش نہ آئے۔

سینیٹوریم کے داخلی دروازے سے چند فرلانگ پر سڑک بائیں طرف گھومتی ہوئی دریا کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس طرح سرن بائیں جانب اور دائیں جانب چیڑھ کے درختوں میں گھری ہوئی، دور دور تک پھیلی ہوئی وہ عمارات ہیں جو ڈاڈر سینیٹوریم کے ملازمین کی رہائش گاہیں ہیں۔ چند میٹر آگے چلیں تو ہسپتال کی وہ عمارت ہے، جس میں دفاتر، معائنہ گاہیں ایکسرے روم اور اپریشن روم ہیں۔ باڑھ سے احاطہ کیے ہوئے سرسبز لان کے بیچوں بیچ رَوِش ہے، جس پر سفید سنگریزے بچھے ہوئے ہیں۔ اس پر گذر کر برآمدہ ہے۔ دو چار سیڑھیاں چڑھتے ہی سامنے ایم ایس کا دفتر ہے جس کا اندرونی منظر سفید پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ اِس دفتر کے دونوں جانب دوسرے دفاتر اور

کمرے ہیں۔ اِس عمارت کے بالکل سامنے سڑک کی دوسری جانب اسسٹنٹ سرجن کا بنگلہ ہے۔ چند گز کے فاصلے پر وسیع سرسبز لان کے بیچوں بیچ خوبصورت بنگلہ ایم ایس کی رہائش گاہ ہے۔ بنگلے کے عقب میں بڑی بڑی چٹانوں سے سر ٹکراتا، شور مچاتا سِرَن رواں دواں ہے۔ اس کے ساحل پر بکھری ہوئی ریت میں چمکتی ابرق پر تاروں کا گماں ہوتا ہے۔ بنگلے کے شمال میں ایک برساتی نالہ، سینیٹوریم کی دیگر عمارات اور بنگلے کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ نالے پر ایک خوبصورت لکڑی کا پُل ہے جو نالے کے پار جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نالے کے اُس پار بنی ہوئی عمارات میں کچھ تو عملے کی رہائش گاہیں ہیں اور کچھ مریضوں کے وارڈ ہیں۔ تمام عمارتوں کی چھتیں ٹین کی ہیں۔ اس پرسکون اور جمالیاتی حسن کے شاہکار کو دیکھ کر یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں کہ یہاں کسی وقت صِرف گھنے جنگلات تھے جہاں دِن کے وقت بھی گذرتے ہوئے لوگ خوف محسوس کرتے تھے۔ اسی ڈر کی بناء پر یہ جگہ "ڈرڈر" کہلاتی تھی۔ جو بگڑ کر 'ڈڈر' اور پھر 'ڈاڈر' بن گیا، جو یہاں کی مختصر سی آبادی کے گاؤں کا نام ہے۔ اسی بنا پر سینیٹوریم کا نام ڈاڈر سینیٹوریم رکھا گیا۔ ڈاڈر سینیٹوریم کا یہ نقشہ اُس ابتدائی زمانے کا ہے جب یکم مئی ۱۹۳۹ء کو اِس کا افتتاح ہوا تھا۔

سینیٹوریم کی تعمیر و تکمیل

سینیٹوریم کا ابتدائی تعمیراتی کام ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اپنی لمبی رُخصت برائے علاج سے قبل کروا چکے تھے۔ تاہم جب فروری ۱۹۳۹ء میں آپ مستقل طور پر یہاں رہائش پذیر ہوئے تو سیلاب سے متاثرہ سڑک کی تعمیرِ نو کے علاوہ آرائشی اور انتظامی نوعیت کے بہت سے کام مکمل کرنے کو تھے۔ آپ نے اپنی نگرانی میں، دِن رات ایک کر کے تمام کام دو تین ماہ میں سمیٹ لیے۔ سرن کے پانی سے سیراب ہوتے ہوئے اِس پُرفضا مقام کو ڈاکٹر سعید احمد خان کے ذوق اور تربیت یافتہ مالیوں کے ہاتھوں نے سنوار کر چار چاند لگا دیئے۔ خوبصورت خودرو نرگس، جو کبھی پہاڑوں کی ڈھلانوں پر بہار دکھاتی تھی اب کیاریوں میں سمٹ آئی۔ گلاب کی نایاب اقسام اور کئی دوسرے پھول، بنگلوں

کے ستونوں سے لپٹی ہوئی چنبیلی کی بیلیں، جا بجا سرسبز لان اور پھلدار پودے، آپ کے ذوق وشوق کی تعبیر بھی تھے اور مُنہ بولتا عملی ثبوت بھی۔ جنگل میں منگل کا یہ سماں دیکھنے والوں کو حیران کر گیا۔ اور بے ساختہ کہنے والوں نے کہا:

؎ اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اب سینیٹوریم ہر لحاظ سے افتتاح کے لیے مکمل ہو چکا تھا۔

ڈاڈر سینیٹوریم کا افتتاح۔ یکم مئی ۱۹۳۹ء

یکم مئی ۱۹۳۹ء کو سینیٹوریم کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ پورے سینیٹوریم کو رنگ برنگ جھنڈیوں اور پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جگہ جگہ بڑی بڑی چٹانوں اور پوسٹروں پر استقبالیہ کلمات اور اشعار لکھے گئے تھے۔ سینیٹوریم کی یہ افتتاحی تقریب کسی شادی کی تقریب سے کم نہ تھی۔ بالخصوص جس انداز سے مہمانوں کا استقبال اور میزبانی ہوئی، اُس نے ہر ایک کو متاثر کیا۔ تقریب میں سرکاری اور غیر سرکاری اہم شخصیات کے علاوہ، آروگیاورم سینیٹوریم کے ڈاکٹر بنجمن (ڈاکٹر سعید احمد خان کے معالج اور اُستاد) خاص طور پر یہاں تشریف لائے تھے۔ سرحد کے گورنر سر جارج کننگم صاحب (Sir George Cunningum) نے افتتاح کرتے ہوئے سینیٹوریم کے قیام کو اُس سال کا سب سے بڑا اور کامیاب ترین کارنامہ قرار دیا۔ افتتاح کی خبر شہ سُرخیوں اور تصاویر کے ساتھ ملک بھر کے اخبارات میں شائع ہوئی۔

سینیٹوریم میں ابتداء میں ستر مریضوں کے لیے انتظامات کیے گئے تھے۔ افتتاح کے وقت چار مریض، سالمی سینیٹوریم سے یہاں منتقل کیے گئے تھے۔ یہ صوبہ سرحد کے شہری تھے، اس لیے ان سے یہ کہا گیا تھا کہ اب اُن کے صوبے میں سینیٹوریم ہے تو وہ وہاں چلے جائیں۔ یہ مریض بہت ہی کم

عرصہ میں صحت یاب ہو گئے۔ بہت جلد سرحد کے، تقریباً ہر ضلع سے مریض آنے لگے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان خود اِس مرض کی اذیت دیکھ چکے تھے، اس لیے مریضوں کی تکلیف اور ذہنی اضطراب کو آپ سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا۔ اُن کے حُسنِ اخلاق، توجہ، علاج اور ڈاڈر کی پُرسکون فضا، مریض کی جلد صحت یابی میں معاون ثابت ہوتی تھی۔

سینیٹوریم کا انتظام وانصرام

بحیثیت میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، تمام انتظام وانصرام ڈاکٹر سعید احمد خان کے ہاتھ میں تھا، جس کے لیے ہدایات وہ براہِ راست آئی جی محکمہ صحت سے لیتے تھے۔ ایک برطانوی خاتون مِس یَنگ برطانیہ سے تربیت یافتہ نرس تھیں، جو بطور میٹرن متعین تھیں۔ وہ تمام ذیلی عملے کے کام کی نگران تھیں اور آپریشن کے دوران ڈاکٹر سعید احمد خان کی معاونت بھی کرتی تھیں۔ ابتداء میں ایک اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر عبدالرحمان مقرر ہوئے جو بوجہ خرابیِ صحت وہاں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے۔ ان کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کا تقرر ہوا جن کا تعلق وزیرآباد کے احمدی گھرانے سے تھا، اور جو ہر لحاظ سے آپ کے اچھے مددگار ثابت ہوئے۔ چند مَیل نرس اور نرسیں مدناپلی کے سینیٹوریم سے تربیت یافتہ تھیں۔ اِس طرح پر سینیٹوریم کو اعلیٰ معیار پر چلانے کے لیے ہر طرح سے حالات سازگار تھے۔

ڈاکٹر رونق زمان خان زادہ جو خود سینیٹوریم میں بطور معالج کام کر چکے ہیں، تحریر فرماتے ہیں:

ایک ادارہ اپنے سربراہ کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔ گِردوپیش خود ہی گواہی دیتے ہیں کہ وہ کس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس ہسپتال کے پودے، سڑکیں، دیواریں بتا رہی

ہیں کہ اِن کا بانی کون تھا۔ بہت تھوڑی مدت میں یہ ہسپتال ایمانداری، پیشہ وارانہ مہارت اور اپنے انتظامی امور کی بنا پر عبدالحمید عدم کے اِس شعر کی ترجمانی کر رہا تھا:

؎ کم سنی اور اس قدر ہوشیاری
ہاتھ سر پر ہے کسی اُستاد کا

(حوالہ: تحریر ڈاکٹر رونق زمان برائے ڈاکٹر عبدالکریم سعید)

وارڈوں کی درجہ بندی اس طرح تھی کہ اپنے معاشی حالات کے مطابق اگر کوئی بہتر جگہ لینا چاہتا تھا تو مل جاتی تھی، جس میں مریض کو خود اخراجات برداشت کرنا پڑتے تھے۔ دوسرے مریضوں کے لیے سرکاری کچن تھا اور آٹھ آٹھ بستروں کے وارڈ تھے۔ ہسپتال کے اوقاتِ کار، ڈیوٹی بدلنے، راؤنڈ، کھانا کھانے، آرام کرنے یا سیر کے لیے جانے کے اوقات کا پتہ گھنٹی کی 'ٹن ٹن' سے لگتا تھا۔ ہسپتال کا تمام عملہ صاف ستھرے یونیفارم میں ملبوس ہوتا تھا۔ ہسپتال کی صفائی بھی بے حد اہتمام سے ہوتی تھی۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ خود یا میٹرن، کسی جگہ بھی کسی بھی چیز کا معائنہ کرنے کے مجاز تھے۔ کام میں کوتاہی یا غفلت یا کسی قسم کی بے ایمانی سزا کا پیش خیمہ ہوسکتی تھی۔ اس لیے سبھی مستعد نظر آتے اور ہر کام باقاعدگی سے اُسی مقرر کردہ معیار پر ہوتا تھا۔ ہسپتال کے باورچی خانہ میں دو چار مرتبہ ایسے واقعات ہوئے کہ باورچی یا باورچی کے معاونین میں سے کسی کی روٹیاں، گھی یا دیگر اشیائے خوردنی کی چوری پکڑی گئی تو اُنہیں فوری طور پر برطرف کر دیا گیا۔

سینیٹوریم کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے اور اُس کی آراستگی اور پودوں پھولوں کی حفاظت کے سلسلے میں آپ کسی قسم کی کوئی کوتاہی برداشت نہ کرتے تھے۔ کبھی کسی چھوٹے بچے نے بھی وہاں

پھولوں کو کبھی نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کی۔ سینیٹوریم کے ماحول کی صفائی کے بارے میں بتاتے ہوئے راجہ ذوق اختر خان، جو اُس علاقے کے ایک متمول شخص تھے اور جنگل کے ٹھیکیدار تھے تحریر فرماتے ہیں:

> ڈاڈر میں معمولی سا واقعہ بھی اگر ہو جاتا تو وہ اُن کے (ڈاکٹر سعید احمد خان) نوٹس میں فوراً آ جاتا۔ ایک دفعہ میرے خلاف شکایت ہوئی کہ ٹھیکیدار نے گھوڑی رکھی ہوئی ہے اور اُس کی لِد سے سینیٹوریم کا ماحول خراب ہوتا ہے۔ مجھے پندرہ دِن کا نوٹس ملا کہ سینیٹوریم کی حدود سے باہر اپنے عملے اور گھوڑی کا انتظام کرو۔ چنانچہ میں نے سینیٹوریم سے کافی فاصلے پر اپنے عملے کے لیے عارضی شیڈ بنوالیا۔ (پیغام صلح، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۷ء)

ڈاکٹر سعید احمد خان خود ایک واقعہ بیان فرماتے تھے۔ ایک دفعہ فجر کی نماز کے بعد وہ اپنے معمول کی سیر کے لیے نکلے تو دیکھا کہ ایک لان میں بھینس چر رہی ہے اور بھینس کا مالک، یاقوت نامی گجر بھی موجود ہے۔ آپ اپنے سینیٹوریم کے لان کو اِس طرح برباد ہوتا کیسے دیکھ سکتے تھے۔ بلاارادہ ہی چھڑی سے اُس کی پیٹھ پر ضرب لگا دی، جس کا آپ کو بہت تاسف بھی ہوا۔ اُسے تنبیہ کی اور سیر کا ارادہ ترک کر کے گھر لوٹ آئے۔ آپ فرماتے تھے: "مجھے اپنی اِس بلاارادہ حرکت سے سخت ندامت اور تاسف ہوا اور آئندہ سیر کے دوران ہاتھ میں چھڑی رکھنا ترک کر دیا"۔ ڈاڈر سینیٹوریم سے اپنی

ملازمت کی مدت پوری کر کے جب آپ فارغ ہوئے، تو وہاں سے روانگی سے قبل، یاقوت کو بلوا بھیجا اور اپنی اس کئی سال پہلے کی زیادتی کے لیے اُس سے معافی مانگی۔

ڈاڈر سینیٹوریم کے مریض اور معالج

ڈاڈر سینیٹوریم کے مریض، معالج اور دوسرا عملہ ایک خاص نظم وضبط کے دائرہ میں مصروفِ کار نظر آتے تھے۔ سینیٹوریم کا کُل نظام ایک خودکار مشین کی طرح تھا۔ اگر ذرا سا نقص کہیں بھی ہوتو صاف نظر آجاتا تھا۔ سینیٹوریم کے اوقات گھڑی کی سوئیوں کی طرح گھنٹی کی ٹن ٹن سے بندھے تھے۔ سٹاف کی حاضری، ڈاکٹر صاحبان کا راؤنڈ، ایکسرے اور معائنہ کے اوقات، کھانے کے اوقات، آرام کا وقت، سیر وتفریح کے اوقات، غرض کوئی بھی کام ہو، جونہی گھنٹی کی آواز فضا میں گونجی وہیں عملدرآمد شروع۔ گویا خودکار مشین کا بٹن دبا دیا گیا ہو۔

خدا تعالیٰ نے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو طبی مہارت کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیتوں سے بھی نواز رکھا تھا۔ آپ کے دِل میں خدمتِ خلق کا بے پایاں جذبہ تھا، جسے آپ دوسروں میں منتقل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ آپ کے رفقائے کار اور معاونین سب آپ سے متاثر تھے۔ آپ کے ساتھ جس شخص کو بھی کام کرنے کا موقع ملا، آپ کے جذبۂ خدمت کو اپنائے بغیر نہ رہ سکا، اور فرائض منصبی کی ادائیگی میں مریضوں کی مکمل ذمہ داری، علاج، حوصلہ افزائی، محبت وشفقت کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔ ڈاکٹر صاحبان کا جذبۂ خدمت وایثار ایک جداگانہ اہمیت کا حامِل تھا، جس سے سینیٹوریم کی پوری فضا پُرسکون نظر آتی تھی۔ وہ مریض جو نہایت مایوسی کی حالت میں سینیٹوریم میں آتے، سینیٹوریم میں قدم رکھتے ہی ایک سکون اور طمانیت محسوس کرتے تھے جو اُن کے علاج میں

معاون ثابت ہوتی تھی۔

کچھ ایسا ہی ماحول تھا، جب "جلتے بجھتے دیپ" کی مصنفہ محترمہ بلقیس چیمہ صاحبہ یہاں تشریف لائیں۔ جب اُنہوں نے سینیٹوریم میں قدم رکھا تو وہ بہت خوفزدہ تھیں۔ مگر لمحوں ہی میں اُن کا وہ خوف جاتا رہا۔ وہ تحریر فرماتی ہیں:

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں سینیٹوریم آنے کی بجائے کسی الف لیلوی زمین میں آ گئی ہوں۔ جہاں آہوں سسکیوں اور کھانسی کی دِل ہلا دینے والی آوازوں کی بجائے مترنم اور کھنکتے قہقہے ہیں۔ جہاں زرد اور مریل چہروں اور ہڈیوں کے خوفناک جیتے جاگتے انسانی ڈھانچوں کی بجائے گلاب کی طرح کھلے ہوئے چہرے، زندگی کی چمک سے منور آنکھوں والے تندرست وتوانا جسم ہیں۔ خوف اور دہشت کے سائے، جو میرے دِل و دماغ پر لہرا رہے تھے جانے کہاں غائب ہو گئے۔ اُمید کی نئی روشنی سے میرے دل و دماغ جگمگا اُٹھے۔ خان بہادر صاحب کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی مریض ہسپتال میں علاج کی غرض سے داخل ہوتا، وہ بذاتِ خود مریض سے اُس کے وارڈ میں جا کر ملتے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب خود اس اذیت سے بخوبی واقف تھے جو تپ دِق کے مریض کے دِل میں پیدا ہوسکتی ہے، اس لیے وہ خود پہلے مریض کا اعتماد بحال کرتے تاکہ اُس کے دِل سے مرض کا خوف دور ہو جائے اور وہ اپنا علاج کرانے میں اپنے معالجوں سے تعاون کر سکے۔

محترمہ بلقیس چیمہ خان بہادر صاحب سے پہلی ملاقات کا حال یوں بیان فرماتی ہیں:

ایک نرس نے خان بہادر صاحب کے آنے کی اطلاع کی جو میرا حال پوچھنے آ رہے تھے۔

"السلام علیکم" کیا حال ہے" ایک شفیق سی آواز سنائی دی۔

شفقت و محبت، نرمی، حلیمی، وقار و سنجیدگی، رعب و دبدبہ یعنی جلال و جمال کا پیکر۔۔۔ یہ تھے خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان انچارج ڈاڈر سینیٹوریم۔

وہ مزید لکھتی ہیں:

خان بہادر صاحب مسکرائے اور پھر بڑی شفقت سے بولے: 'آپ اپنی بیماری کے متعلق سوچنا بالکل چھوڑ دیں۔ آپ کی بیماری کے متعلق فکر کرنا اب ہمارا کام ہے۔ آپ خوش رہیں۔ ڈاکٹروں کے ساتھ تعاون کیجئے۔ یہی آپ کا کام ہے۔ آپ انشاء اللہ جلد صحت یاب ہو کر جائیں گی'۔ خان بہادر صاحب چلے گئے اور بیماری کے متعلق میرے پریشان کن خیالات بھی ساتھ ہی لے گئے۔ (حوالہ: جلتے بجھتے دیپ، تحریر بلقیس چیمہ صاحبہ)۔

خان بہادر صاحب کو مرض کی تشخیص میں بھی خاص مہارت حاصِل تھی۔ بعض اوقات ایسے مریض بھی آپ کے پاس آتے تھے، جن کی علالت کو تپ دق قرار دے کر آپ کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ آپ دیکھتے ہی، بغیر معائنہ کیے بتا دیتے اور تسلی دیتے کہ اس مریض کو دق کا مرض نہیں۔ ایک مریضہ آپ کے پاس لائی گئیں۔ جب وہ آئیں تو نہایت خوفزدہ اور خدشات میں گھری ہوئی تھیں۔ آپ نے دیکھتے ہی کہا: "بی بی! آپ کیوں اتنی پریشان ہیں، میرے خیال میں تو آپ کو عام سی کھانسی زکام ہے اور ہلکا سا بخار۔ وہ اپنے ساتھ جو ایکسرے لائی تھیں وہ دکھایا۔ ایکسرے میں پھیپھڑے پر بہت نمایاں ایک لمبا سا نشان تھا، مگر خان بہادر صاحب کو یہ کسی طرح سے تپ دق کا نشان نہ لگتا تھا۔ آپ نے مریضہ کی طرف دیکھا۔ اُن کے لمبے بال چٹیا میں گندھے ہوئے تھے۔ آپ کو اندازہ ہو گیا۔ اس لیے فوراً نیا ایکسرے کروایا اور اس سے پہلے بال جوڑے کی صورت میں بندھوا دیئے۔ نتیجہ سامنے تھا۔ بالکل بے داغ ایکسرے۔ دق کی مایوس مریضہ چند لمحوں میں تندرست،

خوش وخرم گھر واپس لوٹ گئی۔

ایک اور واقعہ محترم ڈاکٹر اصغر حمید صاحب، امیر جماعت احمدیہ چہارم کی زوجہ محترمہ کا ہے جو امیر مرحوم کے الفاظ میں پیش ہے:

میری بیوی بہت بیمار ہو گئی۔ دیر تک علاج ہوتا رہا۔ بالآخر ایک لیڈی ڈاکٹر نے انتڑیوں کی ٹی بی تشخیص کی۔ اور تین چار دواؤں سے علاج شروع کیا۔ بیماری پر تو فرق نہ پڑا، البتہ کمزوری تو پہلے ہی بہت تھی مزید بڑھ گئی۔ باہمی مشورہ سے ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ڈاڈر سینیٹوریم لے جایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب وہاں سپرنٹنڈنٹ تھے اُن سے رابطہ کیا۔ اُنہوں نے مہربانی سے وہاں داخلہ دیا۔ وہاں گئے۔ کچھ ٹیسٹ ہوئے ہوں گے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کیا کہ اول تو مریضہ کو انتڑیوں کی ٹی بی ہے ہی نہیں۔ دوسرے اگر تھوڑا بہت شبہ ہوتا بھی تو کمزوری کے پیش نظر تین چار دواؤں کا اکٹھا استعمال مناسب نہ تھا۔ ایک ہی دوائی دینا چاہئے تھی۔ آپ کی رائے میں اصل مرض پرانا ملیریا تھا جس کے لیے ٹیکوں کا کورس کروایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ اور مریضہ شفایاب ہو کر گھر واپس آ گئیں۔ (حوالہ: پیغام صلح نومبر، دسمبر ۱۹۹۷ء)

خان بہادر صاحب کی ایک مریضہ، رابعہ خانم جو بعد میں گورنمنٹ جامع ہائی اسکول ایبٹ آباد کی پرنسپل رہنے کے بعد ریٹائر ہوئیں، تحریر فرماتی ہیں:

پاکستان بنے زیادہ وقت نہیں گذرا تھا۔ میں ایک ٹیچر ٹریننگ سکول میں زیرِ تربیت تھی۔ وہیں سے قسمت مجھے ڈاڈر سینیٹوریم میں لے گئی۔ حد سے گذری ہوئی بیماری، صحت یابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مایوسی کی اتھاہ گہرائیاں تھیں اور موت کا انتظار۔ ایسے وقت میں ایک مسیحا جس کی شخصیت عظمت، پاکیزگی، شفقت اور محبت کا ایک حسین امتزاج تھی، جو ہر دُکھی کا خدا کے بعد

سہارا تھا۔ جو دوا کے ساتھ اپنے مریض کے لیے سحر میں دُعا گو ہوتا تھا۔ اُس کی بے پناہ توجہ، شفقت اور مہربانی مجھے خدا کے فضل سے موت کی وادیوں سے واپس کھینچ لائی۔ وہ عظیم ہستی جو کسی دُکھی کے پاس چند لمحے ٹھہر کر کچھ الفاظ ڈھارس اور حوصلے کے کہہ دیتا تھا تو اُس کی آدھی تکلیف دور ہو جاتی تھی۔ اُسی کی دُعا، توجہ، مہربانی اور علاج نے صحت لوٹا کر مجھے پھر سے فعال دُنیا میں پہنچا دیا۔

مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں اچھے مقام پر پہنچ گئی۔ اکثر سوچتی ہوں اگر اس پروقار شخصیت کی مہربانی اللہ کے فضل سے میرے شاملِ حال نہ ہوتی، تو شاید زمانہ کئی دہائیاں قبل مجھے فراموش کر چکا ہوتا۔ میری دُعا ہے:

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو ترا

(بحوالہ پیغام صلح نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء)

نوٹ: محترمہ رابعہ خانم صاحبہ کا ۲۰۰۸ء میں انتقال ہو گیا۔ وہ راقمہ کی استاد رہی ہیں۔ اور زندگی کے آخری ایام میں خان بہادر صاحب کے فرزند ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب کے زیرِ علاج تھیں۔

خان بہادر صاحب ایک ماہر سرجن تھے۔ آپ نے تپ دِق کے اپریشن کرنے میں خاص تربیت حاصِل کی تھی اور ڈاڈر سینیٹوریم کی ملازمت کے دوران سینکڑوں کامیاب اپریشن کیے۔ اپریشن کا دِن پورے سینیٹوریم کے لیے ایک خاص دِن ہوتا تھا۔ تمام عملہ مستعد اور تیار اور تمام مریض اپنے ساتھی مریض کے لیے دُعا گو اور متفکر۔ خود خان بہادر صاحب گھر سے روانگی سے قبل، نفل ادا کر

کے خصوصی دُعا فرماتے ۔ اور گھر میں موجود لوگوں سے بھی دُعا کے لیے کہتے ، کچھ صدقہ خیرات بھی ضرور کرتے ۔ خدا تعالیٰ کا خصوصی فضل آپ کے شاملِ حال رہا اور اپریشن کے دوران کوئی جان تلف نہیں ہوئی ۔

خان بہادر صاحب نے ایک واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک مریضہ کے اپریشن کے سلسلہ میں وہ بہت پریشان تھے ۔ وہ بہت کمزور تھی ۔ بہت دُعا کی ۔ مس ینگ (برطانوی میٹرن) نے بہت تسلی دی اور اپریشن کے بعد وہ خود رات بھر مریضہ کے پاس رہ کر دیکھ بھال کرتی رہی ۔ خدا تعالیٰ نے مریضہ کو مکمل صحت عطا فرمائی ۔

خان بہادر صاحب کی سرجری میں ماہرانہ صلاحیت کا ذکر کرتے ہوئے، ڈاکٹر رونق زمان تحریر فرماتے ہیں :

> اُس زمانہ میں یعنی ۱۹۳۹ - ۶۴ ء کے درمیان ہر قسم کی جراحی مرحوم خان بہادر صاحب، لوکل اَنستھیسیا (local anaesthesia) سے کرتے تھے جس میں چیسٹ سرجری بھی شامِل ہوتی تھی، جس کی جرأت موجودہ جدید سامان اور سہولیات کے باوجود شاید ہی کوئی کر سکے ۔

ڈاڈر سینیٹوریم میں آپ نے سب سے پہلا اپریشن میجر محمد زمان صاحب کی صاحبزادی حفیظہ درانی کا کیا تھا ۔ اُس وقت وہ ایک نوعمر لڑکی تھیں ۔ خدا تعالیٰ نے اُن کو صحت اور لمبی زندگی عطا کی اور اب وہ ماشاءاللہ بیٹے بیٹیوں اور پوتوں نواسوں والی ہیں اور ایک فعال زندگی گذار رہی ہیں ۔

بابو فقیر محمد ریڈیو گرافر کا تاثر :

> آپ جیسا ڈاکٹر صوبہ سرحد میں کوئی نہ تھا ۔ مریض کو بھرپور توجہ دیتے تھے ۔ مریض کے ساتھ کسی کی بے توجہی برداشت نہ کر سکتے تھے ۔ لاپرواہی کی

اجازت نہ تھی۔ چیسٹ کے جتنے اپریشن ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے کیے ہیں شاید ہی کسی اور سرجن نے کیے ہوں۔

مسز ثریا اقبال صاحبہ آپ کی ایک دیرینہ مریضہ نے کہا:

خان بہادر صاحب کا مریض کو دیکھ لینا ہی شفا کی طرف پہلا قدم ہوتا تھا۔ آپ کی نرم گفتگو اور تسلی آمیز الفاظ سے بیماری کا احساس ہی جاتا رہتا تھا۔

محترم جناب میاں فضل احمد صاحب نے ایک مرتبہ دورانِ تقریر فرمایا:

میں ایک دفعہ ڈاڈر سینیٹوریم میں خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان کا کچھ دِن مہمان رہا۔ اس دوران ہسپتال کے مریضوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک مریض فیصل آباد کا تھا اور میرا شناسا تھا۔ کہنے لگا: "خان بہادر صاحب جب وارڈ میں تشریف لاتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ آسمان سے فرشتہ اُتر آیا ہے۔ اب شفا ہو ہی جائے گی۔"

۱۹۴۶۔ ۴۷ء کے زمانہ میں ایبٹ آباد کے ایک معروف سکھ خاندان کا ایک نوجوان ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے زیرِ علاج تھا۔ وہ ابھی شفایاب ہوا ہی تھا کہ تقسیم ہند کی وجہ سے یہ خاندان بمع اُس نوجوان کے ہندوستان ہجرت کر گیا۔ اور خان بہادر صاحب سے اِن کا کوئی رابطہ نہ رہا۔ ۱۹۸۷ء میں اِس نوجوان کی بہن اور دیگر خواتین جو کینیرڈ کالج لاہور کی پرانی طالبات تھیں، وہ کالج کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے آئیں تو اولین فرصت میں خان بہادر صاحب کا پتہ معلوم کر کے دارالسلام لاہور میں آپ کے پاس حاضر ہوئیں۔ وہ بار بار یہی کہتی تھیں "ایک بوجھ چالیس سال سے دِل پر تھا کہ حالات نے ہمیں اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ اب جبکہ ہمارا بھائی تندرست، خوشحال اور صاحبِ اولاد ہے تو یہ دیکھ کر خیال ستاتا رہتا تھا کہ اُس کے معالج کا ہم احسان

تو کیا چکاتے شکریہ ادا کرنے کا موقعہ بھی نہ ملا تھا۔آج آپ سے مل کر دِل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔

ڈاڈر سینیٹوریم سے جب کسی مریض کے شفایاب ہو کر رُخصت ہونے کا وقت آتا تو پورے سینیٹوریم میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ الوداعی تقریبات کے بعد ہاروں سے لدے ہوئے ،اس تندرست، خوش وخرم شخص کو خان بہادر صاحب خود رُخصت کرنے آتے۔محبت اور شفقت سے آئندہ زندگی کے لیے ہدایات دیتے اور سب مل کر دُعا کے ساتھ رُخصت کر دیتے۔محترمہ بلقیس چیمہ کی کتاب "جلتے بجھتے دیپ" سے اقتباس:

> صبح راؤنڈ پر خان بہادر صاحب آئے۔کتنی شفقت اور کتنے خلوص سے اُنہوں نے مجھے الوداع کہا تھا۔ میں وہ شفقت وہ خلوص زندگی بھر نہ بھول سکوں گی۔ خان بہادر صاحب مومن آدمی تھے۔ دوا کے ساتھ دُعا کے بھی قائل۔ میں اُن کی خلوص میں ڈوبی ہوئی دُعائیں لے کر کمرے سے باہر نکلی۔ اب میں سہیلیوں کے جھرمٹ میں کھڑی تھی، جو مجھے ہار پہنا رہی تھیں۔ان ہاروں کے پھولوں میں خلوص کی طراوت اور پیار کی مہک رچی ہوئی تھی۔ بس کا وقت ہوا جا رہا تھا۔ میری سکھیوں، میرے دُکھ درد کے ساتھیوں نے مجھے سر سے پاؤں تک پھولوں سے لاد، آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ان گنت دُعاؤں کے ساتھ رُخصت کر دیا۔

ڈاڈر سینیٹوریم سے ہزاروں مریض حیاتِ نو کا مژدہ لے کر رُخصت ہوئے۔ اور اپنے اپنے کاروبار، ملازمت اور دیگر مصروفیت میں مگن ہو گئے۔کئی نوجوان لڑکے لڑکیاں ادھوری تعلیم کو مکمل کر کے گھریلو زندگی میں ایک عام تندرست آدمی کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔کئی دیگر مریضوں کی طرح رابعہ خانم ،بلقیس چیمہ اور نثار عزیز صاحبہ نے دق سے شفایابی کے بعد ہی اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئیں۔اِن میں سے محترمہ بلقیس چیمہ اور محترمہ نثار عزیز

صاحبہ نے سینیٹوریم سے وابستہ یادوں کو کتابی صورت میں عوام تک پہنچایا۔ بلقیس چیمہ نے" جلتے بجھتے دیپ" تصنیف کی اور محترمہ نثار عزیز صاحبہ نے"نگری نگری پھرا مسافر" تحریر فرمائی۔

ڈاڈر سینیٹوریم کے مریضوں میں اعلیٰ افسران، سیاسی شخصیات، امراء اور خوانین، دانشور، شاعر اور ادیب، مزدور اور کسان، ہندو، سکھ، عیسائی غرض ہر طبقہ اور ہر ملت و مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ اور ہر ایک اپنے مقام پر اُتنی ہی توجہ، اُتنی ہی محبت اور صحیح علاج کا حقدار تھا۔ کبھی کسی سے کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا گیا۔ خان بہادر صاحب کی اپنی اکلوتی بھانجی، ہسپتال میں زیرِ علاج تھیں اور مکمل طور پر تمام قوانین و قواعد کی پابندی اُسی طرح کرتی تھیں، جس طرح باقی مریض۔ اور کبھی بھی کوئی ایسی مراعات اُن کو حاصِل نہیں رہیں جو دوسرے مریضوں کو نہ ہوں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سینیٹوریم کے مریضوں اور معالجوں میں ایک انوکھا سا شفقت اور عقیدت کا رشتہ تھا۔ معالج سراپا شفقت اور مریض سراپا عقیدت و محبت۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سب ایک ہی کنبے کے فرد ہیں، جن کی خوشیاں اور غم سانجھے ہیں، جن کے آنسو اور مسکراہٹیں ایک دوسرے کے لیے ہیں۔

سینیٹوریم میں تفریح کا انتظام

شہری آبادی سے دور ہونے کے سبب یہاں عام تفریحات میسر نہ تھیں۔ اس لیے ایسے انتظام کی ضرورت تھی جس سے مریض اور سٹاف دونوں فائدہ اُٹھا سکیں۔

ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹو بلاک کے ساتھ ایک کھلا میدان تھا جو والی بال اور بیڈمنٹن کے لیے مخصوص تھا۔ عملے کے افراد یہاں کھیلا کرتے تھے۔ تیراکی اور ماہی گیری کے شائقین کے لیے سرِ دعوت عام تھا، مگر صرف ایسے اوقات میں وہاں جانے کی اجازت تھی، جب یہ شوق مریضوں کے

آرام یا سیر کے اوقات اور معمولات میں مخل نہ ہو۔ بعض شائقین جنگل میں شکار کے لیے بھی نکل جاتے تھے۔

مریضوں کی تفریح کے لیے ایک آڈیٹوریم اور اُس سے ملحق ایک لائبریری تھی۔ آڈیٹوریم میں کیرم، ڈرافٹ، تاش وغیرہ جیسے کھیل موجود تھے۔ ریڈیو اور گراموفون بھی تھا۔ اکثر مریض اپنے ریڈیو اور گراموفون بھی پاس رکھتے تھے۔

اسی آڈیٹوریم میں سٹاف کے لوگ اور وہ مریض جو تقریباً تندرست ہو چکے ہوتے، مِل جُل کر چھوٹے موٹے ڈرامے بھی پیش کیا کرتے تھے۔ جو سب کے لیے اچھی خاصی تفریح فراہم کرتے تھے۔ ایک بزم "مجلس زندہ دلانِ ڈاڈر" کے نام سے قائم تھی، جو مریضوں اور سٹاف کے ادبی ذوق کو پورا کرتی تھی۔ تقاریر، مشاعرے، مزاحیہ خاکے اور نظمیں مختلف مجالس میں پیش کی جاتی تھیں۔

انھی مجالس میں ڈاکٹر جی۔ ایم ناز اور ڈاکٹر عثمانی اور عبدالقیوم قائم جیسے بلند پایہ دانشور جو سینیٹوریم میں زیرِ علاج تھے، اپنا کلام اور ادبی تخلیقات سے حاضرین کو نوازتے رہے ہیں۔ کئی دوسرے شائقین بھی نظمیں اور خاکے پیش کرتے۔ بعض اوقات تو خود ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب بھی اِن کی طبع آزمائی اور مزاح کے نشانے سے نہ بچ پاتے۔ اور اسی طرح ہر ایک کو محظوظ و مسرور ہونے کا موقع ملتا رہتا۔

بعض اوقات ایک 'سفری سینما' بھی منگوایا جاتا۔ بعد کے سالوں میں اپنا پروجیکٹر بھی لے لیا گیا تھا جس کی مدد سے کھلے میدان میں پروگرام کے مطابق سینما کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

خواتین مریضوں کی اپنی دلچسپیاں تھیں۔ اکثر کڑھائی سلائی، بنائی میں لگی رہتیں۔ اپنے طور پر چھوٹی موٹی دعوتیں، گڑیا گڈوں کے بیاہ شادیاں۔ گیت سنگیت کی محفلیں ہوتی رہتیں۔ ڈاکٹر

سعید احمد خان اس قسم کی تفریحات پر کبھی کوئی پابندی نہ لگاتے تھے۔

ڈاکٹر خانزادہ رونق زمان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

مرحوم نے جہاں سینیٹوریم میں وقتاً فوقتاً بے شمار کمروں کا اضافہ کیا، وہاں ڈاکٹروں کے بیٹھنے اور مہمانوں کے ٹھہرنے کے لیے دریا کے کنارے ایک کلب بھی بنوایا۔ جس میں ایک بہت بڑی لائبریری بھی تھی جس میں طب پر ایسی ایسی کتابیں موجود تھیں، جن کا اندازہ لگانا اور سپردِ قلم کرنا احقر کے بس کی بات نہیں۔

ڈاڈر سینیٹوریم کی عیدیں اور تہوار بہت بارونق ہوتے تھے۔ اُس دِن سوائے اُن مریضوں کے جن کو بستر پر آرام کی ہدایت ہو، باقی سب لوگ اپنے تیمارداروں اور معالجوں کے ہمراہ نماز ادا کرتے تھے۔ نماز ڈاکٹر سعید احمد خان خود پڑھاتے تھے۔ نماز کے بعد مٹھائی سے سب کی تواضع ہوتی۔ اُس کے بعد ڈاکٹر سعید احمد صاحب اور دوسرے ڈاکٹر خود جا کر اُن مریضوں سے ملتے جو نماز کے لیے نہیں آسکتے تھے۔ ایک عید کا ذکر محترمہ بلقیس چیمہ صاحبہ نے یوں تحریر کیا ہے:

خان بہادر صاحب کے مکان کے قریب ہی سرن کے پاس نماز پڑھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ شامیانہ لگا تھا اور دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف خواتین کے لیے پردہ کا انتظام تھا۔ ہم پہنچے تو نماز شروع ہونے والی تھی۔ سب نے نماز پڑھی۔ پھر خان بہادر صاحب نے خطبہ دیا۔ پہلے عید کی اہمیت واضح کی۔ پھر بڑے ہی مؤثر پیرائے میں بیماری اور تکلیف کا صبر وعزم کے ساتھ مقابلہ کرنے کی تلقین کی۔ مرد نمازی خان بہادر صاحب کے بیٹوں سے گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ اور ہم سب خان بہادر صاحب کے گھر چلے گئے۔ گھر کی سب خواتین بڑی خوش اخلاقی اور تپاک سے ملیں۔ ہمارے پاس بیٹھنے، باتیں

کرنے میں انہیں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ خان بہادر صاحب کے بیٹے کی شادی کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ ہم سب کو دُلہن دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ آج وہ خواہش بھی پوری ہوگئی اور گھروں میں جو عید کے ہنگامے ہوتے ہیں وہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے۔ پھر خوشی خوشی ہلکے پھلکے دلوں کے ساتھ وارڈ میں آئے۔

ڈاڈر سینیٹوریم میں خان بہادر صاحب کے معمولات

خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی تمام تر زندگی ایک با قاعدہ نظم وضبط کے تحت گذاری۔ چوبیس گھنٹے کے نپے تُلے وقت میں جتنا کام وہ کرتے تھے، وہ انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ یہ انسان کب سویا، کب اُس نے کھایا پیا اور کب کون سا کام کرے گا۔ اور مزید یہ کہ نہ کبھی چہرے پر کوئی اضمحلال اور نہ تھکاوٹ کے آثار نظر آئے۔

آپ سحر خیز تھے۔ نمازِ فجر کے بعد سیر آپ کا معمول تھا۔ پھر تھوڑا سا آرام فرما کر آپ دفتر کے لیے تیار ہو جاتے۔ معمول کے مطابق وارڈز کا راؤنڈ، مریضوں کا معائنہ، تشخیص، علاج سب آپ کی اپنی ذاتی نگرانی میں سرانجام پاتا تھا۔

ہسپتال سے گھر پہنچنے پر سفید کوٹ باہر ہی اُتار دیتے۔ غسل فرما کر نماز ظہر ادا کرتے اور کھانے کے بعد آرام کے لیے تشریف لے جاتے۔ اپنی رہائش گاہ سے ذرا فاصلے پر دریائے سرن کے قریب آپ نے ایک چھپر بنوا رکھا تھا۔ خوبصورت مناظر کے درمیان کھلی فضا میں آرام اور پھر نماز عصر کے بعد چائے وہاں ہی پیتے۔ آپ کے اکثر ملاقاتی اور مہمان اُسی وقت تشریف لاتے۔ بعض دوست احباب اور افسران مانسہرہ اور ایبٹ آباد سے تفریح کی غرض سے نکل آتے اور آپ کے ساتھ چائے میں شامِل ہو جاتے۔ ایسے موقعوں پر آپ خاص اہتمام کرواتے اور آپ کے ماہر باورچی شیر زمان لالہ طرح طرح کے کیک، مٹھائیاں اور کباب گھر پر ہی تیار کر کے پیش کرتے۔

ایک موقعہ پر میاں فضل احمد صاحب نے دورانِ تقریر ذکر فرمایا:

مجھے ہفتہ بھر خان بہادر صاحب کے ساتھ ڈاڈر سینیٹوریم میں گذارنے کا اتفاق ہوا۔ دریا کے قریب ایک چھپر سا بنا ہوا تھا۔ اکثر وہاں ہی مغرب کی نماز اور بعض اوقات فجر کی نماز پڑھتے تھے۔ دریا کی مترنم موجوں اور اِس خوبصورت فضا میں آپ کی قرآن کی خوش الحانی عجیب سماں پیدا کر دیتی اور نماز میں بے انتہا لطف آتا۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے آپ مختصر سا راؤنڈ کرتے اور صرف اُن مریضوں کو دیکھتے جن کو خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی۔ مغرب کی نماز کے بعد درسِ قرآن و حدیث ہوتا۔ اُس کے بعد آپ اپنی ڈاک دیکھتے اور پھر عشاء کے بعد گھر کے اندر تشریف لاتے۔ اگر مہمان ہوں تو پھر کھانا باہر مہمانوں کے ساتھ تناول فرماتے۔ کبھی کبھار جب اہل خانہ کے ساتھ کھانا کھانے کا موقعہ ہوتا، تو بے تکلفانہ بات چیت کرتے اور بچوں کی تربیت کو مدِّنظر رکھتے۔ دوپہر کو اور رات کو آرام کے وقت اخبار یا کتب کا مطالعہ کرتے۔ ریڈیو سے خبریں اور تقاریر سننا بھی آپ کے معمولات میں شامل تھا۔ جمعہ کا با قاعدہ اہتمام ہوتا تھا۔ جمعہ کے روز، بعد از نمازِ عصر آپ دریا کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے درود و استغفار پڑھتے۔ اگر فاصلے سے کوئی سُننے کی کوشش کرتا تو ہلکی سی مترنم آواز سُنائی دیتی۔ [۱]

۱: اپنی زندگی کے آخری ایام میں، آپ نے راقمہ کو بتایا تھا کہ وہ عصر کے بعد مغرب تک دُرود شریف اور استغفار پڑھتے ہیں اور والدین کی مغفرت کے لیے خصوصی دُعا فرماتے ہیں۔

جب تک سعید احمد خاں صاحب کے والد حیات تھے، آپ اتوار کا دن اُن کے ساتھ گاؤں میں گذارا کرتے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد آپ اتوار کو ایبٹ آباد جانے لگے، جہاں آپ کے دوست شیخ محمد احمد صاحب کے مکان پر مریض طبی مشورے اور علاج کے لیے آتے تھے۔ آپ کے اِس معمول کی شہرت عام ہوگئی تو ڈاڈر سے ایبٹ آباد تک جگہ جگہ لوگ اپنے مریضوں کو لے کر آپ

کے انتظار میں بیٹھے ملتے۔ مانسہرہ میں خان بہادر غلام ربانی خان صاحب کے مکان پر بھی مریض موجود رہتے۔ اِس طرح آپ کا چھٹی کا دِن بھی خدمتِ خلق کے لیے مخصوص تھا۔

ڈاڈر سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے ڈاڈر تک کے سفر کا وقت آپ قرآنِ پاک کا کوئی حصہ حفظ کرنے میں صرف کرتے۔ اور بلند اور پُرسوز آواز میں قرأت فرماتے۔ اگر کوئی اور ہم سفر ہوتا تو وہ بھی اِس سے متاثر ہوتا۔ اس طرح حفظِ قرآن کا عمل اِس عرصہ میں جاری رہا۔

خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی اِس قدر مصروفیات کے باوجود، مہمانوں اور ملنے والوں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اُن کے آجانے سے آپ کے کام میں کوئی خلل واقعہ ہوا ہے۔ ہر ایک سے تپاک سے ملتے اور کبھی کسی ملاقاتی کو اپنی مصروفیات کے حوالے سے مایوس نہیں لوٹایا۔ تاہم آپ کا کوئی کام کبھی ادھورا یا نامکمل بھی نہیں رہا۔ اور یہ سوائے تائیدِ خداوندی کے اور کیا تھا؟

نماز باجماعت اور درس کا اہتمام

خان بہادر سعید احمد خان صاحب کو اگر ایک بھی دوسرا نمازی ساتھ دینے کو میسر آجاتا تو آپ باجماعت نماز ادا کرنا پسند فرماتے تھے۔ ڈاڈر سینیٹوریم میں ابتدائی دنوں میں صرف اپنے گھر کے افراد کے ساتھ نماز باجماعت اور درس کا اہتمام کیا اور نماز جمعہ کا بھی آغاز کیا۔ آپ کے سٹاف میں بھی چند احباب احمدی تھے۔ وہ بھی درس اور نمازوں میں شامل ہونے لگے اور جب اس کا چرچا زیادہ ہوا تو غیر از جماعت لوگوں نے بھی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اسی طرح چند روبصحت مریضوں نے بھی شمولیت کی خواہش ظاہر کی تو اُنہیں بھی درس میں شمولیت کی اجازت مِل گئی۔

نماز اور درسِ قرآن عموماً آپ کے گھر پر ہی ہوتا تھا۔ موسم اچھا ہوتو باہر لان میں ایک پختہ فرش پر، جو خاص اسی مقصد کے لیے بنوالیا گیا تھا، وہاں ہوتا تھا۔ ایسی ہی ایک جگہ آپ کے چھپر کے ساتھ بھی بنادی گئی تھی۔ عموماً جمعہ اور نمازِ عیدین یہاں ادا کی جاتی تھیں۔ نماز عید کے بعد تمام حاضرین

کی تواضع مٹھائی سے کی جاتی تھی۔

سینیٹوریم میں مسجد کی تعمیر

پتھروں سے بنی ہوئی، ٹین کی ڈھلوان چھتوں والی عمارت، جو ہسپتال کے مین بلاک سے ذرا ہٹ کر اور خواتین کے سپیشل بلاک کے سامنے، باقی سب عمارتوں سے بلند اور منفرد نظر آتی ہے، سینیٹوریم کی مسجد ہے۔ جو ایک وسیع ہال، برآمدے، صحن اور دو گیلریوں پر مشتمل ہے۔ ایک گیلری مریض خواتین کے لیے مخصوص ہوا کرتی تھی اور دوسری دیگر خواتین کے لیے۔ یہ مسجد خان بہادر صاحب کی کوششوں اور آپ کی ذاتی نگرانی میں بنی تھی۔ ابتداء ہی میں آپ نے ایک نوجوان احمدی، حافظ غلام رسول کا وہاں تقرر کیا (حافظ صاحب مولوی احمد گل صاحب کے بھائی ہیں)۔ حافظ صاحب رمضان میں نمازِ تراویح پڑھاتے، اور بچوں کو قرآن بھی پڑھاتے تھے۔

اکثر نمازوں کی امامت خان بہادر صاحب خود فرماتے تھے اور ڈاڈر کے اکثر مکین بلا امتیاز فرقہ وعقیدہ آپ کی اقتداء میں نماز ادا کرتے اور درس قرآن و حدیث سے مستفید ہوتے تھے۔

جلد ہی یہ پُرسکون اور پُرامن ماحول شر پسندوں کی نگاہ میں کھٹکنے لگا۔ سٹاف میں مخالفت کے آثار نظر آنے لگے۔ کچھ احتجاج ہوا، شر پسندوں نے ہوا دی اور یہ بات عام طور پر پھیلا دی گئی کہ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اپنے اختیارات کو بے جا استعمال کر کے لوگوں کو زبردستی احمدی بنا رہا ہے۔ نتیجتاً جمعہ اور عید کی پر رونق تقریبات مسجد سے نکل کر ایک بار پھر آپ کے بنگلہ پر سمٹ آئیں۔ جماعتِ احمدیہ کے ارکان اور غیر متعصب لوگ پھر بھی آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہوتے اور درس سے مستفید ہوتے رہے۔

نوٹ: مسجد سے متعلق یہ واقعات آزادیٔ وطن کے چند سالوں بعد رونما ہوئے۔

سینیٹوریم میں اسکول کا قیام

ڈاکٹر سعید احمد خان نے قیامِ سینیٹوریم کے فوراً بعد ہی محسوس کیا کہ سینیٹوریم میں کام کرنے والے عملے کے بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ اُن کے اپنے بچے بھی ابھی زیرِ تعلیم تھے۔ فوری طور پر کیمپ جیل کے ایک پڑھے لکھے قیدی کو اِس خدمت کے لیے چُن لیا گیا۔ اور اپنے بنگلے کے باہر ایک پھلواری میں، دری بچھا کر، پڑھنے والے سب بچوں کے لیے اسکول کی ابتداء ہوگئی۔ ادھر سرکاری اسکول کے لیے کوشش شروع کر دی گئی اور ایک دو کمروں کی کچی عمارت میں، سینیٹوریم کی حدود کے اندر ایک لوئر مڈل اسکول قائم ہوگیا۔ خوش قسمتی سے یہاں اکثر قابل اساتذہ کا تقرر ہوتا رہا، جن میں دو احمدی قابل اساتذہ محمد الرحمان صاحب اور ماسٹر اصغر علی صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خود سرپرستی فرماتے رہے اور آپ کے اپنے بیٹے بیٹیاں اور دیگر بہت سے بچے، جب اِس اسکول سے فارغ ہو کر مانسہرہ یا ایبٹ آباد کے ہائی اسکولوں میں داخل ہوئے تو اُن کا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا، اور اپنی اچھی عادات، ادب و آداب، اور شائستہ طرزِ کلام کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ چند ہی سال میں یہ اسکول ایک الگ تھلگ پختہ اسکول کی عمارت میں منتقل ہوگیا اور پہلے مڈل اور پھر ہائی اسکول کے درجہ تک پہنچ گیا۔

ڈاک خانہ کا قیام

ڈاڈر سے نزدیک ترین ڈاک خانہ شنکیاری میں تھا، اور ڈاک پہنچانا اور منگوانا کافی تردد کا باعث تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے درخواست دے کر ایک عارضی ڈاک خانہ قائم کروالیا۔ ابتداء میں کوئی پوسٹ ماسٹر بھی مقرر نہ کیا گیا تھا تو ہسپتال کے ہیڈ کلرک اپنے دفتری اوقات کے بعد یہ فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ چند سال بعد یہاں مستقل ڈاک خانہ اور تار گھر قائم کر دیا گیا، جس سے سینیٹوریم کے گردونواح کے گاؤں بھی مستفید ہونے لگے۔

خان بہادر سعید احمد خان کی پہلی موٹر کار

ڈاڈر میں آمدورفت کے ذرائع اگر مسدود نہیں تو محدود ضرور تھے۔ "سلیمان کی لاری" صبح نو بجے ڈاڈر سے مانسہرہ اور پھر شام چار بجے مانسہرہ سے واپس ڈاڈر آنے کا واحد ذریعہ تھا۔ خان بہادر صاحب کو اکثر سفر درپیش رہتے، جس کے لیے اِس لاری سے سفر کرنا کافی دقت طلب تھا جو آپ کی مصروف زندگی کے لیے چنداں موزوں نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں آپ نے ایک چھوٹی سیاہ رنگ کی فورڈ کار خریدی۔ اُس زمانے میں ذاتی گاڑی رکھنے کا تصور عام نہ تھا اور بعض اوقات ملٹری کی گاڑیوں اور چند دوسرے ٹرکوں کے علاوہ، سڑک پر ایک واحد گاڑی، سیاہ فورڈ ہی نظر آیا کرتی تھی۔

آپ نے اپنے والد صاحب کو گاڑی کے بارے میں بتاتے ہوئے دُعا کی درخواست کی تو آپ کے والد صاحب نے جو نصیحت آمیز باتیں آپ سے کہیں، اُنہیں راجہ ذوق اختر خان نے اِن الفاظ میں لکھا ہے:

> "سعید احمد بات یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ کی ہیں۔ وہ جب عنایات کرتا ہے اور منعم جب تک خدا کا حصہ دیتا رہتا ہے تو انعامات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے"۔ اِس کے بارے میں استفسار پر فرمایا: "اگر افسر کی خالی کار جائے اور کوئی غریب پیدل جا رہا ہو تو اپنے ساتھ بٹھا لے۔ اس طرح کار کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی"۔ چنانچہ خان بہادر صاحب نے زندگی بھر اس نصیحت پر عمل کیا اور ہمیشہ راستے میں پیدل چلتے ہوئے بوڑھے بزرگوں کو خاص طور پر اپنے ساتھ سوار کرا کر مانسہرہ یا ایبٹ آباد تک لے جایا کرتے۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے اِس کے بعد ہمیشہ آپ کے پاس ذاتی گاڑی موجود رہی۔ آپ کی نئی Vauxhall (واکس ہال) ۱۹۷۴ء کے سانحہ میں جلا دی گئی تو جلد ہی آپ کے لیے، اللہ تعالیٰ نے





ڈاڈر میں تعمیرات کا آغاز

کرنل ڈائمنڈ کے ساتھ





سینیٹوریم کے ابتدائی عملے اور ڈاکٹروں کے ساتھ



یومِ آزادی پر پہلی بار پاکستانی پرچم لہراتے ہوئے



وزیرِ اعلیٰ سرحد عبدالقیوم خان



گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد خان



کھیلوں اور تفریح کے مناظر



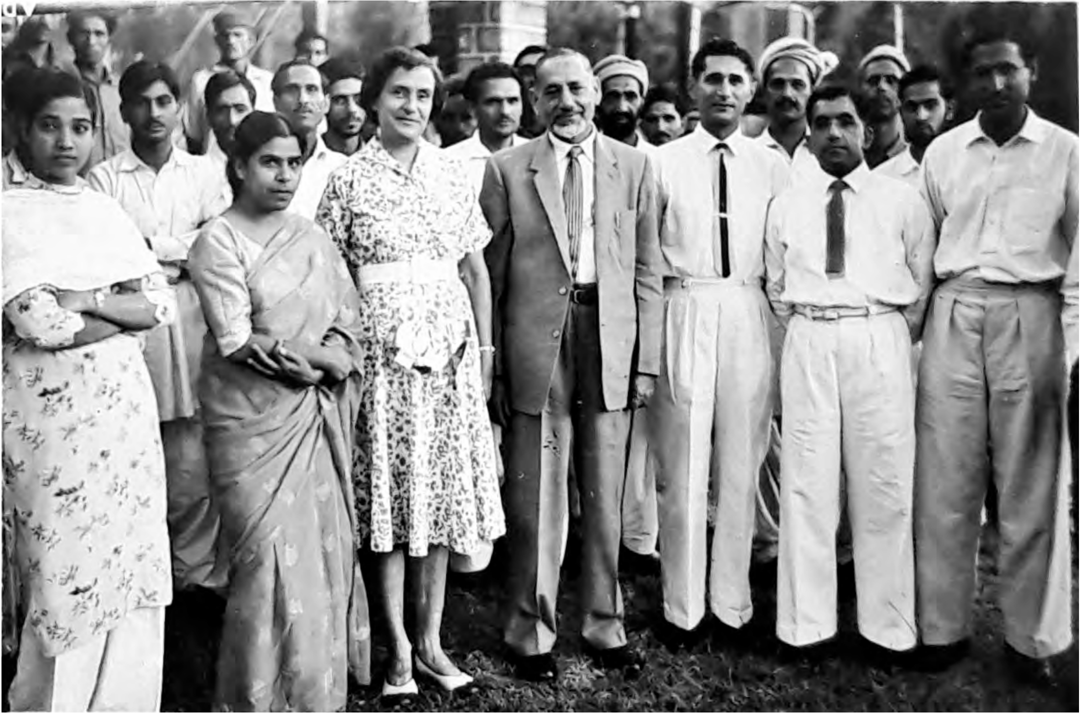


کھیلوں اور تفریح کے مناظر





ڈرامہ کلب



سٹاف کے ساتھ

سینیٹوریم کے راؤنڈ پر





محترمہ فاطمہ جناح ڈاڈر میں

کوہ بھینگڑا کا منظر جہاں آپ نے بیماری کے دن گزارے





ستارہء خدمت کے اعزاز پر استقبال



ڈاڈر میں برف باری کا منظر

ایک اچھی گاڑی کا بندوبست کر دیا۔ جو آپ کے فرزند ڈاکٹر عبدالکریم سعید نے انگلستان سے بھجوائی تھی۔

دہلی میں ایک اہم میڈیکل کانفرنس میں شرکت اور ترقی

ڈاکٹر سعید احمد خان کو ۱۹۴۰ء میں دہلی میں ایک بہت بڑی اور اہم کانفرنس میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہاں سے واپس آنے کے تین ماہ بعد ۱۱ اپریل ۱۹۴۱ء سے آپ کو ایک سال کی پیشگی ترقی دے دی گئی۔ جس سے آپ کو مزید اعزازی حیثیت حاصِل ہوگئی۔

بطور ممتحن تقرری

مارچ ۱۹۴۲ء میں آپ کو پشاور میں ایف ایس سی پریکٹیکل کے امتحان کا ممتحن مقرر کیا گیا۔ کئی برس تک آپ اِس اہم فریضہ کو احسن طریقے پر بجالاتے رہے۔

لیڈی لِنلِتھگو (Lady Linlithgow) کی ڈاڈر میں آمد۔ ۱۹۴۲ء

وائسرائے ہند کی زوجہ لیڈی لِنلِتھگو ۱۷ اپریل ۱۹۴۲ء کو ڈاڈر سینیٹوریم دیکھنے کے لیے آئیں۔ ان کے ہمراہ کئی اعلیٰ انگریز اور مقامی حکام تھے۔ اُن کا شایانِ شان استقبال کیا گیا اور وہ اِس دورے سے بہت خوش اور مطمئن گئیں۔ وہ یہاں کے انتظام وانصرام، صفائی اور طریقۂ علاج سے بہت متاثر ہوئیں۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو وائسرائے ہاؤس دہلی سے شکریہ کا خط بھجوایا گیا اور بتایا گیا کہ لیڈی لِنلِتھگو ڈاڈر سینیٹوریم کی سیر سے بہت لطف اندوز اور متاثر ہوئی ہیں۔ خود لیڈی لِنلِتھگو نے ذاتی طور پر بھی شکریہ ادا کیا اور خوشنودی کا اظہار فرمایا۔

مدنا پلی میں سرجری کی تربیت۔ ۱۹۴۲ء

۱۹۴۲ء کے آخری مہینوں میں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب مدنا پلی میں تپ دِق کے خصوصی

اپریشن کی تربیت حاصل کرنے کے لیے گئے۔ گوکہ وہ اپنی بیماری اور علاج کے بعد یہ تربیت پہلے بھی حاصل کر چکے تھے، لیکن مزید مشق کے لیے کچھ عرصہ وہاں گذارنا ضروری تھا۔ اس تربیت کی کامیابی کے ساتھ تکمیل کے بعد آپ دسمبر میں واپس ڈاڈر تشریف لے آئے۔

"خان بہادر" کا خطاب۔ ۱۹۴۴ء

چھ سال کی انتھک محنت سے آپ نے سینیٹوریم کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ اس میں توسیع کے باوجود مریضوں کو داخلے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا۔ متحدہ ہندوستان میں دور دور تک اِس سینیٹوریم کو شہرت حاصِل ہوگئی۔ عوام آپ کے حسنِ سلوک سے آپ کے گرویدہ تھے اور آپ کی تشخیص اور علاج سے اطمینان پاتے تھے۔ دوسری طرف اعلیٰ حکام آپ کی طبی مہارت اور انتظامی صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے اس کے اعتراف میں آپ کو ایک اعلیٰ اعزاز کے لیے منتخب کیا۔ دس نومبر ۱۹۴۴ء کو تقسیمِ اعزازات کی تقریب میں آپ کو "خان بہادر" کا خطاب اور اس سے منسوب میڈل سے نوازا گیا۔ آپ کے اِس اعزاز پر اہالیانِ ڈاڈر نے بے انتہا خوشی کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو پھولوں کے ہار پہنائے اور آپ کے اعزاز میں ایک بارونق تقریب کا اہتمام کیا۔

مدناپلی سینیٹوریم میں ایک اعلیٰ سطح کے تربیتی کورس کے لیے نامزدگی۔ دسمبر ۱۹۴۴ء

محکمہ صحت صوبہ سرحد نے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو مدناپلی سینیٹوریم میں ایک تربیتی کورس کے لیے نامزد کیا۔ آپ نے اپنے والد حکیم مولوی محمد یحیٰیؒ سے ذکر کیا اور سفر کی اجازت چاہی۔ اُنھوں نے اِس ارادہ کو پسند نہ فرمایا اور کچھ خدشات کا اظہار کیا۔ وہ اپنی روحانی بصیرت سے کوئی ایسا نظارہ دیکھ رہے تھے جو عام نظر سے پوشیدہ تھا۔ خان بہادر صاحب اس سے پہلے اپنے افسران سے اپنی آمادگی کا اظہار کر چکے تھے اور حکومت کی جانب سے سفر کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ اس لیے

آپ اِس وقت انکار نہ کر سکتے تھے۔ آپ بصد مجبوری والد صاحب کو ناخوش چھوڑ کر، ۲۴ دسمبر ۱۹۴۴ء کو دیگراں سے روانہ ہوئے اور لاہور پہنچ گئے۔ وہاں آپ نے سالانہ جلسہ میں شرکت فرمائی اور ۲۴ دسمبر کو آپ نے تقریر بھی فرمائی۔ پھر ۲۸ دسمبر کو لاہور سے مدنا پلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

دورانِ سفر علالت

لاہور کے قیام کے دوران آپ کو زکام کھانسی کے ساتھ حرارت ہوگئی۔ اسی علالت کے ساتھ آپ نے سفر اختیار کیا اور ۳۱ دسمبر کی شام کو مدنا پلی پہنچ گئے۔ اگلے روز ڈاکٹر ہیوبن، پرنسپل اور دیگر ڈاکٹروں سے ملاقات کی۔ کورس کا آغاز ۸ جنوری ۱۹۴۵ء کو ہونا تھا، اس لیے اس کورس میں شمولیت کے لیے آنے والوں میں سے ابھی تک کوئی نہ پہنچا تھا۔ اس طرح آپ کو کچھ آرام کا موقعہ تو مِل گیا، مگر مکمل طور پر صحت بحال نہ ہوسکی۔

اضطراب اور دُعائیں

طبیعت میں اضطراب اور کمزوری کا احساس بڑھنے لگا۔ ایسے میں دُعا فرماتے رہے۔ "اے خدا تعالیٰ صحت کی حالت میں کوئی باعزت و بابرکت راہِ مَفَر پیدا کر دے، جس میں تیری اپنی پُرحکمت تدبیر کا ہاتھ ہو، میری سعی سے نہ ہو۔ یا صحتِ کاملہ عطا فرما کر میرا اضطراب اور پریشانیاں رفع فرما کر یہ زمانہ کامیابی اور مسرت و رحمت کے ساتھ تمام فرما دے"۔

خان بہادر صاحب نے اِن واقعات کو اپنی ڈائری میں تحریر کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی تائید اور نصرت اور ہر موقعہ پر دستگیری کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح فرمایا ہے:

> لیکن میں اپنی فطری کمزوری کا کیا کروں کہ وہ بے چین کرتی ہے اور اپنی خطاؤں اور غلطیوں کا کیا کروں کہ وہ کانٹے کی طرح دِل میں کھٹکتی ہیں۔ اپنے

شفیق باپ کے کلمات، اُس تجربہ کار مومن کے یہ الفاظ

؎ کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد

ہرچہ گیرید مختصر گیرید

(دُنیا کے کام تو کبھی کسی سے ختم نہیں ہو سکے۔ اس لیے جو (کام) بھی آپ لیں مختصر ہی لیں (تاکہ مکمل ہو سکے)۔

بار بار کانوں میں گونجتے اور مجھے بے کل کرتے اور گھبراہٹ میں ڈالتے ہیں۔

خان بہادر صاحب اسی طرح کی پُرسوز دُعاؤں سے خدا تعالیٰ سے رہنمائی چاہتے رہے۔ اور کچھ تسکین ہوئی کہ خدا کی حکمت ہی آپ کو یہاں لائی ہے۔ یہ بطورِ سزا نہیں، بلکہ کسی بہتری کا پیش خیمہ ہے۔

آٹھ جنوری سے با قاعدہ کورس کا آغاز ہوا تو آپ با قاعدگی سے شمولیت فرمانے لگے۔ لیکن طبیعت مضطرب ہی رہی۔ آپ نے اپنے والد محترم کو ایک خط لکھا، جس میں اپنی بیماری اور اضطراب کا ذکر کیا اور ایک فارسی بند اُس میں درج کیا جو اُن کے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ یہ خط آپ کے والد صاحب کو اُن کی زندگی میں نہیں پہنچ سکا۔ وہ فارسی بند یہ ہے:

گر بمانیم زندہ، بردوزیم

جامہ ای کز فراق چاک شدہ

ور بمردیم، عذرِ ما بپذیر

ای بسا آرزو کہ خاک شدہ

(اگر ہم زندہ رہے تو اُس پوشاک کو جو کہ اِس جدائی سے چاک ہو گئی ہے

دوبارہ سی لیں گے اور اگر مرجائیں تو پھر ہماری مجبوری کو معاف فرمادیں۔
ہائے افسوس کہ بہت سی آرزوئیں ایسی ہیں جو خاک میں مل گئی ہیں)۔

نوٹ: یہ دونوں اقتباسات آپ کی ڈائری سے لیے گئے ہیں۔

مدناپلی سے واپسی کا ارادہ

درحقیقت خان بہادر صاحب کے اِس سارے اضطراب کا باعث یہی بات تھی کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب آپ کے اِس سفر سے مطمئن نہ تھے۔ سعید احمد خان صاحب کو والد صاحب نے یہ سفر اختیار کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس کے باوجود بھی آپ کو، بحالتِ مجبوری مدناپلی جانا پڑا تھا۔ دوسری طرف مسلسل بخار سے طبعیت بحال نہ ہو رہی تھی۔ اِس لیے واپس لوٹ آنے کا مصمم اِرادہ کر لیا اور کرنل ہیوبن (Huben) سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ وہ آپ سے نہایت ہمدردی سے پیش آئے اور مناسب طور سے آئی جی (IG) محکمہ صحت سرحد کو ایک تار بھیج دیا کہ ڈاکٹر سعید احمد کا یہاں مزید رُکنا ضروری نہیں۔ وہ پہلے ایسے کئی کورسز کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے خود بھی تار بھیج دیا اور متعلقہ افسران کو خط بھی روانہ کر دیئے۔

مدناپلی سے واپسی اور دیبگراں میں آمد

۱۱ جنوری ۱۹۴۵ء کو ڈاکٹر صاحب مدناپلی سے روانہ ہوئے۔ واپسی کے سفر کے فیصلے سے ذہنی طور پر سکون ملا تو جسمانی صحت بھی بہتر ہونے لگی۔ دورانِ سفر بخار بھی ٹوٹ گیا۔ آپ دہلی میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملتے ہوئے، ۱۷ جنوری کو دیبگراں پہنچے تو سیدھے، حسب معمول مولوی محمد یحییٰؒ صاحب کے رہائشی مکان کی طرف گئے۔ اُس وقت مولوی صاحب کوئی دوا تیار کرنے میں مصروف تھے، آپ نے مخل ہونا مناسب نہ جانا اور اندرونِ خانہ تشریف لے گئے۔ جب معلوم ہوا کہ والد صاحب کام سے فارغ ہو گئے ہیں، تو ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کا دواڑھائی

سال کا بیٹا محمد سعید انگلی تھامے ساتھ ساتھ ہولیا۔ والد صاحب محمد سعید کو دیکھ کر مسکرائے اور اُس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "تمہارا جان جی تو نہ آتا تھا، سیدھا ڈاڈر جاتا تھا، میں اُسے لایا ہوں۔ اب خوش ہو؟" محمد سعید، دادا باجی کی بات سُن کر اپنے جان جی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

والد صاحب کے ساتھ دیر تک مجلس رہی۔ ایک دوسرے کے حالات پوچھتے اور سُنتے رہے۔ والد صاحب فرمانے لگے: "تمہارے سفر سے مجھے بہت ہی خوف تھا۔ اور ڈر تھا کہ تم شاید اِس سے سلامت واپس نہ آسکو گے"۔ ۱

۱: اغلباً مولوی محمد یحیٰی صاحب کو کوئی الہام ہوا یا کشفاً کوئی نظارہ دیکھا جس سے باپ بیٹے کی دائمی جدائی کی طرف اشارہ تھا اور چونکہ ڈاکٹر صاحب مسافرت اختیار کر چکے تھے، تو اُنہیں محسوس ہوا کہ شاید وہ واپس سلامت نہ آئیں گے۔ لیکن چند دِن بعد اُن کی اپنی رحلت اِس دائمی جدائی کا باعث بنی۔

ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: "جب آپ نے سفر کو ناپسند فرمایا تھا، اُس وقت یہ بات میرے اختیار سے نکل چکی تھی۔ خدا کا رحم ہوا کہ سفر قبل از وقت انجام کو پہنچا اور میں زندہ واپس آ گیا"۔ باپ بیٹے دونوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

حضرت مولوی حکیم محمد یحیٰیؒ صاحب کی وفات۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۵ء

۱۹ جنوری کو خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد صاحب والد صاحب کو، بحالتِ صحت چھوڑ کر ڈاڈر سینیٹوریم چلے گئے۔ اگلے دن ہسپتال کا مکمل راؤنڈ کیا اور مریضوں سے ملے۔ دفتر میں دیر تک کام کرتے رہے۔ سردی انتہاء کی تھی، جس کے باعث کھانسی اور زکام ہو گیا۔ اس وجہ سے آپ ہسپتال نہ جا سکے۔ اسی دوران دیبگراں سے والد صاحب کی بیماری کی اطلاع آئی۔ علالت کے باعث، سفر مشکل معلوم ہوا۔ کسی شخص کو بھیجا کہ جا کر بیماری کی نوعیت اور حالات معلوم کر کے آئے۔ آپ کی چھوٹی بیگم اپنے تایا محترم کی خدمت میں رہتی تھیں۔ وہ اُن کی بیماری سے بہت بے قرار تھیں۔ خان

بہادر صاحب کے خود فوراً نہ پہنچ پانے سے پریشانی بڑھ گئی ۔ آپ کو خط لکھ کر بھیجا کہ بیماری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ۔ مزید تاخیر کیے بغیر دیبگراں پہنچیں ۔

فالج کا حملہ بہت شدید تھا ۔ ۲۷ جنوری کو جب ڈاکٹر سعید احمد خان گاؤں پہنچے تو والد صاحب کو سخت بیمار اور بات کرنے سے معذور پایا ۔ صرف چند الفاظ رُک رُک کر آپ سے کہے: "السلام علیکم ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ یا رب ۔۔" اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ پائے ۔ اٹھائیس ، اُنتیس اور تیس جنوری کے دِن آزمائش کے سخت ترین دن تھے ۔ ۳۰ جنوری بروزِ منگل ۴ بجے بوقتِ عصر مولوی محمد یحییٰ صاحب اپنے فرزند کو داغِ مفارقت دے گئے ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کا صبر

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے لیے اپنے والد کی مفارقت کی گھڑی نہایت صبر آزما تھی ۔ پھر بھی آپ نے اپنے سب عزیزوں کو صبر وضبط کی تاکید کی ۔

آپ نے اپنی ڈائری میں تحریر فرمایا:

الحمدللہ ، کہ میری تحریک پر ، میرے گھر کے لوگوں نے صبر وضبط سے کام لیا ۔ سوائے عبدالحئی ، عبداللہ اور عبدالرحمان کے ، سب قریبی موجود تھے ۔

آپ نے مزید تحریر فرمایا ہے:

۲۹ کو ، دِن بھر بارش تھی اور ۲۹ اور ۳۰ کی درمیانی رات کو بھی ۔ ۳۰ کی صبح کی عجیب کیفیت چاندنی اور زمین و آسمان کی تھی ۔ جب میں قبر کے تختوں کا کہنے باہر نکلا ، کس قدر مشکل یہ کام تھا ۔ کس مصیبت سے یہ الفاظ میری زبان

سے نکلے اور میرے گلے میں کیا چیز اٹک رہی تھی۔ میں نے خدا کی نصرت اور رحم کا کچھ نظارہ اُس فجر کو دیکھا تھا۔ وہی مولیٰ کریم ۳۰ جنوری کے بعد کے سخت غم واندوہ، مشقت اور مصیبت ومصروفیت کے ایام میں میری قوت کا سرچشمہ تھا۔ میں آج تک یہ مسئلہ نہ سمجھا کہ مجھ ناتواں میں کہاں سے توانائی آئی کہ تھکان، بےخوابی اور مصیبت میں میری صحت قائم رہی۔

مولوی محمد یحییٰ صاحب کی میت کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے خود غسل دیا اور کفن پہنا کر جنازہ صحن میں رکھا گیا۔ کس قدر رونق والا نورانی چہرہ تھا، اُس کی دھوم مردوزن میں ہوئی۔ ظہر کے بعد جنازہ اُٹھایا گیا۔ کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے جن میں احباب جماعت، اعلیٰ افسران، خوانینِ علاقہ، عزیز واقارب اور دوست اور رفقاء شامل تھے۔

خان بہادر غلام ربانی سے آپ کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ رات کو آپ کے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں: "اُن کی یہ مروت یادرہے گی۔ اَللّٰھُمَّ اٰجِرْہُ"

ان ایامِ حزن میں آپ سے جس نے بھی مروت واحسان کا سلوک کیا اُن کا ذکر آپ نے اپنی ڈائری میں نام بنام کیا ہے اور اُن کے لیے بہت دُعا کی ہے۔ خصوصاً علاقہ پھلڑہ۔ پڑہنہ، ٹلہالہ اور بیڑ وغیرہ کے خوانین کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے نہ صرف ماتم پُرسی کی بلکہ ماتم پُرسی کے کھانے کے طور پر وافر مقدار میں اجناس اور دیگر لوازمات بھیجے۔

مولوی محمد یحییٰؒ کی وفات پر آپ کو متعدد تعزیتی خطوط ملے۔ اُن میں ایک خط آئی جی محکمہ صحت کی طرف سے بھی تھا۔ جس میں تعزیتی الفاظ کے بعد لکھا تھا:

Was shocked when came to know about coming back without completing your training but it seems

to be God's will that you arrived to see your father before his death.

ترجمہ: یہ بات مجھے بے حد شاق گذری تھی کہ آپ اپنی تربیت نامکمل چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی مشیت تھی کہ آپ بروقت واپس آ گئے اور اپنے والد کی زندگی میں اُن سے ملاقات ہو گئی۔

دیبگراں سے ڈاڈر روانگی

والد کی وفات کے بعد آپ نے دس دِن مزید دیبگراں میں قیام کیا۔ مہمانوں کی آمدورفت جاری رہی۔ آخر ۱۱ فروری کو آپ نے ڈاڈر روانگی کا ارادہ کرلیا۔ اُس وقت آپ کو اپنے عزیزوں سے جدا ہونا سخت ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔ اور گاؤں سے باہر قدم نکالنا دوبھر تھا۔ مگر غمِ روزگار سے بھی مفر نہ تھا۔ آپ نے تحریر فرمایا:

> ۱۱ فروری کو ۵ بجے دیبگراں سے رُخصت ہو کر ڈاڈر روانہ ہوا۔ جیب خالی تھا۔ گجری دی گلی (گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک مقام) میں ایک شخص آیا اور اُس نے سولہ ۱۶ روپے مجبور کر کے دیئے کہ مانسہرہ میں مریض دکھانا ہے۔ یہ بھی خدائی تائید کا نشان تھا۔ فالحمدللہ۔

حضرت سید اسد اللہ شاہ صاحب کی ڈاڈر میں تشریف آوری۔ جولائی ۱۹۴۵ء

حضرت سید اسد اللہ شاہ صاحب جماعتِ احمدیہ لاہور کی اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جنہیں امام وقت کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے مواقع بار بار ملتے رہے۔ وہ ایک صاحب کشف و الہام بزرگ تھے۔ خان بہادر صاحب کی آپ سے پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۴۴ء سالانہ جلسہ پر، اپنے برادرِ نسبتی حبیب الرحمان صادق صاحب کے توسط سے ہوئی۔ اِس پہلی ملاقات میں قبلہ شاہ

صاحب اور خان بہادر صاحب دونوں ایک دوسرے سے کافی قریب ہو گئے۔آپ نے شاہ صاحب کو موسمِ گرما، ڈاڈر کے پُرفضا مقام پر گذارنے کی دعوت دی جسے اُنہوں نے قبول فرمایا۔

قبلہ شاہ صاحب ولی اللہ اور مستجاب الدعوات تھے۔ اُن کی ڈاڈر تشریف آوری سے قبل ہی آپ کے الہامات اور دُعاؤں کی قبولیت کے واقعات، خان بہادر صاحب کے مشاہدہ میں آچکے تھے۔ اسی سال کے اوائل میں اپنے والد بزرگوار کی دائمی جدائی سے آپ آزردہ خاطر رہتے تھے۔ اُن کی شفقت اور دُعاؤں سے محرومی کو آپ بہت محسوس کر رہے تھے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کی تشفی کا سامان از خود کر دیا اور سید اسد اللہ شاہ صاحب قبلہ، جولائی ۱۹۴۵ء میں ڈاڈر سینیٹوریم تشریف لے آئے اور موسمِ گرما وہاں گذارا۔ شاہ صاحب کا وجود خان بہادر صاحب اور اُن کے تمام خاندان کے لیے باعثِ برکت رہا۔ اُس کے بعد وہ ہر سال موسمِ گرما آپ کے ساتھ، خاندان کے ایک بزرگ کی حیثیت سے گذارتے رہے۔ گو کہ جسمانی تعلق اُن کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا لیکن روحانی طور پر وہ اب بھی خاندان کے ہر فرد سے قریب ہیں۔

دیبگراں میں مکان کی تعمیرِ نو۔ ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں اپنے رہائشی مکان میں کچھ توسیع کی تھی۔ 'ڈبہ' یا چبوترہ جس پر آپ کے والد اور چچا محترم کا مطب تھا، وہاں دو مزید کمرے اور ایک برآمدہ تعمیر کروایا تا کہ اُس پر دوسری منزل بنوائی جا سکے۔ ٹین کی چھت والی، یہ بنگلہ نما عمارت بہت ہی منفرد اور خوبصورت تھی۔ یہ مردانہ اور زنانہ دو حصوں میں منقسم تھی۔ برآمدوں میں لکڑی کی خوبصورت جالی لگی ہوئی تھی، اور لکڑی کے ہی ستون تھے، جن پر انگور کی بیلیں چڑھائی گئی تھیں۔ اِس بنگلے سے حدِّ نگاہ تک پہاڑوں اور کھیتوں کے خوشنما مناظر نظر آتے تھے۔ خان بہادر صاحب موسمِ گرما میں کھلے آسمان تلے، چھت پر سونا پسند فرماتے تھے۔ چونکہ پہاڑوں کا سلسلہ گاؤں سے کافی فاصلے پر ہے اس

لیے رات کو تاروں بھرا، نیلا وسیع آسمان آپ کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اور آپ بہت سکون محسوس کیا کرتے تھے۔

وہ مکان جو مولوی محمد یحییٰ صاحب کی رہائش گاہ تھی، آپ کی وفات سے خالی ہو گیا تھا اور کافی توجہ طلب تھا۔ چنانچہ اُس میں معمولی ردوبدل کر کے سامنے پختہ برآمدہ تعمیر کروایا اور چند سیڑھیاں دے کر صحن کو رہائشی گھر کے ساتھ ملا دیا۔ اور کچھ تبدیلیاں گھر کے باقی حصہ میں بھی کیں۔ اس کام کے لیے آپ کی ذاتی نگرانی اہم تھی اس لیے تین ماہ کی رُخصت لے کر، تمام اہلِ خانہ کے ہمراہ آپ دیبگراں میں مقیم رہے۔

اسی عرصہ میں آپ نے اپنی زمینداری کے کاموں کا بھی مناسب بندوبست کیا کیونکہ یہ بوجھ بھی والد صاحب کی وفات سے آپ کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ اِس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ آپ ذاتی طور پر فصلوں کی کٹائی کے موقعہ پر سال میں دو تین مرتبہ چند دن یہاں گذاریں۔

تحریک پاکستان سے وابستگی

خان بہادر صاحب نے سیاست سے کبھی کوئی عملی تعلق نہیں رکھا، مگر تحریکِ پاکستان کے لیے آپ کے دِل میں خاص ولولہ اور جوش تھا۔ صوبہ سرحد میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، مگر بدقسمتی سے حکومت کانگرس کی تھی، جو عوام کو خوفزدہ کرتے رہتے تھے کہ اگر پاکستان وجود میں آ گیا تو وہ بڑے صوبوں کے محکوم ہو جائیں گے۔ "قرارداد پاکستان" منظور ہو گئی تو آہستہ آہستہ مسلم لیگ کی پوزیشن یہاں بھی مستحکم ہو گئی۔ قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت، صوبہ سرحد کے چیدہ چیدہ لوگوں اور بالخصوص نوجوان طالب علموں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ مسلم لیگ کے مخلص کارکنوں کی ہمہ تن کوششوں سے حالات یکسر پلٹ گئے اور صوبہ سرحد کے عوام نے یہ مطالبہ کیا کہ ریفرنڈم کرایا جائے، جس سے معلوم ہو سکے کہ عوام کیا چاہتے ہیں۔

ضلع ہزارہ کے مسلم لیگی لیڈر اور عوام خاصے جوش و ولولہ سے پاکستان کی حمایت میں سرگرمِ عمل تھے۔ ڈاڈر سے قریب ہی ایک مقام بھوگڑ منگ ہے۔ وہاں کے خان خداداد خان جوشیلے مسلم لیگی تھے۔ اپنے گردونواح سے لوگوں کو یکجا کر کے جلوس کی صورت میں شنکیاری اور مانسہرہ تک جاتے تھے۔ ڈاڈر سینیٹوریم راستے میں پڑتا تھا۔ پاکستان کے حق میں نعرے تمام سینیٹوریم میں گونجتے، تو بچے بڑے سب باہر نکل آتے۔ اُس وقت خان بہادر صاحب کے فرزند عبدالکریم سعید ابھی توتلی زبان میں بات کرتے تھے۔ مُنہ سے چوسنی نکال کر "پاٹیٹان ڈِنڈہ باڈ" کا نعرہ، خاصے جوش سے لگاتے۔ ایک مرتبہ خداداد خان صاحب یہ نعرہ سُن کر جذبات سے مغلوب ہو گئے اور فرمانے لگے:

"اب تو بچہ بچہ پاکستان مانگ رہا ہے۔ اسے وجود میں آنے سے کوئی طاقت اب نہیں روک سکتی۔"

خان بہادر صاحب کے بڑے فرزند عبدالحیٔ سعید، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں طالب علم تھے، اور اُن نوجوانوں میں سے ایک تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں عملی حصہ لیا۔ قائدِ اعظم لاہور تشریف لاتے تو عبدالحیٔ سعید ہر جگہ آپ کے ساتھ ساتھ رہتے۔ آپ کی قائدِ اعظم کے ساتھ متعدد تصاویر ہیں۔ عبدالحیٔ سعید اپنے طالب علم ساتھیوں کے ساتھ صوبہ سرحد کے دور دراز مقامات تک جاتے رہے۔ اور وہاں لوگوں کو تحریکِ پاکستان کی حمایت کے لیے تیار اور آمادہ کرتے رہے۔ لاہور میں عملی سیاست میں حصہ لینے اور پاکستان کی حمایت میں صفِ اول میں کام کرنے والوں کے ساتھ، عبدالحیٔ سعید نے چند ہفتے جیل میں بھی گذارے۔ خان بہادر صاحب اپنے فرزند کی اِن سرگرمیوں کو پسندیدہ نظر سے دیکھتے تھے۔

ریفرنڈم ہُوا تو ہزارہ کی عوام نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ احمدی لوگ پیش پیش رہے۔ ڈاڈر سینیٹوریم اور شنکیاری میں پولنگ سٹیشن قائم کیے گئے، جس کے لیے آپ نے ہر طرح کی سہولت فراہم کی۔ ڈاڈر میں ایک بھی ووٹ پاکستان کے خلاف نہیں ڈالا گیا۔ اسی طرح شنکیاری میں بھی اکثریت سے 'تحریک پاکستان' کی توثیق ہوئی۔ آپ نے بذاتِ خود دیگر اس کے لوگوں کو بھی منظم کیا اور مسلم

لیگ کے جھنڈے تلے مانسہرہ ووٹ ڈالنے کے لیے روانہ کیا۔ ہزارہ کے لوگ پاکستان کو نئی زندگی کی نوید سمجھتے تھے اور اکثریت نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔

قیام پاکستان

آزادیٔ وطن کی تاریخ اور وقت کے تعین کا اعلان ہو گیا تو ڈاڈر سینیٹوریم میں یہ دِن شایانِ شاں طریق سے منانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تمام عملہ متحرک نظر آنے لگا۔ رنگ برنگ جھنڈیاں ہوا میں لہرانے لگیں۔ پاکستان کا جھنڈا تیار ہوا اور ایک جگہ اِس کے لہرانے کے لیے مقرر کر دی گئی۔ رات بھر مٹھائیاں تیار ہوتی رہیں اور چھوٹی چھوٹی کاغذ کی تھیلیوں میں بند کر دی گئیں۔

۱۴اور ۱۵اگست کی درمیانی شب، آزادیٔ وطن اور پاکستان کے قیام کے اعلان کا وقت بارہ بجے مقرر تھا۔ اِس سے پہلے ۱۴اگست کی صبح کراچی میں قائدِ اعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا حلف لے چکے تھے۔ اُس دِن سینیٹوریم میں مریضوں اور دوسرے لوگوں پر سے سب پابندیاں اُٹھ گئی تھیں، تاکہ جہاں کہیں بھی ریڈیو میسر ہو، ہر ایک کسی نہ کسی مقام پر چلا جائے تاکہ اِس اعلان کو اپنے کانوں سے سُن سکے۔ خود آپ کے گھر میں اندر باہر، مرد وزن اور بچے کثیر تعداد میں منتظر تھے۔ اعلان ہوا، "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگا اور فضا "آزادی مبارک" کی صداؤں سے گونج اُٹھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں اور چہرے پر شادمانی کی چمک لیے سب ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ خان بہادر صاحب کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ سب نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں سحری کے انتظام میں لگ گئے۔

جشنِ یومِ آزادی۔ ۱۵اگست ۱۹۴۷ء

۱۵اگست ۱۹۴۷ء جمعہ کا دِن تھا اور رمضان کی ستائیسویں تاریخ۔ ڈاڈر سینیٹوریم کی ہر عمارت رنگ برنگ جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھی۔ تقریب کے لیے اسسٹنٹ سرجن کے بنگلہ کے ساتھ

کھلا میدان منتخب کیا گیا تھا۔ اسکول کے بچے جھنڈیاں تھامے، قطار در قطار آئے اور مقررہ جگہ پر بیٹھ گئے۔ اسی طرح تمام سٹاف اور مریض اپنے اپنے مقررہ مقامات پر منظم طریق سے بیٹھے تھے۔ خان بہادر صاحب نے پرچم کشائی کی۔ پاکستان کا جھنڈا فضا میں لہرایا تو فضا 'نعرۂ تکبیر، پاکستان زندہ باد' کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ ہر ایک بیمار اور تندرست کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ کچھ تقاریر ہوئیں۔ اسکول کے بچوں اور سٹاف کے کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ انعامات اور مٹھائی تقسیم کی گئی۔ سینیٹوریم کے ایک مریض شاعِر نے موقعہ کی مناسبت سے نظم پیش کی۔

اس ساری تقریب کی رونق اور روحِ رواں خان بہادر صاحب کے فرزند عبداللہ سعید تھے، جو ڈیرہ دون ملٹری اکیڈمی میں زیرِ تربیت کیڈٹ تھے اور رخصت پر گھر آئے ہوئے تھے۔ دو چار روز میں واپس ڈیرہ دون چلے گئے اور پھر پاکستان آنے والی فوج کے ہمراہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں منتقل ہو گئے۔

کشمیر کا سفر۔ اگست ۱۹۴۷ء

خان بہادر سعید احمد خان صاحب کشمیر بارہا جا چکے تھے۔ قدرتی مناظر ہمیشہ آپ کو متاثر کرتے تھے۔ آپ کے اہلِ خانہ میں سے کچھ لوگ ابھی تک کشمیر نہ جا سکے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابھی کشمیر کے الحاق کا تعین مبہم تھا، اس لیے آپ کے دِل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ چند دِن رُخصت لے کر کشمیر چلے جائیں۔ دوسرے آپ کی ایک بیٹی کچھ علیل تھی۔ آپ سمجھتے تھے کہ تبدیلی آب و ہوا سے صحت پر اچھا اثر ہو گا۔ اس لیے آپ نے سفر کا اِرادہ کر لیا۔

آپ اگست کے آخری دِنوں میں عازمِ سفر ہوئے۔ مانسہرہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اُس دِن ایبٹ آباد میں کچھ فساد ہوا ہے اور سفر ترک کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا۔ لیکن آپ نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

بٹراسی کے موڑوں سے کچھ آگے نکلے تو شام ہو چکی تھی اور کچھ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر جا کر گاڑی کو روکنا پڑا۔ کچھ مفسدوں نے ایک بڑا درخت گرا کر راستہ روکا ہوا تھا۔ تقسیم کے بعد اکثر غیر مسلم پاکستان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اور یہ مفسد اُن کو لُوٹنا اور مارنا چاہتے تھے۔ اس لیے راستہ روک لیا گیا تھا۔ گاڑی رُکنے پر خان بہادر صاحب گاڑی سے بے خوف نیچے اُترے۔ اُدھر جنگل کی طرف سے چند افراد نمودار ہوئے۔ آپ نے دو چار منٹ اُن سے گفتگو کی۔ آپ کے ذاتی جلال اور رُعب کو دیکھ کر وہ مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور راستہ چھوڑ دیا۔

اِس واقعہ سے چند روز قبل، قبلہ سید اسد اللہ شاہ صاحب کو خان بہادر صاحب کے لیے ایک الہام ہوا تھا: فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ۔ (سو اسے اور اس کے گھر والوں کو بڑی مصیبت سے نجات دی) (الانبیاء ۲۱:۷٦)۔

اِس واقعہ کے پیش آنے پر خان بہادر صاحب نے فرمایا کہ یہ الہام شاید اِسی واقعہ کے متعلق ہو گا۔ کشمیر میں آپ نے دس دِن قیام میں سیر و تفریح کے علاوہ حضرت عیسٰیؑ کی قبر کی زیارت فرمائی۔ ڈاکٹر نظیر الاسلام صاحب اور دیگر احبابِ جماعت سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے اور نمازِ جمعہ میں بمع بچوں کے شرکت فرمائی۔

حجِ بیت اللہ۔ ۱۹۴۷ء

خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں حجِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ اِس کے محرکات، اسباب اور وہ تمام واقعات جو دورانِ سفر پیش آئے اِس بات کے شاہد ہیں کہ اِس مردِ مومن کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی خاص تائید اور نصرت حاصِل رہی ہے۔

جنوری ۱۹۴۵ء میں خان بہادر صاحب اپنے والد بزرگوار حکیم مولوی محمد یحییٰ صاحب کی دائمی جدائی سے بہت مغموم اور آزردہ خاطر تھے۔ حضرت سید اسد اللہ شاہ صاحب نے آپ کو

تعزیت کا خط لکھا تو جواباً خان بہادر صاحب نے اپنے شدتِ غم کا اظہار کرتے ہوئے دُعا کی درخواست کی۔ شاہ صاحب قبلہ نے دُعا فرمائی تو الہام ہوا: "اتنا غم کیوں کرتے ہیں۔ بچت کریں اور حج کریں"۔

آپ کے اپنے دِل میں حج کی شدید آرزو تھی۔ ایک مرتبہ اپنی لمبی بیماری کے دوران حج کے دِن آپ نے دعا کی کہ یا اللہ یہ آرزو کیسے پوری ہوگی۔ حالات اور بیماری دونوں ہی مانع ہیں۔ قبولیتِ دُعا کا وقت برسوں بعد آیا۔

قبلہ شاہ صاحب جولائی ۱۹۴۵ء میں ڈاڈر تشریف لائے، تو مزید تاکید کرتے رہے کہ بچت کریں اور حج کے لیے زادِ راہ جمع کریں۔ خان بہادر صاحب اپنے ذاتی معاملات کے پیشِ نظر متذبذب تھے۔ محدود آمدنی میں اپنے کثیر اہل و عیال کے اخراجات کے ساتھ ساتھ آپ کا دسترخوان بھی خاصا وسیع تھا۔ طبعاً مہمان نواز تھے، مہمانداری پر خاصا خرچ اُٹھ جاتا تھا۔ اس لیے بچت کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہ سب عرضِ احوال شاہ صاحب سے کیا تو وہ تاکیداً فرماتے رہے کہ بچت کریں اور حج کریں۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ اگر یہ مشیت ایزدی ہے تو وہ خود اسباب پیدا کر دے گا، آپ نے ارادہ کرلیا کہ وہ حج کریں گے، اور سال ڈیڑھ سال میں اتنی ہی رقم فراہم کرسکے کہ جہاز کے عرشے پر سفر کرسکیں۔ آپ کے لیے ایسا کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اُسے آئندہ سال پر ملتوی کر دیا۔ اور جب آپ نے ۱۹۴۷ء کے موسمِ حج میں، حج کے لیے سفر اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تو خدا تعالیٰ نے اپنے خاص رحم و فضل سے آپ کے لیے خود اسباب بھی مہیا کر دیئے۔ ریاستِ امب کے نواب، فرید خان بیمار ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اُن کی عیادت کے لیے گئے تو توجہ دلائی کہ ڈاکٹر سعید احمد سے علاج کروا کر دیکھیں۔ چنانچہ نواب صاحب نے بلوا بھیجا۔ خدا نے شفا بخشی اور نواب صاحب نے تین ہزار روپیہ بطورِ فیس، یکمشت خدمت میں پیش کیے۔

آپ کے رفیقِ خاص اور بھائی خان بہادر غلام ربانی خان صاحب بمعہ اہلیہ، اسی سال حج کا اِرادہ کر چکے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی ہمراہی بھی نصیب ہوگئی۔ چنانچہ یہ تین افراد کا مختصر سا قافلہ مریضوں، عزیزوں اور دوستوں کی دُعاؤں، الوداعی آنسوؤں اور پھولوں کی نچھاور میں عازمِ سفر ہوا۔

تقسیمِ برصغیر کو ابھی چند ہفتے ہی ہوئے تھے اور وطنِ عزیز طرح طرح کے مصائب میں گھرا ہوا تھا۔ حج کے سفر کے آغاز سے ہی دشواریاں سامنے آنے لگیں۔ آپ کی پہلی منزل لاہور تھا۔ لاہور کے گردونواح میں داخل ہوتے ہی پناہ گزینوں کے دردوالم اور بے سروسامانی کے مناظر نے آپ کے حساس دِل کو بہت مجروح کیا۔ اُدھر ذرائع آمدورفت کے مسائل سامنے آنے لگے تو سفر مخدوش نظر آنے لگا۔ مگر خدائے مسبب الاسباب پر بھروسا تھا۔ مایوس نہ ہوئے۔

لاہور میں چند دِن قیام

آپ کا قیام احمدیہ بلڈنگس برانڈرتھ روڈ پر تھا۔ معلوم ہوا کہ موجودہ حالات میں لاہور سے کراچی تک کا سفر بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ریل گاڑی میں نشستیں حاصِل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ لوگ گاڑیوں کی چھتوں پر سفر کرنے کو مجبور ہیں۔ آپ بمع اپنے بھائی اور رفیقِ سفر، غلام ربانی خان کی معیت میں سٹیشن جا کر نشستیں حاصِل کرنے کی غرض سے نکلے، تو کوچے سے گذرتے ہوئے خیال آیا کہ خواجہ نذیر احمد صاحب سے ملتے چلیں۔ خواجہ صاحب، تپاک سے ملے۔ دیر تک اُن کی زیرِ تصنیف کتاب Jesus in Heaven on Earth پر گفتگو ہوتی رہی۔ آپ نے رُخصت ہوتے ہوئے ذکر کیا کہ ریلوے سٹیشن نشستوں کی ریزرویشن کے لیے جا رہے ہیں اور اپنی پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ خواجہ صاحب نے فوراً کہا کہ اگلے ہی روز وہ بھی کراچی جا رہے ہیں۔ اُن کے اہلِ خانہ ہمراہ جانے والے تھے، اس لیے چار نشستیں ریزرو کروائی تھیں۔ وہ اب نہیں جا رہے۔

اور تین ٹکٹ زائد ہیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب ہمراہ گئے اور ٹکٹ واپس کرنے کے بجائے ڈاکٹر سعید احمد خان اور اُن کے ہم سفر دو افراد کے نام منتقل کروا دیئے۔ پہلے مرحلے پر ہی یہ تائیدِ الٰہی اور غیبی مدد آپ کے لیے تقویت کا موجب ہوئی۔

دورانِ قیامِ لاہور، مولینا محمد علی اور دیگر احبابِ جماعت سے ملاقات ہوئی اور آپ سب کی دُعاؤں کے ساتھ، ۳ اکتوبر کو عازمِ کراچی ہوئے۔

کراچی میں پیش آمدہ واقعات اور تائیدِ الٰہی کے مناظر

آپ ۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو صبح پانچ بجے کراچی پہنچے، اور اپنی صاحبزادی عائشہ اور داماد مرزا عبدالرحمان بیگ کے یہاں قیام کیا۔ پہنچتے ہی 'ڈان' اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ "جہاز اسلامی" سمندر میں جانے کے قابل نہیں ہے۔ ہزاروں عازمینِ حج امید وبیم میں متفکر بیٹھے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ،حکومتِ ہندوستان سے "جہازِ رضوان' کا مطالبہ کیا ہے (اُس وقت حج بکنگ کا محکمہ ہر دو حکومتوں کا مشترکہ تھا)۔ آپ کو بھی اُسی جہاز اسلامی سے سفر کرنا تھا۔ سخت فکرمندی کا سامنا اُس وقت ہوا جب حکومتِ ہند کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے مایوسی کی نوبت نہ آئی۔

مرزا عبدالرحمان بیگ صاحب، آپ کے علم میں لائے بغیر ہی، لعل شاہ بخاری صاحب سے ملے۔ وہ اُن دنوں حج بکنگ کے افسر تھے۔ بخاری صاحب نے ایک چٹھی دی اور کہا کہ حج کیمپ میں جا کر نام درج کروائیں۔ حج کیمپ کے انچارج علی گوہر خان تھے جن کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ اُن سے خان بہادر صاحب کا غائبانہ تعارف تھا۔ اُنہوں نے تسلی دی کہ انگلستانی جہاز میں کم از کم سیکنڈ کلاس میں جگہ مِل جائے گی۔ اگلے روز ایک نشست فرسٹ کلاس اور دو سیکنڈ کلاس میں مِل گئیں۔ اُس وقت کے حالات میں ایسا ہو جانا بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہوا تھا

کہ کئی معززین، افسران اور بارسوخ لوگ بھی ڈیک پر سفر کرنے پر مجبور تھے۔ آپ سجدۂ شکر بجا لائے اور سفر کی تیاری شروع کردی۔

کراچی میں احباب جماعت سے ملاقات

کراچی میں مزید دو روز آپ کا قیام تھا۔ نصیر احمد فاروقی صاحب نے چائے پر مدعو کیا۔ آپ کی طبیعت کچھ ناساز تھی، اس لیے آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دعوت میں شریک نہ ہو پائے، تو محترم فاروقی صاحب بمعہ خواجہ نذیر احمد صاحب اور دیگر احبابِ سلسلہ، خود ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ احبابِ جماعت نے ایک فلیٹ کرائے پر لے کر باقاعدہ جمعہ اور درس کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ جان کر آپ بہت خوش ہوئے۔ اِن کے علاوہ شیخ اقبال احمد اور شیخ آفتاب احمد، پسران شیخ نور احمد صاحب سے ملاقات ہوتی رہی اور ان برادران کی وجہ سے کافی معاملات میں سہولت میسر آئی اور بندرگاہ تک پہنچنے اور جہاز پر سوار ہونے تک کے بہت سے انتظام انہوں نے سرانجام دیئے۔

روانگی برائے حجاز۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء

۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بذریعہ "جہازِ انگلستان" سفرِ حجاز کا آغاز ہوا۔ جہاز پر متعدد دیرینہ شناسا مِل گئے اور کچھ نئے لوگوں سے تعارف ہوا۔ آپ کی شہرت بحیثیت ایک قابِل معالج جہاز پر ہر طرف ہونے لگی اور لوگ آپ سے استفادہ کرنے لگے۔

آغازِ سفر میں جن لوگوں سے آپ متعارف ہوئے، اُن میں ایک اہم شخصیت مولوی اسماعیل غزنوی صاحب بھی تھے، جو آپ کے والد محترم سے پہلے سے متعارف تھے۔ مولوی غزنوی، مولٰینا نورالدینؒ کے خاندان سے تھے۔ اُنھوں نے ازخود اپنا تعارف کرایا۔ یہ مختصر تعارف، ایک مستقل دوستی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جدہ کی بندرگاہ پر جہاز کے لنگرانداز ہوتے ہی اندازہ ہوگیا کہ

مولوی صاحب موصوف کو سرزمین حجاز میں، ایک خاص حیثیت حاصِل تھی اور وہ کافی اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ خود فرمانروائے حجاز، عبدالعزیز ابنِ سعود سے اُن کے ذاتی تعلقات تھے۔ چنانچہ اسماعیل غزنوی صاحب نے خان بہادر صاحب کا تعارف "رفیقِ غزنوی" اور "ضیف ملک" (غزنوی کا دوست اور شاہی مہمان) کے طور پر کروایا جس سے آپ کو بہت سی مراعات اور سہولتیں میسر آ سکیں۔ غزنوی صاحب نے جدہ میں آپ کی رہائش کا بندوبست اپنے ایک دوست غلام مصطفیٰ صاحب کے یہاں کروادیا، جہاں ہر قسم کے آرام وآسائش کے سامان موجود تھے۔

مکہ میں آمد

۱۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو، جدہ سے مکہ کا سفر، مولوی غزنوی صاحب کے ہمراہ، ایک آرام دِہ شاندار نئی "شورلے" کار میں کیا۔ یہ سفر باسہولت طے ہوا اور کئی مقامات کی زیارت بھی ممکن ہوسکی۔ مکہ کے حدود میں داخل ہونے پر مولوی صاحب نے دُعا پڑھائی۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی ڈائری سے اقتباس:

> اِس سرزمین مقدس میں داخلے کے وقت اپنے آپ سے شرم آتی ہے کہ یہ ناپاک وجود اِس قابل نہیں، ہاں تیری رحمت وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ، تُو نے خود فرمائی ہے۔ مجھ پر رحم فرما۔

مولوی غزنوی صاحب کی بدولت آپ کو مکہ میں اُس راستہ سے داخل ہونا نصیب ہوا جس راستے سے آنحضرت محمد ﷺ داخل ہوئے تھے۔ محمد ﷺ کا یہ اتباع میسر آ جانا بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جو آپؒ کو نصیب ہوئی۔ مکہ پہنچنے کے بعد، جلد ہی آپ بیت اللہ کے طواف کے لیے تشریف لے گئے۔ خان بہادر صاحب اپنے اُس وقت کے تاثرات کو یوں تحریر فرماتے ہیں:

> ہم کوچوں میں سے گذرتے ہوئے باب السلام پہنچے۔۔۔ باب السلام پر آ کر

دِل دھڑکنے لگا۔

؎ بہ طوافِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند

کہ تُو در برون چہ کردی؟ کہ درونِ خانہ آیی؟

(فخرالدین عراقی)

(میں کعبہ کے طواف کے لیے گیا تو مجھے حرم میں داخل نہ ہونے دیا گیا، کہا کہ تُو نے حرم کے باہر کیا کیا ہے کہ اب گھر کے اندر آسکے؟)

یہاں قدم رکھا تو کعبہ اپنی پوری شان، جلال، عظمت اور ہیبت کے ساتھ سامنے نظر آیا۔ (اقتباس از سفرنامہ حج)

مقامِ قیام

جناب غزنوی صاحب کی وساطت سے آپ کو کعبہ کے 'دروازہ عباس' کے عین مقابل رہائش گاہ نصیب ہوئی۔ یہ مکان آپ کے لیے ایک خاص رحمت کا نشان تھا۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

مکان کیا تھا، بس اُس کی خاص رحمت کا خاص نشان تھا۔ اللہ کے وعدے یاد آئے۔۔۔۔ کعبہ کا 'دروازہِ عباس' مکان کے عین مقابل ہے۔ تیسری چوتھی منزل پر بالا خانہ ہے۔ راستہ ذرا غلیظ اور تکلیف دہ ہے، لیکن جب اپنے کمرے کے صحن میں داخل ہوتا ہے، تو تین ٹوٹے پھوٹے دریچوں میں سے سامنے سارا حرم ہے۔ اور عین اُس کے وسط میں کعبہ کا وہ پہلو سامنے ہے جس میں دروازہ ہے۔ مقامِ ابراہیم، چاہِ زمزم سب کچھ سامنے ہے۔ رات دِن کے چوبیس گھنٹے مُطوِّفین کا ایک چکر میں بہتا دریا نظر پڑتا ہے۔ کعبہ کی زیارت کے لیے صرف اِس قدر محنت بکار ہے کہ سر اُٹھائے اور آنکھ کھولے۔ اس سعادت

مندی کے لیے کیسے شکرادا ہو۔

دورانِ سفر اور ایامِ حج میں جہاں آپ کا وقت عبادات، ذکر وتسبیحات میں گذرا، وہاں مخلوقِ خدا بھی آپ سے فیض یاب ہوتی رہی، اور آپ کی نیکی، حسنِ اخلاق اور حاذق طبیبی کا ہر جگہ بہت چرچا ہوا۔ مولوی غزنوی صاحب نے جلالتہ الملک عبدالعزیز ابنِ سعود سے بذریعہ تار آپ کا تعارف کروایا۔ اور حج کے بعد اپنی ذاتی ملاقات میں بھی فرمانروائے عرب سے آپ کی قابلیت کا تذکرہ ہوا۔ اسماعیل غزنوی صاحب کی خواہش تھی کہ خان بہادر صاحب حج کے بعد رُک کر شاہ عبدالعزیز سے ملاقات فرمائیں مگر آپ نے اسے پسند نہ فرمایا۔

آپ کے اِس سفر میں قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی ہوتی رہی اور نہ صرف مکہ میں بلکہ میدانِ عرفات، مدینہ منورہ اور دیگر مقامات کی زیارتیں بھی خدا کے فضل وکرم سے احسن طور پر انجام پائیں۔ خان بہادر صاحب حج کے دوران کے اپنے جو تاثرات قلمبند کرتے رہے تھے، اُن میں سے چند اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

۱۸اکتوبر ۱۹۴۷ء

میرے ساتھی نمازِ فجر کے بعد سوئے۔ میں بھی سویا لیکن آنکھ کھل گئی تو میرا شوق مجھے طواف کے لیے لے گیا۔ پہلا نفلی طواف میں نے شہداء اور مظلومین پنجاب اور ہند کے لیے کیا اور اُن کے حق میں دُعائے مغفرت کی۔۔۔۔ پھر شام سے پہلے دو طواف ایک حضرت نبی کریم ﷺ کے لیے اور ایک حضرت مسیح موعود کے لیے اور ایک نمازِ مغرب کے بعد اپنے دادا صاحب کے لیے کیا۔

۲۱اکتوبر ۱۹۴۷ء

صبح نماز میں صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا کہ جاگ آئی۔ دِل میں ندامت تھی۔

بہرحال جو خدا کو منظور تھا ہوا اور کچھ تسلی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوگئی۔ حطیم میں جو رحمتِ الٰہی سے رِقت عطا ہوئی اس نے دِل کو ٹھنڈک بخشی۔ مجھے اب تک مُطَوِّفین سے کچھ شکایت تھی۔ اُن کی کرخت آواز اور دھکے دینا ناگوار تھا اور سخت بھیڑ سے بھی گھبراتا تھا۔ آج صبح طواف میں عین ایسے وقت، جب دھکے زوروں پر تھے، میرے دِل میں اللہ نے یہ بات ڈالی کہ یہ چیز تعلیمِ برداشت اور تعمیرِ اخلاق کے لیے ایک ضروری اور لازمی حصہ ہے۔ نیز نیک لوگوں کی آپس کی رگڑ برکات کا ذریعہ ہے۔ اور میرے جیسے عاصی کے کچھ گناہ اِس طرح بھی جھٹکوں سے جھڑتے ہوں وغیرہ وغیرہ۔ عجیب لطف آیا اور انشراحِ صدر پیدا ہوا اور لطف آنے لگا۔ بلکہ جب دھکے نہ لگتے تھے اور کھلی جگہ چلتا تھا تو کسی کمی کا احساس ہوتا رہتا تھا۔

۱۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء

آج صبح کسی ہندی مقرر نے ہند کی قیامتِ صغریٰ کے متعلق تقریر کی۔ بعد میں کچھ عربی میں دُعا کے لیے اپیل کی۔ ہزاروں انسانوں نے آمین کی اور کئی لوگوں کو روتے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ اِس دُعائے بیت اللہ کو قبول فرما کر ہمیں اِن مصائب سے نجات دلائے۔

ایک واقعہ

خان بہادر صاحب اپنی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں:

پرسوں شام کی نماز کا ایک واقعہ قابلِ ذکر اب یاد آیا۔۔۔ ایک وجیہہ موٹا مگر پست قامت چٹا گورا، سیاہ داڑھی والا، جس میں چند بال سفید ہوں گے پیچھے

سے آیا اور میرے اور اخویم [۱] کے درمیان اپنی جگہ بنانے لگا۔ میں نے اپنے ہاتھ یا کہنی سے شاید نادانستہ مزاحمت کی تو بہت میٹھی زبان اور نرم لہجہ میں کہنے لگا: "هَذَا لْبُخْلَ فِيْ هٰذَهِ الْمَقَامِ؟" (اس مقام پر یہ کیسا بخل ہے؟)۔ میں ندامت سے عرق عرق، کچھ جواب نہ بن پڑا۔ کچھ سوچ کے بعد، میں نے عذر کے طور پر کہا: "لَا مَنْ بَخِلَ وَلٰكِنْ فَرَقْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اَخِيْ" (نہیں بخل کون کر رہا ہے، لیکن آپ نے میرے اور میرے بھائی کے درمیان جدائی ڈال دی)۔ اِس جواب سے میرے دِل کو تسلی نہ ہوئی اور نماز میں دِل نہایت رنجور رہا اور شرمندگی کا احساس رہا۔ اپنی کمی بہت برہنہ صورت میں نظر آنے لگی۔ جب سلام پھیرا تو میں نے اسے کہا "مَعْذِرَتاً يَا اَخِيْ" (برادرم معذرت قبول کیجیے)۔ اُس نے کہا "لَا بَأْسَ" (کوئی بات نہیں) تو میرے دِل کا کانٹا نکلا۔

۱: اخویم سے مراد خان بہادر غلام ربانی خان صاحب ہیں۔

۱۲۲ اکتوبر ۱۹۴ء کی تحریرات میں سے مزید اقتباسات:

شام کی نماز میں مسجد میں سید الطاف حسین [۲] صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے خواب سُنایا کہ حضرت امیر [۳] کو، اُنہوں نے خانہ کعبہ میں، اُمتِ مسلمہ کا امام دیکھا۔ اور یہ خانہ کعبہ کی دردمندانہ دُعا کے نتیجہ کے طور پر تھا۔ اور مولٰینا صدرالدین صاحب کی کشمکش کے بارہ میں دُعا کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اُنہیں بڑا اطمینانِ قلب اللہ نے اُس خواب سے دیا۔

۲: سید الطاف حسین صاحب سید محمد حسین شاہ صاحب کے فرزند اور جماعت کے سرکردہ ممبران میں سے تھے۔

۳: مولٰینا محمد علیؒ، امیرِ اوّل۔

میدانِ عرفات میں اپنے تجربات قلمبند کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

جو لطف اُن چار رکعت نماز میں اِس پروانوں کی جماعت میں نصیب ہوئی وہ اپنی مثال نہیں رکھتی۔

چٹانوں پر چڑھتے چڑھاتے ذرا بلندی پر پہنچے۔ وہ رحمت کا ٹیلہ انسانوں سے بھرپور تھا۔ ہر طرف دُعاؤں، مناجاتوں، گریہ وزاری کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں سے سارا عرفات کیمپ نظر آتا تھا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ چند قیمتی لمحے میسر آئے جو میرے نزدیک تمام عمر کی قیمت کے برابر نظر آتے تھے۔ سورج دیکھتے دیکھتے پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا اور مجسم احتیاج اور عاجز بندے کی عرضوں گذارشوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء۔ نمازِ جنازہ غائبانہ شہدائے مظلومینِ ہند

آج معلوم ہوا کہ دِن کی کانفرنس میں جنازہ غائبانہ شہدائے مظلومینِ ہند کا پڑھا جائے گا۔ اِس پر بحث ہوئی۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ پڑھا جائے۔ یہ تحریک، جہاز پر اور پھر مکہ میں، میں نے کی تھی۔ اخی غزنوی نے بادشاہ کو تار دیا تھا۔ جس کے جواب میں معاملہ علماء کے سپرد کیا گیا۔ محمد ابن ابراہیم (نابینا مولوی) نے مخالفت کی تھی لیکن شیخ الاسلام کی تائید سے پاس ہو گیا۔ کل جمعہ کو جنازہ پڑھا جائے گا۔

۴ نومبر ۱۹۴۷ء۔ مکہ سے مدینہ روانگی پر تاثرات

سامان موٹر پر لاد دیا۔ طوافِ وداع کیا، نمازِ ظہر کے بعد فرداً نمازِ عصر جمع کی، کعبہ پر آخری نظر ڈالی اور داغِ فراق دِل پر لے کر بابِ وداع سے باہر نکلے۔

۵ نومبر ۱۹۴۷ء۔ مدینہ میں آمد۔ مسجدِ نبوی کے بارے میں تاثرات

مسجدِ نبوی کی حسن و زیبائش سبحان اللہ۔ اور جن لوگوں نے اِس محبت سے اِس مقدس گھر کو ظاہری رنگ میں زیبا ترین بنایا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔ اور اُن مقدس ترین ہستیوں کی روح پر بھی ہمارا سلام اور خدا کی برکات ہوں، جن کے مقدس قدوم نے اِس سرزمین کو برکت بخشی اور جنہوں نے دولتِ اسلام کو ہمارے آقا سید الاولین و الآخرین سے برائے راست حاصل کیا اور پھر ہم تک پہنچایا۔

الھم صلی علی سیدنا و نبینا محمد و آلِ سیدنا محمد و علی
اصحابہ اجمعین رضی اللہ تعالیٰ عنھم و رضوانہ

حج سے واپسی

۱۶ نومبر کو مدینہ سے جدہ پہنچ کر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کے گھر قیام کیا اور ۱۹ نومبر کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ اُسی رات کو دس بجے کراچی پہنچے۔ اور چند روز وہاں قیام رہا اور اپنے عزیزوں کے علاوہ، جماعت کے رفیقوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ بلکہ اِس دوران آپ کو وہاں جمعہ کی نماز پڑھانے کا بھی موقعہ ملا اور ملیر کے علاقہ میں انجمن کی زمین دیکھنے بھی تشریف

لے گئے۔ سوموار کے دِن جماعت کا درس کا جو سلسلہ قائم تھا، اُس میں بھی شرکت نصیب ہوئی۔

کراچی سے راولپنڈی بذریعہ جہاز اور راولپنڈی سے مانسہرہ تک کا سفر بذریعہ بس طے کر کے آپ دیگر ان تشریف لائے، جہاں آپ کے عزیز واقارب آپ کے منتظر تھے۔ سینیٹوریم واپس پہنچنے پر شاندار استقبال ہوا۔

آپ کا یہ سفر جو تقریباً دو ماہ کا تھا، اس میں، اِس مردِ مومن کی زندگی کے کئی پہلو نمایاں ہوئے۔ خدا تعالیٰ سے خاص تعلق اور قدم قدم پر اُس ذات کی رہنمائی نظر آتی ہے جو کہ ایک عام انسان کو حاصل نہیں ہوتی۔ ایک طرف آپ کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ آپ کی عبادات کا کیا معیار تھا اور دوسری طرف خلقِ خدا سے محبت اور بے لوث خدمت اور حب الوطنی کے جذبات نظر آتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر، ہر لمحے جماعتِ احمدیہ لاہور کے لیے اُن کا خلوص اور دلی محبت کے جذبات نمایاں ہوتے ہیں۔

مس فاطمہ جناح کی ڈاڈر میں آمد۔ ۱۹۴۸ء

قائدِ اعظم محمد علی جناح کے علم میں لایا گیا تھا کہ صوبہ سرحد میں یورپین طرز کا ایک بہت اعلیٰ سینیٹوریم ہے۔ اِس لیے اُنہوں نے اپنے صوبہ سرحد اور ضلع ہزارہ کے دورے میں ڈاڈر سینیٹوریم کو بھی شامِل کیا تھا۔ اور خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو اُن کے اس پروگرام کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ سینیٹوریم میں قائدِ اعظم اور آپ کی محترم ہمشیرہ، محترمہ مس فاطمہ جناح کی متوقع آمد اور استقبال کی تیاریاں کافی عرصہ قبل شروع کر دی گئی تھیں۔ راستے کے دونوں اطراف پتھروں کی بڑی بڑی چٹانوں پر 'پاکستان پائندہ باد' 'قائداعظم زندہ باد' 'مس فاطمہ جناح زندہ باد' اور دیگر استقبالیہ کلمات اور عبارتیں نمایاں طور پر سبز روغن سے لکھوائی گئی تھیں۔ چند ناگزیر حالات کے سبب، محترم قائداعظم کو اپنا دورہ منسوخ کرنا پڑا مگر اُن کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح تشریف لائیں۔ اُن کی آمد پر

ایک پُروقار تقریب منعقد ہوئی۔ اُس وقت خان بہادر صاحب کے فرزندِ اکبر ڈاکٹر عبدالحیٔ سعید، سینیٹوریم ہی میں تعینات تھے۔ تقریب کے تمام تر انتظامات اُن کے سپرد تھے۔ تقاریر ہوئیں اور سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اِس کے علاوہ اسکول کے طالب علموں نے ایک نظم پیش کی جو خاص اس تقریب کے لیے مشہور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر عثمانی نے لکھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت سینیٹوریم میں زیرِ علاج تھے۔

قائدِ اعظم کا انتقالِ پر ملال۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء

ہر پاکستانی کی طرح خان بہادر صاحب اور ڈاڈر سینیٹوریم کے مریضوں اور تمام عملے کے ارکان کو قائدِ اعظم سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی۔ اُن کی وفات کی خبر سے پورے سینیٹوریم پر سناٹا چھا گیا اور ایک عجیب یاس کی کیفیت سے ہر انسان دوچار نظر آنے لگا۔ جلد ہی پرچم سرنگوں کر دیا گیا۔ اور قرآن خوانی کی مجالس منعقد کروائی گئیں۔ تقاریر میں اِس سانحہ پر افسوس کا اظہار ہوا۔ کئی روز تک تمام سٹاف نے بازوؤں پر کالی پٹیاں باندھے رکھیں۔ خان بہادر صاحب کی اقتداء میں غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی، جس میں ہر خاص و عام شریک ہوا۔

سعادتِ حج دوسری مرتبہ۔ ستمبر ۱۹۵۰ء

ستمبر ۱۹۵۰ء میں خدا تعالیٰ نے دوسری مرتبہ خان بہادر سعید احمد خان صاحب کو سعادتِ حج سے مشرف فرمایا۔ درحقیت آپ کے پہلے حج کے موقعہ پر آپ کو جو شہرت نصیب ہوئی، وہی اِس حج کا سبب بنی۔ مولوی محمد اسماعیل غزنوی صاحب نے ذاتی طور پر شاہ ابنِ سعود سے خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان کے حُسنِ اخلاق اور تپِ دق کے ماہر ڈاکٹر ہونے کا تذکرہ کیا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف کی وساطت سے آپ کو شاہی دعوت موصول ہوئی کہ بطورِ شاہی مہمان، آپ حج کی سعادت حاصِل کریں اور شاہِ عرب کو طبی مشورہ سے بھی مستفید فرمائیں۔

آپ اپنی معاونت کے لیے بابو الٰہی بخش صاحب جنہیں عرفِ عام میں "پَیّا"۱ کہا جاتا تھا، ہمراہ لے گئے۔

۱: آپ کے فرزند عبداللہ سعید بچپن میں اُن سے بہت مانوس تھے اور "پَیّا" کہتے تھے۔ چنانچہ یہ نام مشہور ہو گیا۔

شاہ عبدالعزیز ابنِ سعود کی طرف سے خان بہادر صاحب کو اپنا ذاتی معالج مقرر کرنے کی پیشکش ہوئی، مگر آپ نے اپنی قوم اور اہلِ وطن کی خدمت کو مقدم رکھتے ہوئے شاہی اعزازات اور مال و دولت کو قبول نہ فرمایا اور ادائیگی حج کے بعد وطن واپس لوٹ آئے۔

سویڈن اور دیگر یورپی ممالک کا دورہ۔ ۱۹۵۱ء

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کی فیلوشپ (Fellowship) پر آپ یورپ گئے۔ آپ ایک ایسی ٹیم کے ممبر تھے جس میں مختلف ممالک سے آٹھ چوٹی کے ماہرین منتخب کیے گئے تھے۔ آپ نے کئی مغربی یورپی ممالک کا دورہ کیا اور بہترین ہسپتالوں میں تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آپ تقریباً چھ ماہ کے بعد واپس تشریف لائے۔

حضرت مولانا محمد علیؒ کی وفات کا صدمہ۔ ۱۹۵۱ء

امیرِ اوّل حضرت مولانا محمد علیؒ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو اِس جہاں سے رحلت فرما گئے۔ اُس وقت خان بہادر صاحب سویڈن میں تھے۔ دیارِ غیر میں اپنے شفیق اور محترم امیر کی دائمی جدائی کے صدمہ سے آپ بے انتہا مغموم تھے۔ حضرت مولانا آپ سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ یہ آپ کے لیے ذاتی صدمہ بھی تھا مگر اِس سے بڑھ کر یہ احساس کہ جماعتِ احمدیہ بالخصوص اور تمام عالم بالعموم ایک عالمِ بے مثال سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ اِس غریب الوطنی میں احساسِ غم

سے مغلوب ہو کر، ایک سویڈش کرنل سے، جو بہت علم دوست شخص تھا، آپ نے مولیٰنا کی وفات کا ذکر کیا۔ کرنل موصوف کے ہاتھ میں اُس وقت کھانے کی کوئی چیز تھی، اِس خبر سے وہ یوں چونکا کہ نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ حضرت مولیٰنا کی کتب کا مطالعہ کر چکا تھا۔ وہ اُٹھا اور اسلامک ریویو کا ایک پرچہ ہاتھ میں لیے لوٹا۔ اِس کے سرورق پر مولیٰنا محمد علی مرحوم کی تصویر تھی۔ وہ دیر تک آپ سے حضرت مولیٰنا کے بارے میں گفتگو کرتا رہا، جس سے آپ کی دلجوئی ہوئی اور تسکین ملی۔

سویڈن سے واپسی پر سینیٹوریم کے حالات

اوائل ۱۹۵۲ء میں آپ سویڈن سے واپس وطن آئے۔ آپ کی طویل غیر حاضری میں سینیٹوریم کے حالات بہت کچھ بدل گئے تھے۔ کئی قسم کی سازشیں جنم لے چکی تھیں۔ آپ کے ماتحت ڈاکٹروں نے اپنی مطلب برآوری کے لیے ملاؤں کا سہارا لیا۔ اور تمام سٹاف اور مریضوں تک کو بدظن کر دیا۔ کئی غلط الزامات آپ پر عائد کیے گئے اور اس قسم کے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ آپ جب بیرون ملک دورہ سے واپس لوٹیں تو سینیٹوریم میں قیام ممکن ہی نہ رہے۔ یہ صورتِ حال آپ کے لیے بہت تشویشناک اور پُرخطر تھی۔ مگر آپ سمجھتے تھے کہ عموماً ایسی سازشیں جلد ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ اس لیے اپنے طور پر حالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن یہاں معاملہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ حکومتی ادارے بھی اِس سے باخبر کر دیئے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ کو ۲۴ فروری ۱۹۵۲ء کو پشاور تبادلہ کا حکم کر دیا گیا۔ اِس وقت یہ تبادلہ آپ کے لیے ذاتی وجوہات کی بنا پر بھی غیر موزوں تھا۔ آپ چھ ماہ بعد گھر واپس آئے تھے اور مارچ کے آخری ہفتے میں آپ کی دُختر خدیجہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اُس کے لیے کئی انتظامات مدِّ نظر تھے۔ چنانچہ آپ نے طویل رُخصت کی درخواست کے ساتھ ملازمت سے سبکدوشی کے لیے درخواست دی۔ آپ کی رخصت کی درخواست منظور ہو گئی، اور اس اثناء میں آئی جی محکمہ صحت خود سینیٹوریم میں تشریف لائے، معاملات کی تحقیق کی اور آپ سے استعفٰی واپس لے کر، ملازمت جاری رکھنے کی درخواست کی گئی، جسے آپ نے منظور کر

لیا۔

جماعتِ احمدیہ کے خلاف ایک ملک گیر تحریک ۔ ۱۹۵۳ء

۱۹۵۳ء میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف ایک ملک گیر تحریک کا آغاز پنجاب سے ہوا، جس کے نتیجہ میں لاہور میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا۔ جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی اس تحریک کے شعلے سرحد تک بھی پہنچے۔ اور خان بہادر صاحب کی ذات کو ایک بار پھر سازشیوں نے اپنا ہدف بنایا۔ وہ سازشیں جو بظاہر پرسکون حالات میں پنپ رہی تھیں، ایک بار پھر سر اُٹھانے لگیں۔ آپ کے رفقائے کار اور سرحد کے دیگر مقامات پر تعینات ڈاکٹر، ڈاڈر سینیٹوریم کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بننے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ اِس لیے یہ حالات کئی طالع آزما سازشیوں کے لیے تقویت کا باعث ہوئے۔

ڈاڈر سینیٹوریم ایک اہم صحت افزا مقام تھا۔ یہاں کی قدرتی دلفریبی قابل دید تھی۔ آپ عرصۂ دراز سے یہاں قیام پذیر تھے۔ اس لیے یہاں کا ماحول کئی رنگ میں آپ سے متاثر تھا۔ عموماً لوگ آپ کی عزت و وقار اور شہرت کو ڈاڈر سے ہی منسوب سمجھتے تھے۔ اس لیے آپ کے ہم پیشہ لوگ یہاں تقرری کے خواہاں رہتے تھے، تا کہ اِس پُرکشش ماحول میں رہ کر وہ بھی خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان جیسی عزت و وقار اور مالی فراوانی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ ان موقع پرستوں نے، اِس فساد و فتنہ کو اپنے لیے ایک قیمتی موقع جان کر، وزیرِ اعلیٰ سرحد تک کئی خود ساختہ شکایات پہنچانا شروع کر دیں۔ شکایات میں سرِ فہرست وہی پرانا حربہ، کہ یہ شخص احمدی ہے اور احمدیت کی تبلیغ کرتا ہے اور اِس علاقہ میں اس کی موجودگی سے امن و امان خطرے میں ہے اور فسادات کا خطرہ ہے۔ یہ تاثر بھی حکام کو دیا گیا کہ یہ شخص سینیٹوریم میں مختارِ کل کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ڈاڈر سینیٹوریم صوبائی حکومت کے تحت تھا، اور ضلعی حکام کا اِس میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ اُن پر بھی یہ بات گراں گذرتی تھی۔ اس لیے اُنہوں نے بھی سازشیوں کے ساتھ تعاون کر کے اُن کے ہاتھ مضبوط کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس طرح آپ کو سینیٹوریم سے ہٹانے کی سازش مکمل ہوگئی اور

جلد ہی اِس پر عمل درآمد بھی سامنے آ گیا۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں آپ کسی کام کے سلسلہ میں پشاور تشریف لے گئے تھے۔ آئی جی محکمہ صحت نے آپ سے فون پر بات کر کے، پشاور میں مزید رُکنے کو کہا اور کہا کہ ضروری سرکاری کام کے سلسلے میں اُن سے آ کر ملیں۔ آپ نے اپنا قیام بڑھا دیا اور پورا ایک ہفتہ، روزانہ آئی جی کے دفتر جاتے رہے مگر نہ تو آئی جی صاحب نے آپ سے ملاقات کی اور نہ یہ ہی بتایا کہ کام کیا تھا اور مزید کتنا عرصہ رُکنا ہو گا۔ یہ صورتِ حال خاصی پریشان کُن تھی۔ غیر متعین مدت کے لیے آپ نے رُکنا مناسب نہ سمجھا۔ آئی جی صاحب کے دفتر میں، اُن کے لیے نوٹ چھوڑ کر آپ واپس سینیٹوریم تشریف لے آئے۔

انہی دنوں میں لاہور میں مارشل لاء کا نفاذ ہو چکا تھا، لیکن صوبہ سرحد میں ابھی تک کوئی ایسا واقعہ رُونما نہ ہوا تھا جسے تشویشناک قرار دیا جا سکتا۔ تاہم حکامِ اعلیٰ نے امنِ عامہ کے مسئلہ کی آڑ لیتے ہوئے، خان بہادر صاحب کو ڈاڈر سینیٹوریم سے ہٹانے کے لیے ایک موزوں موقع جانا اور آئی جی صاحب نے آپ کو پشاور آ کر، اُن سے ملاقات کرنے کو کہا۔ کام کی نوعیت اب بھی نہ بتائی گئی۔ وہاں پہنچنے پر آپ کا تقرر آپ کی حیثیت سے کم تر جگہ پر کر دیا گیا اور آپ کے واپس سینیٹوریم جانے کو خطرے کا باعث قرار دیا گیا اور فوراً ہی وہاں ایک ڈاکٹر صاحب کو، جو پہلے سینیٹوریم میں آپ کے ماتحت کام کر چکے تھے، ڈاڈر کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب مدت سے اِس عہدہ کے خواہاں تھے اور اِس کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے تھے۔

خان بہادر صاحب کی پشاور روانگی اور نئے ڈاکٹر صاحب کے ڈاڈر سینیٹوریم میں ورود کے ساتھ ہی احمدیوں کے ڈاڈر سینیٹوریم سے مکمل انخلاء کا منصوبہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ سینیٹوریم میں پولیس افسر بمع عملہ کے پہنچ گئے۔ اور تمام احمدی مریضوں اور عملہ کی ایک فہرست تیار کروائی اور ایک بڑی بس میں سوار کروا کر ایبٹ آباد کے سِول ہسپتال بھیج دیا گیا کہ سینیٹوریم میں اُن کی جانوں کو خطرہ ہے۔

خان بہادر صاحب کی غیر موجودگی میں یہ لوگ بالکل بے بس تھے اور بغیر کسی احتجاج کے سب ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ اُس زمانے میں، نہ تو سینیٹوریم میں فون کا سلسلہ قائم ہوا تھا اور نہ آپ کی اپنی ایبٹ آباد کی رہائش گاہ، دارالسعید پر ہی فون تھا۔ آپ کے گھر والے پیش آمدہ تمام حالات سے بے خبر تھے۔ آپ کے چھوٹے، زیرِ تعلیم بچے ایبٹ آباد میں اپنی والدہ کے ساتھ تھے، جبکہ ڈاڈر سینیٹوریم میں آپ کی بڑی بیگم صاحبہ اور چند ملازمین تھے۔ ایک پولیس افسر نے بیگم صاحبہ سے کہلوایا کہ پیش آمدہ خطرے کے تحت وہ یہاں سے جلدی چلے جانے کا بندوبست کرلیں، مگر اُنہوں نے دلیری سے کام لیتے ہوئے کہلا بھیجا کہ میں ڈاکٹر صاحب کے واپس آنے تک کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی۔ دریں اثناء آپ کے فرزند عبداللہ سعید، خود آ گئے اور اپنی والدہ کو اپنے ہمراہ بحفاظت ایبٹ آباد پہنچا دیا۔

یہ تمام کارروائی ایک مفروضہ پر مبنی تھی تا کہ احمدیوں کا سینیٹوریم سے مکمل انخلاء ہو جائے۔ اُس وقت اُس علاقہ میں کوئی بدامنی نہ تھی اور نہ احمدیت کے خلاف کوئی شر ہی تھا۔ مصائب کا یہ پہاڑ جو احمدیوں پر ٹوٹا تو کئی ایک کے لیے اُن کی بہتر زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اُن میں سے اکثر نے ملازمت ترک کر دی اور اپنے اپنے کاروبار شروع کر دیئے۔ دوا خانے اور کلینک بنا لیے اور خدا تعالیٰ کے فضل سے خوش حال ہو گئے۔ اِن لوگوں میں نمایاں نام لالہ علی بہادر اور بابو الٰہی بخش کے ہیں۔

مصائب میں خان بہادر صاحب کا صبر و تحمل اور تائیدِ ایزدی کے نشانات

حکامِ بالا کا خان بہادر صاحب کے ساتھ یہ غیر منصفانہ رویہ اور تحقیر آمیز سلوک، آپ کے لیے اور آپ کے اقرباء کے لیے نہایت صبر آزما تھا۔ یہ کڑی آزمائش کا دور تھا اور مستقبل قریب میں طرح طرح کے خطرات سر پر منڈلا رہے تھے۔ خان بہادر صاحب کافی دِل برداشتہ تھے۔ اِس کے خلاف احتجاج کا خیال بھی دِل میں گذرا۔ تاہم خاموش رہے اور صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے بادلِ ناخواستہ ہسپتال میں اپنی نئی تقرری کا چارج لے لیا۔ آپ کی یہ دِل آزاری اور سُبکی، جو احمدیت کی

وجہ سے کی گئی تھی، اُس کی فریاد وہ صرف اللہ تعالیٰ سے ہی کرنا چاہتے تھے اور اُسی سے دادرسی کی آس تھی۔ آپ نے صبرِ یعقوبؑ کو سامنے رکھا اور صرف یہ فرمایا:

اِنَّمَآ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ

(میں اپنے غم و الم کی فریاد صرف اللہ سے کرتا ہوں)۔ (یوسف ۱۲:۸۶)

ہمہ مقتدر تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے اور جب اُس کے بندے آزمائشوں میں پورے اُترتے ہیں تو وہ اُن کی دادرسی بھی فرماتا ہے اور دلجوئی کے سامان بھی خود پیدا کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی خان بہادر صاحب کی دلجوئی کا سامان بھی فوراً ہی ہو گیا کہ جب خان بہادر صاحب، دِل کڑا کر کے ہسپتال میں نیا چارج سنبھال رہے تھے، تو بعینہٖ اُسی وقت، سرحد اسمبلی میں ردو بدل رونما ہو رہے تھے اور اُسی دِن شام سے پہلے پہلے، جن وزیرِ اعلیٰ کی حمایت سے یہ کارروائی ہوئی تھی، اُن کو برطرف کر دیا گیا اور نئے وزیرِ اعلیٰ نے اپنے عہدہ کا چارج سنبھال لیا۔

تقریباً ایک ہفتہ تک خان بہادر صاحب نے ہسپتال میں کام کیا ہوگا، کہ محکمہ صحت کے آئی جی، دو ماہ کے غیر ملکی دورہ پر روانہ ہو گئے۔ اس خالی جگہ پر آپ کو قائم مقام آئی جی مقرر کر دیا گیا۔ رب العزت نے ایک ہفتہ کے صبر آزما امتحان کے بعد ایک باعزت مقام عطا کر دیا۔ اور وہ ڈاکٹر صاحب، جو بڑے ذوق و شوق سے ڈاڈر سینیٹوریم میں اپنی خواہش سے گئے تھے، ایک بار پھر آپ کے ماتحت ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی تائید کے نشان دکھلائے۔

دو ماہ کی اِس اعزازی تقرری کے بعد آپ نے طویل رُخصت کی درخواست پیش کی۔ آئی جی نے اپنی سفارشات کے ساتھ وزیرِ اعلیٰ سے چار ماہ کی رُخصت منظور کروا لی۔ آپ ایبٹ آباد تشریف لائے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے اہل و عیال کو دو ماہ کے طویل صبر آزما اور پُرتشویش آزمائش کے بعد سکون و اطمینان بخشا۔

ایبٹ آباد میں پریکٹس ۔ ۱۹۵۳ء

''دارلسعید'' کی عمارت دو حصوں میں منقسم تھی۔ رہائشی وسیع مکان اور بالا خانہ جو عموماً مہمانوں کے قیام کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بالا خانہ کی عمارت برلبِ سڑک، دو گیراج اور ایک دوسرے کمرے کے اوپر تھی۔ آپ نے اپنی چار ماہ کی رخصت میں، برلبِ سڑک واقع، اِس کمرے میں اپنا مختصر سا کلینک بنالیا۔ اور با قاعدہ مریض دیکھنے لگے۔ چند ہی دنوں میں علاقے بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ ڈاڈر والے خان بہادر صاحب نے اپنا ذاتی مطب کھول لیا ہے۔ مریضوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اور خان بہادر صاحب کو خود یہ محسوس ہونے لگا کہ سرکاری ملازمت کے مقابلہ میں ذاتی مطب میں زیادہ مالی منفعت ہوتی ہے۔ ملازمت کی لگی بندھی تنخواہ تو بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ آپ نے ملازمت ترک کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اور ایک نقشہ بھی تیار کروا لیا، جس سے بالا خانہ کی پوری عمارت کو ردوبدل کے بعد ایک کلینک کی صورت دی جا سکے۔

دوسری طرف، ڈاڈر سینیٹوریم کے نئے انچارج، جو ذاتی خواہش سے بہت سنہرے خواب لے کر یہاں پہنچے تھے، اپنے اِن خوابوں کی تعبیر وہاں نہ پا کر مایوس اور پریشان حال تھے۔ سینیٹوریم میں ذاتی پریکٹس کے امکانات معدوم تھے، اس لیے اُنہیں وہاں رہنا دوبھر ہو رہا تھا۔ جلد ہی وہاں سے تبدیلی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ اِن چند ماہ میں حکامِ بالا کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ سینیٹوریم کی روحِ رواں تو خان بہادر صاحب ہی ہیں۔ اُن کے دم سے ہی سینیٹوریم کی رونق ہے۔ موجودہ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو نہ تو مریضوں سے ویسا اُنس تھا، نہ وہ شفقت اور ہمدردی ہی تھی، اس لیے مریض اور عملہ دونوں اپنی اپنی جگہ نالاں تھے اور ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ پریشان۔ ان ڈاکٹر صاحب نے وزیرِ اعلیٰ تک رسائی حاصل کی، اپنی تکالیف بیان کیں اور واپس پشاور تبادلہ کی درخواست کی۔ وزیرِ اعلیٰ نے ہمدردانہ غور کر کے حل نکالنے کا وعدہ کیا۔

خان بہادر صاحب کی سینیٹوریم میں واپسی

خان بہادر صاحب کی رُخصت کا عرصہ قریب الاختتام تھا، جب وزیرِ اعلیٰ نے آپ سے فون پر بات کی اور کہا کہ آپ کی رُخصت ختم ہونے کو ہے۔ آپ اِس کے بعد ڈاڈر سینیٹورم کا چارج سنبھال لیں۔ آپ نے قدرے لیت ولعل کی اور ملازمت ترک کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ وزیرِ اعلیٰ نے اصرار کیا اور گذارش کے رنگ میں آپ سے بات کی، اور سینیٹوریم کی بگڑتی ہوئی حالت کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ سینکڑوں مریض آپ کی توجہ کے منتظر ہیں۔ اُن کو زندہ رکھنے کے لیے اور مایوسی سے دوچار ہونے سے بچانے کے لیے آپ کا سینیٹوریم میں چلا جانا ضروری ہے۔ خان بہادر صاحب کو بھی سینیٹوریم سے ذاتی لگاؤ تھا اور مریضوں کو بھرپور توجہ دینے کو آپ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے اور یہی خیال آپ کے انکار میں مانع تھا۔ آپ نے سوچ کر جواب دینے کا کہا اور چند دِن بعد اثبات میں جواب پانے پر، آپ کے ڈاڈر تبادلہ کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ اس طرح آپ باعزت طور پر ڈاڈر سینیٹوریم واپس آ گئے۔

تاہم، آپ نے اپنا ذاتی کلینک بند نہ کیا اور ہفتہ وار چھٹی کے روز مریض دیکھتے رہے۔ ساتھ ساتھ، عمارت کو باقاعدہ طور پر کلینک میں تبدیلی کا عمل بھی جاری رہا۔ اور سال بھر کے عرصہ میں کلینک کی سہ منزلہ عمارت، دور ہی سے نمایاں نظر آنے لگی، جس میں ہر قسم کے جدید آلات اور سہولیات موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنے افضال اِس طرح نازل فرمائے کہ یہ ڈیڑھ دِن جو آپ کو ایبٹ آباد میں میسر آتا، اس میں مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔ شاذونادر ہی کبھی آپ کو آرام کرنے کے لیے کوئی وقت میسر آتا تھا۔

تقرری بطور ڈپٹی ڈائریکٹر ناردرن ریجن۔ ۱۹۵۵۔۵۶ء

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے چار صوبوں کو ایک متحدہ صوبہ بنا دیا گیا جسے ”ون

یونٹ" (One Unit) کہتے تھے۔ یہ متحدہ صوبہ کئی ریجنز میں تقسیم کیا گیا تھا۔ محکمۂ صحت کا افسرِ اعلیٰ جو پورے "ون یونٹ" کا انچارج ہوتا تھا وہ ڈائریکٹر ہیلتھ کہلاتا تھا اور ذیلی ریجنز میں ایک ایک "ڈپٹی ڈائریکٹر" تعینات کیا گیا تھا۔ خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان کا تقرر بطور "ڈپٹی ڈائریکٹر ناردرن ریجن" ہوا۔ اِس ریجن میں صوبہ سرحد کے تمام اضلاع اور پنجاب کے چند اضلاع شامل تھے۔

خان بہادر صاحب اِس ریجن میں سب سے سینئر ڈاکٹر تھے۔ آپ کو ترقی دے کر اُس عہدے پر فائز کرنا حکومت کے لیے ناگزیر تھا۔ آپ نے اِس تقرری کو قبول فرمایا اور پشاور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ کے دوست، راجہ ذوق اختر خان صاحب نے اپنی عقیدت، محبت اور خوشی کا اظہار اِس طرح کیا کہ اپنی نئی گاڑی میں آپ کو پشاور لے گئے اور یہ گاڑی وہیں آپ کے استعمال کے لیے چھوڑ آئے۔ آپ نے اپنے قیام کے لیے سروسز کلب میں دو کمروں پر مشتمل ایک یونٹ کرائے پر لے لیا اور کام کاج کے لیے ایک اردلی اور ایک ڈرائیور رکھ لیے۔

خان بہادر صاحب کی تقرری کے خلاف مقدمہ

بعض حلقوں کے لیے خان بہادر صاحب کی یہ تقرری خلافِ توقع تھی اور اِسے قبول کرنا خاصا مشکل۔ ایسے ہی لوگوں کے ایما پر، اُس علاقے کے ایک ڈاکٹر صاحب نے حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا کہ اِس عہدے کے وہ حقدار ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب موصوف آپ سے جونیئر تھے، مگر مقدمہ اِس بنیاد پر دائر کیا گیا تھا کہ چونکہ وہ "ون یونٹ" کے قیام کے وقت صوبہ سرحد میں بطور قائم مقام 'آئی جی' کام کر رہے تھے اِس لیے اُن کا حق بنتا تھا کہ اُن کو 'ڈپٹی ڈائریکٹر' مقرر کیا جاتا۔

حضرت قبلہ سید اسد اللہ شاہ صاحبؒ کی شبانہ روز دُعاؤں اور التجاؤں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملتا رہا اور اس دور میں آپؒ کو کئی بشارات ملیں جو سب کے لیے باعث تسلی و تشفی تھیں۔ مقدمہ جلد ہی خارج ہو گیا اور خان بہادر صاحب نے اپنی سال بھر کی ملازمت کا یہ عرصہ نہایت

کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ گذارا۔

قیامِ پشاور میں جماعت کے ساتھ تعلق

پشاور میں قیام کے دوران، دفتری اوقات کے علاوہ، زیادہ تر وقت آپ جماعت کے احباب کے ساتھ گذارتے تھے۔ دفتر سے واپس آ کر کچھ دیر آرام فرماتے یا اخبار وغیرہ پڑھتے۔ عصر کے بعد اکثر احبابِ جماعت ملاقات کے لیے سروسز کلب تشریف لے آتے تھے۔ بالخصوص آپ کے دیرینہ دوست اور ہم جماعت ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب اکثر آ جاتے اور آپ کے ساتھ وقت گذارتے تھے۔

مغرب کی نماز کے لیے آپ جماعت کی مسجد، واقع کوچہ گل بادشاہ میں تشریف لے جاتے اور اکثر اوقات عشاء کے بعد کلب واپس آتے۔ اس دوران احبابِ جماعت سے تبادلۂ خیال ہوتا۔ جماعت سے متعلق گفتگو رہتی اور درس کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا۔ آپؒ وہاں موجود ہوتے تو نماز کی امامت بھی آپ ہی فرماتے تھے۔ بابو فقیر محمد جو اُس وقت نوجوان تھے، تعلیم مکمل کر چکے تھے اور ابھی ٹریننگ کے مراحل سے گذر رہے تھے۔ وہ آپ کے ساتھ چار ماہ تک پشاور میں مقیم رہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> خان بہادر صاحب دفتر کے اوقات کے علاوہ زیادہ وقت جماعت کے احباب کے ساتھ گذارنا پسند فرماتے تھے۔ فرداً فرداً احباب سے ملاقات کے لیے بھی تشریف لے جاتے تھے، مگر اکثر دوست احباب خود آپ سے ملنے سروسز کلب تشریف لے آتے تھے۔ مغرب کی نماز کے لیے کوچہ گل بادشاہ کی مسجد میں تشریف لے جاتے تھے۔ جماعت کے افراد میں خاص طور پر دلاور خان صاحب، عبدالرحمان نیازی صاحب، عبداللہ جان نیازی صاحب، محمد الرحمان

صاحب اور ڈاکٹر عبدالعزیز خان صاحب مجھے یاد ہیں۔ اِس کے علاوہ دس پندرہ افراد اور بھی ہوتے تھے۔نمازوں کی امامت خان بہادر صاحب فرماتے تھے اور نمازِ جمعہ کا خطبہ بھی آپ ہی دیتے تھے۔

توسیع ملازمت اورڈاڈر سینیٹوریم میں تقرری۔اکتوبر ۱۹۵۶ء

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں بلحاظِ عمر، جو اُس زمانہ میں پچپن برس تھی، آپ محکمہ صحت سے بطور ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ سبکدوش ہو گئے۔ آپ نئے نامزد ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کو چارج دے کر ایبٹ آباد واپس آ گئے۔ محکمہ صحت اُس وقت ایک عجیب اُلجھن کا شکار تھا۔ ڈاڈر سینیٹوریم کے حالات زیادہ اچھے نہ تھے۔ وہاں کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، مالی منفعت نہ ہونے کے باعث ناخوش تھے اور تبادلہ کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ کوئی دوسرا ڈاکٹر وہاں جانے کو رضامند نہ تھا۔ حکومت کو یہ تسلیم کرنا پڑ رہا تھا کہ ڈاڈر سینیٹوریم کو صرف وہی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بطورِ احسن سنبھال سکتا ہے، جسے اِس سے ذاتی وابستگی ہو اور بے لوث خدمت جس کا شعار ہو۔ چنانچہ افسرانِ اعلیٰ نے ڈاکٹر سعید احمد خان کو ملازمت میں توسیع دے کر ڈاڈر سینیٹوریم میں دوبارہ تقرری کی پیشکش کی۔ خان بہادر صاحب نے کچھ مراعات کے ساتھ اِسے قبول فرمایا اور ڈاڈر سینیٹوریم تشریف لے گئے۔

ڈاڈر سینیٹوریم کی توسیع

ڈاڈر سینیٹوریم میں وقتاً فوقتاً وارڈوں میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اب اس کی توسیع اُس شمالی پہاڑی کی طرف ہونے لگی جو ڈاڈر کو بھوگڑ منگ سے جدا کرتی ہے۔ بہت جلد کئی مردانہ اور زنانہ وارڈوں کا اضافہ ہو گیا اور اس طرح یہ ہسپتال تین سو سے زیادہ بستروں کا ہو گیا۔ ہسپتال کی مین بلڈنگ کے ساتھ خالی میدان، جہاں والی بال اور دوسرے کھیل کھیلے جاتے تھے، وہاں ایک نیا بلاک بنایا گیا جس میں ایک اپریشن روم، چند ریکوری روم اور دوسرے کمرے بنائے گئے۔ اسی زمانہ میں

اسسٹنٹ سرجن کے بنگلے کے ساتھ، خالی جگہ پر ایک کلب تعمیر ہوا جو ڈاکٹر صاحبان کی تفریح کے لیے مخصوص تھا۔

حضرت سید اسد اللہ شاہؒ صاحب کا داغِ مفارقت

۱۴ فروری ۱۹۵۷ کو خان بہادر صاحب کے رفیق اور بزرگ قبلہ شاہ صاحب وفات پا گئے۔ سید اسد اللہ شاہ صاحب کا وجود آپ کے لیے شفیق باپ کے سایہ سے کم نہ تھا۔ قدم قدم پر آپ کی دُعاؤں کا سہارا رہتا تھا اور تسلی اور تشفی کا سامان مہیا ہوتا رہتا تھا۔ اُن کی وفات نے آپ کو بہت مضمحل کر دیا۔ وفات کا تار ملنے پر آپ کافی دیر تک اپنے کمرے میں رہے۔ خدا تعالیٰ کے حضور صبر و تحمل اور برداشت کے لیے دُعائیں مانگتے رہے، غالباً آنسو بھی ضرور بہہ نکلے ہوں گے۔ دروازہ کھول کر اپنی بیٹی صفیہ کو کمرے میں بلا کر تار دکھایا اور کہا: ”اس تار کا مضمون، میرے لیے اپنی زبان سے ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ کام آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کو آپ سُنا دیں“۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ چند گھڑیاں گھر بھر میں سکوت سا چھایا رہا۔ پھر آپ نے تمام اہلِ خانہ کو بلا کر تسلی آمیز باتیں کہیں اور لاہور کے لیے روانہ ہو گئے، مگر جنازہ میں شریک نہ ہو سکے جس کا آپ کو بے حد صدمہ تھا۔

ملازمت میں مزید توسیع کی پیشکش

اولاً، آپ کی ملازمت میں تین سال کی توسیع کی گئی تھی، جو اکتوبر ۱۹۵۹ء میں اختتام کو پہنچنی تھی۔ حکومت کی طرف سے آپ کی ملازمت میں مزید تین سال کی توسیع، کچھ اور مراعات دے کر، کر دی گئی اور آپ نے اپنی ملازمت جاری رکھی۔

ملک امیر محمد خان (نواب آف کالا باغ) کی سینیٹوریم میں آمد

یوں تو خان بہادر صاحب کو، بحیثیت میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، لاتعداد مقامی اور غیر ملکی افسرانِ اعلیٰ، حکام اور وزراء کی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا رہا تھا، مگر ملک امیر محمد خان صاحب کی تشریف آوری اِس طرح زیادہ اہمیت کی حامِل تھی کہ وہ خود آپ کی ذاتی دعوت پر آئے تھے۔ آپ بطور ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ کالا باغ بھی دورے پر گئے تھے۔ بعد میں ملک امیر محمد خان صاحب سے ایک ملاقات میں آپ نے نواب صاحب کو ڈاڈر تشریف لانے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا: ”آپ نے کالا باغ میں دریا کے کنارے ایک شاندار آرام گاہ اپنے لیے بنوائی ہے۔ ایک جھونپڑا نما آرام گاہ ہم نے بھی دریا کے کنارے بنوائی ہے۔ کسی وقت وہاں بھی آپ ضرور تشریف لائیں“۔

نواب صاحب نے وعدہ فرمایا۔ اور خداداد خان صاحب وزیرِ صحت کے ہمراہ تشریف لائے۔ ہسپتال کا معائنہ فرما کر نہایت محظوظ ہوئے، اور دوپہر کو آپ کے ”چھپر“ پر آرام فرمایا۔ آپ کی ضیافت کا انتظام بھی دریا کے کنارے اسی چھپر میں کیا گیا تھا۔

جناب خداداد خان صاحب اور دیگر وزراء کئی بار سینیٹوریم میں آئے۔ بعض اوقات بغیر اطلاع کے بھی تشریف لائے تو حالات کو ہر طرح سے اطمینان بخش پایا۔ اور کبھی کسی قسم کی دخل اندازی کی ضرورت محسوس نہ کی۔

ستارۂ خدمت کا اعزاز

۱۹۶۱ء میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے آپ کی برس ہا برس کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں ستارۂ خدمت کا اعزاز حاصل ہوا، اور اس طرح آپ نے اپنی ملازمت کے دوران تین اعلیٰ اعزاز پائے۔ پہلے دو برطانوی عہدِ حکومت میں ملے تھے۔ ’خان صاحب‘ اور پھر ’خان بہادر‘۔ یہ دونوں اعزازات آپ کے نام کے ساتھ جڑے رہے اور آپ عوام میں ” خان بہادر ڈاکٹر

سعید احمد خان صاحب" کے نام سے ہی متعارف تھے۔

خان بہادر صاحب کے نام پر وارڈ تعمیر کرنے کا منصوبہ

۱۹۶۲۔ ۶۳ء کے دوران سینیٹوریم سے شفایافتہ مریضوں کی تحریک پر، زیرِ علاج مریضوں کے تعاون سے کچھ فنڈ فراہم کر لیے گئے، جس سے ایک وارڈ تعمیر کر کے خان بہادر صاحب کے نام سے منسوب کیا جا سکے۔ اِس کا مقصد ان تمام فیوض کے لیے اظہارِ تشکر تھا جو آپ کی ذات سے اِس ادارہ کو حاصل ہوئے۔ اِس منصوبہ پر بہت کچھ پیش رفت ہو چکی تھی، بلکہ تعمیر کی ابتداء بھی ہو گئی تھی، مگر حاسدوں کے ایک گروہ نے اسے اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے کہ ایک ایسے شخص کے نام کی بازگشت ہمیشہ ان فضاؤں میں بسی رہے، جو اُن کی نگاہوں میں ہمیشہ کھٹکتا رہا تھا، کچھ لے دے اور ہنگامہ آرائی کے بعد اِس منصوبہ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، اور آپ کے چاہنے والوں کو اِس کی تکمیل کا کبھی موقعہ نہ مِل سکا۔

ڈاڈر سینیٹوریم کی ملازمت سے سبکدوشی

تین سال کی توسیعی ملازمت ختم ہونے پر، خان بہادر صاحب سے مزید تین سال اسی مقام پر خدمات انجام دینے کی درخواست کی گئی۔ آپ نے صرف ایک سال کی توسیع کو قبول فرمایا، تا کہ محکمہ صحت اِس دوران کسی مناسب میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کا انتخاب کر سکے اور آپ یہاں سے رُخصت ہوتے ہوئے سینیٹوریم کو ایسے ہاتھوں میں چھوڑ کر جائیں، جو اُسی خلوص اور بے لوث خدمت کے جذبے سے اسے ترقی دیتا چلا جائے۔

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں آپ نے ایک سال کی رخصت لے لی جو کہ ملازمت کے اختتام پر آپ کا حق تھا۔ اور اکتوبر ۱۹۶۴ء میں تقریباً ۲۵ سال کا عرصہ ڈاڈر سینیٹوریم کے ساتھ منسوب رہ کر آپ باقاعدہ طور پر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

بحیثیت میڈیکل سپرنٹنڈنٹ آپ کی خدمات کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ سالہا سال سینیٹوریم میں اور سینیٹوریم سے باہر آپ نے نہایت مصروف وقت گذارا۔ آپ کئی برس میڈیکل ایسوسی ایشن ہزارہ، نیز پاکستان سپیشلسٹ پینل (Specialist Panel) کے صدر رہے۔ آپ باقاعدگی سے ریڈیو پشاور سے تپِ دق سے متعلق پشتو میں تقاریر کرنے کے لیے مدعو کیے جاتے رہے۔ آپ بارہا میڈیکل کانفرنسوں میں شرکت کے لیے نامزد ہوئے۔ اور دہلی، کلکتہ اور مدراس جیسے دور دراز مقامات پر آپ کانفرنسوں میں شریک ہونے کے لیے تشریف لے گئے۔

آپ اپنے علاقہ میں ہر قسم کے رفاہی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ موسمی اور متعدی بیماریوں کی روک تھام کے لیے نہ صرف اپنے گاؤں میں بلکہ گرد و نواح کے تمام علاقے میں اپنے ذاتی خرچ سے ٹیکے لگوانے کا انتظام کرتے تھے۔

سینیٹوریم کے اس پچیس سالہ دور میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مزید اولاد، ایک بیٹی اور پانچ بیٹے عطا فرمائے۔ اسی عرصہ میں آپ کی چار بیٹیوں اور دو بیٹوں کی شادی بھی سرانجام پائی۔ الغرض یہ زمانہ اُسی طرح سے آپ کے لیے اور آپ کے اہل و عیال کے لیے باثمر اور باعثِ رحمت و برکت رہا جس طرح کہ عوام الناس کے لیے تھا۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے خان بہادر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> اللہ کی شان ہے کہ میں ایک پرانا ٹی بی کا مریض تھا۔ مجھے کبھی اپنی زندگی اور مستقبل سے مایوسی ہوتی تھی۔ اللہ نے مجھے نہ صرف اس مرض سے نجات دلائی اور اِس قابل کیا کہ اِس مرض میں مبتلا، جان بلب مریضوں کی خدمت کر کے اُن کو ازسرِ نو صحت کا اور نئی زندگی کا مژدہ سناؤں۔ اور اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے یہاں انسانی خدمت کے لیے پچیس چھبیس سال مدت کی ایک لمبی مہلت عطا کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ اور اُس کی شکرگذاری کے لیے

میرے پاس زندگی اِس قدر نہیں کہ اُس کی بارگاہ میں سجدے کرتے کرتے اُس کا شکر ادا کر سکوں۔

آپ نے مزید تحریر فرمایا:

آج برصغیر میں ہی نہیں بلکہ دُنیا کے خطے خطے میں بڑے لوگ ہیں جنہوں نے اِس سینیٹوریم سے استفادہ کیا اور بظاہر موت کے بعد نئی زندگی پائی۔ اللہ تعالیٰ کے مقدرات کے سامنے انسان کا سر سجدے میں گرتا ہے کہ ایک چھوٹی سی ابتداء سے جلدی جلدی یہ ادارہ ترقی کرتا گیا۔ حتیٰ کہ جب میں وہاں سے پچیس سالہ خدمات کے بعد ریٹائر ہوا تو اُس وقت یہ ادارہ برصغیر پاک و ہند کا دوسرے نمبر کا مشہور ترین ادارہ تھا، جہاں تین سو دس (۳۱۰) بستروں کا انتظام تھا۔ اور میرا بیٹا عبدالحیٔ سعید جو ڈاڈر کے مقام پر پہلی دفعہ میرے ہمراہ تھا، وہ، الحمدللہ، اِس وقت مرض ٹی بی کے مشہور ترین بین الاقوامی سطح پر شہرت کے حامل چند چوٹی کے ماہرین میں سے ایک ہیں۔

اس ادارہ کی خدمت کے دوران جو واقعات مجھے پیش آئے اُن میں مشیتِ ایزدی کا کھلم کھلا اظہار ہوتا ہے، اور میری زندگی کے پچیس سال ایسے مقام پر گذرے جو جنتِ ارضی کا درجہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب، ڈاڈر سینیٹوریم کی منصوبہ بندی، تعمیر اور افتتاح تک کے تمام مراحل میں شامل رہے اور پھر ۱۹۳۹ء تا ۱۹۶۴ء کا عرصہ اس اِدارہ کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے طور پر تعینات رہے۔

آپ کا یہ دور سینیٹوریم کا بہترین دور تھا۔ آپ کے وہاں سے چلے آنے کے بعد رفتہ رفتہ سینیٹوریم کی شان و شوکت بھی رُخصت ہوتی گئی اور بعد میں اس سینیٹوریم کو جنرل اور مینٹل ہسپتال بنا دیا

گیا۔

ڈاڈر سینیٹوریم کے عروج و زوال کی داستان کو محترم شفیق خان خیل صاحب الٰہی نے ایک مضمون بعنوان "گورنمنٹ مینٹل اینڈ جنرل ہسپتال ڈاڈر تباہی کے دہانے پر" تحریر فرمایا جو روزنامہ 'شمال' ایبٹ آباد میں ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۴ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون سے ایک اقتباس:

> بالآخر ۱۹۳۹ء میں یہ شاندار منصوبہ تکمیل کو پہنچا اور مشہور معالج ڈاکٹر خان بہادر سعید احمد خان کو بطور ایم۔ ایس تعینات کیا گیا اور اس طرح لوگوں کے ذہن میں ناقابل علاج اور یقینی موت دینے والی بیماری کا علاج شروع کر دیا گیا۔ مقامی لوگوں نے ہر قسم کا تعاون فراہم کیا۔ ہسپتال میں داخل مریض کے ساتھ انتہائی اچھا سلوک کیا جاتا۔ اُن کو ہر قسم کی سہولت دی جاتی۔ مریضوں کا دل بہلانے کے لیے ایک سینما ہال بھی بنایا گیا تھا۔ جس میں مریض اور اُس کے لواحقین مفت فلم دیکھ سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی بیمار شفایاب ہو کر نکلتا تو اُس کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ رُخصت کیا جاتا۔ اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے جاتے اور اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا کر مین گیٹ، جو ہسپتال سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، تک ایم ایس بمع عملہ چھوڑنے جاتے تھے۔
>
> خان بہادر صاحب ایک فرض شناس معالج تھے اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ عرصہ ہسپتال میں تعینات رہے۔ اِن کی تعیناتی میں ہسپتال دِن دُگنی رات چگنی ترقی کے منازل طے کرتا گیا۔ براعظم ایشیاء کے تمام علاقوں سے مریض آتے اور شفا پا کر چلے جاتے۔ اسی لیے اسے ایشیاء کا سب سے بڑے ہسپتال ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔



تیسرا حصہ



چھٹا باب

درالسعید ایبٹ آباد میں قیام ۔ ۱۹۶۳ تا ۱۹۷۴ء

اپنی ملازمت کی توسیعی مدت پوری ہونے سے ایک سال پہلے خان بہادر صاحب نے ایک سال کی رُخصت لے لی اور اکتوبر ۱۹۶۳ء میں دارالسعید، ایبٹ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ ''دارالسعید''، اُس رہائش گاہ کا نام ہے جو آپ نے خود تعمیر کروائی تھی۔ اِس کی تعمیر کے متعلق آپ کی تحریر:

> میرا آبائی مسکن تو دیبگراں ہے، جہاں میرے خاندان کے افراد عرصۂ قدیم سے فروکش ہیں۔ البتہ میں نے دورانِ ملازمت، رہائش کے لیے ایک قطعۂ اراضی ایبٹ آباد کے محلۂ اَپر ملک پورہ میں خرید لیا تھا جو ڈسٹرک جیل کے بالمقابل برلب سڑک ہے۔ اِس پر تعمیر کر لی تھی۔ پھر وقتاً فوقتاً اِس کے متصل اطراف سے قطعاتِ اراضی خرید کر اِس میں توسیع کر دی۔ اِس طرح اُس کا رقبہ آٹھ کنال ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اِس کے تعمیری حصہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور اِس طرح یہ سہ منزلہ عمارت کی شکل اختیار کر گئی جس میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے گذرانِ زندگی کی تقریباً سب ہی ضروریات مہیا ہیں۔ عمارت کے عقب میں زیریں حصہ 'کھڈ' ہے جس میں مختلف درخت ہیں جو گرینری (greenery) کا سماں دیتے ہیں۔
>
> یہ تعمیر کسی منظور شدہ نقشہ، کسی انجینئر یا کسی ماہرِ تعمیرات کے صلاح مشورے سے نہیں کی گئی، بلکہ اِس کے حصے یکے بعد دیگرے خانگی ضروریات کے تحت

گاہے بگاہے اپنی ہی صوابدید سے بنوائے گئے۔لیکن بعداز تکمیل یہ عمارت کچھ ایسی شکل وصورت اختیار کر گئی جس نے سانحۂ ۱۹۷۴ء میں ایک محفوظ، مضبوط اور مامون پناہ گاہ کا کام دیا۔

ڈاڈر سینیٹوریم کی ملازمت کے دوران اگرچہ وہیں پر میری رہائش کا معقول انتظام تھا، تاہم میرے عیال میں سے کچھ افراد، خصوصاً میرے زیرِ تعلیم بچے، ایبٹ آباد ہی میں اِسی عمارت میں رہائش پذیر تھے۔

ڈاکٹر سعید احمد خاں صاحب ایبٹ آباد تشریف لائے تو اُن کے وجود سے جہاں اِس شہر کو ایک منفرد اور ماہر معالج کی خدمات حاصِل ہو گئیں وہاں جماعتِ احمدیہ کے لیے بھی فیوض و برکات کے دروازے کھل گئے۔ایبٹ آباد میں آپ کا دس سالہ قیام ہر لحاظ سے بابرکت و بارونق رہا۔ایک طرف لوگ جسمانی طبابت کے لیے کھچے چلے آتے تھے تو دوسری طرف جماعتِ احمدیہ کے افراد آپ سے روحانی فیض پانے کو دوڑے چلے آتے۔ یہ دور دنیوی اور دینی ہر دو کی ترقی میں آپ کے لیے ایک سنگِ میل تھا۔آپ کی ذاتی سعی اور کاوشوں سے ہزارہ کی جماعت کو خاص تقویت حاصِل ہوئی اور جامعۂ احمدیہ ایبٹ آباد کی تعمیر نے جماعت احمدیہ کو ایک مرکز فراہم کر دیا۔

جامعۂ احمدیہ کی تعمیر

ایبٹ آباد، اگرچہ کئی نامور احمدیوں کا مسکن رہا ہے، مگر جامعۂ احمدیہ کی تعمیر کا شرف خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے حصہ میں آیا۔تحریکِ احمدیت کے اولین دور میں، ایک نامور احمدی وکیل شیخ نور احمد صاحب کے مکان کا ایک کمرہ جماعت کی مسجد کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔شیخ صاحب کا یہ مکان ۱۹۳۶ء کی ایک آتشزدگی میں جل گیا تھا۔ جب نئے نقشہ کے مطابق مکان تعمیر ہوا تو وہ کمرہ جو مسجد ہوا کرتا تھا باقی نہ رہا۔البتہ شیخ محمد احمد صاحب، فرزند شیخ نور احمد صاحب نے اپنے

مکان کا ایک کمرہ نمازِ جمعہ کے لیے دے رکھا تھا۔

۱۹۶۱ء میں خان بہادر صاحب نے اپنے مکان کے قریب ایک آدھ کنال قطعۂ زمین خرید کر جماعتِ احمدیہ کے لیے ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تعمیر کروائی۔ اِس مسجد کی دو منزلیں ہیں، جس کا زیریں حصہ خواتین کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ ابتداء میں یہ حصہ مکمل طور پر تیار کر لیا گیا تھا اور ۱۹۶۲ء میں یہ حصہ اس قابل بنا لیا گیا تھا کہ باقاعدہ باجماعت نماز کا سلسلہ شروع کیا جا سکے۔ چنانچہ خان بہادر صاحب شیخ محمد احمد صاحب کے پاس تشریف لے گئے اور اُن سے اجازت چاہی کہ آئندہ نمازِ جمعہ مسجد میں ادا کی جائے۔ شیخ صاحب نے مسجد کی تعمیر پر اظہارِ مسرت ضرور کیا مگر کسی قدر افسردگی کے ساتھ فرمایا: ”ہمارے گھر کی برکت جا رہی ہے“۔

اگلے ہی روز، شیخ صاحب نے مسجد کی دریاں اور جانماز نئی تعمیر شدہ مسجد میں بھجوا دیئے اور یہ مسجد آباد ہو گئی۔ ابھی چند ماہ ہی گذرے تھے کہ شیخ محمد احمد صاحب عارضۂ قلب سے اچانک وفات پا گئے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اپنی مشیت تھی کہ اُن کی زندگی میں مسجد کی تعمیر ہو جائے، کیونکہ اُن کے اِس دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اُن کی رہائش گاہ پر اجتماعِ جمعہ ممکن نہ ہوتا۔ اُن کے بچے ابھی کم عمر تھے اور گھر پر اُن کی والدہ کے علاوہ دوسرا کوئی سرپرست بھی موجود نہ تھا۔

جامعہ کی تکمیل میں تعطل

مسجد کے زیریں حصہ کی تکمیل تک یہ بات زیادہ لوگوں کے علم میں نہ تھی کہ خان بہادر صاحب کے مکان کے ساتھ جو عمارت زیرِ تعمیر ہے، وہ مسجد ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ خان بہادر صاحب اپنے مکان میں توسیع کروا رہے ہیں۔ اس لیے کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ لیکن مسجد کی بالائی عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوا تو کئی متجسس نگاہیں اِس پر پڑیں اور جلد ہی یہ چرچا عام ہو گیا کہ یہ احمدیہ مسجد کی عمارت تعمیر کی جا رہی ہے۔ مخالفینِ سلسلہ یہ موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیتے۔ لگے محلے

داروں سے گٹھ جوڑ کرنے۔ اُن کا تعاون حاصل ہوتے ہی عدالت میں مقدمہ دائر کر کے تعمیر روکنے کا حکم نامہ جاری کروالیا۔ چنانچہ تعمیر روک دی گئی۔ جماعت کا ہر فرد گہرے صدمے سے دوچار تھا۔ ہر فرد ایک ناقابلِ بیان اذیّت سے گذر رہا تھا کہ اِس آزاد ملک میں اُن کے لیے عرصہ حیات کیوں محدود کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں خان بہادر صاحب کا تحمل اور برداشت دیدنی تھا۔ ہر ایک کو صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کی تلقین کرتے رہے اور مایوسی اور یاس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور انصاف کی اُمید رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ مگر قانونی چارہ جوئی یا احتجاج کو ناپسند فرمایا۔ اکثریت نے آپ سے ہم خیالی کا اظہار کیا مگر چند احباب نے جذباتیت کا مظاہرہ بھی کیا۔ خواجہ عبدالرحیم صاحب (سابق جج سرینگر) نے اِس حکم امتناہی کے خلاف قانونی چارہ جوئی پر بہت زور دیا، مگر خان بہادر صاحب نے ایسا کرنا مناسب نہ جانتے ہوئے اُنہیں بھی ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ البتہ ذاتی طور پر اِس حکم کی منسوخی کے لیے سعی کرتے رہے۔ مسجد کی تعمیر تو ضرور رُک گئی مگر نماز اور درسِ قرآن کا سلسلہ اُسی چھوٹی مسجد میں باقاعدہ جاری رہا۔

آخر وہ دِن بھی دور نہ تھا جب جماعت کی دردمندانہ فریادیں عرش تک پہنچ گئیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی خاص مشیت سے ایک غیر متعصب شریف النفس ڈپٹی کمشنر کی تقرری ایبٹ آباد میں ہو گئی۔ اُن کے چارج سنبھالنے کے جلد ہی بعد خان بہادر صاحب اُن کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے اور اُن کو تمام حالات سے آگاہ فرمایا۔ معاملہ کو سمجھتے ہوئے، ڈپٹی کمشنر صاحب نے عدالتی حکم کو فوراً منسوخ کر دیا۔ تعمیر از سرِ نو شروع ہو گئی اور ایک خوبصورت مسجد وجود میں آئی۔

مسجد سے ملحق ایک مختصر سا مہمان خانہ بھی تعمیر کر لیا گیا، جو اوپر نیچے چھ سات کمروں پر مشتمل ہے۔ بالائی منزل سے ایبٹ آباد کے دلفریب مناظر بہت دلپذیر اور پُرفضا ہیں۔

جامعہ کی آرائش

جامعۂ احمدیہ کا کوئی مینار یا گنبد نہیں بنایا گیا تھا۔ البتہ اُس کے بیرونی حصہ پر کلمۂ طیبہ اُس کی دلکشی میں اضافہ کا باعث تھا۔ دور سے رہگیروں کی نظر اِس کلمہ پر پڑتی تھی۔ یہ سامنے کو اُبھرتی ہوئی تحریر ایک نہایت قابل احمدی مصور اور فنکار، مرزا الطیف صاحب کی قلم کاری تھی جسے اُنہوں نے کئی ہفتوں کی محنتِ شاقہ سے مکمل کیا تھا۔ یہ کلمہ اب وہاں موجود نہیں۔ اسے ۱۹۷۴ء کے فسادات میں تو نقصان نہ پہنچا تھا۔ البتہ ۱۹۸۴ء میں جنرل ضیاء الحق کے آرڈیننس کے نفاذ کے نتیجہ میں اِسے شہید کر دیا گیا۔ اِس شہید شدہ کلمے کے چند ٹکڑے ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب نے احتراماً، اُٹھا کر ایک فریم میں لگائے اور ساتھ انگریزی زبان میں ایک نظم اُنہوں نے خود لکھی، جس سے اُن کے تاسف اور صدمے کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ فریم عبدالکریم سعید صاحب نے اپنے والد کی خدمت میں پیش کی، جو اُنہوں نے دارالسلام میں اُس دفتر میں آویزاں کروا دی جو بطورِ امیر آپؓ کا دفتر تھا۔ یہ فریم اب بھی وہاں آویزاں ہے۔

جامعہ کے اس جاذبِ نظر کلمہ سے متعلق خان بہادر صاحب کے زیرِ علاج ایک مریضہ کے تاثرات قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مریضہ محترمہ صفیہ بیگم صاحبہ، ملتان کے میاں فضل الرحمٰن صاحب کی صاحبزادی اور میاں عمر فاروق صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔ اُنہوں نے خان بہادر صاحب سے خود اِس کا ذکر کیا تھا کہ جب وہ اپنی بیماری سے پریشان، ایبٹ آباد میں واقعہ خان بہادر صاحب کے کلینک میں آئیں تو کلینک کی بالائی منزل اُنہیں رہائش کے لیے دی گئی۔ جب وہ پچھلے صحن میں جا کر کھڑی ہوئیں تو معاً اُن کی نظر جامعہ کے کلمۂ طیبہ پر پڑی اور یوں محسوس ہوا کہ اب اِس جگہ ہی اُن کی شفا مقدر ہے۔ اور اطمینانِ قلب سے علاج شروع کروایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں شفا بخشی۔ اِسی تاثر کا ذکر میاں عمر فاروق صاحب نے یادِ رفتگاں، ۴ جولائی ۲۰۰۴ء کے جلسہ میں بھی کیا تھا کہ اُن سے اُن کی ہمشیرہ نے ایسا ہی کہا تھا۔

جامعہ کی تعمیر کے اخراجات

جامعہ جس قطعۂ اراضی پر تعمیر ہوئی وہ خان بہادر صاحب نے خود خرید فرمائی تھی۔ البتہ اِس کی تعمیر کے اخراجات میں ہزارہ کی تمام جماعتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جماعت کے چند مخیّر ارکان نے بھی معاونت فرمائی۔ اُس وقت تعمیر پر تقریباً پچیس، تیس ہزار روپیہ کا خرچ اُٹھا تھا۔ جس میں مرکزی انجمن کی طرف سے پانچ ہزار روپے کی امداد بھی شامل ہے۔

جامعہ میں جماعتی سرگرمیاں

خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے ایبٹ آباد میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے جماعت میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ جامعہ میں پنج وقتہ نماز باجماعت کا اہتمام ہونے لگا۔ قاضی عبدالاحد صاحب امام مسجد مقرر ہوئے۔ جامعہ سے اذان کی صدا بلند ہوتی تو دور دور تک اُس کی گونج سنائی دیتی۔ کئی متجسس لوگ غور سے سُنتے کہ اذان وہی ہے جو عامۃ المسلمین کی ہے یا کوئی اور، اور فرق نہ پاکر بھی متردد ہوتے۔ نمازِ فجر کی امامت خان بہادر صاحب خود فرماتے تھے۔ آپ کی مسحور کن تلاوتِ قرآن اور رقت آمیز دُعائیں دلوں کو موم کر دیتی تھیں۔ نمازِ مغرب میں بکثرت مرد و زن اور بچے شمولیت کرتے اور آپ کے درسِ قرآن، حدیث و ملفوظاتِ مسیح موعود سے مستفید ہوتے۔ یہ بابرکت مجلس نمازِ عشاء کی ادائیگی کے بعد برخواست ہو جاتی تھی۔

اِس جامعہ نے بہت جلد ہزارہ ڈویژن کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ نمازِ جمعہ اور نمازِ عیدین خصوصی رونق کی حامِل ہوتی تھیں۔ نمازِ جمعہ کے لیے مضافاتی مقامات سے احباب وخواتین بمعہ بچوں کے شامِل ہوتے۔ بالخصوص مانسہرہ، داتہ، دیبگراں، ہری پور وغیرہ سے احباب تشریف لا کر جامعہ کی رونق بڑھاتے۔ خان بہادر صاحب اُن کے لیے طعام اور آرام کا بندوبست خود فرماتے۔ نمازِ جمعہ کے بعد تمام نمازیوں کے لیے چائے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس طرح احباب مل

بیٹھتے، غیر رسمی گفتگو ہوتی اور میل ملاپ بڑھانے کا موقعہ بھی میسر آ جاتا تھا۔ نمازِ عیدین پر خاصا بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ ادئیگیِ نماز کے بعد تمام حاضرین کی تواضع مٹھائی اور دیگر لوازمات سے کی جاتی تھی۔ چھوٹے بچوں کو عیدی بھی ضرور دی جاتی تھی۔

سالانہ اجتماعات

۱۹۶۳ء کے موسمِ گرما سے خان بہادر صاحب نے ایبٹ آباد کی جامعہ میں سالانہ اجتماعات کے سلسلہ کا آغاز فرمایا۔ یہ اجلاس عموماً دو دِن کے دورانیہ کے ہوتے تھے، جن میں شمولیت کے لیے راولپنڈی، لاہور، پشاور اور کئی دوسرے مقامات سے لوگ شرکت فرماتے۔ مہمانوں کے قیام و طعام کا معقول بندوبست کیا جاتا تھا۔ مولوی عبدالحق ودیارتھی صاحب، میاں نصیر احمد فاروقی صاحب، مرزا مسعود بیگ صاحب، پروفیسر خلیل الرحمن صاحب اور کئی دیگر نامور احبابِ جماعت اپنی اعلیٰ معیار کی تقاریر سے حاضرین کو مستفید فرماتے تھے۔ اِن اجلاس میں غیر از جماعت افراد کو شرکت کے لیے مدعو کیا جاتا تھا اور تقاریر کرنے اور تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع بھی انہیں دیئے جاتے تھے۔ ایبٹ آباد کے ایک نامور ماہرِ تعلیم عزیز الرحمٰن بادشاہ صاحب[1] بالخصوص اِن مجالس میں خطاب فرماتے تھے۔

[1]: بادشاہ صاحب ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب کے اُستاد تھے جنہیں وہ اپنے طالب علمی کے زمانہ میں انگریزی ترجمۃ القرآن اور احمدیہ لٹریچر سے متعارف کر چکے تھے۔

جامعہ ایبٹ آباد بطورِ درسگاہ

ایبٹ آباد کا خوشگوار موسم اور پُر فضا ماحول، میدانی گرم علاقوں کے رہائشیوں کے لیے خاص جاذبیت رکھتا تھا۔ جماعت کے اکثر احباب بھی موسمِ گرما یہاں گذارنے آتے تھے۔ خان بہادر صاحب کی خواہش پر زیرِ تعلیم مبلغین، بالخصوص غیر ملکی طلباء و طالبات جو مرکز میں حصولِ دین

کے لیے آتے تھے، دو ماہ کا عرصہ ایبٹ آباد میں گذارتے۔ ان ایام میں میاں نصیراحمد فاروقی صاحب بھی یہاں تشریف فرما ہوتے تھے۔ جامعہ ایبٹ آباد ایک درسگاہ بن جاتی، جہاں فاروقی صاحب نہایت محنت اور لگن سے قرآن پاک کی تعلیم خود دیتے تھے۔ وہی اِس سلسلہ تدریس کے سرپرست ہوتے تھے۔ جبکہ پروفیسر خلیل الرحمن صاحب، قاضی عبدالاحد صاحب اور دیگر اساتذہ جو موجود ہوتے، وہ بھی اِن طالب علموں کو اپنے علوم سے مستفید فرماتے تھے۔ مسٹر کمال ہائیڈل اور محترمہ صفورہ حمید صاحبہ جن کا تعلق جزائرغرب الہند سے ہے، ۱۹۷۴ء کے موسمِ گرما میں بغرضِ تعلیم آئے ہوئے تھے۔ سانحۂ ۱۹۷۴ء میں یہ دونوں طالب علم خان بہادر صاحب کے اہل خانہ کے ساتھ موجود تھے اور آتش زدگی کے تمام واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔

خان بہادر صاحب کے عربی زبان سیکھنے کے شوق کی تکمیل

آپ نے ابتدائی عربی قادیان کے تعلیم الاسلام ہائی اسکول میں سیکھی تھی۔ ترجمۃ القرآن اور تفسیر کا باقاعدہ مطالعہ کر چکے تھے اور کرتے رہتے تھے۔ مگر پھر بھی آپ کو ایک تشنگی کا احساس رہتا تھا کہ کسی طرح وہ حضرت مسیح موعود کی عربی تحریرات کو بکلی سمجھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس جامعہ کے ذریعہ آپ کے اِس شوق کی تکمیل کا بھی بندوبست فرما دیا۔ قاضی عبدالاحد صاحب جامعہ کے امام تھے۔ خان بہادر صاحب نے آپ کی عربی دانی اور گرائمر پر مکمل عبور سے بہت استفادہ فرمایا۔

قاضی عبدالاحد صاحب نے اپنے مضمون بعنوان ”حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب“ میں یوں تحریر فرمایا ہے:

> گو پیشہ کے لحاظ سے سینہ کے امراض کے ایک قابل ڈاکٹر تھے مگر دینی تعلیم میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا۔ ایبٹ آباد میں روزمرہ کا معمول تھا کہ بعد از نمازِ مغرب تا نمازِ عشاء درس قرآن، درس بخاری شریف اور ملفوظاتِ حضرت بانیٔ

سلسلہ ہوتا تھا جس میں سب حضرات شرکت کیا کرتے تھے۔ اور ایک مجلس ہم دونوں کی ہوا کرتی تھی جس میں عربی کتب حضرت مسیح موعود، میں اُنہیں پڑھ کر سُنایا کرتا تھا۔ اُن کی معیت میں مجھے ذاتی طور پر یہ فائدہ ہوا کہ میرے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اور یہ بڑی دولت تھی جو اُن کی وجہ سے مجھے نصیب ہوئی۔ (پیغام صلح نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء)

ایبٹ آباد کا سمر سکول

خان بہادر صاحب کے دِل میں نوجوانوں اور قوم کے بچوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے بالخصوص دینی اور اخلاقی تربیت کے لیے ایک خاص جذبہ موجزن رہتا تھا، اور ہمیشہ اس بات کی تمنا دِل میں رہتی تھی کہ آئندہ آنے والی نسل کو اپنے سلسلہ کے عظیم مقاصد اور حضرت مسیح موعود کی تعلیمات سے بہرہ مند ہونے کے مواقع ملیں۔ جب جامعہ ایبٹ آباد مکمل ہوگئی اور جماعت ہزارہ کافی فعال ہوگئی تو آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ، جس طرح اعلیٰ سطح کے تعلیمی ادارے موسمِ گرما کی تعطیلات میں اپنے طلباء کے لیے کسی صحت افزاء مقام پر سمر کیمپس (Summer Camps) کا اہتمام کرتے ہیں، جہاں وہ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں اور اِس طرح اُن کی عمدہ تربیت ہو جاتی ہے، اور نئے ماحول اور خوشگوار موسم سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں، اُنہی بنیادوں پر اپنی جماعت کے نوجوانوں کے لیے اس جامعہ کا استعمال کرتے ہوئے، موسمِ گرما کی تعطیلات میں تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام کیا جائے۔ اِس کا مکمل منصوبہ بنا کر، اپنی تجویز مرکز میں امیرِ وقت مولٰینا صدرالدینؒ صاحب کی خدمت میں پیش کی، جسے حضرت امیر نے بصدقِ دل منظور فرمایا اور لاہور کی مقامی جماعت کے زیرِ اہتمام ایبٹ آباد میں ”سمر اسکول“ کا اجراء ہو گیا۔ سمر اسکول کا انعقاد ۱۹۷۱ء کے موسم گرما کی تعطیلات سے شروع ہوا جس کا دورانیہ تقریباً تین ہفتے تک کا ہوتا تھا۔ ملک کی بیشتر جماعتوں سے نوجوان بالخصوص اور دیگر احباب بالعموم شرکت فرماتے تھے اور

بہت ذوق وشوق سے دینی اور اخلاقی تربیت حاصِل کرنے کے ساتھ ساتھ ایبٹ آباد کے خوشگوار موسم اور پُرسکون ماحول سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ اُن کی تعلیم و تربیت و تدریس کے لیے مرکزی انجمن سے زعماء، علماء و فضلاء، مبلغین و مقررین تشریف لاتے تھے۔ حضرت مولانا صدرالدین صاحب امیرِ دوم، خود تشریف فرما ہوتے تھے۔ اُن کے علاوہ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب، میاں نصیر احمد فاروقی صاحب، مرزا مسعود بیگ صاحب، محترم صالح نور صاحب، پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب، قاضی عبدالاحد صاحب اور خود خان بہادر صاحب کا نام بطور استاد، نمایاں ہے۔ اکثر مواقع پر میاں فضل احمد صاحب اور کئی دیگر اکابرین سلسلہ بھی کچھ نہ کچھ وقت وہاں گذارتے تھے۔

جامعۂ احمدیہ کا ذکر کرتے ہوئے خان بہادر صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

یہ ہزارہ کی جماعتوں کا مرکزی مجلسی مقام تھا۔ یہاں پر نمازوں اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ایبٹ آباد اور مضافاتی جماعتوں کے احباب و خواتین نماز جمعہ کے لیے یہاں آنے جانے لگے۔ مقامی جماعت کے اجتماعات بھی یہیں پر منعقد ہوتے تھے، جس میں دوسری جماعتوں اور مرکزی انجمن کے احباب بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ سالانہ اجلاس میں دورونزدیک کے ملکی وغیر ملکی، سب ہی احباب و خواتین شریک ہوا کرتے تھے۔ پھر یہاں کی آب و ہوا کی خوشگواری کے پیشِ نظر بھی احبابِ جماعت کا یہاں آنا ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں بیرونِ ملک کے زیرِ تربیت طلباء و مبلغین بھی حصولِ علمِ دین کے لیے یہاں فروکش ہوتے اور لاہور کی مقامی جماعت کے زیرِ اہتمام یہاں سمر سکول کا بھی اجراء ہو گیا تھا، جو عام طور پر موسمِ گرما میں ایبٹ آباد کے پُرفضا اور صحت افزاء ماحول میں منعقد ہوتا تھا، جس میں نوجوان بالخصوص اور احباب بالعموم شرکت کرتے۔ اُن کی تعلیم و تربیت اور تدریس کے لیے مرکزی انجمن

سے زعماء، علماء وفضلا اور مبلغ ومقررین تشریف لاتے، جن کی وجہ سے یہاں ایک وقت کے لیے بڑی رونق ہو جاتی۔ اُن کی مجالس ومحافل بڑی پُرکیف ہوتیں۔ اُن کے مواعظِ حسنہ سے حاضرین وسامعین بڑے محظوظ ہوتے۔ اِس طرح ایبٹ آباد اور مضافاتی جماعتوں کے لیے عید وشادی کی تقریب پیدا ہو جاتی۔ اپنے اثرات ونتائج کے اعتبار سے اور اپنی افادیت واہمیت کے اعتبار سے ”سمرسکول“ کا انعقاد تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم نامساعد حالات کی ستم ظریفی سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ آخر چند سال کے بعد ختم ہوگیا۔ اب لاہور مرکز میں اِس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

پروفیسر اعجاز صاحب اپنے مضمون ”الحمدللہ“ میں جامع اور ’سمرسکول‘ کے حوالہ سے یوں رقم طراز ہیں:

جن احباب نے یہ مسجد دیکھی ہے وہ اُس کی خوبصورتی کے معترف ہیں۔ آپ کا وجود اور یہ جامع ضلع ہزارہ میں احمدیت کا مرکز بن گیا۔ بلکہ اِس جماعت نے جماعت کے ’سمرکیمپس‘ کا بھی کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے پہلے پہل گرمیوں کی چھٹیوں میں حضرت امیر مولانا صدرالدینؒ صاحب کی اجازت سے تربیتی کلاس کا انعقاد ایبٹ آباد میں کیا۔ اِس تربیتی کلاس کو بڑا سراہا گیا اور جماعت کے بڑے بڑے بزرگ جیسے حضرت امیر مولانا صدرالدین صاحب، ڈاکٹر اللہ بخش صاحب، محترم نصیر احمد فاروقی صاحب، مرزا مسعود بیگ صاحب اور پروفیسر خلیل الرحمان صاحب نے اِس میں بھرپور کردار ادا کیا۔ (پیغام صلح، نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء)

کلینک "دارالسعید" میں باقاعدہ پریکٹس کا آغاز

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی ملازمت کے دوران ہی 'دارالسعید' کے اُس حصے کو جو کہ گیراجوں اور بالائی منزل پر دو تین کمروں پر مشتمل، ایک گھر کی صورت میں موجود تھا، ضروری ردو بدل کر کے اور ضروری اضافہ کر کے ایک خوبصورت مکمل کلینک کی صورت دے دی اور ایک خطیر رقم خرچ کر کے اُس کو جدید ترین طبی آلات و سامان جراحی سے آراستہ کیا۔ جدید ترین ایکسرے مشین اور اعلیٰ درجے کا لیبارٹری کا سامان مہیا کیا۔

اس تمام علاقے میں یہ کلینک، اپنی طرز کی واحد کلینک تھی۔ ملازمت کے دوران آپ ہفتہ کی شام اور اتوار کا دِن اس کلینک میں خدمتِ خلق کے لیے حاضر رہتے۔ ملازمت کی مدت پوری کر کے جب آپ مستقل طور پر ایبٹ آباد میں مقیم ہو گئے تو کلینک میں پریکٹس کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آپ کی حاذق طبیبی کا چرچا تو ضلع بھر میں تھا ہی۔ بہت جلد کلینک کی شہرت بھی دور دور تک پھیل گئی اور ایک ہی چھت کے نیچے ہر قسم کی سہولیات کی موجودگی مریضوں کے لیے مزید کشش کا باعث بن گئی۔ بعض اوقات مریض رات بھی بسر کرنا چاہتے تو اِس کا بھی انتظام کر دیا جاتا تھا۔

مریضوں سے حسنِ سلوک

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اُن مریضوں سے جو واقعی نادار ہوتے تھے کبھی فیس نہیں لی۔ بلکہ اکثر اوقات اُن کی ادویات کے اخراجات بھی خود ادا کر دیتے تھے۔ اگر کوئی دوا پاس موجود ہوتی، تو دے دیتے، ورنہ نسخہ دے کر ہدایت فرماتے کہ "پاک میڈیکل سٹور" یا "خیبر میڈکل سٹور" سے لے لیں اور بعد میں وہ بل خود ادا فرما دیتے۔ ایبٹ آباد کے یہ مشہور میڈیکل سٹور، دو احمدیوں، ماسٹر اصغر علی صاحب اور احمد صادِق صاحب کے تھے، جو ۱۹۷۴ء کے فسادات میں نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ آپ نے اپنے گاؤں کے کسی بھی فرد سے یا اپنے قرابت داروں سے، حتیٰ کہ

اپنے بچوں کے استادوں اور اُن کے اہل خانہ سے بھی کبھی کوئی فیس نہیں لی ، اور نہ ہی کبھی کسی ایسے شخص سے فیس لی جس کا تعلق جماعتِ احمدیہ سے ہو۔ اِس کے باوجود رزقِ حلال کے راستے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ہمیشہ کھلے رکھے اور فراخ رزق عطا فرمایا، جس میں غریب ، نادار ہر ایک کا حصہ تھا۔

بشیر احمد صاحب (ڈی ایس پی ، پشاور) تحریر فرماتے ہیں :

ایک دفعہ ایک غریب مریض کا نمبر دیر سے آیا۔ رات ہو چلی تھی ، گھر دور تھا، آپ نے اُسے رات ٹھہر جانے کو کہا مگر اُس کا جانا ضروری تھا۔ آپ نے اُس کی فیس بھی واپس کر دی اور ساتھ ٹیکسی کا کرایہ بھی دیا"۔ (پیغام صلح نومبر، دسمبر ۱۹۹۷ء)

پروفیسر اعجاز احمد صاحب کے مضمون سے اقتباس :

ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد ایبٹ آباد میں سکونت اختیار کی ۔ یہاں بھی آپ کی مصروفیات خدمتِ انسانی اور مذہبی تعلیم تھی ۔ آپ کی شہرت دور دور تک تھی ۔ لوگ دوسرے شہروں اور ضلعوں سے بھی علاج کے لیے آپ کے پاس آتے ۔ جو مریض فیس نہ دے سکتے ، اُن سے فیس کا تقاضا نہ کرتے بلکہ غریب اور احمدی مریضوں کو اپنے پاس سے دوائیں دیتے ۔ اس کے علاوہ خوراک کے لیے کئی دفعہ پیسے بھی دے دیتے ۔ اُن کی کلینک کے نیچے ایک کمرہ تھا۔ جہاں اکثر دُور سے آنے والے مریضوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ (مضمون "الحمدللہ"، پیغام صلح ، نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء)

عوام الناس کو آپ کے دستِ شفا پر بہت اعتقاد تھا۔ بعض اوقات تو مریض ایسے جذبات کا بھی اظہار کرتے کہ ڈاکٹر صاحب کا اُن کو ایک نظر دیکھ لینا بھی باعثِ شفا ہے ۔ اُن کی ایک نگاہِ کرم ہی

کافی ہے۔ ۱۹۷۴ء کے اوائل کا ذکر ہے کہ خان بہادر صاحب علالت کے باعث کلینک میں نہیں بیٹھتے تھے۔ آپ کے فرزندِ اکبر، ڈاکٹر عبدالحیٔ سعید آپ کی عیادت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے فرزند سے کلینک میں کچھ وقت دینے کو کہا تا کہ مریض مایوس نہ لوٹیں۔

ایک مریض کا اُنہوں نے معائنہ کیا اور دوا تجویز کی۔ مریض کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کی تشخیص اور دوا دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ لیکن اگر بڑے ڈاکٹر صاحب صرف ایک نظر دیکھ لیتے تو تسلی ہو جاتی۔ اس طرح کے اَن گنت واقعات اور روایات مشہور ہیں، لیکن اس تحریر میں سب کو شامل کرنا ممکن نہیں۔

کلینک کے اوقات اور نمازِ ظہر

کلینک کے مقررہ اوقات صبح آٹھ بجے سے سہ پہر ایک بجے تک تھے۔ مگر شاذ ہی ایسا ہوا ہوگا کہ آپ ایک بجے کلینک سے فارغ ہوئے ہوں۔ عموماً تین، چار تو بج ہی جاتے تھے۔ ظہر کی نماز عصر کے ساتھ ملا کر پڑھنا ایک معمول سا بنتا جا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرما دی اور آپ کو سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷۸ کا ایک حصہ بطورِ الہام سُنائی دیا:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ ۔(سورج کے ڈھلنے سے نماز کو قائم رکھ۔)

آپ نے حُکمِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً اپنے معاونین کو ہدایت دے دی کہ ایک بجے کے بعد کسی مریض کو آپ کے پاس نہ بھیجا جائے۔ بعض اوقات مریض احتجاج بھی کرتے مگر آپ ایک بجے ضرور مسجد میں تشریف لے جاتے اور ادائیگیِ ظہر کے بعد منتظر مریضوں کو دیکھ لیتے۔

نمازِ عصر اور مغرب کے درمیان کلینک کھلی رہتی اور اگر کوئی مریض اُس وقت آتا تو آپ کو اطلاع کر دی جاتی اور آپ کلینک تشریف لے جاتے تھے۔

کلینک میں علاج اور کامیاب آپریشن

آپ کا خاص شعبۂ علاج تپ دِق تھا۔ مگر آپ کو ہر قسم کے امراض کی تشخیص اور علاج میں پوری مہارت حاصل تھی۔ آپ نے اپنے اِس کلینک میں کئی قسم کے اپریشن کیے۔ بالخصوص اپنڈیکس کے اپریشن سرانجام دیئے۔

لاہور کے ایک نامور ڈاکٹر، ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب، ایک مرتبہ موسمِ گرما کے کچھ دِن ایبٹ آباد میں بسر کرنے کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے کلینک کے اوپر کی منزل کی رہائش گاہ اُن کے قیام کے لیے مہیا کر دی تھی۔ ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب موصوف اکثر کلینک میں آ جاتے اور آپ کے ساتھ کچھ وقت گذارتے تھے۔ وہ خاصے متعجب ہوئے کہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب بغیر کسی دوسرے ماہر سرجن کے تعاون کے اپنڈیکس جیسے اپریشن بھی نہایت کامیابی سے کر لیتے ہیں۔ لاہور واپس آ کر اُنہوں نے اِس کا ذکر کئی لوگوں سے کیا۔ بالخصوص چوہدری منصور احمد صاحب سے آپؒ کی صحیح تشخیص، علاج اور کامیاب سرجری کا ذکر کیا۔

حالتِ اعتکاف میں مریضوں کا معائنہ

ماہِ رمضان کے آخری عشرہ میں آپ مسجد میں معتکف ہوتے۔ کلینک عمومی طور پر بند کر دیا جاتا تھا۔ تاہم آپ کے معاونین میں سے کوئی ایک شخص وہاں موجود رہتا تھا تا کہ اگر کوئی ایسا مریض آ جائے جسے فوری علاج کی ضرورت ہو یا پھر دور دراز علاقوں سے آنے والے لوگ جنہیں یہ علم نہ ہو کہ اِن دِنوں کلینک بند ہے، تو اُنہیں تکلیف نہ ہو۔ تو اطلاع ہونے پر آپ ایسے مریضوں کو مسجد میں ہی دیکھ لیتے تھے۔ اگر کوئی فیس دے جاتا تو فوراً خیرات کر دیتے تھے۔

ایبٹ آباد میں ٹی بی ٹیسٹ کلینک کا قیام

محترمہ محمودہ سلیم صاحبہ ایک زمانہ میں وزیرِ صحت رہ چکی تھیں۔ اس زمانے میں جب خان بہادر صاحب کا قیام ایبٹ آباد میں تھا محترمہ موصوفہ بھی وہیں قیام پذیر تھیں۔ اُنہوں نے علاقہ ہزارہ میں بہت سے رفاہِ عامہ کے کام کیے۔ اُن میں سے ایک ٹی بی ٹیسٹ کلینک کا قیام بھی تھا جو نواں شہر روڈ پر گورنمنٹ کالج کے عقب میں ہے اور سول ہسپتال کے کافی قریب ہے۔ اِس کے قیام کے لیے محترمہ محمودہ سلیم صاحبہ نے آپ کے وسیع تجربہ کی بناء پر آپ کا تعاون چاہا تو آپ نے بصدقِ دِل قبول کیا۔ ہر طرح کی طبی اور ضروری معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ مالی مدد بھی کی، جس کی بنا پر ایکسرے بلاک، جو آپ کی فراہم کردہ رقم سے تعمیر کیا گیا تھا، اُس پر آپ کا نام سفید پتھر پر نمایاں طور پر لکھا گیا تھا، جو آج بھی اُسی طرح موجود ہے۔ غالباً کسی تخریب کار کی نگاہ اُس پر نہیں پڑی۔

کلینک 'دارالسعید' سے متعلق ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر "سانحات ۱۹۷۴ء" سے اقتباس:

> یہ کلینک علاقہ کی جدید اور تمام ضروریات سے آراستہ تھی۔ ۱۹۶۴ء میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے اپنی کلینک میں پریکٹس شروع کر دی۔ جو بہت جلد مشہور ہوگئی۔ دور ونزدیک سے مریض آنے لگے۔ اِس کلینک اور اس سے وابستہ مریضوں کی لمبی چوڑی حکایت ہے، جو ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے۔ تاہم اس قدر ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ پاکستان بھر کے ہر حلقۂ زندگی کے افراد نے اِس کلینک سے استفادہ کیا، خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، کاروباری ہوں یا ملازم پیشہ، جاگیردار، قبائلی سردار ہوں یا علماء و ادیب ہوں۔ بہت سی تاریخی اور نامور ہستیاں اِس زمرے میں آتی ہیں۔ اور اب، جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں وہ اب بھی بڑی صحت منداور خوش حال زندگی بسر

کر رہے ہیں ۔ مگر مقامِ تاسف ہے کہ ۱۹۷۴ء میں اِس کلینک کو نذرِ آتش کرنے ، برباد کرنے اور اِس کے سامان کو لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کا ذکر چھیڑا جائے ،تو اِس اتلاف اور بربادی کے ذمہ دار بعض ایسے لوگ قرار پاتے ہیں جنہوں نے اِس کلینک کے وسیلہ سے ہی اللہ تعالیٰ سے اپنی عمر میں اضافہ کروایا ہے ۔ میرے لیے یہ مناسب نہیں کہ میں ان کی پردہ دری کروں ۔ اللہ ستار ،غفور ، رحیم و کریم ہے ۔

خان بہادر سعید احمد خان صاحب کے معمولات

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اپنے دورِ ملازمت میں ایک مصروف ترین شخص تھے ۔ فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ سماجی اور مذہبی سرگرمیاں زندگی کے معمولات میں شامل رہی تھیں ۔ ایک معمولی انسان ایسی مصروف ترین زندگی کی ساٹھ دہائیاں گذارنے کے بعد ضرور خواہش مند ہوتا ہے کہ وہ ہلکے پھلکے اشغال میں وقت گذارے ، مگر ایسی سوچ آپ کے قریب قریب بھی کہیں نہیں تھی ۔ دیکھنے والے ضرور ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے تھے کہ اِس شخص کے شب و روز میں کس قدر مصروفیات ہیں ۔ ہر وقت کے لیے کوئی مصروفیت اور ہر مصروفیت کے لیے وقت ضرور مختص ہے ۔ اور پھر کبھی کسی وقت نہ تھکن کے آثار ، نہ بیزاری اور نہ کبھی گلہ شکوہ اور شکایت کا اظہار ہی ہوا ۔

آپؒ تہجد گذار تھے ۔ رات کے پچھلے پہر تہجد کے لیے اُٹھتے ۔ اذانِ فجر کے ساتھ جامعہ میں تشریف لے جاتے اور نمازِ فجر کی امامت فرماتے ۔ گھر کے بیشتر افراد آپ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کرتے تھے ۔ جماعت کے وہ احباب جو قریب رہائش رکھتے تھے ساتھ شامل رہتے ۔ نماز کی ادائیگی کے بعد آپؒ لمبی سیر کو نکلتے ۔ کبھی کبھی کوئی آپؒ کے ہمراہ چلتا ، ورنہ آپ کے دو سیاہ لیبریڈور وفادار کتے ، پہاڑیوں کے نشیب و فراز میں آپ کے آگے پیچھے بھاگتے رہتے ۔ ان جانوروں کی محبت اور وفاداری بھی مثالی تھی ۔ جب تک آپ مسجد میں تشریف رکھتے یہ دونوں کتے مسجد کے باہر بیٹھے رہتے ۔

جونہی آپ باہر نکلتے یہ آپ کے ساتھ ہو لیتے۔

گھر لوٹنے پر خان بہادر صاحب گھنٹہ بھر استراحت فرمانے کے بعد کلینک جانے کو تیار ہوتے۔ نفل ادا کرتے اور کلینک تشریف لے جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام ضرور فرماتے۔ شام مہمانوں کی تواضع میں گذرتی۔ کبھی کبھار خود بھی عزیزوں کی ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے۔ نمازِ مغرب اور عشاء کے درمیانی وقت میں درسِ قرآن، حدیث اور ملفوظات کا سلسلہ رہتا۔ عشاء کے بعد اہلِ خانہ کے ساتھ کچھ وقت گذارتے۔ رات کو سونے سے قبل مطالعہ کرتے۔ اخبارات، ٹائم میگزین، ریڈرز ڈائجسٹ، جماعتی لٹریچر، سبھی آپ کے زیرِ مطالعہ آتے۔ کبھی ذہن اِس بات کو سمجھ نہیں سکا کہ چوبیس گھنٹے کا محدود وقت اور یہ ساری مصروفیات! اس کے علاوہ سینکڑوں خطوط کے جوابات، دوستوں کی دلداری، قریبیوں کی احوال پُرسی، بچوں کی تربیت، مریضوں کی تشفی۔ یہ سب کب اور کیسے ہوتا تھا؟ کبھی کوئی ملاقاتی آپ کے گھر سے اِس لیے مایوس نہیں لوٹا کہ آپ کے پاس ملاقات کے لیے وقت نہیں ہے۔

جمعہ کا روز کلینک کی ہفتہ وار چھٹی کے لیے مقرر تھا۔ لیکن اگر کوئی مریض آ جاتا تو اُسے مایوس نہ لوٹاتے۔ کلینک کا عملہ موجود نہ ہونے کے باوجود آپ مریض کا معائنہ ضرور فرماتے تھے۔ جمعہ کے صبح کے اوقات میں آپ خطبۂ جمعہ اور نماز کی تیاری فرماتے اور خطوط کے جوابات لکھتے تھے۔ اولاً تو وہ خود اپنے ہاتھ سے خطوط تحریر فرماتے تھے، مگر بعد کے ایام میں محترم ماسٹر اصغر علی صاحب (آپ کی بھانجی رقیہ کے شوہر) آپ کی معاونت فرماتے تھے۔ ماسٹر صاحب موصوف، اپنی دُکان اُس دِن بند رکھتے اور یہ وقت خان بہادر صاحب کی خدمت کے لیے مخصوص فرما دیتے تھے۔ خط کا مضمون آپ زبانی بولتے جاتے جسے ماسٹر اصغر علی صاحب تحریر کرتے جاتے اور آپؓ کے دستخط سے سپردِ ڈاک کر دیتے۔ خان بہادر صاحب کے پاس ایک چھوٹا سا ریکارڈر بھی تھا، جس میں وہ جو بات جس وقت یاد آئے ریکارڈ کر لیتے تھے تاکہ بھول نہ جائے۔ کئی خطوط کا مضمون بھی ریکارڈ کر لیتے، جو

ماسٹر صاحب سُن کر لکھ لیتے تھے۔اس طرح آپ کے کام میں تخفیف اور سہولت ہو جاتی تھی۔

یہ سلسلہ ۱۱ جون ۱۹۷۴ء تک یوں ہی چلتا رہا۔ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا ایبٹ آباد میں یہ دس سالہ قیام آپ کی زندگی کا وہ خوبصورت اور بامقصد دور تھا جس میں آپ کو ہر طرح سے سکونِ قلب میسر تھا۔آپ کی اپنی مالی حیثیت بہت مستحکم تھی۔آپ کی اولاد میں سے سوائے آپ کے چھوٹے بیٹے زاہد سعید کے،سب اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے،برسرِ روزگار تھے اور اپنے اپنے کاروبارِ زندگی میں مصروف تھے۔جماعتِ احمدیہ لاہور کے لیے یہ ایک ایسا سنہرا باب تھا جس کو تاریخ کبھی بھلا نہ پائے گی۔یہ جماعت جس طرح ہزارہ ایبٹ آباد میں فعال نظر آتی تھی،مرکز سے باہر کہیں اور ایسا نظر نہ آتا تھا۔اور یہی سب تو مخالفین کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔جماعت کی ایسی ترقی اُن کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی،ورنہ ڈاکٹر صاحب سے تو کسی کو کوئی ذاتی عناد نہ تھا۔

اُن کی شخصیت تو ایسی تھی کہ دُشمن بھی محبت کرنے پر مجبور تھے۔مگر مقامِ تاسف ہے کہ "دارالسعید" اور کلینک کو برباد کرتے وقت کسی ایک فرد نے بھی یہ نہ سوچا کہ اِس شخصیت اور کلینک سے تو فائدہ اُنہی کو پہنچ رہا ہے۔تعصب اور غیض وغضب نے عوام کو اندھا کر دیا۔جو عمارت سالہا سال کی محنت سے بنی تھی،اُس کا بیشتر حصہ چند گھڑیوں میں راکھ ہو گیا۔لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے گھر میں مکین تمام لوگوں کی جانوں کی حفاظت فرمائی۔آپ نے ایبٹ آباد کو خیر باد کہا اور بمع اہلِ خانہ لاہور تشریف لے آئے۔



چوتھا حصہ

سانحات ۱۹۷۴ء



ساتواں باب

سانحات ۱۹۷۴ء کا تاریخی پسِ منظر

احمدیت کی مخالفتِ عامہ کے اسباب

جماعت احمدیہ ایک منفرد تاریخ کی حامِل ہے۔ یہ اپنی دینی خدمات، دین کے لیے ایثار و خلوص، جوش و جذبہ، صبر و استقلال اور جان و مال کی ایمان افروز قربانیوں سے مزیّن ہے۔ تحریک احمدیت نے جہاں اپنی انفرادیت کی بناء پر اقوامِ عالم کی مذہبی اور عمرانی تاریخ میں ایک خاص مقام اور شہرت حاصل کی، وہاں مخالفت بھی بڑے زور و شور سے ہوئی۔ باوجود شدید مخالفتوں اور مزاحمتوں کے، ہزاروں مصائب اور ابتلاء سے گذرتے ہوئے یہ اپنے نصب العین کو مرکزِ نگاہ بنائے ہوئے، قدم آگے ہی بڑھاتی رہی۔ اس تحریک نے دین و مذہب اور انسان و اقوام کو بہت کچھ دیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس سُرعت سے اور جس سطح پر یہ اُبھری اُسی شدت سے اُس کی مخالفت بھی ہوئی۔

اِس مخالفت کی شدید ترین اور نہایت ہی المناک صورت وہ تھی جو ۱۹۷۴ء کے سانحات و واقعات میں کھل کر سامنے آئی۔ اِس مخالفت کے اسباب کیا تھے اور وہ مختلف ادوار میں کس طرح سے اس تحریک پر اثر انداز ہوتے رہے، اُس کے لیے حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے غیر مطبوعہ مضمون "احمدیت کی مخالفت اور ہزارہ کی جماعتوں پر اس کا اثر" میں سے ایک اقتباس پیش ہے:

> برصغیر پاک و ہند کے دوسرے علاقوں کی طرح ہزارہ کی پتھریلی وادی میں بھی اس کی مخالفت روزِ اوّل سے ہی شروع ہوئی۔ وقفہ وقفہ کے بعد ابھری، اور پھر بڑے زور و شور سے پھیلی۔ مخالفت کی آگ اس علاقہ میں مکمل طور پر کبھی فرو نہ

ہوئی۔ وقتاً فوقتاً شعلوں کی صورت میں سلگتی رہی۔

شروع شروع میں وہ محض بحث ومباحثہ، سوال و جواب، مناظرہ ومجادلہ کی حد تک رہی۔ تاہم افراد جماعت کیلیے چنداں نقصان دہ نہ تھی، بلکہ تشہیر وتبلیغ کا بالواسطہ ذریعہ بنی رہی۔ اس میں دشمنی وعناد کے عناصر کارفرما نہ تھے۔ افرادِ جماعت کوعزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس علاقہ میں ایک طویل زمانہ نسبتاً امن وسکون اور کامیابی وکامرانی کا گذرا۔

لیکن بعد میں جب اس تحریک کی مخالفت کے اسباب میں اضافہ ہوا تو مخالفت کے اثرات بھی اپنا رنگ لانے لگے، لیکن وہ دیرپا نہ ہوتے تھے۔ ہر موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی غیبی طاقت سے مخالفینِ سلسلہ کو ناکام بنائے رکھا، اور بعض شریروں کو ایسی سزائیں دیں جو کمزوروں کے لیے قوتِ ایمانی کا موجب بنیں۔ اگرچہ مخالفت کے ان ادوار میں احبابِ جماعت کو انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے طرح طرح کے ابتلاؤں اور صبر آزما آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا، مگر انہوں نے کمال ایمان ویقین اور بڑے صبر واستقامت سے ان مصائب ومشکلات کا مقابلہ کیا اور خندہ پیشانی سے ان کو برداشت کیا۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۷۴ء تک کے ساٹھ سالہ دور میں ملاؤں اور بعض سیاسی اور نیم سیاسی رہنماؤں نے تحریکِ احمدیہ کے خلاف نفرت کو ہوا دی اور اس نے شدت اختیار کرلی۔ کفر کے فتوے، گالی گلوچ، ناپاک الزامات اور اعتراضات کے طوفان کھڑے ہوتے رہے۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں جماعت قادیان نے جب سیاست کی دلدل میں قدم رکھا اور اس میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا اور تحریکِ آزادئ کشمیر میں شریک ہوئے، تو جماعتِ احرار اور اُس کی ہمنوا

دوسری جماعتوں کو اپنا کھلم کھلا حریف بنا لیا۔ بعد ازاں ۱۹۵۳ء میں ان جماعتوں نے ”تحفظِ ختمِ نبوت“ کے نام سے ایک شورش بر پا کر دی اور عوام کو مشتعل کر کے اِس بات پر آمادہ کر لیا کہ احمدیہ تحریک کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ اس شورش پسندی سے پاکستان میں امن و امان کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور پنجاب میں مارشل لاء لگ گیا۔ پنجاب میں بڑے پیمانے پر تخریب کاری ہوئی اور احمدیوں کے جان و مال کو بہت نقصان پہنچا۔ تاہم علاقہ ہزارہ میں کوئی جانی و مالی نقصان نہ ہوا۔

۱۹۷۱ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت میں قادیانی جماعت نے سیاست میں حصہ لیا۔ اس طرح ایک طرف تو مولویوں کو اپنا دشمن بنا لیا اور دوسری طرف ملکی سیاسی جماعتوں سے دُشمنی مول لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دو پلیٹ فارموں سے احمدیہ تحریک کے خلاف آواز اُٹھنے لگی اور احمدیہ تحریک پر ابتلاء اور آزمائشوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

برصغیر پاک و ہند کی اس صدی کی تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی بھی یہاں سیاست نے سر اٹھایا اور سیاسی بحران نے افراتفری کی صورت اختیار کی، تو پروپیگنڈا کے طور پر احمدیہ تحریک کو ہی نشانہ بنایا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں کئی مواقع ایسے آئے کہ سیاست بازی کا آغاز اور انجام احمدیہ تحریک کی مخالفت پر ہوا۔

ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ برصغیر پاک و ہند ایک مذہب خیز اور مذہب پرست خطہ ہے۔ یہاں پر مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ تنگ نظری عام ہے۔ یہاں پر مذہبی غیر مذہبی بے شمار تحریکوں نے جنم لیا ہے۔ یہاں کے ابن الوقت، مفاد پرست اور طالع آزما علماء اور سیاستدان خوب جانتے اور سمجھتے

ہیں کہ مذہب یہاں کے عوام کی جان اور کمزوری ہے۔ اس کے لیے وہ جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں، اور بڑے بڑے خطرات مول لے لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس عوامی کمزوری کو اسلام اور ملت اسلامیہ کے مفاد و مصالحہ سے بالاتر ہوکر اپنے غیر صالح عزائم کی تکمیل و تحصیل کے لیے "دین خطرے میں ہے" اور "ختم نبوت خطرے میں ہے" وغیرہ جیسے نعرے لگا کر اور عموماً احمدیہ جماعت کی مخالفت کا طوفان برپا کر کے حالات کو اپنے لیے سازگار بنانے کی خاطر امن عامہ اور نظم و نسق کا مسئلہ پیدا کرتے رہے ہیں۔ پاکستان کے اندر مذہب کے نام پر سیاسی دہشت گردی کے لیے تو یہ کارآزمودہ ہتھیار رہے۔ اور اس کی پیدا کردہ بحران سے پاکستان کو کئی بار واسطہ پڑا ہے۔ اور انجام کار جماعت احمدیہ ناکردہ گناہ کی سزا بھگتتی رہی ہے۔

یہ ایک افسوس ناک المیہ ڈرامہ ہے جس کو جب چاہیں یہاں کے علماء اسٹیج کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں کشمیر کی سیاست ہو یا ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۵ء کے معاملات ہوں، یا پھر ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۳ء اور ۱۹۶۰ء کے واقعات ہوں، یا ان سے بڑھ کر ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء کے حالات ہوں یا پھر ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء کے بحران یا پھر آئندہ ہونے والے خرابے ہوں، ان سب کے پس پردہ یہی عوامل واسباب ہیں اور ہوں گے۔

جماعت احمدیہ لاہور، اگرچہ حضرت مرزا صاحب کی صحیح تعلیمات کی علمبردار ہے جو کہ عین اسلام ہے۔ تاہم ایسے اقدامات وسیع پیمانے پر خواہ کسی بھی وجہ سے ہو، نہیں اُٹھائے جا سکے جن کے تحت جماعت احمدیہ لاہور کے حقیقی خدوخال، اس کا حقیقی رنگ وروپ، اس کے حقیقی عقائد ونظریات اور اس کے حقیقی اغراض ومقاصد عوامی سطح پر متعارف ومقبول بنائے جائیں، اور عوامی ذہن کو یقین

کرایا جائے کہ یہ تحریک کوئی غیر اسلامی تحریک نہیں ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر سے اقتباس:

> جماعت احمدیہ لاہور نے ہر قسم کا مالی، علمی اور قلمی جہاد کیا اور اسلامی لٹریچر میں بے نظیر علمی اور تحقیقی ادب کا اضافہ کیا ہے۔ بیرونی ممالک میں تبلیغِ دین کے سلسلہ میں جماعت کی مساعی بے مثال اور لازوال ہیں۔ ایک دنیا ان کے اسلامی جہاد سے بہرہ ور ہوئی ہے۔ تاہم اندرونِ ملک اس کا دائرہ اثر صرف اور صرف خواص تک ہی محدود رہا ہے اور عوامی ذہنوں تک رسائی نہیں ہو پائی۔ لہذا عوام دونوں جماعتوں کے عقائد و نظریات کے فرق کو نہ تو سمجھ سکے اور نہ ہی جان سکے کہ اس تحریک کے بانی کا مقام و مرتبہ کیا ہے، اور یہ کہ تحریک احمدیہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔
>
> چنانچہ قادیانی جماعت کی تلبیسِ حق، مخالفین کے کتمانِ حق اور لاہوری جماعت کی طرف سے تشہیرِ حق کے فقدان نے تحریک احمدیہ کی حقیقت و اصلیت اور بانی سلسلہ کے صحیح مقام و مرتبہ سے لوگوں کو بے خبر رکھا۔

علاقہ ہزارہ میں تحریک احمدیہ کی مخالفت کے تین مخصوص اسباب

تحریک احمدیہ کی عمومی مخالفت کے تمام اسباب و عوامل علاقہ ہزارہ پر بھی اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور یہاں کے احمدی بارہا ملاؤں اور سیاست دانوں کے پیدا کردہ طوفانوں سے دوچار ہوتے رہے ہیں، لیکن تین ایسے اسباب ہیں جو اسی علاقہ سے مخصوص ہیں۔ ان کی نشاندہی ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی تحریر "تحریک احمدیہ کی مخالفت عامہ اور ہزارہ کی جماعتوں پر اس کا اثر" میں اس طرح کی ہے:

۱۔ ہزارہ کے باشندوں کا مخصوص مزاج

ان اسباب وعوامل کے ساتھ ساتھ تین مزید اسباب تھے جن کی وجہ سے علاقہ ہزارہ میں احمدیہ تحریک کی شدید مخالفت ہوئی۔ ایک تو یہ کہ یہاں کے لوگوں کا مخصوص مزاج ہے۔ ان کی مُتلَوِّن مزاجی اور ناقدرشناسی کی سینکڑوں داستانیں اس علاقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ لوگ ایک وقت تو محبت وعقیدت کے پھول برساتے ہیں اور دوسرے وقت قہر سامانی کے اسباب پیدا کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں، میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی مثال دیتا ہوں کہ ساتھیوں نے ہی غداری کر کے ان کا گلا کٹوا دیا۔ پھر سانحہ ۱۹۷۴ء میں تو یہ معاملہ بندی میرے اپنے ساتھ بھی ہوئی۔ کتنے اور کیسے کیسے پیارے لوگ تھے، جو چشمِ زَدَن میں خون کے پیاسے ہو گئے۔

اللھم اغفرھم وارحمھم۔ انک انت خیر الراحمین۔

۲۔ دین و مذہب سے ناواقفیت

دوسرا سبب یہاں کے عوام کی دین و مذہب سے ناواقفیت ہے۔ موقعہ پرست طبقے اور طالع آزما لوگ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ملاں لوگ ان کے جذبات کو مشتعل کر کے غیرت ایمانی اور امن عامہ کا مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان حالات کا مجھے ازخود بھی ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہے۔ میں یہ امر واقعہ خودستائی اور ذاتی بڑائی کے اظہار کے لیے نہیں، بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر کرتا ہوں۔ یہاں کے معروف گھرانے سے میرا تعلق ہے۔ علاقہ کا ہر مرد و زن میرے نام سے واقف ہے۔ میں نے اپنی بیشتر زندگی یہیں گذاری ہے۔

عرصہ ملازمت اور بعد از ملازمت کا عرصہ بھی میرا یہیں پر ہی گذر رہا ہے۔ بطور ڈاکٹر وطبیب بفضلہٖ تعالیٰ لوگ قدر سے جانتے مانتے تھے۔ ڈاڈر سینیٹوریم کے بانی مبانی کی حیثیت سے بھی لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ اور میں نے خود بھی ڈاکٹری کو ایک مقدس پیشہ سمجھتے ہوئے اس احساس وفرض کو حتی المقدور خداخوفی کے ساتھ نبھانے کی کوشش کی ہے۔ علاقہ ہزارہ بلکہ پاکستان بھر کے دور وقریب کے امیر وغریب ہر طبقہ کے لوگ علاج معالجہ کے لیے مجھ سے رجوع کرتے۔ ایک وقت تو یہ عالم تھا کہ علاقہ بھر میں صرف میں ہی ایک ڈاکٹر تھا جو یہاں کی طبی ضرورتوں کے وقت ان کے کام آ سکتا تھا۔ مجھے ان سے محبت تھی اور وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ سعودی عرب کے شاہ عبدالعزیز ابن سعود نے مجھے دعوت دی اور مجھے اپنے ذاتی طبیب کی حیثیت سے ملازمت کی پیشکش کی اور بیش قدر مشاہرہ کے ساتھ ساتھ دیگر شاہانہ مراعات ونوازشات سے نوازنے کی بھی تحریک کی۔ مگر میں نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میرے علاقہ کے بیماروں کو میری زیادہ ضرورت ہے۔

اس علاقہ سے اس قدر وابستگی اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ اس قدر تعلق خاطر ہوتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سانحہ ۱۹۷۴ء میں بلوائیوں کی رہنمائی اور قیادت کرنے، میری کلینک اور میرے گھر بار کو نذر آتش کرنے اور مجھ پر اور میرے اہل وعیال اور میرے عزیز واحباب پر فائر کھولنے میں پیش پیش وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک عرصے تک میرے ساتھ ایثار ووفا کی زندگی گذاری تھی، اور جنہوں نے ممنونیت اور شکر گذاری کی زندگی بسر کی تھی، بار احسان سے جن کے سر میرے سامنے جھکے رہتے تھے۔ ایسے لوگوں میں سے یعنی میرے مریضوں میں سے ایک شخص جس نے مرض دق سے ڈاڈر سینی ٹوریم میں

میرے زیرِ علاج رہ کر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے شفاء کامل پائی تھی وہ مجھ پر دھاوا بولنے والوں کا سرغنہ تھا۔

دلوں کے اندر یہ انقباض، تبدیلی اور ناقدری یہاں کی روایات کا ایک حصہ ہیں، جن کا کڑوا پھل مجھے چکھنے کو ملا۔ اب جبکہ میں پریکٹس عملاً چھوڑ چکا ہوں اور علاج معالجہ کا سلسلہ ختم کر دیا ہے، آجکل بھی دور وقریب سے قدیم وشناسا مریض اور ان کے اعزاء واقربا مجھے ایبٹ آباد، لاہور اور دوسرے مقامات پر ڈھونڈتے تلاش کرنے آتے ہیں۔ مریض کیلیے دوا دارو مانگتے ہیں۔ جب میں معذوری ظاہر کرتا ہوں، تو وہ کہتے ہیں کہ آپ صرف نسخہ ہی لکھ چھوڑیں اور دعا پڑھ دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی دوا اور دعا سے ہمارا مریض تندرست ہوجائے گا۔



خان بہادر صاحب کے کئی قدر شناس آپ کی تلاش میں لاہور آئے۔ مثال کے طور پر یہاں دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) ایبٹ آباد کے قرب و جوار میں رہنے والا ایک شخص، لاہور اِس غرض سے آیا کہ خان بہادر صاحب سے طبی مشورہ حاصل کر سکے۔ اُسے معلوم ہواتھاکہ ترکِ وطن کے بعد آپ لاہور تشریف لے گئے ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ لاہور میں اُن کا کلینک ہو گا جو بآسانی مل جائے گا۔ مگر مایوسی ہوئی اور واپس جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کسی پرانے جان پہچان والے دوست سے ملاقات ہو گئی اور اُس سے یہ تذکرہ کیا۔ اُس

دوست نے بتایا کہ خان بہادر صاحب کی شکل و شباہت کے ایک شخص کو اُس نے گارڈن ٹائون میں چوہدری منصور احمد صاحب کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا، مگر یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہی تھے۔ چنانچہ وہ چوہدری صاحب کے گھر آئے، پتہ معلوم کر کے آپ کے پاس دارالسلام پہنچ گئے اور مفید مشورہ اور دُعا سے فیض یاب ہوئے۔

(۲) عطاء اﷲ وزیر صاحب ۱۹۶۰ء میں ڈاڈر سینیٹوریم میں خان بہادر صاحب کے علاج سے شفا یاب ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے داماد کے توسط سے، جو محکمہ پولیس میں افسر ہیں اور لاہور کے قرب و جوار میں تعینات تھے، خان بہادر صاحب کا پتہ معلوم کیا اور بمعہ دُختر و داماد دارالسلام آپ سے ملاقات کے لیے آئے۔ بعدازاں ایک خط میں عطاء اﷲ وزیر صاحب نے اپنی عقیدت کا اظہار اِن الفاظ میں کیا:

”خدا اور رسول کی قسم آپ بہت یاد آتے ہیں۔ آپ کے سینکڑوں ہزاروں مریض اب بھی زندہ ہیں۔ آپ نے صحیح معنوں میں دُکھی انسانیت کی خدمت کی ہے۔ میں نے آج تک آپ جیسا خوبصورت و خوب سیرت قابل ڈاکٹر نہیں دیکھا۔۔۔ کاش دوسرے ڈاکٹر آپ کے اخلاق اور سلوک کی پیروی کرتے۔ محترم جناب خان بہادر صاحب۔ خدا کی قسم آپ مجھے بہت پیارے لگتے ہیں۔ اتنے پیارے کہ میں اظہار بھی نہیں کر سکتا۔“



۳۔ ایبٹ آباد میں ربوہ جماعت کے گرمائی ہیڈکوارٹر کا قیام

ہزارہ میں احمدیت کی مخالفت کا تیسرا موثر سبب قادیانی (ربوہ) جماعت کی طرف سے ایبٹ آباد میں اپنے گرمائی ہیڈکوارٹر کا قیام ہے۔اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ قادیانی جماعت نے ایک جامع اور وسیع منصوبے کے تحت ۱۹۷۰۔۷۳ء میں ضلع ہزارہ میں اپنے سمر ہیڈکوارٹر کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کی اور اس کی بڑی تشہیر بھی کی۔ اس کی مجوزہ سکیم یہ تھی کہ موسم گرما میں ربوہ کے بجائے ایبٹ آباد میں ان کا صدر دفتر کام کیا کرے گا۔ اور جماعت کے خلیفہ، دیگر امراء، عمال ومبلغین یہیں فروکش ہوا کریں گے اور یہاں تبلیغی پروگرام کو وسعت دی جائے گی۔ یاد رہے کہ ان دنوں اور اس سے کچھ عرصہ پہلے سے احمدیہ جماعت لاہور، اپنی مقامی جماعت کی سرپرستی میں موسم گرما میں سمر سکول کا اجراء ایبٹ آباد کی جامع احمدیہ میں کیا کرتی تھی، جہاں نوجوان بالخصوص اور دیگر احباب بالعموم کچھ وقت کے لیے اکٹھے ہوتے اور دین و تحریک کے بارے میں تربیتی کورس میں حصہ لیتے۔ یہ ایک چھوٹے پیمانے پر تعلیم وتربیت کا انتظام تھا، جو بڑی خوش اسلوبی سے چلا۔ اس کی روئیداد بھی جماعتی اخبار و رسائل میں شائع ہوتی رہی۔ سمر سکول کا یہ سلسلہ بہت پسند کیا گیا۔ غالباً ربوہ جماعت کو یہ طریق پسند آیا ہو اور انہوں نے اپنا گرمائی ہیڈکوارٹر ایبٹ آباد میں بنانے کے لیے اس سمر سکول سے رہنمائی حاصل کی ہو۔

بہرحال جماعت ربوہ نے اپنے منصوبے پر مرحلہ وار عمل شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو انہوں نے مانسہرہ روڈ پر ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر "دعوت اور اصلاح و

ارشاد" کا آغاز کیا۔ ان کے خلفاء مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب اور مرزا ناصر احمد صاحب بھی یہاں آ کر فروکش ہوئے۔ بعد ازاں ایبٹ آباد میں ایک احمدیہ کالونی کے قیام و تعمیر کا پروگرام طے ہوا۔ مرزا ناصر احمد صاحب کی سرکردگی میں ایبٹ آباد کے قریب پاکستان ملٹری اکیڈمی کے نواح میں ایک وسیع قطعۂ اراضی خرید کر وہاں دفاتر، مہمانخانہ، لائبریری اور مسجد وغیرہ کی تعمیرات کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کا بڑا چرچا کیا گیا۔

چنانچہ یہاں کی آبادی نے اس امر کا نوٹس لیا۔ مولوی ملاں سرگرمِ عمل ہو گئے۔ احمدیوں کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ کالونی کی تعمیر کو روکنے کے لیے عوام کو مشتعل کیا گیا۔ جلسے جلوس نکلے۔ نعروں، بینروں اور پوسٹروں کے ذریعہ سے غم و غصہ کا بھرپور اظہار کیا گیا۔ اور کہا گیا کہ یہاں دوسرا ربوہ نہیں بننے دیا جائے گا۔

علاقہ بھر میں در و دیوار پر، پلوں سڑکوں پر، بازاروں گلیوں میں اور عوامی مقامات پر ہر کہیں ہر جگہ، احمدیت کے خلاف زہر آلود اور نفرت انگیز باتیں لکھی لکھائی گئیں۔ اور صورت حال فزوں تر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ان پہاڑوں سے احمدیت کی مخالفت کا لاوا زور سے ابلنے لگا، جس کی لپیٹ میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور سے وابستہ، ایبٹ آباد کی مقامی جماعت بھی آ گئی۔ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر تو مخالفین کی قہر آلود نگاہیں خاص طور پر جمی ہوئی تھیں۔ اور ان کی مجھ پر یہ قہر سامانی بظاہر بے وجہ نہ تھی۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ جماعت ربوہ کی زیر تعمیر احمدیہ کالونی اپنے رقبہ اور محل وقوع کے اعتبار سے پی ایم اے کے قریب بلکہ ملحق و متصل تھی۔ اس کو حسن

اتفاق کہیئے یا سوئے اتفاق، کہ انہی ایام میں جبکہ کالونی کی تعمیر اپنے ابتدائی مراحل میں تھی، میرا بیٹا بریگیڈئر عبداللہ سعید، جو اس وقت پی ایم اے کا کمانڈانٹ تھا، اس کے بارے میں یہ پروپیگنڈا عام تھا کہ وہ مرزائی ہے۔ اس کی ہی کوششوں سے اور اس کے ہی اثر ورسوخ سے پی ایم اے کے قریب مرزائی کالونی کے لیے اراضی خریدی گئی ہے۔ اور اسی کے انتظام وانصرام کے باعث یہاں تعمیرات ہو رہی ہیں اور وہ کیڈٹوں اور سٹاف کو مرزائیت کی تبلیغ کرتا ہے۔ اور یہ کہ وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ اور تبلیغی مقاصد کے ماتحت پی ایم اے کے افسروں اور زیرِ تربیت کیڈٹوں کو خلیفہ ربوہ کے پیچھے نماز جمعہ پڑھانے کے لیے مرزائی کالونی میں لے جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صورتحال قطعاً نہ تھی۔ عبداللہ سعید نے تو خلیفہ ربوہ کی صورت بھی سوائے تصویر کے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ محض پروپیگنڈا تھا۔ اور اس پروپیگنڈے کی روشنی میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے، میرے متعلق عوام میں یہی بات پھیلی ہوئی تھی کہ ہزارہ علاقہ میں ربوہ کا سب سے بڑا اور اہم رکن میں ہی ہوں اور یہ سب کچھ میرے ہی سوچ وعمل اور دخل سے ہو رہا ہے۔

اس تفصیلی بیان سے میں قارئین کو بتانا یہ چاہتا ہوں، کہ علاقہ ہزارہ میں احمدیہ تحریک قادیانیت سے موسوم ومتعارف رہی۔ لاہوری جماعت سے جو احمدیہ تحریک کا دوسرا نام ہے، عوام قطعاً لاعلم تھے۔ ۱۹۷۴ء میں مجھے اور میرے احباب کو جو سانحہ پیش آیا، اس کی بنیاد صرف اسی نفرت وغصہ پر مبنی تھی جو قادیانی جماعت کے عقائد کے ردعمل کے طور پر تھی۔ میرے بارے میں بھی اس علاقہ میں عام تاثر یہ تھا کہ میں قادیانی ہوں اور قادیانی جماعت ایبٹ آباد کا سربرآوردہ لیڈر ہوں اور اس علاقہ میں قادیانی مفادات کا نگران ومحافظ

ہوں۔ یہ تاثر یہاں کے لوگوں کی میرے صحیح مسلک کے بارے میں عمومی لاعلمی
اور ظاہری غلط فہمی پر مبنی تھا۔





آٹھواں باب

سانحات ۱۹۷۴ء

اَلَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ ؕ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۚ﴿۱۷۲﴾

اَلَّذِيۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَـكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِيۡمَانًا ۖۚ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ ﴿۱۷۳﴾

وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی اس کے بعد کہ انھوں نے زخم کھایا، جنھوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقویٰ کیا ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

وہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے (مقابلے کے) لیے (لشکر) جمع کیے ہیں پس ان سے ڈرو تو اس (بات) نے ان کا ایمان بڑھایا اور انھوں نے کہا اللہ ہمیں کافی ہے اور کیا ہی اچھا کارساز ہے۔ (آل عمران، ۳: ۱۷۲ اور ۱۷۳)

۱۹۷۴ء کے واقعات و سانحات، تاریخ احمدیہ کا ایسا دلخراش باب ہے، جس میں مرد و زن، پیر و جوان، بچے اور بچیاں شورش پسندوں کا براہِ راست نشانہ بنے اور غیض وغضب کی بھڑکتی ہوئی آگ کے دریا پار کر کے نکلے۔

احمدیت کی اِس قدر شدید مخالفت جیسی کہ، اِس دور میں ہوئی اِس سے قبل کبھی دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی۔تحریک احمدیہ کا یہ دور نہایت ابتلاء اور پریشانی کا تھا۔ پاکستان بھر میں مخالفت کی ایک آگ شعلہ زن تھی۔لیکن جس قدر اس کی مخالفت علاقہ ہزارہ میں ہوئی کہ مخالفین سر پر کفن باندھ کر

میدان میں آ نکلے تھے کسی اور جگہ اس قدر نہیں ہوئی۔تحریک احمدیہ کے لیے یہ ایک سانحی دور تھا۔ مخالفت ایک شورش کی صورت اختیار کر چکی تھی اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت احمدیت کا مکمل استیصال عمل میں لایا جار ہا تھا۔

تحریک احمدیہ کے خلاف شورش۔Anti Ahmadiyya Agitation

۱۹۷۴ء میں پاکستان بھر میں جو فساد برپا ہوا، اُس کی خفیہ سازش عرصہ سے ہو رہی تھی۔ متعدد مقامات پر، نجی مکانوں، سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی عمارات کی دیواروں اور سڑکوں پر غلیظ اور اشتعال انگیز نعرے لکھے جا رہے تھے اور مخالف تحریکوں کے نمائندے گلی گلی، قریہ قریہ عوام میں نفرت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ عام افواہ یہ تھی کہ اگست ۱۹۷۳ء میں احمدیوں کا مکمل طور پر استیصال ہو جائے گا۔مگر ۱۹۷۳ء میں پنجاب میں ایک عظیم سیلاب آیا، جسے طُوفانِ نوح سے تشبیہ دی جانے لگی۔جس کی وجہ سے شورش کی آگ وقتی طور پر مدھم پڑ گئی،مگر جونہی طوفانِ نوح تھما اور لوگوں کے حافظہ سے اُس کی یاد محو ہونے لگی تو یہ شورش جسے تحفظِ ختمِ نبوت کا نام دیا گیا تھا، پھر سے تازہ ہو گئی اور زور پکڑتے پکڑتے اپنے عروج پر پہنچ گئی۔مخالف شر پسند طاقتیں حرکت میں آ گئیں اور ملک بھر میں شورش پھیل گئی۔احمدیہ تحریک کو کچلنے کے لیے عتاب وعذاب کے ہر طرح کے سامانوں سے کام لیا جانے لگا۔قتل وغارت، لوٹ کھسوٹ، اتلافِ جان و مال، آتش زنی، ذرائع معاش کی بندش، سماجی مقاطعہ، غرضیکہ کونسا ایسا ظلم تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو۔ پاکستان کی پاک سرزمین احمدیوں کے لیے جہنم بنا دی گئی تھی۔ اگرچہ مخالف تحریک کا نشانہ پنجاب و سرحد میں کئی احمدی خاندان بنے اور لاکھوں کی املاک اور متعدد جانیں تلف ہوئیں لیکن سرحد اور ضلع ہزارہ میں پیش آنے والے سانحات و واقعات کا تعلق ہزارہ میں تحریک احمدیت سے بالعموم اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی ذات سے بالخصوص تھا۔اور تاریخِ احمدیت میں خاص اہمیت کا حامِل ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے کلینک میں دھماکا۔ ۲۳ اپریل ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر سعید احمد خان کو عوام، اپنی لاعلمی کی بناء پر، قادیانی (ربوہ) جماعت کا لیڈر تصور کرتے ہوئے اُن کے درپے آزار تھے۔ آپ کے نام تہدید آمیز گمنام خطوط آتے تھے جن میں آپ کو دھمکایا جاتا تھا۔ ایسی ہی دھمکیوں کی عملی صورت آپ کے کلینک میں ایک دھماکا تھا۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی تحریر سانحۂ ۱۹۷۴ء کی سرگزشت میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے:

> ۲۳ اپریل ۱۹۷۳ء کو رات ایک بج کر ۲۵ منٹ پر میرے گھر میں انتہائی خوفناک دھماکہ ہوا، جس کی شدتِ آواز سے شہر بھر میں دور دور تک لوگوں کی آنکھ کھل گئی۔ تاہم کچھ دیر بعد پھر سو گئے۔ علی الصبح جب نماز فجر کے لیے ہمارے گھر میں حرکت شروع ہوئی اور نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ یہ دھماکہ ہمارے کلینک میں ہی ہوا تھا۔ ایک بم کلینک کے لب سڑک واقع برآمدہ میں پھٹا تھا، جس سے برآمدہ کی چھت، برآمدے میں کھلنے والے پانچ دروازوں، کھڑکیوں، قریبی کمروں اور ایکسرے مشین کے کمرے میں پڑی ہوئی اشیاء کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ اور ان شکستہ چیزوں اور سیلنگ کی لکڑی کے ٹکڑوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ تاہم میں نے بجلی کی فراہمی درست پائی اور ایکسرے مشین کو بھی اپنی صحیح حالت میں دیکھا۔
>
> اس حادثہ اور نقصان کی رپورٹ مجاز افسران کو دی گئی۔ ایس ایس پی آتے جاتے رہے۔ مگر پولیس نے اپنی کاروائی پوری کرنے کے علاوہ کوئی مؤثر قدم نہ اُٹھایا۔ میں نے ہفتہ عشرہ کے اندر اندر کلینک کی مرمت کروا لی اور حسب معمول کام جاری رکھا۔

محترم عبدالرحمان صاحب، پرنسپل ایبٹ آباد پبلک سکول کی رہائش گاہ پر دھماکہ

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے کلینک کے واقعہ کے چند ہفتوں بعد، ایبٹ آباد پبلک سکول کے پرنسپل عبدالرحمان صاحب کے گھر، اُن کے کھانے کے کمرے میں بم پھینکا گیا اور قیمتی سامان کو بھاری نقصان ہوا۔ مگر اثرات صرف ایک کمرے تک محدود رہے اور قیمتی جانیں، اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے محفوظ رہیں۔ اُس وقت پرنسپل صاحب کی رہائش گاہ پر اُن کے اپنے اہل خانہ کے علاوہ میاں ممتاز احمد فاروقی صاحب، میاں نصیر احمد فاروقی صاحب بمع اہلِ خانہ بھی رہائش پذیر تھے۔

احمدی احباب کے نام گمنام خطوط

کئی احمدی احباب کو ایک ہی مضمون 'مرزائیت کی موت کا پیغام' کے عنوان سے گمنام خطوط آئے، جن میں بم دھماکوں کا حوالہ دیتے ہوئے، احمدیت سے تائب ہونے کا پیغام تھا اور یہ کہ بصورتِ دیگر اُن کی جانوں اور مالوں کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے۔ اُن میں سے ایک کی تحریر مندرجہ ذیل ہے:

مرزائیت کی موت کا پیغام

> ڈاکٹر سعید احمد کے بنگلہ پر ماہ اپریل میں بم کے دھماکہ اور حال ہی میں پرنسپل رحمان (قادیانی) کے گھر پر بم کے پھینکے جانے نے تم کو ضرور حیرت اور خوف میں ڈال رکھا ہوگا۔ صورت حال کو واضح کرنے کے لیے تحریر ہے کہ یہ تو ابھی ابتدائی طور پر تم جہنمیوں کے خلاف عملی کارروائی ہے۔ اور اگر تم مردود جلد سے جلد ایبٹ آباد شہر سے نکل نہ گئے اور ایبٹ آباد میں ربوہ بنانے کے ناپاک ارادوں کو عملی طور پر تم نے اپنے دل سے نہ نکالا تو عنقریب تم مرزائیوں کے

خلاف پورے پاکستان میں خوفناک حملے کیے جائیں گے۔ تمہارے بیوی بچوں کو قتل کیا جائے گا۔ اور تمہاری لاشوں پر رونے والا کوئی نہ ہوگا۔ آج وقت ہے یا تو پاکستان سے نکل جاؤ یا مرزائیت کو چھوڑ دو۔

اس تحریر کو صرف دھمکی ہی نہ سمجھنا۔ یہ مرزائیت کی موت کا پیغام ہے۔

سرفروشان ناموسِ محمدؐ

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی رہائش گاہ میں دھماکا۔ ۲۷ جون ۱۹۷۳ء

مخالفین کی طرف سے خوف و ہراس پھیلانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی سلسلے کی نئی کڑی ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی رہائش گاہ پر ایک دھماکہ تھا۔ آپ نے اس دھماکے کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے:

۲۷ جون ۱۹۷۳ء کی صبح نماز فجر کی ادائیگی کے بعد مسجد سے جب میں اپنے گھر واپس گیا، اس وقت ابھی دھندلکا ہی تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں حسب معمول قدرے آرام کے لیے اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ بہت قریب، پہلے دھماکے کی طرح، ایک اور لرزہ خیز دھماکہ ہوا، دروازے کھڑکیاں الغرض سارا مکان ہل گیا۔ اس وقت پانچ بجکر دس منٹ کا عمل تھا۔ افراد خانہ اٹھ کر باہر آئے تو دیکھا کہ میرے مکان کے شرقی صحن میں جو مسجد کو جانے والی سڑک پر واقع ہے اور وکیل عبدالسلام سرور کے مکان کے عین سامنے ہے۔ ایک بم پھٹا پڑا ہے۔ جس کے تیز تیز آہنی ٹکڑے وغیرہ صحن میں بکھرے پڑے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس وقت صحن میں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ ایک چھوٹی سی

میرین کتیا اور اس کے چار پانچ ننھے ننھے پلّے جن کا چھوٹا سا گھر اس صحن میں واقع تھا، وہ بھی سلامت تھے۔ یہ پلے تو وہاں اچھل کود رہے تھے، لیکن کتیا بڑے خوف و ہراس کے عالم میں میرے کمرے میں میری چارپائی کے نیچے ہانپ کانپ رہی تھی۔ وہاں سے ہٹائے جانے اور باہر نکالنے کی ہر کوشش کی سختی سے مزاحمت کر رہی تھی۔ گویا اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝١ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ۝٢ (اس گھڑی کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے، جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی (بدحواس ہوکر) اسے چھوڑ دے گی جسے دودھ پلاتی تھی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی اور تو لوگوں کو متوالے دیکھے گا۔ حالانکہ وہ متوالے نہیں ہوں گے۔ لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے)۔ (الحج ۲۲:۱-۲)۔

اس صحن میں کھلنے والے تین دروازوں میں سے ایک دروازہ قدرے شکستہ تھا اور روشندانوں کے کچھ شیشے ٹوٹے تھے۔ اور کوئی نقصان نہیں ہوا۔

باہر جاکر میں کمرے میں واپس آ گیا اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ غنودگی طاری ہوگئی اور یہ الفاظ زبان پر جاری ہوئے:

هُوَالَّذِیْ یَهْدِیْ اِلَى الرُّشْدِ مَنْ یَّشَآءُ۔ (وہ ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف جسے وہ چاہتا ہے)۔

اِس دھماکے کے بعد کچھ پولیس افسران ہمدردی کے لیے آئے اور اِس دفعہ کے بم دھماکے کی تحقیقات میں دلچسپی کا اظہار بھی کیا تھا۔ کچھ گرفتاریاں ہوئیں اور

گرفتار شدگان کچھ حقائق بھی سامنے لائے۔مگر کوئی خاطر خواہ کاروائی نہ کی گئی۔اور بااثر حلقہ کی دخل اندازی کی بنا پر گرفتار شدہ اشخاص کو رہا کر دیا گیا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب پر قاتلانہ حملہ کی کوشش

۱۵ جولائی ۱۹۷۳ء کو ڈاکٹر صاحب اپنے قریبی عزیز عبدالسلام مبارک کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے دیبگراں تشریف لے گئے۔ پروگرام کے مطابق آپ کو وہاں بعد از دوپہر پہنچنا تھا۔مگر ایبٹ آباد سے روانگی میں غیر ضروری تاخیر ہوگئی۔اس لیے آپ نے مانسہرہ سے دیبگراں جانے والے راستہ کو چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کیا۔ جو،گو کہ فاصلے کے حساب سے لمبا تھا، مگر پیدل مسافت کم رہ جاتی تھی۔اس طرح آپ بروقت تقریب میں شامِل ہو سکتے تھے۔آپ کا یوں متبادل راستے سے جانے کا خیال خدائے علیم وخبیر کی طرف سے ایک باریک تدبیر تھا،جس سے شرپسندوں کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔منصوبہ یہ بنایا گیا تھا کہ مانسہرہ سے دیبگراں، ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے پیدل سفر کے دوران آپ پر حملہ کیا جائے گا۔اس مقصد کے لیے ایک بھاری چٹان راستہ کے قریب رکھ دی گئی تھی کہ عین وقت پر اُسے لڑھکا کر راستہ روک لیا جائے گا اور اوٹ میں چھپے افراد یکبارگی حملہ کر دیں گے۔آپ کے متبادل راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے اُنہیں ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔شادی کی تقریب کے دوران ہی کچھ خیر خواہوں نے آپ کو مطلع کر دیا اور جلد واپس چلے جانے کا مشورہ دیا،کیونکہ اُس وقت بھی مشتبہ افراد کی نقل وحرکت دیکھنے میں آئی تھی،اور خطرہ تھا کہ واپسی کے سفر میں کوئی ناگہانی صورت حال پیش نہ آجائے۔

ربوہ سٹیشن کے واقعات۔ ۲۲ اور ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء

اینٹی احمدیہ ایجی ٹیشن جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی،ایک آتش فشاں کی طرح اُس وقت پھٹ پڑی جب ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو ربوہ سٹیشن کا واقعہ رونما ہوا۔درحقیقت یہ واقعہ ایک خاص سوچ

سمجھے منصوبے کے تحت عمل میں لایا گیا تھا تا کہ عوام میں اشتعال پیدا ہو، اور یہ محدود تحریک ایک عوامی تحریک بن جائے۔ یہ واقعہ نشتر میڈیکل کالج کے ایک گروپ کی اشتعال انگیزی سے ظہور پذیر ہوا۔ یہ گروپ ملتان سے براستہ ربوہ بذریعہ ریل گاڑی پشاور سفر کر رہا تھا۔ ۲۲ مئی کو ربوہ سٹیشن پر جتنی دیر تک گاڑی رُکی رہی، یہ طلباء اشتعال انگیز نعرے لگاتے رہے اور غیر شائستہ حرکات کرتے رہے۔ مگر احمدیوں نے تحمل سے کام لیا اور مشتعل نہ ہوئے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو طلباء نے دھمکی دی کہ ایک ہفتہ بعد آ کر دیکھیں گے کہ مرزائی اُن کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔

۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو اِن طلباء کی واپسی ہوئی تو سٹیشن ربوہ پر پہنچ کر پہلے سے کہیں زیادہ اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے۔ جس پر چند احمدی نوجوان مشتعل ہو گئے اور اُن کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور مار پیٹ تک نوبت آ گئی۔ چند طلباء کو معمولی زخم بھی آئے۔ جب آدھے گھنٹے بعد گاڑی فیصل آباد پہنچی تو ایک مجمع کثیر اِن طلباء کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ ایک شامیانے کے نیچے، جو اِن کے استقبال کے لیے پہلے ہی سے وہاں نصب کر دیا گیا تھا، ان طلباء پر ظلم وستم کے متعلق مبالغہ آمیز اور اشتعال انگیز تقاریر کی گئیں تا کہ عوام کو بھڑکا کر فتنہ وفساد کی آگ لگائی جائے۔ ۳۰ مئی کو واقعہ ربوہ کے متعلق تمام پریس میں بعید از قیاس خبریں شائع کی گئیں۔ اخبارات نے اس واقعہ کو اِس قدر بڑھا چڑھا کر اُچھالا کہ تمام ملک میں وسیع پیمانے پر احمدیوں کے خلاف فتنہ وفساد اور تشدد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور پنجاب اور صوبہ سرحد کے مختلف مقامات پر اس واقعہ کی آڑ لے کر تمام مخالف طاقتیں حرکت میں آ گئیں اور ملک بھر میں شورش پھیل گئی اور قتل وغارت، لوٹ کھسوٹ کے واقعات رونما ہونے لگے۔

مری میں واقع لاہور احمدیہ جماعت کی مسجد پر قبضہ بالجبر

مری کی احمدیہ مسجد پر ایک مشتعل ہجوم حملہ آور ہوا۔ مولوی عبدالرحمان صاحب، احمدی امامِ مسجد، اُس وقت وہاں پر بالکل تنہا تھے۔ اُن کو مسجد چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ اپنی جان بمشکل بچا

پائے اور سیالکوٹ کے شیخ رشید احمد صاحب کے پاس برائٹ لینڈ ہوٹل میں پناہ گزین ہوئے۔قبضہ بالجبر کے بعد اُس مسجد پر"مسجد ختمِ نبوت" کی تختی آویزاں کر دی گئی۔دو دن بعد مولوی صاحب خان بہادر صاحب کے یہاں تشریف لائے اور افسوسناک آپ بیتی سنائی۔

محترمہ رقیہ عزیز صاحبہ کی تحریر:

۱۹۷۴ء کے ملک گیر فسادات میں مری کی احمدیہ مسجد کو نذرِ آتش کرنے اور قبضہ بالجبر کا واقعہ نہایت تکلیف دہ ہے۔اُس دور میں ہمارے والد محترم مولوی عبدالرحمان صاحب وہاں بطور امام مسجد متعین تھے۔اُن کی زبانی تمام حالات کا علم ہوا۔مری کی جامع مسجد کے خطیب نے جمعہ کے روز ایک اشتعال انگیز خطبہ دیا۔بالخصوص نوجوانوں کو مشتعل کیا۔چنانچہ اگلی ہی صبح کو تقریباً نو دس بجے ایک مشتعل ہجوم نے مسجد کو گھیر لیا۔مولوی صاحب اپنی رہائش گاہ میں جو مسجد کے نچلے فلیٹ میں تھی، بے خبر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اچانک فلک شگاف غلیظ نعرے فضاء میں بلند ہوئے اور سنگ باری شروع ہو گئی۔مسجد کو چاروں اطراف سے گھیرے میں لے لیا گیا اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ ہمارے ابا جان (مولوی عبدالرحمان صاحب) آگ کی حِدّت سے تقریباً نیم بے ہوش تھے، جب ایک نیک دل ایس۔ایچ۔او، آگ کے شعلوں سے اُنہیں باحفاظت باہر نکال لایا۔ اللہ تعالیٰ نے مولوی صاحب کو اپنی خاص رحمت اور قدرت سے یوں محفوظ رکھا کہ اُن کے جسم پر ایک خراش تک بھی نہ آئی۔ پولیس افسر نے اُنہیں برائٹ لینڈ پہنچا دیا، جس کے مالکان کا تعلق سیالکوٹ کے احمدی گھرانے سے تھا۔

مسجد کو ویران کھنڈر بنا دیا گیا اور اُس پر قبضہ کر لیا گیا۔مولوی صاحب کا تمام

قیمتی اثاثہ لوٹ لیا گیا۔ یہ مسجد اب بھی مخالفینِ جماعت کے قبضہ میں ہے۔

موضع ٹوپی (ضلع مردان)

مئی کے آخری ایام میں موضع ٹوپی ضلع مردان میں احمدیوں پر ظلم وستم، آتش زنی اور قتل و غارت کے روح فرسا واقعات کچھ کم چونکا دینے والے نہ تھے۔ کچھ احمدی وہاں سے بھاگ کر ایبٹ آباد میں پناہ گزیں ہوئے اور وہاں کے واقعات بیان کیے۔

پشاور یونیورسٹی کے واقعات

ٹوپی کے روح فرسا واقعات کے معاً بعد، غالباً مئی کے آخری ہفتہ میں پشاور یونیورسٹی بھی فسادات کی لپیٹ میں آ گئی۔ ہر احمدی طالب علم اور اُستاد کا کُل اثاثہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اِن طالب علموں میں خان بہادر صاحب کے چھوٹے بیٹے زاہد احمد سعید، جو میڈیکل کے سالِ چہارم کے طالب علم تھے، ایک قریبی عزیز محمد صالح اور خان بہادر غلام ربانی خان صاحب کے پوتے ثاقب ممتاز بھی شامل تھے، جو اُس وقت یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ اِن کے اثاثے تو تلف کر دیئے گئے مگر اُن کے وجود پر چند شریف النفس انسانوں کی وجہ سے کوئی آنچ نہ آئی۔ زاہد سعید کالج کی سرگرمیوں، بالخصوص انتخابات وغیرہ میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ اگرچہ اپنے لیے وہ کسی خاص عہدہ کے خواہاں کبھی نہیں ہوئے، مگر دوستوں کیلیے خوب سرگرمِ عمل رہتے تھے، جس وجہ سے مخالفین کی نگاہوں میں کھٹکتے تھے۔ اس لیے زاہد کے حق میں بالخصوص اُن کے ارادے اچھے نہ تھے۔ ایسے کڑے وقت میں اُن کی یہی دوست نوازی آڑے آئی۔ شر پسندوں کے منصوبے کی خبر جب ان کے خیر خواہ دوستوں کو ہوئی تو وہ وقوعہ سے کچھ ہی دیر قبل تقریباً دس بجے، اُنہیں یونیورسٹی سے لے کر نکل گئے۔ وہ رات اُنہوں نے یونیورسٹی ٹاؤن میں ایک دوست کے یہاں گذاری۔ اگلی رات ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کے یہاں اور پھر وہاں خطرہ سمجھ کر چند دوسرے مہربانوں کے گھروں میں روپوش

رہے۔ مخالفین اِن کی کھوج میں پھر رہے تھے۔ ہفتہ بھر چھپتے چھپاتے پشاور میں گذر گیا۔ بالآخر سات اور آٹھ جون کی درمیانی شب کو زاہد کے انہی دو اچھے دوستوں نے اُنہیں اور اُن کے ماموں زاد محمد صالح کو دارالسعید ایبٹ آباد میں پہنچا کر حقِ وفاداری ادا کر دیا۔۔جزاھم اللہ واحسن الجزاء۔

زاہد سعید کے یونیورسٹی سے نکل جانے کے بعد اُسی شب، طے شدہ پروگرام کے مطابق شر پسند یونیورسٹی ہوسٹل میں وارد ہوئے اور زاہد سعید کے کمرے پر دھاوا بول دیا۔ اُنہیں وہاں نہ پا کر، اُن کے تمام سامان اور کتب کو نذرِ آتش کر دیا۔ زاہد کے پاس اپنی کتب کے علاوہ لائبریری کی کئی کتب بھی تھیں جن کے لیے خان بہادر صاحب نے بعد میں زاہد کا سرٹیفکیٹ حاصِل کرنے کے لیے، ایک بھاری رقم قیمت کے طور پر ادا کی۔

پشاور یونیورسٹی کے طلباء کی ایبٹ آباد میں آمد

فسادات کی وجہ سے پشاور یونیورسٹی غیر متعینہ مدت کیلیے بند کر دی گئی۔ اور طلباء کو یونیورسٹی خالی کر دینے کے احکام جاری ہو گئے۔ چنانچہ تمام طلباء اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ لیکن فتنہ کو ہوا دینے والے جہاں جہاں بھی گئے، جلتی پر تیل ہی چھڑکتے گئے۔ چنانچہ ضلع ہزارہ سے تعلق رکھنے والے طلباء نے جو اِدھر رُخ کیا اور پانچ چھ آتش بیان طلباء ایبٹ آباد پہنچے تو فتنہ کی جو آگ اِس علاقے میں مدھم مدھم سلگ رہی تھی ایک دم بھڑک اُٹھی، اور مسجدوں کے لاؤڈ سپیکروں سے لاوا بن کر بہنے لگی۔ ایبٹ آباد میں جو واقعات بعد میں رونما ہوئے اُس میں اِن نوجوانوں کا کافی ہاتھ تھا۔

دارالسعید پر پولیس گارڈ کا تعین

ایبٹ آباد میں پھیلتے ہوئے اشتعال کے مدِّنظر ۳ جون کو انتظامیہ کی طرف سے دس بارہ افراد پر مشتمل پولیس کی ایک گارڈ، ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر کی زیر قیادت دارالسعید کی حفاظت پر متعین کر

دی گئی۔اُن افراد کی خورد ونوش اور ہر طرح کی خاطر مدارات کا ذمہ خان بہادر صاحب کا تھا۔

ایبٹ آباد میں جلسہ اور بارش۔ ۷ جون ۱۹۷۴ء

۷ جون بروز جمعہ، ایبٹ آباد کے کمپنی باغ میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں ایک قرارداد منظور ہوئی اور یہ فیصلہ ہوا کہ چار دِن بعد ایک عدیم المثال ہجوم ایبٹ آباد میں موجود ہو گا اور تمام احمدیوں کو ختم کر دیا جائے گا۔اور اُس دن کے بعد ہزارہ میں کوئی احمدی نہیں بچے گا۔جلسہ کے اختتام پر فوراً ایک جلوس نکالا جائے گا جس کا مقصد بدامنی اور فساد کی ابتداء ہو گی۔مگر دوران جلسہ غیر متوقع طور پر شدید طوفانی بارش ہوئی اور جلسہ درہم برہم ہو گیا۔لوگ تتر بتر ہو گئے اور اُس دن کا خطرہ ٹل گیا۔

حکومت کی طرف سے حفاظتی اقدامات

جلسے کے اگلے روز ہی فرنٹیئر کانسٹیبلری (Frontier Constabulary) کا ایک دستہ جو کُرّم کے شیعہ پٹھانوں پر مشتمل تھا دارالسعید کی حفاظت کے لیے تعینات کر دیا گیا تھا۔پولیس کے پہلے سے متعین دستہ کا قیام آپ کے کلینک کی بالائی منزل میں تھا، جبکہ کانسٹیبلری کا دستہ مسجد کے قریب آپ کے گیراج اور احمد صادق صاحب کے مکان کے برآمدے میں متعین کیا گیا۔آپ سمجھتے تھے کہ کانسٹیبلری کے جوان پولیس کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتماد تھے، اس لیے آپ نے تجویز کیا کہ انہیں کلینک کے سامنے اور آپ کے مکان کے برآمدے میں ٹھہرایا جائے۔لیکن افسر انچارج نے آپ سے اتفاق نہ کیا، تو آپ خاموش ہو گئے۔لیکن مابعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اگر آپ کی تجویز پر عمل ہوتا تو شاید صورت حال مختلف رنگ میں اثر انداز ہوتی۔

مانسہرہ میں جلسہ۔ ۸ جون ۱۹۷۴ء

ایبٹ آباد کے بعد اگلا دِن مانسہرہ میں جلسہ کے لیے مقرر تھا۔ چنانچہ ہفتہ، ۸ جون کو ایک بھاری عدیم المثال اجتماع وہاں ہوا۔ مقررین نے ربوہ کے واقعہ کے حوالے سے احمدیوں کے مظالم کی من گھڑت داستانیں سنا سنا کر نفرت اور اشتعال پیدا کر کے عوام کو اِس قدر بھڑکا دیا کہ وہ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ اسی طرح کے جلسے ہزارہ کے دیگر مقامات پر بھی منعقد کیے گئے، اور عوام کو آمادہ کر لیا گیا کہ وہ احمدیوں کے مکمل استیصال میں بھرپور حصہ لے کر ثواب حاصل کریں۔

ایبٹ آباد میں مخدوش صورتِ حال اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا اطمینان قلب اور توکل علی اللہ

شرپسندوں کے منصوبے میں سرفہرست ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی جان و املاک کا اتلاف تھا۔ دیگر احمدیوں کی املاک کی بربادی اور مسجد پر جبری قبضہ اِس منصوبہ کی اگلی کڑی تھی۔ حالات لحہ بہ لحہ مخدوش ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے میں آپ کے فرزند عبداللہ سعید، جو اُن دنوں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے کمانڈانٹ تھے، انتظامیہ اور امن عامہ کے ذمہ دار اداروں سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے اور وہ اُن کی طفل تسلیوں سے مطمئن بھی تھے، مگر آپ کو خود یہ یقین نہ تھا کہ جو کہا جا رہا ہے ویسا ہی ہوگا۔ خطرات اردگرد منڈلاتے نظر آ رہے تھے۔ لیکن خوف و ہراس کے اِن ایام میں بھی آپ کے کسی عمل سے بے اطمینانی کا اظہار نہیں ہوا۔ آپ کے معمولات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی، کلینک۔ مسجد یا باہر آنے جانے کے معمولات وہی رہے، یہاں تک کہ اصل وقوعہ سے تین روز قبل، بغیر کسی حفاظتی تدبیر کے آپ اپنے داماد، عبدالرحمان بیگ صاحب کے ساتھ دیبگراں تشریف لے گئے۔ وہاں ضروری کام نپٹائے اور شام کو اپنی زوجہ محترمہ (والدہ عبدالحیٔ سعید) اور اپنی چچی صاحبہ (والدہ عبدالرحمان) کے ہمراہ ایبٹ آباد واپس لوٹ آئے۔

اطمینان اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ ایسا تھا کہ ۸، ۹ جون کو آپ کے فرزند عبداللہ سعید بمع اہلِ خانہ کے پشاور کسی تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے، تو اُن سے صرف اتنا کہا کہ جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔ مگر جانے سے منع نہیں فرمایا۔ بہت سے ایسے واقعات رونما ہوتے رہے جن سے آپ کا اطمینانِ قلب اور توکل علی اللہ نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ اُن میں سے ایک عبدالعزیز جہانگیری صاحب کا بیان کردہ ہے۔ جہانگیری صاحب، محمد انور مرحوم کے دوست ہیں اُنہوں نے ایک تحریر محمد انور صاحب کو دی تھی جس سے اقتباس پیش ہے۔

جہانگیری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ایک بدنام اور بدمعاش شخص نے آکر مجھے دُکان سے باہر بلایا اور کہا کہ مجھ تک اُس کا کوئی کام ہے۔ پہلے تو میں گھبرایا کہ اِس شخص کا مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے۔ تاہم از راہِ مروت میں باہر آیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر آگے چلا اور بیان کیا کہ وہ خود چونکہ ایک بدکردار آدمی ہے اس لیے اُس کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ خود ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب جیسی عظیم شخصیت سے ملے۔ اس لیے اُنہیں پیغام دینے کے لیے اُس نے مجھے منتخب کیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ مترشح داڑھیوں والے متقیوں نے ڈاکٹر صاحب کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ لیکن اُس جیسی گناہ گار شخصیت یہ نہیں گوارا کرتی کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے جس کا وجود لوگوں کے لیے رحمت کا موجب ہے اور وہ دُکھی انسانیت کی خدمت میں مصروف ہے۔ لہذا میں ڈاکٹر صاحب کو کہوں کہ وہ اپنی حفاظت کا خیال رکھیں۔ صرف اسی غرض کے لیے وہ خصوصاً مانسہرہ آیا ہے کہ کسی اور احمدی سے اُس کا تعارف نہیں جس کے ذریعہ وہ یہ اطلاع دے سکے۔ اس کے بعد وہ داڑھی والے، ایسے پرہیزگاروں کو گالیاں دیتا ہوا رُخصت ہو گیا۔ میں نے

اُسی وقت جا کر یہ بات ڈاکٹر محمد دین صاحب سے بھی کہہ دی کہ اگر وہ ایبٹ آباد جائیں تو مکرم ومحترم ڈاکٹر صاحب سے عرض کر دیں۔ اِس کے دوسرے تیسرے دن میں خود بھی ایبٹ آباد آیا تو اتفاقاً مکرمی ڈاکٹر صاحب وہاں ایک گھڑی ساز کے پاس کھڑے تھے۔ میں بھی قریب چلا گیا۔ گھڑی ساز کے پورے الفاظ تو میں نہ سُن سکا لیکن اندازہ ایسا تھا کہ وہ بھی شاید ڈاکٹر صاحب کو حفاظت کا کہہ رہا تھا۔ جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کے الفاظ تھے کہ اُن کا اللہ تعالیٰ پر مکمل ایمان ہے اور اُنہیں یقین ہے کہ موت وزیست اُسی باری تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ انسان موت سے کہیں پناہ نہیں لے سکتا۔ یہ جواب سُن کر میری جرأت نہ تھی کہ میں اِس کے بعد پھر بھی اُنہیں حفاظت کا کہتا۔ چنانچہ خاموشی سے اُنہیں سلام کر کے رُخصت ہو گیا۔

جرأت ایمانی اور توکل علی اللہ کی اِس سے بڑھ کر کیا مثال ہوگی کہ قتل کیے جانے کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے اور آپ بھرے بازار میں تن تنہا گھڑی کی مرمت جیسا عام نوعیت کا کام خود کروا رہے ہیں۔

آپ کی تحریر سے اقتباس:

عبدالعزیز، مرحوم وکیل عبدالقیوم کے فرزند ہیں اور جہانگیری میڈیکل ہال مانسہرہ کے مالک تھے۔ اور اب احمدیت پر ثابت قدم رہ کر بطور مہاجر راولپنڈی میں رہتے ہیں۔ اُنہوں نے معلوم الاسم، ایک بدنام، بدکار آدمی کا ایک واقعہ جس کا ذکر آ چکا ہے مجھے لکھ کر بھیجا۔۔۔۔۔۔ اُس کے کردار کا یہ پہلو کیا عجیب ہے۔ یا اللہ! تو اُس کی مغفرت فرما دے۔

نوٹ: یہ شخص ۱۹۷۴ء کے واقعات کے بعد جلد ہی قتل ہو گیا تھا۔

بریگیڈیر عبداللہ سعید کے نام ایک معزز شہری کا خط

راولپنڈی کے ایک معزز قانون دان نے بریگیڈیر عبداللہ سعید کے نام ایک خط تحریر کیا جس سے مخالفین کے غیض وغضب اور منصوبوں کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اُس باضمیر شخص نے اُن کو مطلع کیا کہ بہت جلد ایک شدید حملہ ڈاکٹر سعید احمد خان کے گھر پر کیا جائے گا۔ جس کے لیے ایک بھاری قیمت ادا کر کے مسلح بدمعاشوں کو خریدا گیا ہے، جو ایبٹ آباد کے تمام چیدہ چیدہ مرزائیوں کو ختم کر دیں گے۔ محترم ایڈووکیٹ صاحب نے نام بنام مفسدین کی نشاندہی بھی کی اور پولیس سے چھاپہ مروانے کا مشورہ بھی دیا۔ لیکن دُنیاوی محافظوں پر بھروسہ رکھنے کی بجائے متوکل باپ بیٹے نے تمام معاملات قادرِ مطلق، حافظ و ناصر اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا بہتر تصور کیا۔

بابو محمد ایوب کی اطلاع اور مشورہ

حضرت ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی تحریر سے اقتباس:

میں معمول کے مطابق اپنی کلینک میں روزانہ دن بھر کام کرتا رہتا تھا۔ مریض بھی دیکھتا تھا۔ سب لوگ ہی پیش آمدہ طوفان سے باخبر تھے۔ میرے سٹاف والے بھی سب کچھ جانتے تھے۔ ایبٹ آباد کا شاید ہی کوئی شہری ہو جس کا مجھ سے کبھی نہ کبھی واسطہ نہ پڑا ہو، لیکن عجیب بات ہے کہ کسی شخص نے مجھ سے اس خطرے کے متعلق کبھی ذکر نہ کیا تھا۔ صرف میرے اسسٹنٹ محمد ایوب خان آف بگڑہ نے مجھ سے اس واقعہ سے تین دن پہلے تنہائی میں کہا کہ لوگوں کے ارادے ہمارے بارے میں، خصوصاً آپ کی ذات کے متعلق اچھے نہیں۔ اور مشورہ دیا کہ میں اپنے گھر کے لوگوں کو کاکول بھیج دوں اور خود بھی رات کو اپنے بیٹے عبداللہ سعید کے پاس چلا جایا کروں۔ میں اس نوجوان کی خیرخواہی کو

فراموش نہیں کرسکتا، اگرچہ میری طبیعت نے کسی خیال سے اس کا مشورہ اس وقت قبول نہ کیا۔

۱۰ جون ۱۹۷۴ء کے واقعات۔ڈاکٹر محمد دین صاحب کی اطلاع

۱۰ جون ۱۹۷۴ء کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کلینک میں مریض دیکھ رہے تھے کہ مانسہرہ سے ڈاکٹر محمد دین صاحب (احمدی) نے فون پر آپ سے بات کی کہ، خاص احتیاط رکھیں۔ مانسہرہ میں سننے میں آیا ہے کہ کوئی شخص مریض بن کر آپ کے پاس آئے گا اور آپ پر قاتلانہ حملہ کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُن سے کہا: ”ڈاکٹر کی زندگی تو ہر وقت خطرے میں ہوتی ہے، بہرحال آپ دُعا کریں۔ میں حتی الوسع احتیاط کروں گا“۔

ارجمند صادق صاحب کا بیان کردہ واقعہ

ارجمند صادق صاحب نے آپ سے ایک واقعہ بیان کیا۔ وہ یوں ہے کہ قصرِ وزیراعظم (Prime Minister House) اسلام آباد میں، جہاں وہ بطور بجٹ اسسٹنٹ ملازم تھے، ایک شخص کو باتوں باتوں میں اُن کی خان بہادر صاحب سے قریبی رشتہ داری کا علم ہوا تو اُس نے ارجمند صادق صاحب سے کہا:

> کل ۱۱ جون کو ایبٹ آباد میں ایک بہت بڑا واقعہ ہونے والا ہے۔ اتنا بڑا ہجوم لوگوں کا جمع ہوگا، جس کی مثال تاریخِ ہزارہ میں نہ ملے گی اور اُن کا بڑا مقصد احمدیت کی یہاں سے جڑھ کاٹنا، اور ڈاکٹر سعید احمد کا قتل ہے۔ آپ ڈاکٹر صاحب کے رشتہ دار ہیں۔ کسی طرح سے ممکن ہو تو اُنہیں اس خطرے سے آج ہی آگاہ کردیں کہ وہ اپنی جان بچاسکیں تو بچالیں۔

ارجمند صادق کا کہنا ہے کہ وہ دارالسعید میں خان بہادر صاحب سے اور بعد میں کاکول

میں عبداللہ سعید سے ٹیلی فون پر رابطہ کی انتھک کوشش کرتے رہے، لیکن اُنہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ باوجود قصرِ وزیراعظم کا حوالہ دینے کے، ٹیلی فون آپریٹر نے تعاون نہ کیا اور وہ کچھ نہ کر سکے۔

اہالیانِ شہر کا عجیب رویہ

اگرچہ عوام تمام حالات سے باخبر تھے مگر آپ سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ مگر بعض حالات اس بات کے غماز تھے کہ لوگ باخبر ہیں۔

ایک معزز سیاسی شخصیت کی اہلیہ صاحبہ نے ایک مقفل صندوق بطورِ امانت آپ کے گھر میں رکھوایا ہوا تھا۔ اکثر اوقات وہ کوئی چیز اُس میں رکھ جاتیں یا نکالتیں مگر سالہا سال سے وہ اپنا صندوق واپس نہیں لے گئی تھیں۔ وقوعہ سے دو روز قبل اُن کی صاحبزادی قدرے سراسیمگی کی حالت میں آئیں اور صندوق لے گئیں کہ وہ گاؤں جا رہے ہیں۔ گویا کہ وہ اپنا قیمتی اثاثہ آنے والے حالات کے پیشِ نظر بچا لے گئیں۔ اُنہیں حالات کا علم تھا۔ بعد میں اُن کے اہل خانہ میں سے کسی نے کسی سے ذکر بھی کیا تھاکہ وہ واقعی اُسی دِن گاؤں چلے گئے تھے۔ کیونکہ بقول اُن کے: ”وہ اپنی آنکھوں سے خان بہادر صاحب کو جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے“۔

دوسرا واقعہ آپ کے ایک ہم جماعت اور دیرینہ دوست کی

صاحبزادی کا ہے۔ وقوعہ سے پہلی شام کو کلینک کے اوقات کے بعد وہ اپنی پھوپھی صاحبہ کے لیے نسخہ لینے گھر پر آ گئیں۔ ۔وہ گھبرائی ہوئی تھیں اور کافی بے ربط باتیں کر رہی تھیں۔ آپ تحریر فرماتے ہیں: ”ایک بات اُس کی زبان سے یہ نکلی 'یا اﷲ! جو گولی ڈاکٹر صاحب کو لگنی ہے وہ میرے سینے میں لگ جائے'۔ ایسی باتیں اُس کی بعض معلومات اور دِل میں گذرنے والے خیالات کی غمازی کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی پھوپھی کے لیے میرا آخری طبی مشورہ لینے شام کے وقت آ گئی ہیں اور میرے ناگزیر انجام کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی ہیں“۔

قرآن کے ٹیپ ریکارڈ راور ضروری کاغذات کی حفاظت

عبداللہ سعید تقریب کے سلسلہ میں پشاور گئے ہوئے تھے، جہاں سے ۱۰ جون کو واپس تشریف لائے تو آپ نے ایک صدوقچہ جس میں ضروری کاغذات اور قرآن پاک کی تلاوت کی ٹیپ کی ریلیں اور ٹیپ ریکارڈ رکھا ہوا تھا، اُن کی گاڑی میں رکھ دیا کہ وہ ساتھ لے جائیں۔

خان بہادر صاحب تحریر فرماتے ہیں: ”اس غیر معمولی احتیاط سے جو پہلی بار میری زندگی میں اُنہوں نے دیکھی اُن کو محسوس ہو گیا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے جو میرے ذہن میں آئی ہے۔ یہ اُن کا بعد کا بیان ہے“۔

۱۰ جون کی شام کو مسجد میں رونق

ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے اقتباس:

۱۰ جون کی شام کو نماز کے لیے مسجد دارالسعید میں قریباً سب ہی افرادِ جماعت، مردوزن اور بچے بوڑھے شامل ہوئے۔ ہمارے گھر کے لوگوں کے علاوہ پروفیسر خلیل الرحمان صاحب، احمد صادق صاحب، بشیر احمد صاحب، قاضی عبدالاحد صاحب، محمد زمان صاحب، ماسٹر اصغر علی صاحب، اور ان کے خاندان کے جملہ افراد کے علاوہ ٹرینیڈاڈ کے مصطفی کمال اور گیانا کی مس صفورہ حمید بھی شامل تھی۔ بڑی عجیب رونق تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم معمولاً درس قرآن و حدیث اور حضرت مسیح موعودؑ کی تحریرات میں سے کچھ پڑھتے تھے۔ اور پھر عشاء کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ ہمارا معمول تھا۔ صرف جمعہ کی شام درس نہ ہوتا تھا۔ آج نماز مغرب کے فوراً بعد، مسجد کے زیریں حصے سے جو مستورات کے لیے مختص تھا، فرمائش آئی کہ آج درس کی بجائے قرآن کریم کا ختم پڑھا جائے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تجویز راشدہ بنت محمد زمان کی تھی۔ چنانچہ سپارے تقسیم ہوئے اور قرآن خوانی شروع ہوگئی۔ اور بیم ورجا کے درمیان کی باطنی حالتوں کو تو اللہ ہی جانتا دیکھتا تھا۔ رات گذری۔ حسب معمول تہجد اور فجر کے اوقات گذرے۔ دعائیں جو بن پڑیں، کی گئیں۔

دارالسعید پر حملہ۔ ۱۱ جون ۱۹۷۴ء

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۫ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُۙ۝۱ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُۙ۝۲

وہ ذات بابرکت ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے۔ (الملک، ۶۷:۱۔۲)

۱۱ جون ۱۹۷۴ء کا سورج طلوع ہوا۔ اُسکی سنہری کرنوں نے ہزارہ کی گلپوش وادیوں کو روشنی کی اُمید بخش نوید دی۔ لیکن یہی سورج جماعت احمدیہ کے لیے ظلمات اور ہولناک طوفان کا پیغام لے کر آیا، جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اِن نہتے چند نفوس کے پاس نہ تو کوئی ساز و سامان تھا، نہ کوئی منصوبہ اور نہ کوئی مددگار۔ ایک طرف لاکھوں کا مجمع، آتشیں ہتھیار، گولہ اور بارود۔ اور دوسری طرف چند عاجز بندوں کی بارگاہ ایزدی میں فریاد اور مناجات: ”اے اللہ، احمدیت کی خاطر، اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح موعود کی خاطر، ہماری حفاظت فرما، تیرے سوا ہمیں بچانے والا کوئی نہیں، ہم اپنی جان، ایمان اور مال سب تیرے سپرد کرتے ہیں“۔

شیطان صفت انسانوں کا ایک ریلہ تھا جو چہار اطراف سے اُمڈا چلا آتا تھا اور ایبٹ آباد کی گلیوں اور بازاروں میں طوفان کی طرح پھیل رہا تھا۔ اِس دن کا سانحہ تاریخِ احمدیت کا وہ ناقابلِ فراموش باب ہے جس میں چند نفوس ایمان و استقامت کی ناقابلِ فراموش داستانیں مرتب کر گئے۔

دوسرے منگل کے دِن آیا تھا ایسا زلزلہ
جس سے اک محشر کا عالم تھا بصد شور و پکار

گذشتہ سالوں میں حضرت مرزا صاحب کے اس شعر کو ۱۱ ستمبر کی نیویارک کے تجارتی مرکز (Trade Centre) کی عمارت کی تباہی اور جانی اتلاف کی پیش گوئی قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جماعتِ احمدیہ کے لیے وہ دوسرا منگل، جس نے ایک حشر کا عالم بپا کر دیا تھا، ۱۱ جون ۱۹۷۴ء کا دن تھا۔ اگر ”نائن الیون“ کا لرزہ خیز واقعہ ایک تاریخی سنگِ میل تھا، تو جماعت

احمدیہ کے لیے ”سِکس الیون“ ایک تاریخ ساز سانحہ تھا۔ اس قیامت خیز زلزلہ کے لمحات میں عاجز بندوں کی آہ و بکا عرش تک پہنچتی رہی اور رب العرش، خیرالماکرین نے اپنے ان بندوں کی حفاظت کے لیے کیا تدابیر فرمائیں۔ یہ حالات ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی تحریر ”سانحات ۱۹۷۴ء“ میں قلم بند فرمائے ہیں۔

۱۱ جون کی صبح ڈاکٹر سعید احمد خان کا الہام اور تیاری

تحریر سے اقتباس

۱۱ جون منگل کی صبح تھی۔ پہلی بار جب میری آنکھ کھلی یا کھلنے والی تھی، زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے: ”تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۟ۙ ① “ یوں بیداری ہوتے ہوئے میں نے اگلی آیت ”الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ② “ پڑھ لی۔ اُس وقت لفظ، الموت، میری طبیعت پر طبعاً گراں سا گذرا، لیکن معاً کچھ عزم بھی دل میں مضبوط ہوتا گیا۔ چنانچہ جب دن روشن ہوا، تو اس خیال کے تحت کہ شاید زندگی کے آخری دن کا ہی یہ ایک حصہ ہو، میں نے ارادتاً کچھ تیاری اس رنگ میں شروع کی کہ جسمانی ہر قسم کی صفائی اور طہارت کے ساتھ بڑے اہتمام سے غسل کیا کہ ظاہری میل کچیل کا اثر باقی نہ رہے۔ پھر صاف ستھرا لباس جس قدر میسر تھا پہنا۔ ایک پتلون جس کا کپڑا ”سفوفی“ بڑا مشہور ہوا تھا، اور وہ اپنی بیٹی عائشہ کے پرزور مشورہ پر کراچی سے کچھ عرصہ پہلے خریدا تھا، اور اسے سلائے ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے، اور یاد نہیں کہ اسے پہلے بھی ایک آدھ بار پہنا ہو، وہ بڑے شوق سے اس تیاری کے سلسلہ میں پہنا۔ اوپر سفید بوشرٹ پہنا۔ ناشتہ کر کے اوپر والے مکان میں گیا۔

خلیل یا ایوب (معاون کلینک) نے کہا کہ مریض دو چار آئے ہیں، دیکھ لیں۔
میں نے بجائے کلینک کے، اوپر والے مکان میں ہی یہ آخری مریض دیکھے۔
کبھی کبھی جب طبیعت ناساز ہوتی، تو اس مکان کا ایک کمرہ اس ہی مقصد کے
لیے استعمال کرلیا کرتا تھا۔ یہاں کوفت کم ہوتی تھی۔

حکام کی طفل تسلیاں

گیارہ بارہ بجے کے درمیان آپ کے فرزند عبداللہ سعید نے فون پر آپ کو اطمینان دلایا کہ اُن کی سِول اور پولیس افسران سے بات ہوئی ہے اور اُنہوں نے مکمل یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ لوگ کمپنی باغ میں جمع ہورہے ہیں۔ وہاں نمازِ ظہر ادا ہوگی اور ایک جلوس نکلے گا۔ وہاں سے چھاؤنی کی طرف سے مانسہرہ روڈ پر جائیں گے اور واپس آ کر کمپنی باغ میں جلسہ کریں گے، ریزولوشن پاس کریں گے اور منتشر ہوجائیں گے۔ اُن کا خان بہادر صاحب کے گھر کی طرف یا شہر کے اندر جانے کا ارادہ نہیں۔ حکام مطمئن ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ جلوس ملک پورہ کی طرف جائے بھی تو وہ اُس کو روکنے کے لیے پورے طور پر تیار ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

عبداللہ سعید تو بکلی مطمئن ہوکر سکون میں ہوگئے ہوں گے، لیکن اس خبر سے میرا دل خدشہ اور فکر سے فارغ نہ ہوا۔ بہرحال بارہ بجے کے قریب میں نے سب سامان، مریض دیکھنے کے آلات وغیرہ سمیٹے سوائے ایک سٹتھوسکوپ کے (جو مجھے بہت پیاری تھی۔ پاشا (عبدالکریم سعید) نیوزی لینڈ سے لایا تھا وہ اب تک میرے زیر استعمال ہے، میں اپنے بریف کیس میں ڈال کر لے آیا۔ باقی کئی چیزیں نیچے لاسکتا تھا، لیکن وہیں رہنے دیں۔ اس کمرے اور اس گھر کے

اس حصہ میں میرا یہ آخری ورود تھا۔

مسجد میں نمازِ ظہر وعصر

ایک بجے اذان ہوئی تو سب احبابِ جماعت نمازِ ظہر کے لیے مسجد میں جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ابتدائی چار سنت ادا کر رہے تھے، جبکہ پروفیسر خلیل الرحمان صاحب سنت پڑھ کر فارغ ہو چکے تھے۔ اُنہیں اپنے گھر کے قریب سے بات چیت کی آواز سنائی پڑی تو وہ کھڑکی کے پاس چلے گئے، تو دیکھا کہ ایف سی کے گارڈ کمانڈر اور مقرر کردہ سپاہیوں سے دو افسر بات چیت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اُس دن صبح سے باوردی، چاک و چوبند اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے مستعد اور تیار کھڑے تھے۔ پروفیسر صاحب نے سُنا کہ اے ایس آئی صاحب نے دوسرے افسر کا تعارف بطور مجسٹریٹ کروایا اور کہا کہ اُن لوگوں نے مجسٹریٹ صاحب کے ہر حکم کو ماننا ہے۔ مجسٹریٹ صاحب نے گارڈ کمانڈر سے پوچھا کہ کیا اُن کے پاس ڈنڈے ہیں؟ جواب نفی میں تھا۔ اس پر مجسٹریٹ صاحب نے تاکیداً کہا کہ فائرنگ ہرگز کسی صورت میں نہیں کی جائے گی۔

پروفیسر صاحب گھبرائے ہوئے تھے۔ یہ قدرتی امر تھا۔ اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ حالات اچھے نظر نہیں آرہے اور یہ ہدایات بڑی پُرمعنی ہیں۔ آپ خاموش رہے اور کھڑکی کے پاس آئے تو ان افسران کو جاتے ہوئے دیکھا، جو جیل روڈ پر پہنچ کر شہر کی سمت مڑ گئے۔

نماز شروع کرنے سے پہلے، آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”ہم عصر کی نماز بھی جمع کر لیں گے۔ نہ معلوم ہمیں اس کے بعد دوسری نماز نصیب ہو یا نہ ہو“۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

> یہ الفاظ دِل کی کِن گہرائیوں اور کِن جذبات کو لیے ہوئے زبان سے نکلے، میری دائمی یادگار ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم نے دُعا کی اور کہا کہ اللہ پر

بھروسہ کریں۔ اور اپنے اپنے گھروں میں جا کر ٹھہریں اور میں خود بھی گھر آ گیا۔

پروفیسر خلیل الرحمان صاحب اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ہمارا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ تھا۔ ہم نے ظہر اور عصر کی نماز جمع کی اور ایک دوسرے کو اِس طرح الوداع کہہ کر جدا ہوئے جیسے آئندہ ملنے کا موقعہ ملے گا یا نہیں۔ نماز کے بعد ہم اپنے اپنے گھروں میں بند ہو کر رہ گئے اور بیم و رجا کی حالت میں آنے والے طوفان کا انتظار کرنے لگے۔ (خودنوشت سوانح پروفیسر خلیل الرحمان صاحب)۔

احمدی خاندان دارالسعید میں

تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور اہلِ خانہ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ یکے بعد دیگرے، کئی گھروں سے بچے اور خواتین دارالسعید میں آنے لگے اور مرد مسجد میں جمع ہو گئے۔ اس کے لیے پہلے کوئی صلاح مشورہ اور منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی، مگر دارالسعید کو محفوظ پناہ گاہ سمجھتے ہوئے سب مستورات اور بچے یہاں منتقل ہو گئے۔ پروفیسر خلیل الرحمان صاحب کے اہلِ خانہ اپنے گھر میں رہے۔ غیر ملکی طالب علم مسٹر کمال ہائیڈل بھی مہمان خانے کے ایک کمرے میں تھے۔

جمال بلڈنگ (صدر بازار) ایبٹ آباد میں آتش زدگی

دوسوا دو بجے، بعد دوپہر کا وقت تھا جب احسان پسر مولوی محمد علی صاحب (مبلغ ملتان) نے ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون ایکسچینج سے فون پر بتایا کہ جمال بلڈنگ کو آگ لگا دی گئی ہے اور بڑا ہجوم ہے جو سخت مشتعل ہے اور ایک قسم کی جنگ کی سی حالت ہے۔ جمال بلڈنگ میں بارہ دُکانیں، ایک ہوٹل اور کیفے اور بالائی منزل پر ایک سرائے اور کئی فلیٹ تھے۔ دُکانوں میں تین احمدیوں، ماسٹر

اصغر علی صاحب، احمد صادق صاحب اور الٰہی بخش صاحب کے میڈیکل سٹور تھے۔ اِسی بنا پر یہ پوری بلڈنگ نذرِ آتش کر دی گئی۔

لیفٹیننٹ کرنل فیروز عالم خان سے مشورہ اور دارالسعید میں اُن کی آمد

جمال بلڈنگ کی آتشزدگی کا سُنا تو خان بہادر صاحب نے اپنے داماد فیروز عالم سے مشورہ لینے کے لیے اُنہیں فون کیا کہ اگر اس طرف حملہ ہو جائے تو آپ کو کیا تدبیر کرنا ہو گی۔ اس سے زیادہ اُن کے ذہن میں کچھ خیال نہ آ سکتا تھا۔ آپ نے فیروز عالم سے بات شروع کی ہی تھی کہ اُنہوں نے کہا: "میں کھانا کھا رہا ہوں اور ابھی آپ کی طرف آ رہا ہوں۔" اِس پر آپ خاموش ہو گئے۔ چند منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ وہ آ گئے اور کہا کہ وہ شام تک آپ کے ساتھ ٹھہریں گے۔ خان بہادر صاحب نے بہت اصرار کیا کہ وہ گھر واپس جائیں۔ اُن کے اہل وعیال بھی تو تنہا ہیں۔ فیروز عالم نے تسلی دی کہ اُن کے گھر پر اُن کے ایک فوجی دوست بمع اہل وعیال کے مہمان ہیں اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس پر خان بہادر صاحب خاموش ہو گئے۔

جلوس کی آمد اور دارالسعید پر حملہ

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر سے اقتباس

> اُس وقت پونے تین بجے کا وقت ہو گا اور ابھی چند منٹ ہی گذرے تھے کہ نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔ فضاء میں ایک شورِ محشر بر پا ہونے لگا، جو لحہ لحہ بڑھتا گیا۔ پھر چند لمحوں بعد توڑ پھوڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اس وقت ٹیلی فون اٹھایا۔ خیال تھا کہ عبداللہ سے بات کروں گا مگر فون بند تھا۔ (بعد میں احسان ابن مولوی محمد علی صاحب ملتانی نے بتایا کہ اس نے ہمیں ٹیلی فون ایکسچینج سے فون کیا تھا اور معاً بعد اس کے دوست آپریٹر نے اسے بتایا کہ ڈپٹی کمشنر کی

طرف سے ہدایت آئی ہے کہ ہمارا ٹیلی فون کاٹ دے۔ یہ احسان کی روایت ہے)۔ اسی لمحہ خیال گذرا کہ میری بڑی بیوی اوپر گھر میں ہیں، جس جگہ بلوائی حملہ کر چکے تھے۔ فیروز عالم بھاگ کر ان سیڑھیوں سے، جو عقبی صحن میں سے اوپر کو چڑھتی ہیں، گئے اور بڑی سرعت سے والدہ عبدالحئ کو نیچے لائے۔ وہ خطرے کو ابھی پوری طور پر بھانپ نہ سکی تھیں۔ اسی اثناء میں گیانا کی ہماری مہمان دینی طالبہ صفورہ کو، جو مغرب کی طرف واقع سامنے کے کمروں میں کسی کمرے میں سوئی پڑی تھیں، میری چھوٹی بیوی والدہ محمد سعید نے بھاگ کر جگایا اور اسے خطرے سے آگاہ کیا اور اسے اپنے ہمراہ لائیں۔ اور یہ تمام مستورات اور بچے اسی درمیانی منزل کے پچھلے کمروں میں جمع تھے۔

محافظوں نے حملہ آوروں کے لیے خود گیٹ کھول دیا

بلوائیوں نے گھر کے اوپر والی منزل اور کلینک کی دومنزلہ عمارت کو آگ لگا دی تھی۔ فیروز عالم خان، جب والدہ عبدالحئ کو لانے کے لیے اوپر گئے تھے تو انہوں نے دروازے یا کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھا تھا کہ لوگ آہنی دروازے کو ہتھوڑوں، کلہاڑوں اور کدالوں وغیرہ سے توڑ رہے ہیں۔ لیکن اسسٹنٹ سب انسپکٹر انچارج پولیس گارڈ نے جو گیٹ کے اندر گیراج کے سامنے کے کمرے میں متعین تھا، اس نے بھاگ کر خود دروازہ کھول دیا۔ اس طرح لوگوں کا ریلا صحن میں داخل ہو گیا۔

مستورات اور بچوں کا اضطراب اور دُعائیں

فسادیوں اور بلوائیوں کے نعروں اور ان کی توڑ پھوڑ کی آوازیں شروع ہوئیں تو

مستورات اور بچوں میں کچھ اضطراب پیدا ہوا۔ میری چھوٹی بیوی، والدہ محمد سعید اپنی ملازمہ سرور جان کو غصہ میں چلا چلا کر کسی بات سے منع کر رہی تھیں۔ میں نے خاموش رہنے اور سکون کی سب کو تلقین کی۔ پھر آہستہ آہستہ مستورات اور بچوں کے مجمع میں بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہونے اور دُعائیں کرنے کا ایک دور شروع ہوا اور خاموشی طاری ہوگئی، جو کم وبیش آخری وقت تک جاری رہی۔ ان میں سے اِکا دکا خاتون کبھی برآمدے میں اور کبھی صحن میں آتی جاتی رہیں۔

اس مکان کی ہیّت کچھ ایسی ہے۔ اوپر سڑک یا اوپر کے مکان پر جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اس میں سے کچھ بھی نظر نہ آسکتا تھا۔ اور نہ کوئی انسانی شکل وصورت نظر آسکتی تھی۔ اور نہ کسی کی نظر اس نچلے حصے میں جہاں مستورات تھیں یا صحن کے اکثر حصہ پر پڑسکتی تھی۔ ملازمہ سرور جان کافی دلیر اور جرأت مند عورت ہے۔ وہ زیادہ دیر صحن اور برآمدہ میں دوڑتی پھرتی رہتی تھی۔ اور صحن کے سامنے ایک کونہ سے باہر جھانکنے کی بھی بار بار کوشش کرتی تھی، جس پر اسے والدہ محمد سعید ٹوکتی تھیں۔ صفورہ، ہاتھ میں قرآن شریف لیے بار بار برآمدے اور صحن میں آتی اور مجھے 'ابا ابا' کہہ کر پکارتی اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں کرتی۔ اس کے یہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں:

Oh! Allah! save us for the sake of your Maseeh Maud.

اے اللہ۔ اپنے مسیح موعود کے صدقے ہمیں بچالے۔

اس بچی کی اضطراری دعاؤں اور کئی مضطر عورتوں اور بچوں کی سسکیوں بھری دعاؤں کو اللہ تعالیٰ سن رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بعض بچے اور لڑکیاں







ٹرنیڈاڈ اور گیانا کے مہمان ایبٹ آباد میں

عبدالحئی سعید قائداعظم کے ساتھ





ٹرنیڈاڈ اور گیانا کی خواتین ایبٹ آباد میں



سویڈن میں کشتی کے سفر کے دوران نماز ادا کر رہے ہیں

جامعہ دارالسعید کا مغربی منظر ایک مصور کی نگاہ سے





جامعہ دارالسعید

PRECIOUS STONES

I don't collect precious stones,
But these ones I must keep.
My heart is filled with sorrow,
But I'll try not to weep.



I pick some stones and save them,
I hold my tears within a heavy heart.
Of a "KALIMA" that once graced a MOSQUE,
These precious stones are a part.

PASHA
APRIL 1984...

ڈاکٹر عبدالکریم سعید کی نظم



احمدیہ ہال کا سنگِ بنیاد



جلسہ سالانہ پر بیرونِ ملک سے آئے مہمانوں کے ساتھ

حضرت مولانا صدرالدینؒ کی ڈاڈر میں آمد





جلسہ سالانہ پر بیرونِ ملک سے آئے مہمانوں کے ساتھ

جلسہ سالانہ احمدیہ بلڈنگز



ایبٹ آباد سمر سکول



جامعہ دارالسعید میں ایک تقریب



جلسہ سالانہ ۱۹۷۳ء کے منتظمین کے ساتھ



انڈونیشیا کے طلباء کے ساتھ

اندر کمرے میں سجدوں میں گر گئے اور اسی حالت میں نامعلوم کتنی دیر پڑے رہے۔ کچھ عورتیں قرآن کریم پڑھنے میں لگ گئیں۔ یہ نقشہ میرا چشم دید نہیں، کیونکہ میں برآمدہ تک تو کئی بار گیا تھا، لیکن کمرے کے اندر نہیں جھانکا۔ اور اس کی کچھ ضرورت بھی نہ تھی۔

گھر میں معمولی اسلحہ کی موجودگی

جونہی احساس ہوا کہ گھر پر حملہ ہو چکا ہے تو فیروز عالم نے مجھ سے پہلی بار پوچھا کہ کیا گھر میں کچھ اسلحہ موجود ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ اور اسلحہ لا کر اس کے آگے ڈال دینے میں شاید مجھے پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگے ہوں گے۔ اسلحہ کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اور اس امر کی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے اور کسی کے ساتھ خاص معاملہ احسان کا وہ پہلے سے مقدر فرما لیتا ہے، تو اس کے اسباب بھی وہ خود جمع فرما دیتا ہے۔

اسلحہ کی کہانی مختصراً یوں ہے کہ اپنی ملازمت کے ابتدائی دور میں، یعنی ۱۹۲۶ء میں میں نے ایک دونالی چھرہ دار بندوق خریدی تھی۔ بہت کم شکار کا موقع ملا۔ اور ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں اپنی بیماری کے دوران درخت پر بیٹھی فاختاؤں کے جوڑے پر فائر کیا (ان دنوں کوہ بھینگڑا کی چوٹی کے قریب بغرض علاج جنگل میں رہتا تھا) تو ایک فاختہ بلند و بالا درخت سے نیچے کھڈ کی سمت ہوا میں گرتی پڑتی دیکھی، جبکہ دوسری فاختہ ہوا میں کسی طرف اُڑ گئی۔ اور میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ عصر کا پچھلا وقت تھا۔ اس منظر کا دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ دل سے عہد کیا کہ آئندہ کسی شکار پر ہرگز فائر نہ کروں گا اور اس عہد پر میں عمر بھر قائم رہا۔ ایک پستول ۱۹۲۹ء

میں پشاور میں خریدا تھا۔ بعد میں وہ تبدیل کرا کے ایک چھوٹا پستول حاصل کرلیا جو ۳۸ بور کا تھا۔ پہلا بہت وزنی ۴۵ بور کا تھا۔ ایک ۳۰۳ رائفل ان دنوں خریدی تھی جب پاکستان بنا تھا۔ ان دنوں اسلحہ کا شوق عام تھا۔ مجھے ایک دوست نے کہا کہ ایک رائفل سستے داموں مل رہی ہے۔ چنانچہ میں نے خرید لی۔ اسلحہ کے استعمال کا طریقہ قاعدہ سیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ یہ چیزیں گھر میں منتشر حالت میں پڑی تھیں اور مجھے یہ بھی یاد نہ تھا کہ کونسی چیز کہاں پڑی ہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۶۸ء میں، محمد یحییٰ خاں کے زمانے میں جب مارشل لاء لگا، تو اسلحہ جمع کرنے کا حکم ہوا۔ اس موقعہ پر بڑی کاوش کے بعد یہ ہرسہ حزب اسلحہ اور کارتوس وغیرہ یکجا کیے۔ دو تین ڈبے چھرے دار کارتوس تھے اور رائفل کی دو درجن سے زائد گولیاں نہ ہوں گی۔ یہ سب گتے کے ایک ڈبہ میں بند اس موقعہ پر تھیں۔ ڈبہ اور اسلحہ اپنے نام کے لیبل لگا کر تھانے میں جمع کرا دیا تھا۔ دو دن کے بعد جب یہ چیزیں واپس ہوئیں تو اپنے سونے کے کمرے کی الماری میں رکھ دی تھیں۔ یہ کمرہ قریب ہی تھا۔ صرف ایک دروازہ درمیان میں تھا۔ میں منٹوں میں نکال لایا، کیونکہ مجھے یاد تھا کہ کہاں پر ہیں۔ آج اس اسلحہ کی ضرورت کا اور استعمال کا دن اللہ تعالیٰ علام الغیوب کے ہاں مقدر تھا۔ چنانچہ اس کو اٹھانے اور لانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔

یہ تھی ہمارے اسلحہ کی کل کائنات۔ اور ان کا استعمال جاننے والا جو مرد اللہ نے ہمارے لیے منتخب کر رکھا تھا وہ تھا میرا شریف النفس اور مسلمہ طور پر بلند کردار اور باضمیر داماد لیفٹننٹ کرنل فیروز عالم خان۔

فیروز عالم خان کا تعارف

تحریر: ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب

فیروز عالم خان اللہ آباد (ہند) کے ایک پٹھان شریف خاندان کا فرد ہے اور جس کے دوسرے چھ بھائی سب کے سب پاکستانی بری، بحری اور فضائی افواج میں ہیں اور ۱۹۶۵ء میں اس کی طرح ملکی اور قومی خدمات بجا لا چکے ہیں۔ اور اپنی بہادری و شجاعت کی داد تمغہ جات اور اعزازات کی صورت میں حاصل کر چکے ہیں۔ اور خود فیروز عالم ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی شامل ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں فیروز عالم اس بٹالین کے کمانڈر تھے جس نے کشمیر میں چھمب کے مقام پر پیش قدمی کی تھی۔ یہ علاقہ اب بھی پاکستان کا حصہ ہے اور اسے افتخارآباد کا نام دے دیا گیا ہے۔

فیروز عالم کو اللہ تعالیٰ نے اُس بڑے اعزاز کے لیے اپنے ہاں چن رکھا تھا جو اسے ۱۹۷۴ء کی ۱۱ جون میں، ان بے بس اور کمزور انسانوں کی حفاظت میں خود زخمی ہونے پر، آسمان پر اُسے ملنا تھا۔ وہ لوگ جنہیں تباہ کرنے کے لیے ایک دنیا صرف اس لیے امڈ پڑی تھی کہ انہوں نے ارشاد الٰہی

کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) پر عمل کرتے ہوئے اﷲتعالیٰ کے صادق مامور کے دامن کے ساتھ وابستہ ہونے کا جرم کیا تھا۔ اور اس کے علاوہ ان کا اور کوئی گناہ نہ تھا۔

نوٹ: فیروزعالم کے دو بھائی اپنے عسکری فرائض انجام دیتے ہوئے ۱۹۷۱ء سے قبل جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ اس طرح بشمول فیروز عالم کے یہ نو بھائی تھے جو تمام بری، بحری اور فضائی فوج سے منسلک رہے۔

کرنل فیروز عالم کی فوجی حکمت عملی اور دارالسعید کا دفاع

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر سے:

اوپر والے مکان اور کلینک کی عمارات کی توڑ پھوڑ اور دُھواں اور آگ کے ماحول میں فسادیوں کے نعروں کی آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ نچلے حصے کو جس میں ہم محصور تھے، آگ لگانے کی غرض سے اوپر سے آتش گیر مادوں سے تر، جلتی اشیاء نیچے صحن میں پھینکی جا رہی تھیں اور فسادی نچلے حصہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فیروز عالم خان گھر کے اس حصہ کے جنوبی برآمدہ میں اسلحہ لیے اکیلا مدافعت کر رہا تھا اور میرا سب سے چھوٹا لڑکا زاہد احمد سعید اس کی امداد کر رہا تھا۔ اس کی ہدایت پر کبھی اُس سمت میں بندوق سے فائر کر دیتا۔ اس طرف ایک اونچی دیوار تھی۔ اس کے عقب سے ان پر پتھر پھینکے جا رہے

تھے۔ اور ایک حصے میں لمبے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی باڑھ کے بیچ سے، جن کے ساتھ خاردار تار بھی تھی، فسادی گھسنے کی کوشش کر رہے تھے، گالیاں دے رہے اور نعرے لگا رہے تھے، اس باڑھ پر فیروز عالم نے فوجی حکمت عملی سے کام لے کر کچھ بوریاں ڈال دی تھیں، جن پر کیروسین تیل ڈال کر معمولی سی آگ لگا دی تھی، تا کہ دھواں نکلتا رہے اور معمولی معمولی آگ سلگتی رہے، تا کہ بلوائی سمجھیں کہ اس طرف بھی آگ لگی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں دھوئیں کی وجہ سے وہ اندر کی طرف کچھ نہ دیکھ سکیں۔ ان کی ان تدابیر سے اللہ تعالیٰ نے ہماری حفاظت کے سامان کر دیئے۔ ورنہ اس حصہ میں اگر شرپسند ذرا سی بھی جھانکی لگاتے تو ہم انہیں صاف نظر آ جاتے۔ مگر تصرفِ الٰہی سے ہم اللہ کی پناہ میں رہے۔

کرنل فیروز عالم خان زخمی ہو گئے

مفسدوں نے اب آتشیں اسلحہ کا استعمال شروع کر دیا۔ دیوار مکان میں کئی گولیاں لگیں۔ کئی گولیاں شیشہ توڑ کر اس کمرے میں بھی آئیں جہاں میں موجود تھا۔ اسی اثناء میں ایک گولی فیروز عالم کو ٹانگ میں گھٹنے کے ذرہ نیچے لگی اور سرعت و شدت سے خون بہنے لگا۔ پہلے تو باہر والے کمرے میں جہاں عبدالرحمٰن نیازی صاحب بطور مہمان ٹھہرے ہوئے تھے، انہیں لیٹا دیا گیا۔ پھر میں انہیں اندر کے کمرے میں لے آیا اور پٹی کی۔ مگر خون بند نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ ہمت دکھاتے رہے، پھر کمزوری لاحق ہوگئی۔ اس طرح وہ تو معذور ہو گئے، لیکن اس وقت جانب غرب سے ہجوم ہٹ چکا تھا۔

دارالسعید پر عقبی دروازہ سے حملہ

تھوڑی دیر بعد خادمہ سرور جان چیختی چلاتی آئی اور کہا کہ عقبی دروازہ (جو مسجد جانے کے لیے گھر کے صحن میں تھا) فسادیوں نے توڑ دیا ہے۔ اوراب گھر میں داخل ہونے ہی والے ہیں۔ اس دروازے کے بعد ایک بارہ چودہ فٹ کی گیلری اورتھوڑی کھلی جگہ ہے اور یہاں پر ایک نہایت کمزور بوسیدہ دروازہ ہے۔ اب ہمارے درمیان اور ہزاروں کے خونخوار ہجوم کے درمیان صرف اور صرف یہ کمزور بوسیدہ دروازہ حائل تھا۔ فیروز عالم نے زاہد سے کہا کہ فوراً چھرہ دار بندوق سے اسی سمت میں صحن سے جا کر دو فائر کر دو۔ زاہد نے بڑی سرعت سے دو فائر کیے۔ فائر کرنا تھے کہ وہ امنڈتا ریلا یک دم تھم گیا۔ بلوائیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ سراسیمہ ہو کر پیچھے بھاگے۔ چھروں کے نشانات اس گیلری کی دیواروں پر اب بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ کمزور، بوسیدہ دروازہ جوں کا توں قائم رہا۔ اس گیلری کے دونوں اطراف میں ایک ایک دروازہ تھا۔ ایک طرف گیراج کا اندرونی دروازہ اور دوسری طرف ایک کمرے کا۔ گیراج میں داخل ہونے والا دروازہ بھی فسادیوں نے توڑ ڈالا۔ مگر مزید نقصان نہ کر پائے۔ ان کی یہ کوشش آخری ثابت ہوئی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ گھر میں میرے بیٹے عبداللہ سعید نے ضرور فوج کا کوئی دستہ بٹھا رکھا ہے جو دفاع کر رہا ہے۔ چنانچہ ان پر غیبی رعب طاری ہو گیا اور وہ بھاگ نکلے۔

ایک طرف سے فیروز عالم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت کا مظاہرہ کیا کہ فسادی ادھر سے دل چھوڑ بیٹھے، تو کسی کی مخبری و نشاندہی سے انہوں

نے عقبی دروازے کا رخ کیا۔ اور اس طرف سے جو ایک دو فائر ہوئے اور کچھ لوگوں کو اکا دکا چھرہ بندوق کا لگا بھی، تو اس طرح ان کو یقین ہو گیا کہ دفاع مضبوط ہے اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔

فرنٹیئر کانسٹیبلری کے ایک جوان کی جرأت کا مظاہرہ

اسی دوران فرنٹیئر کانسٹیبلری کے ایک شخص نے، جو محض نمائشی طور پر پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب والے مکان کی چھت پر ایک سب مشین گن لگا کر بیٹھا ہوا تھا، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے کچھ القا فرمایا کہ اس نے بغیر حکم اور اجازت کے مشین گن سے ازخود دو برسٹ چلا دیئے، جن کی آواز ہمارے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ اس سے بھی بلوائیوں کے حوصلے پست ہونے لگے تھے۔

پروفیسر صاحب کے مکان کے ساتھ اور مسجد سے متصل بھاری ہجوم تھا۔ ان کے مکان کو آگ لگانے کی ناکام سی کوشش بھی کی گئی۔ تاہم کوئی نقصان نہ ہوا اور آگ بھی بڑھنے نہ پائی۔ مسجد کی طرف توجہ کرنے کی، ابھی ان کو فرصت نہ ہوئی تھی کہ وہ پہلے ہی کچھ پست ہمت ہو گئے اور حوصلے چھوڑ بیٹھے۔

کانسٹیبلری کے جس سپاہی نے دو برسٹ اپنی مرضی سے چلائے تھے، اُس کی وجہ پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب نے اِس طرح بیان کی ہے:

ایف سی کے کمانڈر نے اپنا ایک آدمی برین گن یا سٹین گن کے ساتھ ہمارے مکان کی دوسری منزل کے اوپر پانی کی ٹینکی کی اوٹ میں بٹھا دیا تھا۔ مکان کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کو پیاس لگی اور وہ نیچے اُتر کر پانی مانگنے کے لیے آیا اور اُس نے دیکھا کہ میری بیگم ایک بچے (عاصم) کو اُٹھائے مکان کے شمالی صحن

میں مضطربانہ اِدھر اُدھر گھوم رہی ہیں، اور رو رو کر اللہ سے دُعا کر رہی ہیں کہ اے خدا تو ہمیں اِن ظالموں سے بچا نہیں سکتا۔ ہمارا کیا قصور ہے کہ یہ ہم پر اتنا ظلم ڈھا رہے ہیں؟

اس آدمی پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اُس نے میری بیگم سے کہا: "بی بی آپ اندر چلی جائیں یہ ہماری لاشوں پر سے گذر کر آپ تک پہنچیں گے" اور بغیر پانی پیئے واپس چلا گیا۔ اُس نے جاتے ہی ہوائی فائر کھول دیا جس سے بلوائی ذرا رُک گئے۔ لیکن صحن کے اندر ایک حصہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اُنہوں نے ہمارے مہمانوں والے کمرے کے پردوں کو آگ لگا دی لیکن ایف سی کے سپاہیوں نے فوراً بجھا دی۔ ہمارے برآمدے میں چارپائیاں اوپر نیچے رکھ کر آگ لگانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ مکان کے اُوپر بیٹھے ہوئے سپاہی نے فائر کھول دیا اور یہ ڈر کر باہر کی طرف بھاگے۔

ہجوم کا مسجد کو نذرِ آتش کرنے کا قصد اور پسپائی

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر سے:

معاً اُسی وقت جب زاہد کی چھرہ دار بندوق کے دو فائروں سے بلوائی دارالسعید میں داخل ہونے کا خیال چھوڑ کر پیچھے ہٹے، تو دوسری طرف سے ایف سی کی طرف سے دو ہوائی فائر ہوئے جن کی آواز دارالسعید میں محصور لوگوں نے بھی سُنی۔ اور اُس کے بعد اُنہوں نے وہ سڑک بھی خالی کر دی جو دارالسعید اور پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کی رہائش گاہ کے درمیان ہے۔

ہجوم نے مسجد کے اندر گھسنے، نذرِ آتش کرنے اور توڑ پھوڑ کا قصد کیا تو ایف سی

کے ایک تنومند فوجی نے للکار کر مسجد کی دیوار پر نقش خوبصورت کلمہ کی طرف توجہ دلائی۔ اللہ تعالیٰ نے اِس فوجی کی اِس للکار کو ایسا مؤثر بنایا کہ ہجوم اِس ارادہ سے باز آ گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ اُس کے چند لمحوں بعد مشین گن سے دو ہوائی برسٹ بھی کھولے گئے، جس سے ہجوم میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ پیچھے کی طرف بھاگے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسجد کو خرابی سے بچالیا۔ الحمدللہ۔ ثم الحمدللہ۔

پروفیسر خلیل الرحمن صاحب کی تحریر سے اقتباس

یہ مسجد کو بھی نقصان پہنچانا چاہتے تھے، لیکن ایف سی کے کمانڈر نے اُن کے سامنے آ کر کہا: ’دیکھو اِس کے اوپر کلمہ لکھا ہوا ہے۔ اندر قرآن شریف ہیں۔ کیا تم کلمہ اور قرآن شریف کو جلانا، ختم کرنا چاہتے ہو۔ اس سے باز آ جاؤ ورنہ ہم اپنا فرض پورا کریں گے‘۔ اُس کی اس مضبوطی کو دیکھ کر یہ لوگ وہاں سے پیچھے ہٹ گئے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں:

میں سمجھتا ہوں کہ مسجد کے متعلق میری تڑپ کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لیا تھا۔ ہمیں صحن سے مسجد کی چھت اور اس کا بالائی حصہ نظر آتا ہے۔ میں بار بار کمرے سے نکل کر دیکھتا تھا کہ اسے آگ لگی ہے یا نہ۔ اور اسے ہر بار باوقار اور امن کے ساتھ قائم دیکھ کر دل کو ٹھنڈک ہوتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب محسوس فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اُن دعاؤں کو ضرور شرفِ قبولیت بخشے گا جو وہ اُس وقت سے، جب سے یہ خطرے ارگرد منڈلا رہے تھے، بالالتزام کر رہے تھے اور اُن میں سے سرِفہرست ان کی اہل وعیال کی ناموس اور مسجد کی سلامتی کی دُعائیں تھیں۔

آپ کی تحریر سے اقتباس

میری دُعائیں

میں ایک عرصہ سے بطورِ معمول ایک دعا کرتا رہا ہوں۔ الفاظ کچھ یوں ہیں کہ جو خطرناک حالات سامنے آ رہے ہیں، اگر ان کا ہم پر وارد ہونا تیرے مقدرات میں سے ہو چکا ہے، تو اللہ ایسے موقعہ پر ہمارے ایمان کو سلامت رکھنا اور میرے تصور میں ایمان کے امتحان کا ایک نقشہ بھر جاتا۔ کہ دُشمنوں سے گھرا ہوا ہوں، جو مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ تو جو کچھ سوال و جواب اور ایک خاص عزم میرے دل میں ابھرتا، اس کے مطابق ایک حدیث کے یہ الفاظ وَلَاَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ لِیْ اَھلُ الْوَبَرِ وَالْمَدَرِ (گاؤں یا شہر میں رہنے سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارا جانا مجھے زیادہ پسند ہے) (سنن نسائی، باب تمنی القتل فی سبیل اللہ، حدیث نمبر ۳۱۶۶) اکثر میرے دل میں آتے رہے۔ سلامتی ایمان کی دعا کے بعد اپنے اہل و عیال کی عزت و ناموس کی حفاظت کا سوال کرتا۔ تیسرے نمبر پر دارالسعید کی مسجد کی حفاظت و حرمت کے لیے دعا کرتا کہ ہمارے مخالفین ہماری مسجد کے سخت دشمن ہیں۔ اور یہ مسجد مجھے دنیا کی عمارتوں میں کچھ زیادہ ہی پیاری ہے۔ چوتھے نمبر پر میں کہتا کہ میری دنیوی جائیداد اور اموال بھی تیرے عطا کردہ ہیں۔ یہ بھی بچالے تو تیری نوازش ہے ورنہ یہ مال سب تیرا ہے۔

بس اسی ترتیب سے کچھ اسی مفہوم کی دعائیں بالالتزام کم از کم دو تین سال سے کرتا رہا۔ دعا میں اہل و عیال اور اولاد کے علاوہ جماعت کو بھی شامل کرتا تھا۔

میں اللہ تعالیٰ کا کیسے شکر ادا کروں کہ اس نے میری اس عاجزانہ دعا کو، میں سمجھتا ہوں کہ قریباً قریباً قبول ہی فرما لیا، سو اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی قبولیت کا نشان اس یوم الفرقان میں بڑی شان سے دکھایا۔ جو نقصان املاک کا ہوا، باقی عظیم حصہ دعا کی قبولیت کا جب دیکھا تو اس کا رنج اللہ تعالیٰ نے مٹا دیا۔ یہ بھی محض اس کے فضل سے ہوا۔ فالحمد للہ۔

پروفیسر خلیل الرحمان صاحب کی تحریر سے اقتباس:

فسادیوں کی پسپائی کے بعد جب ہم اُن کے (ڈاکٹر صاحب) پاس اندر گئے تو آپ نے صرف یہ پوچھا کہ کیا مسجد بچ گئی ہے اور ہمارے کہنے پر کہ 'جی ہاں' آپ نے الحمد للہ کہا۔ اپنے لاکھوں کے نقصان کا آپ کو کوئی غم نہ تھا۔ اگر خوشی تھی تو مسجد کے صحیح سلامت بچ جانے کی۔

پروفیسر اعجاز احمد صاحب کے تاثرات

۱۹۷۴ء میں پروفیسر اعجاز احمد صاحب ابھی طفلِ مکتب تھے۔ مگر اس سانحہ دارالسعید کے واقعات ان کے چشم دید ہیں۔ وہ اپنے مضمون 'الحمد للہ'، پیغام صلح نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء میں تحریر فرماتے ہیں:

ہزارہا بلوائیوں کا اصل نشانہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب تھے۔ ہزاروں شریر، جو بندوقوں، سٹین گنوں اور دیگر اسلحہ سے لیس تھے، نے آپ کا کلینک وغیرہ جلانے کے بعد آپ کے گھر کا بالائی حصہ بھی جلا دیا۔ اس دوران خدا کی شان کہ صرف آپ کے داماد فیروز عالم صاحب گولی لگنے سے زخمی ہوئے، جبکہ انوار احمد صاحب اور آپ کی ملازمہ سرور جان ماسی کو بھی چھرے لگے۔ باقی

اللہ کی حفاظت رہی۔ آگ اور سینکڑوں فسادیوں کے گھیرے کے باوجود کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اِس سارے اثناء میں ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی توجہ مسجد کی طرف رہی۔ اور بار بار اونچی آواز میں دُعا کرتے: "یا اللہ اپنے گھر کو (مسجد) کو محفوظ رکھنا"۔ اور اللہ نے اپنی بے پایاں قدرت سے نہ صرف اپنے گھر بلکہ اِس میں عبادت کرنے والے سب کو محفوظ رکھا۔

فتنہ پردازوں کی پسپائی اور افسرانِ اعلیٰ کی آمد

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فتنے کا یہ عمل جو تقریباً پونے تین بجے شروع ہوا تھا، چھ بجے کے بعد دھیما پڑ گیا۔ جس حصہ مکان میں ہم محصور تھے، اس کے نیچے تین کوارٹر ہیں۔ اور اس کے آگے ایک گہری کھڈ ہے۔ اس طرف بھی مفسدوں کی توجہ ہوئی۔ لیکن نیچے جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ کھڈ سے گذرنا ناممکن تھا۔ اس طرح انہوں نے اس طرف کا رخ بھی نہ کیا۔ کھڈ سے اس پار محلہ دارالخیر ہے۔ اس کے سامنے سڑک اور خالی جگہوں پر مفسدوں اور تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ ہمیں وہ لوگ اس طرف کے کمرے کے شیشوں سے، جو میرے سونے کا کمرہ تھا، نظر آتے تھے۔ وہ شور کر رہے اور نعرے لگا رہے تھے اور دوسری عمارات کی تماش بینی کرتے تھے۔ جب چھتیں جل جل کر گرتیں، ان کی آوازیں سنتے اور شعلے دیکھتے، تو وہ لوگ تالیاں بجاتے اور خوشی سے نعرے لگاتے تھے۔

اس وقت تک فیروز عالم کا خون بند نہیں ہو رہا تھا، کچھ کمی ضرور ہوئی تھی لیکن میں پٹی پر پٹی باندھتا تو تھوڑی دیر بعد اس پر پھر خون کا دھبہ نمودار ہونے لگتا۔

اب قریباً ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا کہ ڈپٹی کمشنر ہزارہ اور ایس ایس پی میرے گھر میں مسجد کی طرف کے دروازہ سے داخل ہوئے اور کمرے میں ہمارے پاس آئے۔ کچھ اظہار افسوس کرنے لگے۔ میں نے کہا، کہ جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ صرف ایک درخواست ہے کہ فیروز عالم کو ہسپتال لے جانے کا فوراً انتظام کریں۔ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ انہوں نے کہا "اچھا"۔ پھر باہر صحن میں نکل کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ دیر لگ گئی۔ میں باہر نکلا اپنی درخواست دہرائی۔ انہوں نے جواباً کہا کہ ابھی پانچ منٹ میں لے جاتے ہیں اور گھر سے نکل گئے۔ ایس ایس پی تو کوئی دو گھنٹے بعد شام کو آیا لیکن ڈی سی ہفتہ عشرہ بعد، پہلی بار مجھے کاکول میں ملا۔

ایک دیرینہ دوست کی گھر میں آمد

جب یہ لوگ اندر آئے تھے اسی دوران میرا بہت ہی دیرینہ دوست اور میرا سابقہ مریض عطائی خان آف بٹ گرام (جو معروف رئیس، خان آف الائی محمد ایوب کا برادر نسبتی بھی ہے)، اپنے ایک چھ سالہ بچے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ آتے ہی فیروز عالم کے ساتھ بڑی شدت سے اظہار ہمدردی کرنے لگا، اور پشتو میں گفتگو شروع کی۔ مجھے خیال گذرا کہ یہ فیروز عالم کو جانتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بچے کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ بچہ پیچھے سے کچھ گھبرایا اور رونے لگا۔ میرے دلاسہ دلانے اور شربت جو موجود تیار تھی، وہ پلانے سے چپ ہو گیا۔ عطائی خان واپس آیا اور کہا کہ کچھ خدمت بتائیں۔ میں نے عبداللہ کا فون نمبر دیا کہ اس نمبر پر ٹیلی فون کر کے واقعات سے اسے مطلع کر دیں (بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے ٹیلی فون کیا تھا)۔ اگرچہ عبداللہ کو

چار بجے اپنے ایک افسر کے ذریعہ اطلاع مل چکی تھی۔ عطائی خان سے میں نے پوچھا کہ کیا خان الائی بھی آیا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں ایبٹ آباد میں میں نے اسے دیکھا تو تھا۔

پلٹے جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

(حفیظ جالندھری)

مجھے کسی ذریعہ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی فسادیوں کا قائد ہے۔ یہ خان (ایوب خان) بھی ایک زمانہ سے اپنا اور اپنے خاندان کا علاج معالجہ مجھ سے کرایا کرتا تھا اور ہفتہ عشرہ پہلے بھی نسخہ لکھوا کر لے گیا تھا۔ میں نے اس سے فیس وغیرہ شاذ ہی لی ہوگی۔ البتہ عطائی خان کھلے دل والا، بہت ہشیار اور شیریں گفتار انسان ہے۔

عطائی خان کا یوں گھر میں آنا، بالخصوص چھوٹے سے بچے کے ساتھ، آپ کے لیے ایک معمہ سا تھا، جو بعد میں یوں حل ہوا۔ کسی شخص نے آپ سے ذکر کیا کہ بپھرا ہوا شوریدہ سر ہجوم، آخری وقت میں جب پست حوصلہ ہوگیا، (اور اُس پس ہمتی کی وجہ مکان کے اندر کی دو اطراف سے فائرنگ تھی، جس سے اُنہیں خیال ہوا کہ گھر کے اندر آپ کے فرزند نے فوجی دستے تعینات کر رکھے ہیں) تو یہ ہجوم انتظامیہ سے اصرار کر رہا تھا کہ چند افراد جو گھر کے اندر داخل ہوئے تھے وہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اُن کی لاشیں فراہم کی جائیں۔ مگر انتظامیہ کی تسلی پر اُنہیں یقین اور اعتبار نہ تھا۔ اس لیے عطائی خان اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر آئے کہ اگر ایسا ہوا کہ جیسا کہ اُن کا خیال ہے، تو وہ جو سلوک اُن کے اور اُن کے بیٹے کے ساتھ کریں گے اُنہیں منظور ہوگا۔

چنانچہ عطائی خان نے گھر کا جائزہ لیا اور باہر جا کر بتایا کہ وہاں ہم لوگوں میں سے نہ کوئی

گرفتار ہے اور نہ کسی کو مار کر قتل کر کے کہیں گرایا چھپایا گیا ہے۔ جبکہ صورت حال جدا ہے۔ گھر والوں کا خود ایک آدمی ہماری فائرنگ سے موت و حیات کی کشمکش میں ہے۔ اِس طرح کے عطائی خان کے بیان سے ہجوم کو کچھ سُکون ہوا، اور اُن کا غیض و غضب فرُو ہوا۔ آخر کار یہ ہجوم چھٹ گیا۔ اور شام ہوتے ہوتے لوگ یہاں سے چلے گئے۔

فیروز عالم کی ہسپتال منتقلی

ڈی سی اور ایس ایس پی کے چلے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ایف ایف سنٹر کے دو افسر آ گئے جو فیروز عالم کے ذاتی دوست تھے۔ ساتھ ہی ڈی آئی جی پولیس گوہر زمان خان اور اُن کے بھائی میجر حیدر زمان خان بھی تشریف لے آئے۔ گوہر زمان خان نے زاہد کو شاباش دی کہ اُس نے بڑی بہادری کی ہے۔ اور زاہد کے کہنے پر کہ ہمارے تو کارتوس بھی ختم ہو گئے تھے، جھٹ جیب سے ایک ڈبہ جس میں سو کارتوس تھے اور اپنا پستول میز پر رکھا اور کہا: "یہ لو گن اور کارتوس"۔

خان بہادر صاحب نے فیروز عالم کو ہسپتال لے جانے کی درخواست کی کہ اُن کی جان خطرے میں ہے۔ اِس سے پہلے کہ ڈی آئی جی صاحب کچھ کہتے میجر حیدر زمان نے کہا: "چلو لالہ جیپ لاتے ہیں"۔ اور بھائی کو کچھ متردد دیکھ کر کہا: "پرواہ مت کرو میں جیپ چلاؤں گا"۔ اسی اثناء میں فیروز عالم کو چارپائی پر اٹھا کر عقبی دروازے تک لایا گیا اور جیپ میں بٹھا دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میجر حیدر زمان نے واپس آ کر تسلی دی کہ ڈاکٹر اُن کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

لیفٹننٹ کرنل فیروز عالم خان کا بیان

کرنل فیروز عالم نے ۱۱ جون کے سانحہ سے متعلق ایک انگریزی تحریر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو دی تھی۔ اِس سے ایک اقتباس کا اردو ترجمہ پیش ہے:

ممکنہ فرقہ وارانہ فسادات کے مدنظر، سرکاری انتظامیہ نے دارالسعید کے تحفظ

کے لیے پولیس اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کے فوجی مقرر کر رکھے تھے۔ ۱۱ جون ۱۹۷۴ء کو میرے خسر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں وہاں آ کر حفاظتی انتظامات کا جائزہ لوں۔ چنانچہ میں صبح نو بجے کے قریب اُن کی رہائش گاہ پر گیا اور پولیس اور ایف سی کے انتظامات دیکھے اور اُن سے بات چیت کی۔ وہاں پر مقرر مجسٹریٹ اور سب انسپکٹر پولیس نے مجھے ہر طرح سے یقین دہانی کروائی کہ اُس دن کے متوقع واقعات عام نوعیت کے ہوں گے اور کسی قسم کے جانی یا املاک کے اتلاف کا کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔

سہ پہر تقریباً سوا دو بجے کے قریب میں اپنے گھر سے پیدل دارالسعید چلا گیا جہاں مجسٹریٹ اور سب انسپکٹر پولیس نے بار بار مجھے یقین دلایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور نہایت تسلی آمیز باتیں کیں۔ میں نیچے رہائش گاہ میں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اور اہل خانہ کے پاس چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہی فاصلے پر دُھواں اُٹھتا نظر آنے لگا اور معلوم ہوا کہ جمال بلڈنگ کو آگ لگا دی گئی ہے۔ یہ دیکھ کر میں تیزی سے اوپر گیا۔ محافظین نے اِس بار بھی یہی تسلی دی کہ یہاں کچھ ایسا ہونے والا نہیں۔ میں جلوس کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا جو چند لمحوں ہی میں وہاں آن پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ چند لوگ پولیس والوں سے کچھ بات چیت کر رہے ہیں۔ دریں اثناء ہجوم نے پتھراؤ شروع کر دیا اور لگاتار پتھروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ میرے دیکھتے دیکھتے پولیس نے دارالسعید کا بڑا داخلی دروازہ کھول دیا۔ یہ منظر دیکھ کر میں حیران و ششدر رہ گیا اور قدرتی طور پر بے انتہا متردد ہو گیا۔ انسانوں کا ایک ریلہ اندر داخل ہو گیا۔ گیراج سے گاڑی نکال کر اُسے آگ لگا دی اور بالائی منزل اور کلینک میں داخل ہو کر لوٹ کھسوٹ شروع کر دی اور کمروں میں آگ لگا دی۔ میں نیچے چلا آیا اور گھر میں

موجود اسلحہ جو ایک ۳۰۳ رائفل اور ایک بارہ بور ڈبل بیرل شاٹ گن پر مشتمل تھا، نکلوا کر پاس رکھا اور خود اِس منزل کے داخلی راستے پر کھڑا ہو گیا تا کہ ہجوم کو اِس طرف سے آنے سے روک سکوں۔ اِس اثناء میں مجسٹریٹ صاحب بمع پولیس کے غائب ہو چکے تھے۔ فرنٹیئر کانسٹیبلری کی طرف سے ایل۔ ایم۔ جی کے دو برسٹ چلائے گئے۔ اور پھر اُن کا بھی کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گئے۔

اب تک، تمام مکان ہجوم کے گھیرے میں آ چکا تھا۔ تہذیب سے گرے ہوئے نعروں، غلیظ گالیوں اور دھمکیوں سے فضا گونج رہی تھی۔ اور کہا جا رہا تھا کہ آج تمہارا آخری دن ہے۔ ہجوم کو مسجد اور کلینک دونوں اطراف سے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے، میں نے فائرنگ شروع کر دی۔ یہ لوگ مٹی کے تیل اور پٹرول سے تر بوریاں اور دیگر مواد نیچے پھینک کر نچلی منزل میں آگ لگانا چاہتے تھے۔ ہجوم کی طرف سے لگا تار گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے چھوٹے بیٹے زاہد سعید کی مدد سے ہجوم کو روکے رکھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے گھٹنے سے نیچے رائفل کی گولی لگ گئی ہے۔ زخمی حالت میں مجھے قریب ترین کمرے میں پہنچا کر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب میری دیکھ بھال اور مرہم پٹی کرنے لگے۔

بریگیڈیئر عبداللہ سعید کی انگریزی تحریر کے ایک اقتباس کا ترجمہ

۱۱ جون ۱۹۷۴ء کو جب بلوائیوں نے اپنے طے شدہ منصوبوں پر عمل درآمد کیا، تو سول انتظامیہ اور پولیس کی طرف سے کوئی مدافعتی کوشش دیکھنے میں نہیں آئی۔ اگرچہ پولیس گارڈ بہت سے حساس مقامات پر تعینات تھی مگر جب انسانی

جانوں یا املاک کے تحفظ کا وقت آیا تو پولیس اہل کار خاموش تماشائی بنے کھڑے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی رہائش گاہ واقع ملک پورہ نزد ڈسٹرکٹ جیل پر تعینات گارڈ کو وہاں پر موجود مجسٹریٹ اور اے ایس آئی کی طرف سے واضح ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ کسی بھی صورت میں گولی نہیں چلائیں گے۔ عینی شاہدین کا بیان ہے کہ اے۔ ایس۔ آئی نے خود داخلی دروازہ کھول کر ہجوم کو اندر آنے دیا۔ جنہوں نے داخل ہوتے ہی کار جلائی، گھر اور کلینک کو لوٹا اور پھر پوری عمارت کو آگ لگا دی۔

مبارکہ کے تاثرات

۱۱ جون ۱۹۷۴ء کو دفتر سے آنے کے بعد فیروز عالم ابھی کپڑے تبدیل کر کے کھانے کی میز پر آئے ہی تھے کہ جان جی کا فون آیا۔ فیروز نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا۔ جیب میں پستول رکھتے ہوئے مجھ سے صرف یہ کہا کہ جان جی نے بلایا ہے۔ مہمان تھوڑی دیر تک پہنچ جائیں گے۔ آپ لوگ چائے پر میرا انتظار نہ کرنا، مجھے واپس آنے میں شاید کچھ وقت لگ جائے۔

فیروز کو گئے ابھی زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ محمد جان (اردلی) نے آ کر کہا: ”دارالسعید جل رہا ہے“۔ میں باہر کی طرف بھاگی۔ جیل کی بلند عمارت کے عقب میں دارالسعید کی سہ منزلہ عمارت سے اُٹھنے والے شعلے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے کسی کل چین نہ تھا۔ دُشمنوں میں گھرے ہوئے میرے اپنوں کے اور میرے درمیان آگ کی دیوار حائل تھی۔ تڑپ کر باہر جاتی اور پھر بے بس ہو کر اندر لوٹ آتی اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجائیں کرتی تو میرا دل یقین سے بھر جاتا کہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور وہ قدرت رکھتا ہے کہ اپنے ان بے

گناہ بندوں کو اپنے دستِ قدرت سے یوں بچا لے کہ کسی کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال میرے دل میں نہیں گذرا کہ میں اپنے پیاروں کو زندہ سلامت نہیں دیکھ پاؤں گی۔

سورج ڈھل چکا تھا، مگر دارالسعید میں لگی آگ ابھی تک بھڑک رہی تھی۔ اُس میں محصور کس حال میں ہوں گے، کوئی خبر نہ تھی۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی جب ہمارے مہمان نے مجھ سے کہا: ”فیروز عالم تھوڑے زخمی ہو گئے تھے اُنہیں سی ایم ایچ لے گئے ہیں۔“ سوائے خاموش آنسوؤں کے میرے پاس کوئی چارا نہ تھا۔ ہمارے مہمان میری ڈھارس بندھاتے رہے۔ اُن کی موجودگی سے میرا حوصلہ قائم رہا۔ اسی اثناء میں کرنل شکور جان تشریف لائے اور مجھ سے اپنے ساتھ کاکول چلنے کو کہا۔ یہ جگہ اب ہمارے لیے غیر محفوظ تھی۔ میں فیروز عالم کی غیر موجودگی میں گھر چھوڑ کر جانے پر راضی نہ تھی۔ وہ اصرار کر رہے تھے کہ اتنے میں میرے چھوٹے لالہ (عبداللہ سعید) اندر داخل ہوئے۔ چند لمحے رُک کر مجھے تسلی دی اور کہا کہ تم بچوں کو ساتھ لے کر شکور جان کے گھر چلی جاؤ۔ چنانچہ میں تیار ہو گئی۔

اگلے دن فیروز عالم سے ملنے ہسپتال گئی تو اُن کو مطمئن دیکھا۔ کوئی حرفِ شکایت نہیں اور حسبِ عادت اپنی تکلیف کا کوئی اظہار بھی نہیں کیا۔ وہ ملک کے دفاع میں دو جنگیں لڑ چکے تھے اور ہمیشہ ہر گزند سے محفوظ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان نہتے مظلوموں کا دفاع اُن کا مقدر تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی اس بے لوث جرأت اور قربانی کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُس جہان میں بڑے بڑے اعزازات سے نوازا ہو گا۔ مجھے بجا طور پر فخر ہے کہ میری

نسبت سے فیروز عالم کو اللہ تعالیٰ نے یہ موقع بخشا، جو اُس کی بارگاہ میں اجرِ عظیم کا موجب ہوگا۔ جان جی نے مجھ سے کہا: ”تمہارے دادا سے اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام مبارکہ رکھوانے میں شاید اسی موقعہ کے لیے تمہارے نام کی نسبت سے برکات رکھی ہوئی تھیں، جو فیروز عالم نے اپنی شجاعت سے ثابت کیں“۔

۱۱ جون کا سورج، تشدد، بے رحمی اور ظلم کے اندوہ ناک مناظر کی ایک داستان کا گواہ بن کر غروب ہوا۔ ایک ایسی داستان جس میں ایک طرف مخلوق خدا کے غیض وغضب، نفرت اور سفا کی کی انتہا نظر آتی ہے، تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم اور اُس کی قدرتوں کا اظہار نمایاں ہے۔ ربِّ کعبہ کمزور پرندوں کو اپنے گھر کی حفاظت پر مامور فرماتا ہے، تو ایک لشکر جرار فنا ہو جاتا ہے۔ اور جب رب الناس اپنے نیک بندوں کی حفاظت چاہتا ہے، تو ایک شخص فیروز عالم کی صورت میں مقرر فرما دیتا ہے۔ اور مسلح افراد کا ایک انبوہِ کثیر اپنے مقاصد میں ناکام ہو کر پسپا ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی نہ تھی تو اور کیا تھا کہ فیروز عالم، دونو عمر، ناتجربہ کار لڑکوں، زاہد سعید اور انوار احمد اور اُن کی مددگار، ایک عورت، سرور جان کی مدد سے اس بپھرے ہوئے ہجوم کو دست اندازی سے روک لیتے ہیں۔ یہی تو اُس قادرِ مطلق کی قدرت نمائی ہے کہ اپنے ارادوں کی تکمیل کے اسباب بھی خود ہی پیدا فرما دیتا ہے۔

حضرت مرزا غلام احمدؑ نے کیا خوب فرمایا ہے:

قدرت سے اپنی ذات کا دیتا ہے حق ثبوت
اُس بے نشان کی چہرہ نمائی یہی تو ہے

جس بات کو کہے، کہ کروں گا یہ میں ضرور
ٹلتی نہیں وہ بات، خدائی یہی تو ہے

یہ یوم فرقان اُس بشارت کے پورا ہونے کا بھی دن تھا جو اُس نے اپنے مومن بندے سعید احمد کو کئی برس پہلے دے رکھی تھی۔ یہ ۱۹۴۶ء کے موسمِ گرما کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب دیبگراں میں اپنے گھر کی چھت پر کھلے آسمان کے نیچے، تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں محوِ استراحت تھے کہ الہام ہوا:

یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ۔

(اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا) (الانبیاء۲۱:۶۹)

دورِ حاضر کی ’آتش نمرود‘ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ’اولادِ ابراہیم‘ کے لیے ٹھنڈی ہوئی۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد جب یہ شیطانی کھیل، یہ رقص ابلیس اپنے انجام کو پہنچا تو اُس شخص، سعید احمد، کو جس کو ختم کرنے کے ارادے سے یہ کھیل کھیلا گیا تھا، آگ اُس کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔





نواں باب

دارالسعید سے ہجرت

اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ

میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، وہ مجھے رستہ دکھائے گا۔ (الصّٰفّٰت ۳۷:۹۹)

فیروز عالم ہسپتال منتقل ہوئے ہی تھے کہ چند باوردی فوجی افسران کرنل شکور جان، کرنل شریف، کرنل حفیظ اور ایک میجر صاحب جو پی ایم اے کاکول سے تشریف لائے تھے دارالسعید میں داخل ہوئے۔ ان کے علاوہ، ایف ایف سنٹر کا ایک افسر بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ اُن کے آنے کے بعد ہی ایس ایس پی صاحب بھی واپس تشریف لے آئے۔

اِس وقفہ کے دوران جماعت کے تمام افراد جو مسجد میں رُکے ہوئے تھے وہ بھی گھر کے اندر آ گئے۔ اُس وقت ملک بشیر احمد اور پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کے ماموں زاد بھائی محمد ایوب نے ڈاکٹر سعید احمد صاحب کو بتایا کہ اُنہیں بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مفسدین کے دوسرغنوں نے باہم مشورہ کیا ہے کہ کام ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ ہر لیڈر نے دس دس آدمی نامزد کیے ہیں جو رات کی تاریکی میں گھر کو بموں سے اُڑا دیں گے۔ رات کے لیے ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا جا چکا ہے، اس لیے رات کو یہاں رُکنا مناسب نہیں۔ مذہبی جنون اور تعصب انسان کو ایسا وحشی بنا دیتا ہے کہ اِس کی مثال اِس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ جِن دوسرغنوں کا یہاں نام لیا جاتا تھا، وہ ماضی میں آپ کے مریض رہ چکے تھے۔ وہی نگاہیں جو آپ کے سامنے بارِ احسان سے جھکی رہتی تھیں آج آپ کو تشدد کا نشانہ بنانے کے لیے آپ کی متلاشی تھیں۔ آپ سے اِن کی ذاتی دشمنی، عداوت یا ناراضگی کی کوئی بھی

وجہ کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ آپ کا احمدی ہونا ہی ایک ایسا جرم اُن کے سامنے تھا جو اُن کو ایک ایسے فعل کے ارتکاب کے لیے اُکسا رہا تھا جو خود ایک ناقابلِ معافی اور گھناؤنا جرم تھا۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

اَور احمدی کیا ہوتا ہے! کس کو کہتے ہیں اور وہ کیا کرتا ہے! یہ باتیں تو شاید اُن دو شخصوں کو بھی پتہ نہ ہوں۔ بہرحال یہ صورتحال اچھی خاصی تشویشناک تھی۔ میرے لیے بھی، اپنے ساتھیوں کے لیے بھی اور انتظامیہ کے لیے بھی۔ بِنا بریں ایس ایس پی نے مجھ سے کہا کہ بہتر ہوگا آپ کاکول چلے جائیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ ڈی آئی جی گوہر زمان نے بھی یہی بات دہرائی۔ میں نے ان سے کہا: ”کیا اسی گھر میں آپ لوگ ہماری حفاظت نہیں کر سکتے؟“ گوہر زمان جھٹ سے بولا: ”کیوں نہیں کر سکتے۔ لیکن صرف میں، گوہر زمان، اکیلا آپ کے گھر کا پہرہ دے کر حفاظت کر سکتا ہوں۔ اپنے سوا کسی اور کا کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ بات ہوتی تو آج کے دن آپ پر جو گذری ہے، وہ ہرگز نہ ہوتی۔ آپ دیکھ نہیں سکے؟“ یہ انہوں نے طنزاً کسی قدر تلخی کے ساتھ مقامی پولیس کے بارے میں کہا۔ اور دوبارہ یہی مشورہ دیا کہ بہتر ہوگا آپ کاکول چلے جائیں۔ میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اسی اثناء میں پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کے ماموں زاد محمد ایوب نے بڑے ہی زوردار اور رازدارانہ لہجے میں کہا: ”جانجی! آپ ضرور جائیں۔ آپ اس مکان میں آج رات ہرگز نہ گذاریں۔“ فوجی افسران جو اس موقعہ پر کاکول سے آئے تھے، یعنی کرنل شریف، کرنل حفیظ، کرنل شکور جان اور کرنل عاشق، ان میں سے کرنل شکور جان آگے بڑھے اور مجھے گلے سے لگایا اور ایسے تپاک سے مجھے بھینچا کہ اس کا احساس میرے وجود کی رگ

رگ میں سرایت کر گیا۔ اور اِس وقت جبکہ اس بات کو تین سال گذرنے کو ہیں، اپنے تصور میں اب بھی وہی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ اور انہوں نے کہا کہ آپ کاکول جائیں گے۔ ہمارے کمانڈنٹ صاحب نے ہمیں یہی حکم دے کر بھیجا ہے کہ آپ کو ساتھ لے کر جاؤں۔ جس خلوص اور محبت بھرے انداز میں اُس کی زبان سے یہ کلمات نکلے وہ الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا۔

میں نے اس موقعہ پر کہا کہ سوال میرے اکیلے یا اپنے گھر کے چند نفوس کے جانے کا نہیں۔ میرے ساتھ تو ایک گروہ یہاں اس وقت پناہ گزین ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔ اس پر ایس ایس پی اور فوجی افسران یک زبان ہوکر بولے کہ نہیں نہیں یہ سب لوگ آپ کے ساتھ جائیں گے۔ اور ایس ایس پی نے کہا کہ آپ لوگ ضروری ضروری مختصر سامان رکھ لیں، گھر مقفل کر دیں اور فوراً تیار ہو جائیں اور انہوں نے گاڑی لانے کا سوچا۔ اور کہا کہ پہلے آپ مستورات کے ساتھ چلے جائیں۔ دوسری بار مردوں کو لے جائیں گے۔ یا کل چلے جائیں گے۔ میں نے کہا یہ کل والی بات درست نہیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے آپ سب فوراً تیاری کر لیں۔ چنانچہ باہر پڑا سامان کمروں میں رکھا اور تالے لگا دیئے۔ صرف چند ضروری اشیاء ساتھ رکھیں۔ اتنے میں ایک بڑی بس آ گئی۔ اور ہم سب ہی لوگ بس کے پاس آ گئے۔ پہلے مستورات اور بچوں کو بٹھایا۔ پھر بھی جگہ باقی تھی۔ اور سب مرد بھی اس میں سما گئے۔

دن بھر کے طویل اذیت ناک لمحات سے گذرنے کے بعد یہ بندگانِ خدا اب بھی ہمت اور حوصلہ نہ ہارے تھے۔ اپنے ایمان اور عزت و ناموس کی دولت کو سمیٹتے ہوئے، ڈاکٹر سعید احمد خان کی معیت میں یہ قافلہ عازمِ سفر ہوا۔ یہ گھر جس کی مکمل تعمیر و تزئین میں کم و بیش چار دہائیاں صرف ہوئی

تھیں، ظالموں کے ہاتھوں اسے خاکستر ہونے میں چار گھنٹے بھی نہیں لگے۔ دارالسعید کا وہ حصہ جو ابتداء میں تعمیر ہوا تھا، وہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی زوجہ بی بی اُمِ کلثوم کے زیرِ استعمال تھا اور یہی بلوائیوں کی براہِ راست زد میں آیا تھا۔ تنکا تنکا سمیٹ کر نصف صدی میں جو گرہستی اس نیک صابر وشاکر خاتون نے بنائی تھی، اُس میں سے بس تن کے چار کپڑے اور کلامِ پاک کو سینے سے لگائے، اِس گھر کو خیر باد کہتے ہوئے اُن کے دِل کی کیا کیفیت ہوگی، یہ تو اُن کے اور اُن کے مالکِ حقیقی کے درمیان تھی۔ مگر اُن کا صبر وسکون دیکھنے والوں کے لیے ایمان افروز اور حوصلہ افزا ضرور تھا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر سے اقتباس

> والدہ عبداللہ کے پاس صرف اس کا قرآن کریم تھا۔ جو وہ جلدی میں اپنے ساتھ لے کر اوپر کی منزل سے نیچے اتری تھی۔ سوائے اس ایک خزانہ رحمت کے اور ان کپڑوں کے جو اس نے پہن رکھے تھے، اس کی زیر ملکیت ہر چیز نذر آتش ہو چکی تھی۔ محمد زمان خانساماں کی نیک بیٹی راشدہ نے مجھ سے کہا: ”جان جی! میرا یہ قرآن آپ آگے بیٹھے ہیں، اپنے پاس رکھ لیں“۔ کس قدر خاموش اور صابر وشاکر یہ جماعت تھی۔ اور کس قدر پر وقار اور انوار رحمت سے منور اس وقت کی فضاء تھی۔ ان باتوں کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔
>
> یہ بس جس میں ہم سوار تھے انہی راستوں پر اب رات کی تاریکی اور سڑکوں کی روشنی اور معروف عمارات کے پاس سے گذر رہی تھی۔ دل میں ایک عجیب پرسکون کیفیت اللہ کے حسن و احسان اور جبروت و کبریائی اور اس کے غیر معمولی کرم وفضل کی طاری تھی۔ جب مکان کے صحن میں جمع ہوئی یہ جماعت چلنے لگی اور میں نے پہلا قدم اٹھایا، تو میری زبان سے بے ساختہ یہ آواز اور الفاظ نکلے: اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ۔ اور ان سے جو ٹھنڈک اور خنکی

>۱۱ جون منگل ۱۹۷۴ء کے اس گرم دن کے بعد میرے دل میں وارد ہوئی، وہ دنیا کی ہر ٹھنڈک اور راحت سے کچھ بڑھ کر ہی تھی۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔
>
>میرا خیال تھا کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے نجات بخشی تھی اور انہوں نے ہجرت کے وقت جو الفاظ کہے تھے وہ یوں تھے: اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ لیکن بعد میں معلوم ہو گیا کہ دونوں طرح ہی یہ الفاظ قرآنِ کریم میں آئے ہیں، لیکن حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ اِنِّیْ ذَاھِبٌ ہیں۔ اُس وقت سے لے کر، تا ایں دم، بس یہی الفاظ ایک سہارا ہم عاجزوں کا ہے۔ یہی الفاظ سَیَھْدِیْنِ۔ یا اللہ ہماری خطائیں، ناسپاسی اور نالائقی ہمیں تیری ہدایت سے محروم نہ کر دیں۔ یا اللہ! ہمارا انجام بخیر کرنا۔ اور اپنی سچی اور صحیح منزل تک ضرور پہنچانا۔ ورنہ ہر قدم پر خطرہ ہے۔ اور میرا دل بہت خائف ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے اپنی ایک ڈائری میں، ۱۹ اگست ۱۹۷۴ء کو، تحریر فرمایا ہے:

>۱۱ جون کی رات کو جب ہم اپنے مکان سے پولیس کی زیرِ حفاظت نکل رہے تھے تو اُس وقت میں یہ الفاظ دُہراتا رہا: اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ۔ اور پھر یہ آیت پڑھتے پڑھتے گھر چھوڑا: وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔ (اور کہہ اے میرے رب مجھے سچائی کے داخلہ سے داخل کیجیو اور سچائی کا نکلنا نکالیو اور مجھے اپنے پاس سے مدد دینے والی قوت دے)۔ (بنی اسرآئیل ۱۷:۸۰)

کاکول جانے والی بس میں ڈاکٹر سعید احمد خان کے ہم سفر مرد و زن، جب غم سے لبریز

دلوں کے ساتھ ایبٹ آباد کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، تو اِس شہر سے متعلق اُن احساسات کی ترجمانی پروین شاکر کے اِن اشعار سے بخوبی ہوتی ہے:

جو شہر کہ اپنی شخصیت میں شبنم تھا، گلاب تھا، صبا تھا
اب آگ ہے، خون ہے، دھواں ہے

یہ شہر ہے، سانحہ ہے، کیا ہے
کوفہ ہے کہ کربلا ہے، کیا ہے

پہلی پناہ گاہ۔ پی ایم اے، کاکول

رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ

(اے میرے رب مجھے برکت والا اُتارنا اُتاریو اور تُو سب اُتارنے والوں سے بہتر ہے) (المؤمن ۲۳:۲۹)

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی سربراہی میں جو قافلہ اُن کے ہمراہ بس میں سوار پی ایم اے میں پہنچا اُن کی کل تعداد اٹھاون (۵۸) تھی۔ کچھ دیر بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے مہمان پہنچتے رہے اور پھر یہ تعداد بہتر (۷۲) تک پہنچ گئی۔ یہی تعداد اُس قافلے کی بھی بتائی جاتی ہے جو حضرت امام حسینؓ کے ہمراہ میدانِ کربلا میں یزیدی فوجوں کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہوا۔

بحوالہ تحریر پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب:

ہم ۷۲ مرد و زن اپنا سب کچھ چھوڑ کر فوج کی حفاظت میں رات کو کاکول پہنچ گئے۔ کہتے ہیں حضرت نوحؑ کی کشتی میں بھی ۷۲ نفوس سوار تھے۔ اور یہاں بھی حضرت مسیح موعودؑ نے جو کشتی بنائی اُس میں بھی ۷۲ نفوس ہی شامل تھے۔

پی ایم اے میں استقبال

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے الفاظ میں:

پی ایم اے کاکول کا گیٹ آیا۔ کرنل شکور جان اترا۔ گیٹ کھلوایا اور ہم کمانڈنٹ ہاؤس میں پہنچے۔ یہ کوئی دس بجے رات کا وقت تھا۔ عبداللہ اور اُن کی بیوی انجم دونوں برآمدے کے آگے کھڑے تھے۔ اپنے مہمانوں کو انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کیا پروقار وہ پہنچنا تھا۔ اور کیا عظیم وہ استقبال تھا۔ انجم نے مستورات کا چارج لیا۔ بڑی خاموشی اور کمال سنجیدگی سے عورتیں کمروں کے اندر داخل ہوئیں۔ مرد برآمدے میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

میری رقّت تو ایک معروف کمزوری ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ میں اس دن اور اس وقت بھی جب عبداللہ مجھ سے بغلگیر ہوا، اور نہ بعد ہی میں، رقت سے مغلوب ہوا۔ جب سب لوگ بیٹھ گئے تو میرے دل میں ایک خاص احساس پیدا ہوا جس کا اظہار میری زبان نے تقریباً ان الفاظ میں کیا: 'عزیزو اور دوستو! ہماری زندگیوں کے یہ لمحات کوئی معمولی واقعات نہیں۔ یہ عظیم موقعہ ہر کس و ناکس کے نصیب میں نہیں ہوا کرتا۔ ہم اللہ کے اس احسانِ عظیم کا شکر ادا کن الفاظ میں کریں۔ ہم اس وقت مہاجر ہیں۔ اور یہ گھرانا اور ان کے رفقاء کار، انصار ہیں۔ یہ ہماری نسبت ہے۔ آؤ ہم اللہ کا شکر ادا کریں۔ اور اس کے فیصلوں پر باطیب خاطر راضی اور خوش ہو جائیں۔'

بس میں سوار مہمانوں کے علاوہ جو لوگ بعد میں کمانڈنٹ ہاؤس میں پہنچے اُن میں آپ کی بیٹی مبارکہ، بمع اپنے خوردسال بچوں کے، آپ کے فرزند ناصر احمد سعید، اُن کی بیگم اور شیر خوار بچہ اور

آپ کے عم زاد عبدالرحمٰن شامل تھے۔ ۱۱ جون کی صبح کو ناصر احمد سعید دیگر ان گندم لانے گئے تھے، مگر جلوس کے پہنچ جانے کی وجہ سے دارالسعید تک نہ پہنچ پائے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں آپ کے عم زاد بھائی عبدالرحمٰن، ناصر کی بیوی اور بچے کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جماعتِ ربوہ سے تعلق رکھنے والے چند افراد بھی یہ جان کر کہ آپ ایک محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ گئے ہیں، یکے بعد دیگرے وہاں آ گئے۔ اُن میں مولوی چراغ دین ربوہ جماعت کے ایک مربی بھی شامل تھے جنہیں آپ کے دوست مشہور ناول نگار نسیم حجازی صاحب، انسان دوستی اور ہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے وہاں پہنچا گئے۔ مولوی صاحب دن بھر کسی بالا خانے کے غسل خانے میں روپوش رہے تھے اور رات ہونے پر وہ نسیم حجازی صاحب کے گھر کی عقبی دیوار پھاند کر اُن کے گھر آ گئے تھے۔ اِس طرح کل مہمانوں کی تعداد بہتر تک پہنچ گئی۔ مہمانوں کے استقبال اور انتظام، قیام و طعام میں جس اعلیٰ حوصلگی اور فراخ چشمی کا ثبوت عبداللہ سعید اور اُن کی زوجہ انجم سعید نے دیا وہ عدیم المثال ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے اقتباس:

مردوں کے لیے سامنے کے برآمدے میں اور مستورات اور بچوں کیلیے کھانا، اندر کے ایک بڑے کمرے میں چنا گیا۔ رات سونے کے لیے چھ بستر پی ایم اے کے VIP گیسٹ ہاؤس میں اور باقی ایک افسر کے خالی بنگلہ میں انتظام کیا گیا۔ مجھ سے عبداللہ نے کہا کہ آپ چھ افراد گیسٹ ہاؤس میں رہنے کے لیے منتخب کر لیں۔ میں نے ربوہ کے مربی مولوی چراغ دین صاحب ان کا لڑکا، مولوی عبدالرحمن صاحب نیازی، ماسٹر اصغر علی صاحب، احمد صادق صاحب اور پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کا انتخاب کیا۔

خالی کوارٹر جو راولپنڈی کے ایک میجر صاحب کو ملا ہوا تھا، وہ ایک دو دن میں اپنی فیملی لانے والے تھے۔ عبداللہ نے میجر صاحب سے کہا کہ یہ درخواست

ذاتی نوعیت کی ہے، بحیثیت کمانڈنٹ نہیں وہ یہ کہ وہ تقریباً دو ہفتہ تک مزید اپنے بچے یہاں نہ لائیں اور یہ کوارٹر متوقع مہمانوں کے لیے خالی رکھیں۔ میجر صاحب نے یہ درخواست قبول کر لی تھی۔ چارپائیاں، گدے، چادریں، کمبل وغیرہ کرنل حفیظ صاحب کے انتظام سے لگائے گئے۔ اور یہی نیک دل اور شریف کرنل تمام عرصہ انتہائی خلوص سے مہمانوں کی دیکھ بھال اور آرام کا خیال کرتے رہے۔

مہمانوں کی آمد پر بیگم انجم عبداللہ سعید کے تاثرات اُن کی اپنی تحریر سے:

ہم برآمدے میں کھڑے تھے۔ بس داخل ہوئی۔ سب سے پہلے مجھے اپنی ساس یعنی بے بے جی کا اُترنا یاد ہے۔ اُنہوں نے اپنا قرآن شریف اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُتارا۔ چہرے پر اطمینان تھا۔ کہنے لگیں (قرآن شریف کو دیکھ کر): "بس یہ ایک باقی رہ گیا ہے۔" میں نے کہا: "ہمارے لیے یہی کافی ہے۔" اُس کے بعد ببو جی، جان جی اور سب سے ملاقات ہوئی۔ دِل پر جو گزر چکی تھی یا گزر رہی تھی وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن بظاہر کسی کے لب پر کوئی شکایت نہ تھی۔ اس قدر پُرسکون اور پُروقار طریقہ سے یہ لُٹا ہوا قافلہ آ کر اپنی اپنی جگہ پر صبر و شکر کر کے بیٹھ گیا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ مجھے پہلی بار اِن لوگوں کو تکلیف کے عالم میں نزدیک سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ صبر و تحمل، یہ برداشت یہ تو اللہ کے نیک بندوں کو ہی حاصِل ہوتے ہیں۔ پھر اُنہیں بُرا کیوں کہا جاتا ہے۔

مسز انجم سعید مزید تحریر فرماتی ہیں:

جب رات کا کھانا کھا چکے تو سب لوگ لیٹ گئے۔ جان جی کو عبداللہ کا ڈریسنگ

روم دے رکھا تھا۔ جب وہ اپنے بستر پر دراز ہوئے تو عبداللہ کُرسی پر قریب ہی بیٹھ گئے اور میں بستر پر اُن کے پاؤں دبانے لگی۔ کچھ دیر اُنہوں نے حالات سنائے اور پھر عام گفتگو ہونے لگی۔ جیسے ہم لوگ ہمیشہ آپس میں کیا کرتے تھے۔ میرے دِل میں خیال گذرنے لگا کہ کتنا بڑا حادثہ گذرا ہے اور یہ کس اطمینان سے بیٹے سے محوِ گفتگو ہیں۔ میں دونوں باپ بیٹے کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، اُن کی باتیں سُن رہی تھی اور سوچ بھی رہی تھی کیا ایسے ہی لوگوں کے لیے نہیں کہا گیا: "سرِ تسلیم خم ہے"۔

اِن کا یہ تحمل اور برداشت صرف ایک دِن کے لیے نہ تھا۔ جتنا عرصہ یہ لوگ ہمارے پاس رہے، اگر کوئی اُلجھن یا دشواری پیدا ہوئی، جان جی اور عبداللہ نے ساتھ دیا۔ بزرگوں نے حوصلہ دکھایا، بچوں نے ایک دوسرے سے پیار نبھایا۔ نماز روزے کا ساتھ رہا اور یوں کہنے کو یہ مشکل دِن ہمارے لیے رحمتوں اور برکتوں کے دِن بن کر رہ گئے تھے، جن کی یاد میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ میں کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کرسکتی ہوں جس نے ہمیں اور خاص کر مجھے اپنے ان بندوں کی خدمت کا موقعہ عطا فرمایا۔ اُس کے احسانوں میں سے یہ ایک احسانِ عظیم ہے۔

کاکول کے لیل ونہار

صادق آں باشد کہ ایامِ بلا مے گذارد با محبت باوفا
گر قضا را عاشقے گردد اسیر! بوسد آں زنجیر را کز آشنا!

(حضرت مرزا غلام احمد، کتاب البریہ، سرورق)

(صادق وہ ہوتا ہے کہ ابتلاؤں کے دن محبت اور وفاداری سے گذارتا ہے۔
اگر قضائے الٰہی سے عاشق قید ہوجاتا ہے تو وہ اُس زنجیر کو چومتا ہے جس کا سبب
آشنا ہو)۔

کچھ ایسا ہی حال ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا تھا۔ جس صبر و رضا کے ساتھ اُنہوں نے حالات اور مصائب کو گلے لگایا اور راضی برضا رہے، ایسی مثالیں تاریخ میں شاذ ہی نظر آتی ہیں۔ کاکول کے عارضی ٹھکانے کو اُنہوں نے اپنے عمل، سوچ، فکر سے ایک مثالی دور بنا دیا۔ آپ کے اپنے الفاظ میں:

اگلی صبح میں نے گھر کا جائزہ لیا، اور کمانڈنٹ ہاؤس کا عقبی برآمدہ مہمانوں کے کھانے اور بعد ازاں باجماعت نمازِ ظہر وعشاء ادا کرنے کے لیے پسند کیا۔ یہ کوارٹر (Hut) جس میں مہمان مقیم تھے، کمانڈنٹ ہاؤس کے بالکل ہی قریب تھا اور مہمان شرقی گیٹ سے داخل ہو کر باہر سے اس عقبی برآمدے میں پہنچ جاتے تھے۔ سامنے سڑک سے گھر میں آنے والے یا سامنے کے برآمدے میں بیٹھے دیگر زائرین یا ملنے کے لیے آنے والے لوگوں سے کسی قسم کا رابطہ یا آمنا سامنا نہ ہوتا تھا۔ اور یہ انتظام بڑی خوبی سے چلتا رہا۔ کھانا میں خود بھی دیگر مہمانوں کے ساتھ ہی کھاتا تھا۔ چائے دونوں وقت ہَٹ میں ہی پہنچائی جاتی تھی۔ باقی نمازیں اُس ہَٹ میں ہی ہم باجماعت پڑھتے تھے۔ جو مہمان پہلی رات کو گیسٹ ہاؤس میں سوئے تھے اگلے روز انہیں بھی دوسرے مہمانوں کے ساتھ لے آئے۔ وہ عجیب دن تھے جنہیں ایام اللہ کہنا چاہیئے۔ دلوں کی عجیب ہی حالت تھی۔ عورتیں گھر کے اندر دو کمروں میں فرش پر سوتی تھیں۔ بڑی عمر کی چند خواتین کو چارپائیاں مہیا کی گئی تھیں۔ والدہ زاہد نے اپنے لیے

ایک چھوٹا سا کمرہ کونے میں لے لیا تھا۔ اور وہیں اس نے اپنے ایام ابتلاء آخر تک گذارے۔ میرے لیے ایک کمرہ جس کے ملحق ایک غسل خانہ تھا، گھر میں ہی مخصوص کیا گیا تھا میرے وقت کا اکثر حصہ اپنے احباب کے ساتھ ہی گذرتا۔

کھانا سادہ طیب اور بافراخت، فراخی سے ملتا تھا۔ فروٹ از قسم خوبانی وغیرہ دونوں وقت مہیا ہوتا تھا۔ خوبانی کے تین چار پیڑ بنگلہ کے احاطہ میں تھے۔ جب خوبانیاں ختم ہوئیں تو خربوزہ وغیرہ بازار سے آنے لگا۔ ایک ماہ کے بعد میں نے حساب کا تخمینہ لگا کر عبداللہ سعید کی بیوی کو پیشکش کی تو انہوں نے انکار کیا اور رقم قبول نہ کی۔

محترمہ انجم سعید کی تحریر سے اقتباس:

ایک بات صرف یہ ثابت کرنے کے لیے لکھ رہی ہوں کہ اللہ کے وعدے ہمیشہ سچے ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر میں خوبانی کے دو تین پیڑ تھے۔ گھر میں دوپہر کے کھانے کے بعد پھل کھانا ایک معمول تھا۔ جب ہمارے یہ سب عزیز آئے تو خوبانیاں پک چکی تھیں۔ چند دن تک تو وہ کھانے کے بعد دیتی رہی۔ جب وہ ختم ہوگئیں تو میں نے سوچا کہ کھانے کے بعد پھل جاری رکھا جائے یا ختم کیا جائے۔ دِل نے کہا اپنے لیے ہوتا تو کرتی رہتی۔ جب مہمان ہیں تو اُن کے لیے ہمیشہ کے معمول میں تبدیلی لانے کا سوچ رہی ہو۔ لہذا یہی فیصلہ کیا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد پھل کھایا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔ وقت گذر گیا اور اللہ تعالیٰ نے کمی نہ ہونے دی۔ کاکول کے بعد ہماری پوسٹنگ کوئٹہ میں ہوئی۔ وہاں جو گھر ملا اُس میں پھل ہی پھل تھا۔ وہ دِن اور آج کا دِن ابھی تک پھل کی کمی نہیں ہوئی بلکہ زیادتی کا احساس رہتا ہے۔

محترمه انجم سعید صاحبه نے کوئٹه کے جس گھر کا ذکر کیا ہے اُس کا تو نام ہی (Orchard House) آرچرڈ ہائوس تھا۔ یعنی پھلوں کے باغ میں گھِرا ہوا گھر یا ”دارِثمربار“۔ یه اﷲتعالیٰ کی طرف سے اُن کی میزبانی کا وہ اجر تھا جو اُنہیں فوراً اِسی جہاں میں عطا ہوا۔ جنت الفردوس میں جواثمار اِس نیک جوڑے کو ملیں گے، اُس کو تصور کی آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی (راقمه)

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ’کاکول کے لیل ونہار‘ کے عنوان کی تحریر میں مزید فرماتے ہیں:

ہم پر جو کچھ گذرنا تھا ے ستمبر کی شام تک اپنی انتہا کو پہنچ کر گذر گیا۔ الحمدللہ رب اللعالمین الرحمن الرحیم الجواد الکریم البر الرئوف الرحیم۔ ہم کس زبان سے اللہ کا شکر ادا کریں۔ جب سوچا اور جائزہ لیا تو دل جذبۂ تشکر سے لبریز ہو گیا۔ ایمان بچ گیا اور ایسے امتحان سے بچ گئے جو شاید ہماری طاقت سے باہر ہوتا۔ اور ہزاروں دیگر لوگوں کی طرح اس چیز سے، باکراہت ہی سہی، ہم جسے کل تک حق سمجھتے رہے، اب بھی حق سمجھنے کے باوجود انکار کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيۡنِ ﴿۹۷﴾ وَ اَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ يَّحۡضُرُوۡنِ ﴿۹۸﴾ (میرے رب میں شیطانوں کی عیب جوئی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اور میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ

میرے سامنے آئیں)۔ (المومن ۲۳: ۹۷، ۹۸)۔کئی ہزار کے بپھرے ہوئے ظالم اور سفاک ہجوم کی شکلیں ہمیں آمنے سامنے دیکھنے سے اور ان کے ہر قسم کے تخاطب سے بالکل محفوظ رکھا۔سوائے چند ایک منحوس چہروں کے جو باڑھ کے گھنے پتوں کے درمیان سے، جہاں سے وہ گھر میں داخل ہونا چاہتے تھے اور کھڈ کے پار محلہ دارالخیر کے سامنے جمع شدہ انبوہ پر دو چار مرتبہ نظر پڑی۔ واللہ انہیں ہم سے دور رکھا اور خود ہمیں اپنی پناہ میں رکھا۔ پھر ہماری آبرو محفوظ رکھی ۔ ورنہ یہ ظالم گھر میں، جن کے درمیان اور ہمارے درمیان ایک نہایت بوسیدہ چوبی دروازہ ہی صرف حائل رہ گیا تھا، داخل ہو پاتے ،تو کیا کچھ نہ ہوتا۔اس لمحہ سے تھوڑی دیر پہلے فیروز عالم نے پستول میرے ہاتھ میں دے کر کہا تھا کہ یہ اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ اسے اس وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کسی لمحہ بھی ہجوم کے ریلا کا اندر گھس آنے کا امکان ہے۔اللہ نے پھر ہماری جانوں کو محفوظ رکھا۔ اور ہماری محبوب مسجد کو کس طرح ظالموں کی رسائی کی نوبت تک نہ آئی۔ اور ہمارے پڑوس میں پروفیسر صاحب اور مسجد کے ان محصورین کو بھی اسی طرح محفوظ رکھا۔اس کے مقابل میں اگر میرے مکان کا ایک حصہ اور میرا ہسپتال اور اثاثہ اور سامان، جن کی مالیت صرف چند لاکھ تھی، جل گیا تو اس کی کیا حقیقت ہے۔

بس اس قسم کے تجزیئے نے میرے دل کو اپنی رحمت سے ایک ایسی تسکین بخشی ،جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ میں نے اپنے گھر کے لوگوں اور دوستوں سے بھی کہا اور اللہ کا بڑا ہی شکر ہے کہ ان لوگوں نے بھی اس بات کو سمجھ لیا، جیسا کہ ان کے بعد کے عمل نے ثابت کیا۔ فالحمدللہ۔

کاکول سے مہمانوں کی رُخصتی

ملک میں فتنہ کی آگ کچھ فرو ہونے کی خبریں ملنے لگیں تو کچھ مہمان آہستہ آہستہ پولیس کی حفاظت میں رُخصت ہونے لگے۔ کاکول سے جو بھی جاتا عبداللہ سعید پولیس کے ذریعے اُن کی حفاظت اور ٹرانسپورٹ کے انتظامات کروا دیتے تھے۔ کیونکہ ابھی تک ملک بھر میں بالعموم اور ہزارہ میں بالخصوص فضا پُرخطر تھی۔ چند دن بعد چالیس افراد باقی رہ گئے اور ایک ماہ ختم ہونے پر صرف آپ کے گھر کے افراد اور خاندان کے اُنیس افراد باقی رہ گئے، جن میں سے اکثر نومبر تک کاکول میں مقیم رہے۔

ہزارہ کے دیگر مقامات پر جماعتِ احمدیہ پر ابتلاء

بالاکوٹ

۱۱ جون ۱۹۷۴ء کو ہی بالاکوٹ کے احمدی تشدد کا نشانہ بنائے گئے۔ ربوہ جماعت کے ایک معزز احمدی اور اُن کے نوجوان بیٹے کو جو ابھی میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا تھا شہید کر دیا گیا اور اُن کی لاشیں سڑک پر پھینک دی گئیں۔ کئی دوسرے احمدی بھی نہایت تکلیف دہ حالات سے گذرے۔

مانسہرہ

۱۲ جون ۱۹۷۴ کا دِن مانسہرہ کے لیے مقرر کیا گیا تھا، اور وہاں اُس قسم کی کاروائی کی منصوبہ بندی کی گئی تھی جو ۱۱ جون کو ایبٹ آباد میں کی گئی تھی۔ مگر بروقت پیش بندی اور مزاحمت سے ویسے حالات پیدا نہ کیے جا سکے جیسا کہ ایبٹ آباد میں ہوئے تھے۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب کی تحریر سے اقتباس:

۱۱ جون کی رات کو جب ہم کاکول پہنچ چکے تھے تو ڈی آئی جی گوہر زمان کمانڈنٹ ہاؤس آئے، اور پشاور آئی جی پولیس سے ٹیلی فون پر باتیں کرنے لگے۔ آئی جی بشیر احمد صاحب نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور گوہر زمان خان نے واقعات سنائے۔ آئی جی پولیس میرے دیرینہ مخلص دوست تھے۔ انہوں نے ٹیلی فون پر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ گوہر زمان خان نے فون پر مانسہرہ کے متعلق آنے والے دن کے بارے میں خدشات بیان کیے۔ بشیر احمد نے کہا کہ ہر قیمت پر آپ لوگوں نے خان بہادر غلام ربانی خان کی حفاظت کرنی ہے۔ گوہر زمان نے کہا کہ کم از کم بس کی نفری پشاور سے بھیجیں۔ ہزارہ میں ہزارہ کی پولیس پر اعتماد نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ اگلے روز صبح سویرے وہ خود مانسہرہ پہنچ گیا۔ اور ہجوم کے سامنے خود آکر اسے روکنے کی جرأت دکھا کر کامیاب ہوگیا۔ اگر پولیس اسی فرض شناسی سے ایبٹ آباد میں بھی میرے مکان پر سنجیدگی اور متانت سے اپنا فرض ادا کرتی، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میرے مکان پر بلوہ ہوتا، کیونکہ میرے مکان کا محل وقوع کچھ اس قسم کا ہے کہ شہر سے آنے والی ایک ہی بڑی گذرگاہ ہے، جو دس گیارہ فٹ سے چوڑی نہ ہوگی۔ اور اس کے دونوں طرف مسلسل مکانات اور دوکانیں ہیں۔ اگر پولیس فرض شناس ہوتی، تو کم سے کم تعداد میں ہونے کے باوجود، اس انبوہ کثیر کو آگے بڑھنے سے کامیابی کے ساتھ روک سکتی تھی۔

پولیس کے خلوصِ نیت اور مناسب پیش بندی سے ہجوم، خان بہادر غلام ربانی خان صاحب کی رہائش گاہ تک نہ پہنچ سکا۔ ایک دوسرے احمدی ڈاکٹر محمد دین صاحب کا مکان، جو گنجان آبادی میں تھا وہاں تک تخریب کار پہنچ تو گئے۔ مگر مکان کو وہاں کے لوگوں کی مزاحمت کی وجہ سے آگ نہ لگائی جا

سکی۔ البتہ اُن کے گھر کا اثاثہ باہر نکال کر نذرِ آتش کر دیا گیا اور لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کا مظاہرہ کیا، اور ڈاکٹر محمد دین صاحب کو مجبور کیا کہ وہ مسجد میں جا کر احمدیت سے لاتعلقی کا اظہار کریں۔

اِس کے علاوہ مانسہرہ میں معمولی تخریب کاری ہوئی۔ املاک ونفوس کا اتلاف تو نہ ہوا، مگر طرح طرح کے دباؤ کے زیرِ اثر ایک ایک کر کے تقریباً سبھی ممبران جماعتِ احمدیہ لاہور اور جماعتِ احمدیہ ربوہ احمدیت سے منحرف ہو گئے۔ یہاں تک کہ صاحبزادہ عبدالطیف شہید کے نقشِ قدم پر جان کا نذرانہ پیش کرنے کے دعویدار نوجوان اور بڑے بڑے پہاڑ بھی اِس سیلاب میں بہہ گئے۔ مسجد میں جا کر توبہ کرنے والوں میں سے ایک شخص نے اعلان کے بعد ایک تقریر بھی کی۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب تک یہ بات بھی پہنچی کہ اُن صاحب نے یہ کہا کہ اِس جماعت میں کچھ بھی نہیں۔ اگر ہوتا تو ڈاکٹر سعید احمد کا مکان کیوں جلتا۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> میں نے جب یہ سُنا تو میں بہت متفکر ہوا کہ کیا کہیں واقعی مجھ پر یہ عذابِ الٰہی تو نہیں ہوا، تو میری توجہ اللہ تعالیٰ نے اِن آیاتِ قرآنی کی طرف پھیر دی: وَ لَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ رَحۡمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ۝ (اور ضرور ہم کسی قدر ڈر اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمھارا امتحان کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دو۔ جنھیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں ہم اللہ کے لیے ہی ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی وہ ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت

ہے اور یہی وہ ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں)۔ (البقرة ۲:۱۵۵ تا ۱۵۷)۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتۡنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ ؕ وَ لَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمۡ ؕ اَوَ لَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِیۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ (اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب اللہ کے لیے دُکھ اُٹھانا پڑتا ہے تو لوگوں کے دُکھ دینے کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھتے ہیں۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے مدد آئے تو وہ ضرور کہیں گے ہم بھی تمھارے ساتھ تھے کیا اللہ اسے خوب نہیں جانتا، جو لوگوں کے سینوں میں ہے)۔ (العنکبوت ۲۹:۱۰)۔ اس سے میرے دل کو تسلی ہوگئی۔

خان بہادر سعید احمد خان صاحب نے اپنی خودنوشت میں ربوہ کے ایک دلیر نوجوان عبدالعزیز ابنِ مولوی عبدالقیوم وکیل مرحوم کا بالخصوص ذکر فرمایا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے استقامت بخشی اور اُنہوں نے اپنے ایمان کی بجائے املاک سے دست برداری کو پسند فرمایا، اور ہجرت کی۔ بعد کے ایام میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی استقامت کے انعام میں ہر طرح کے فیوض سے نوازا ہے۔

دیگر مقامات جہاں احمدی آبادی زیادہ تھی، داتہ اور دیبگراں تھے۔ وہاں کے احمدی بھی اِس ابتلاء کو برداشت نہ کر پائے۔ دیبگراں کے دو ایک احمدیوں کے متعلق تو یہ روایت بھی ہے کہ وہ مسجد کی درمیانی دیوار کو مسمار کر کے بڑی مسجد میں شامل کرنے کے لیے کدالیں لے کر ہجوم کے ساتھ ہو لیے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے خاندان کے افراد جو دیبگراں میں مقیم تھے اُن پر اللہ تعالیٰ نے خاص فضل فرمایا۔ آپ کے عم زاد عبدالرحمان اور خواہر زادے مبارک عبداللہ وقوعہ کے روز دیبگراں میں موجود نہ تھے۔ اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو استقامت بخشی اور وہ دلیری سے احمدیت پر قائم رہے۔

ڈاڈر اور چند دیگر مقامات پر جہاں اکا دُکا احمدی تھے۔ وہاں بھی کچھ نرم قسم کے اعلانات سے بات ٹل گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہزارہ میں احمدیت پر بہت بھاری حملہ ہوا اور بظاہر تحریک کالعدم تو نہیں ہوئی لیکن کافی دب گئی۔ بعد کے دنوں میں مولوی صاحبان کی گورنر سرحد کے ساتھ ایک نشست میں مولوی صاحبان نے بہت فخر سے یہ کہا کہ: ”ہم نے ہزارہ میں احمدیت کا مسئلہ ختم کر دیا ہے“۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ ہزارہ میں احمدیت کا گڑھ ختم ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیّت دیکھئے کہ جب احمدیت کا گڑھ، یعنی دارالسعید، آگ کی لپیٹ میں تھا، اُنہی گھڑیوں میں کرۂ ارض کے کسی دوسرے حصے میں ایک بچے کی ولادت ہوئی، جسے خدا اُسی گڑھ میں واپس لایا۔ اور اُسی گڑھ میں بیٹھ کر اُس نے احمدیہ انجمن کی ویب سائٹ کی بنیاد رکھی اور احمدیت کی تبلیغ نئے راستوں سے کرنے کا آغاز کیا۔ یہ بچہ ڈاکٹر مجاہد احمد سعید ہیں جو خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے فرزند ڈاکٹر عبدالکریم سعید کے بیٹے ہیں۔

خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب پر دباؤ

گو ہرز مان صاحب (ڈی آئی جی پولیس) کی خاص ہمت سے بُدھ ۱۲ جون ۱۹۷۴ء کا دن تو خان بہادر غلام ربانی خان صاحب سے ٹل گیا، لیکن خطرات بدستور قائم رہے۔ اُن کی برادری اور رشتہ داروں کی طرف سے اُن پر دباؤ بے انتہا بڑھ گیا، جو اُن کے لیے باعثِ تردد و اضطراب تھا۔ اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ احمدیت سے دست بردار ہو جائیں۔ غلام ربانی خان صاحب، ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب سے بذریعہ فون رابطہ میں رہے۔ آپ کے نقصان اور بے سروسامانی پر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اضطراب کا بھی اظہار وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے۔

دریں اثنا ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب پر بھی کئی اطراف سے ہر ممکنہ دباؤ ڈالا جاتا رہا کہ ہزارہ میں قیام امن اس بات کا متقاضی ہے کہ آپ احمدیت سے انحراف کا اعلان کر دیں۔ آپ کے

ماضی کے کچھ دوست اِس سلسلہ میں کافی تگ و دو کرتے رہے۔ آپ کے دیرینہ دوست ذوق اختر راجہ خان بارہا آپ کے پاس ایسی گذارشات لے کر آتے رہے اور آخر ایک رات کو وہ بالخصوص اسی غرض سے مولوی صاحبان کا تحریر کردہ ایک مسودہ ساتھ لائے کہ اُس پر دستخط کر دیں اور کہا کہ اِس مسودہ میں حضرت مرزا صاحب کو بُرا بھلا نہیں کہا گیا۔ یہ آپ کے لیے اور خان بہادر غلام ربانی خان صاحب دونوں کے لیے قابل قبول ہونا چاہئے۔ اِس سے مولویوں کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ضلع بھر میں امن و امان کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اور بھی طرح طرح سے آپ کو اس طرف راغب کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

> مجھے تو اب کوئی پریشانی اور ذاتی تکلیف نہیں۔ نہ مجھے اس اعلان یا کسی اور اعلان کی ضرورت ہے۔ باقی لوگوں کو کیا کرنا چاہئے، یہ اُن کے اعمال کا معاملہ ہے۔ خدا سب پر رحم کرے۔ اِس سے مختلف جواب کی گنجائش میرے پاس نہیں۔

ذوق اختر خان کچھ مایوس ہو کر رخصت ہو گئے۔ آپ کے فرزند زاہد سعید اُن کے متعلق کہنے لگے: "یہ کیا ہنری کسنجر کا رول ادا کر رہا ہے۔" (ہنری کسنجر امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ تھے جنہوں نے صدر ایوب کے دور میں اُن کے توسط سے چین کا خفیہ دورہ کیا تھا۔ اور اس طرح امریکہ اور چین میں دوستانہ تعلقات کے قیام کے لیے ایک کامیاب رول ادا کیا تھا)۔ کچھ عرصہ تک تو خان صاحب کا نام ہی ہنری کسنجر پڑا رہا۔

اگلے ہی روز خان بہادر غلام ربانی خان صاحب نے آپ سے فون پر بات کر کے اپنے مجبور اور بے بس ہو جانے کا اعتراف کیا۔ یہ سُن کر جیسے آپ کی تو زبان ہی گنگ ہو گئی اور سوائے السلام علیکم کے اور کوئی بات زبان سے ادا نہ ہو سکی۔ اُس دِن سے پہلے اِس پیکرِ جرأت اور احمدیت کے لیے سینہ سپر رہنے والے کے ساتھ یہ کیا سانحہ ہوا ہے؟ اس قیامت خیز طوفان نے آپ سے آپ کے بھائی کو

جسمانی رنگ میں نہ سہی لیکن نظریاتی رنگ میں جدا کر دیا تھا۔ وہ بھائی جس سے زندگی بھر دُکھ سُکھ کا ساتھ رہا تھا، یہاں تک کہ حج کے موقعہ پر کسی شخص کا آپ دونوں کے درمیان جگہ بنا کر بیٹھ جانا بھی آپ کی طبیعت پر گراں گذرا تھا اور اب مذہبی ٹھیکیداروں کی ایک فوج بیچ میں حائل ہو گئی تھی۔ یہ حالات یقیناً ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے لیے ناقابلِ برداشت حد تک تکلیف دہ تھے۔ اِس واقعہ سے ہزارہ کے احمدی احباب کے رہے سہے حوصلے بھی پست ہو گئے اور جماعت کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

بیرونی دباؤ کے علاوہ اپنی جماعت کے کچھ سرکردہ احباب نے آپ کو اِس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ مرکز میں اُن کی طرف سے جماعت کا نام تبدیل کرنے کی تجویز میں اُن کا ساتھ دیں اور ممبران مجلس معتمدین کو نام تبدیل کرنے پر آمادہ کریں۔ اُن احباب کا خیال تھا کہ نئے نام ہی سے اب جماعت قائم رہ سکتی ہے۔ آپ نے اِس تجویز کو قابلِ قبول نہ سمجھا اور اپنے اِس موقف پر قائم رہے کہ یہ جماعت اسی نام سے زندہ رہے گی۔

اظہارِ مہر و وفا اور بے مہری

داستانِ سعید میں، بالخصوص ۱۹۷۴ء کے سانحات کے حوالے سے، انسانیت کی دو رُخی نمایاں ہے۔ انسان کی مہر و وفا اور بے مہری اور بے وفائی ہر گھڑی ایک نیا انداز اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ اِن جذبات میں بس اتنا ہی فرق ہے جتنا 'محرم' اور مجرم اور 'دعا' اور 'دغا' میں۔ انسانیت کے جذبات سے آراستہ اور اس جذبے سے عاری انسانوں میں بھی بس یہی فرق ہے۔

وہ جو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے درپئے آزار تھے، وہ بھی اور آپ کو خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے سرگردان بدنامِ زمانہ بھی انسان تھا۔ فیروز عالم جیسا جان باز بھی انسان تھا اور زخمی فیروز کو ہسپتال منتقل کرنے سے پہلو بچا کر نکل جانے والے بھی انسان تھے۔ گھیراؤ، جلاؤ کے نعرہ

باز بھی انسان تھے، اور اُس تنگ گھیرے سے بچا کر نکال لے جانے والے بھی انسان۔ قیامِ کاکول میں مہاجرین و انصار کی اخوت، ایثار و وفا، وسعتِ قلب کی انتہا بھی انسانیت کی مظہر تھی، اور تاریکی میں سائے کی طرح گریزاں بھی نوعِ انسانی میں ہی سے تھے۔

خان بہادر صاحب سے اظہارِ وفا اور ہمدردی کرنے والوں میں آپ کی بہو انجم کے اقارب کو بالخصوص اولیت حاصِل رہی۔ وہ آپ سے اظہارِ ہمدردی کے لیے کاکول تشریف لاتے رہے اور ہر ممکنہ طریق سے دلجوئی کرتے رہے۔ وہ خود شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر آپ کے ساتھ باجماعت نماز میں شریک رہے۔ وہ آپ کی نماز میں خشیت اور گریہ وزاری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے اور اُن کے دِل پسیجتے اور گریہ وزاری میں آپ کا ساتھ دیتے۔

دورانِ گفت وشنید، اُن کی حضرت صاحب کی ذات اور احمدیت سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں بھی دُور ہو گئیں۔ ڈاکٹر سعید احمد خان کے خاص دوستوں میں سے ڈاکٹر سردار علی شیخ صاحب (سرجن میو ہسپتال لاہور) کی مروت بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ آپ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے یوں تحریر فرمایا ہے:

> بعض احباب نے میرے اموال و جائیداد کے اتلاف پر مجھ سے اظہارِ ہمدردی اور افسوس کیا۔ اِن میں میرے ایک محترم دوست ڈاکٹر سردار علی شیخ صاحب کا ذکر آتا ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف میری اخلاقی طور پر مزاج پُرسی کی اور میری دلداری کر کے میرے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کی، بلکہ میری مالی امداد بھی کرنا چاہی اور اس سلسلہ میں ۲۸ اگست ۱۹۷۴ء کو اُنہوں نے پانچ ہزار روپے کا چیک بھجوایا، جو میں نے کیش نہیں کروایا، بلکہ اُس دوست کی پیاری یاد کے طور پر جوں کا توں اپنے پاس رکھ لیا۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔

جماعت احمدیہ میں سے چند احباب جو بظاہر جماعت احمدیہ سے لاتعلقی کا اظہار کر چکے

تھے، وقتاً فوقتاً کاکول آتے رہے۔ یہ لوگ آپ سے ملتے تو آنکھیں پُرنم ہوتیں، اور نمازِ جمعہ میں شرکت کے بعد لوٹ جاتے۔

ایبٹ آباد میں بسنے والے ہزاروں انسانوں میں سے ایک مخلص شخص، عبدالجلیل، اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ رات کو کاکول آپ سے ملاقات کے لیے آیا۔ اور حالاتِ حاضرہ کے تحت افسوس کا اظہار کیا۔

اِس ضمن میں رضیہ احمد صاحبہ کی جرأت اور اخلاص کا ذکر نہ کرنا، ناانصافی ہوگی۔ وہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی دُختر ان کی ہم مکتب اور دوست تھیں۔ وہ تن تنہا، بے خطر فیروز عالم کی عیادت کیلیے سی ایم ایچ تشریف لائیں۔ کرنل فیروز عالم نے بارہا ان کی اِس مروت کا اظہار کیا اور کہا کہ:

> میرے کئی دوست اور شناسا، سی ایم ایچ سے چند قدم پر رہتے تھے۔ کبھی کسی کو رات کی تاریکی میں بھی میری احوال پُرسی کے لیے آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اور رضیہ آپا کو دیکھو کہ نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چلی آئیں۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے ایک نہایت قریبی دوست نے فون پر کہا: ”میں آپ کی کیا مدد کروں۔“ آپ نے فرمایا: ”شکریہ اِس کی ضروت نہیں۔“ دوست کہنے لگے: ”آپ بے خانماں ہو گئے ہیں، کیوں ضرورت نہیں۔“ ان الفاظ پر آپ کے دِل کو چوٹ سی لگی۔ مگر دوست کو اپنے بارے میں تسلی دی کہ وہ متردد نہ ہوں۔ آپ کو کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک مرتبہ قاضی عبدالرشید صاحب بھی تشریف لائے اور کچھ تحائف بصورت چاول، گھی اور شہد لائے۔ جزاہ اللہ۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب راضی برضا تھے۔ اور کسی غم واندوہ کا اظہار نہ فرماتے تھے۔

اُدھر اہالیانِ ایبٹ آباد و مضافات اور ہزارہ کے لوگ خاموش تھے، مصلحت کوش تھے، بے دست و پا اور بے نطق تھے۔ نہ قدم ہی اُٹھے کہ آپ تک آتے، نہ نوکِ قلم سے کوئی حرف نکلا اور نہ نوکِ زبان سے کوئی لفظ۔ یہی وہ لوگ تھے جو آپ سے شب و روز ملتے ملاتے رہتے تھے اور جن کی آپ سے شب و روز معاملہ بندی کرنا پڑتی تھی۔

آپ کی ہم پیشہ برادری کی بے التفاتی تو سب سے سوا تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحبان، جو آپ کو اپنا اُستاد اور رول ماڈل مانتے تھے اُن کی سرد مہری پر آپ حیران بھی ہوتے، تاہم ان کی مجبوری اور معذوری کے خیال سے آپ کو اُن کے رویے پر افسوس نہ ہوتا تھا۔ ایک دِن ایک ڈاکٹر صاحب کاکول تشریف لائے۔ دروازے پر ملاقات ہوئی۔ آپ قدرے خوش ہوئے کہ ایک صاحب تو زندہ دِل نکلے جو آپ کی احوال پُرسی کے لیے تشریف لائے ہیں۔ لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ آپ کی دلداری کے لیے نہیں بلکہ اپنی مطلب برآری کے لیے تشریف لائے ہیں۔ اُنہیں اپنے کسی عزیز کو ایبٹ آباد پبلک سکول میں داخل کروانا تھا اور بھلا محترم پرنسپل عبدالرحمٰن صاحب کے لیے آپ سے بڑھ کر معتبر سفارش کسی کی ہو سکتی تھی؟ آپ نے تواضع کے بعد مہمان کو رخصت کیا اور فرمایا: ”میں عبدالرحمٰن صاحب سے ذکر کروں گا۔“ ایک اور ڈاکٹر صاحب نے کوئی چھ ماہ بعد ایک خط لکھا۔ اس کے علاوہ خاموشی ہی رہی۔

تحدیثِ نعمت

۱۹۷۴ء کے واقعات کو قلم بند کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے چند ایسے امور کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت و تائید کا مظہر ہیں۔ ۱۹۷۴ء کے واقعات کے رونما ہونے سے قبل اور بعد میں خاص تصرفِ الٰہی سے خاص انتظامات اور واقعات ہوئے، جو اُس مصیبت کی گھڑی میں آپ کی تقویت اور اطمینانِ قلب کا باعث ہوئے اور خدا تعالیٰ کی خاص حکمت کا

اظہار ہوا۔ ان امور کا ذکر آپ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر کیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

میرے بیٹے عبداللہ سعید کی پی ایم اے کاکول میں تعیناتی کی معیاد ختم ہو چکی تھی اور اپریل ۱۹۷۴ء کو ملٹری بورڈ میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ اُنہیں کسی بریگیڈ کا انچارج بنا دیا جائے گا۔ اور وہ کاکول سے جانے کی تیاری کر رہے تھے، لیکن کمانڈر انچیف نے اِس حکم کو بدل دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ جاری کورس کے اختتام یعنی اکتوبر تک یہیں رہیں، تصرفِ الٰہی سے اِس صورت کا بننا ہمارے حق میں بہت اہمیت کا حامِل ثابت ہوا۔

دوسری بات یہ کہ میرے داماد کرنل فیروز عالم صاحب نے ایک سال پہلے کوشش سے اپنی پوسٹنگ ایف ایف سنٹر ایبٹ آباد میں کرائی تھی، اور اِس دوران اُنہوں نے اپنا مکان یہاں تعمیر کروا لیا تھا۔ فوج کی طرف سے اُنہیں جو مکان ملا ہوا تھا، وہ ہمارے مکان کے بہت قریب تھا اور عقبی کھڈ کے راستہ سے صرف پانچ منٹ میں ہمارے ہاں آ جا سکتے تھے۔ اس محلِ وقوع نے آنے والی گھڑی میں ہماری غیبی مدد کی۔

تیسری بات یہ کہ میرا چھوٹا بیٹا میجر ناصر احمد سعید دو چار ماہ پہلے سے ایف ایف سنٹر میں تعینات تھا۔ اُس کا مکان بھی کرنل فیروز عالم کے مکان کے قریب ہی تھا۔ بعد کے واقعات میں اِن سب امور کی حکمتِ عملی ظاہر ہوئی۔

اولاد کی ثابت قدمی پر اللہ تعالیٰ کا شکر

آپ نے تحریر فرمایا:

میرے چار بیٹے فوج میں افسر ہیں۔ اُن سب نے انشراحِ صدر اور جرأت مندانہ طور پر اپنے احمدی ہونے کا ہر موقعہ پر اعلان کیا۔ اُن میں سے عبداللہ سعید اُس وقت بریگیڈئر تھا اور قریباً قریباً یہ یقین کیا جا رہا تھا کہ اُس کی جو ترقی ہونے والی ہے وہ رُک جائے گی۔ بلکہ ہمارے دوست میاں ممتاز احمد فاروقی صاحب نے اسلام آباد سے لکھا بھی کہ ترقی روک لینے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ مگر فرزندم عبداللہ سعید نے اس کی کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ مختلف تھا۔ واقعہ کے تقریباً دو ماہ بعد میجر جنرل ہو گئے۔ چنانچہ اُس کی ترقی ہوئی اور بڑی شان اور عزت کے ساتھ ہوئی۔ تین بیٹے میجر ہیں۔ اپنے اپنے رنگ میں انہوں نے بھی جرأت ایمانی کا نمونہ پیش کیا۔ ان میں سے میجر اکرام سعید کو ایک اور آفیسر نے، جو خود بھی ایک احمدی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور کچھ کمزوری کا شکار ہو گیا تھا اور بدقسمتی سے بعد میں وہ فوج سے ریٹائر بھی کر دیا گیا، مشورہ دیا کہ تم لوگ اپنے باپ سے کہو کہ وہ احمدیت سے انکار کر دے۔ ورنہ تم سب کا اور خاندان کا مستقبل بڑا تاریک ہو جائے گا۔ اکرام نے بڑی سختی سے اسے جواب دیا کہ تمہیں شرم نہیں آتی۔ کیا ہم اپنے باپ کو مشورہ دیں؟! اور پھر غلط مشورہ دیں! اگر خدانخواستہ ہمارا باپ احمدیت سے اس موقعہ پر انکار کر دیتا تو ہم تو دنیا میں منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہتے، کہ ہم بے ضمیر (characterless) باپ کی اولاد ہیں۔

میں نے جب یہ بات کسی سے سنی تو اس بچے کے لیے میرے دل سے دعا نکلی۔ اور مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ جتنی کہ دنیا کی ساری دولت بھی کسی کو مل جائے تو شاید اُسے بھی اتنی خوشی نہ ہو گی۔ فالحمدللہ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے جس کے شکر کا حق مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ○ (اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما، تُو سننے والا جاننے والا ہے)(۲:۱۲۷)۔

کرنل شوکت محمود (داماد) کی ثابت قدمی

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر سے اقتباس

خان بہادر غلام ربانی مرحوم آف مانسہرہ کے فرزند کرنل شوکت محمود نے کوئٹہ سے مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۷۴ء کو میرے نام ایک خط انگریزی میں لکھا، جس میں ۱۱ جون ۱۹۷۴ء کے سانحہ پر انہوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے مجھے کئی رنگ میں تسلی وتشفّی کرائی، جس سے میرے غم کا بوجھ ہلکا ہوا۔ انہوں نے اس واقعہ کو اور اس نقصان کو کسی اعلیٰ تر کام کے میرے سپرد ہونے کیلیے پیش خیمہ قرار دیا۔ گویا اس کے سامنے میرے بارے میں آئندہ کے حالات بیّن اور واضح تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا۔ اور مجھے ان دنیاوی جھن جھٹوں سے آزاد کرا کے دین کی خدمت کا موقعہ بخشا۔ الحمدللہ۔ ثم الحمدللہ۔

کرنل شوکت صاحب نے اپنے خط میں اپنے بارے میں بھی ایسے ہی عزم کا اظہار کیا تھا کہ اس اعلیٰ مقصد میں جو آپ للہ فی اللہ کریں گے وہ بھی میرا ساتھ دیں گے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں بھی اپنے خاص الخاص فضل وکرم سے خدمتِ دینِ اسلام کے مواقع عطا فرمائے۔

اپنے فرزند عبداللہ سعید سے متعلق تحریر

سابقہ اوراق میں میرے بیٹے عبداللہ سعید کا ذکر آیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات

بھی بیان ہوئی تھی کہ وہ پی ایم اے کاکول کے کمانڈانٹ تھے اور بریگیڈیئر کے عہدہ پر فائز تھے۔ اتفاق سے پی ایم اے سے ملحق ایک قطع اراضی، ربوہ جماعت نے اپنے گرمائی ہیڈکوارٹر کی تعمیر کے لیے، عبداللہ سعید کے زمانہ میں ہی خریدا۔ اور مخالفین کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ سب کچھ عبداللہ سعید کے ایما پر اور اس کے ہی انتظام و انصرام کے تحت ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں مخالفین میرے حوالہ سے بھی عبداللہ سعید سے متعارف تھے۔ متعارف ہی نہیں بلکہ سخت معاند تھے۔ اور طرح طرح کی سکیمیں اور منصوبے اس کے خلاف باندھتے تھے۔ اُن کا خیال یہ بھی تھا کہ ۱۱ جون کو عبداللہ سعید نے میرے مکان پر فوج کا ایک دستہ میری معاونت اور نگرانی کے لیے تعینات کر رکھا ہے۔ حالانکہ صورتِ حال بالکل اس کے برعکس تھی۔ جب میرا مکان جل رہا تھا، تو عبداللہ سعید کاکول میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب ہجوم اپنا کام کر کے چلا گیا تو اس نے ہمیں ہمارے مکان سے بالواسطہ بحفاظت نکلوایا اور اپنے ہاں پناہ دی۔ یہ پناہ بھی سراسر اُس کی ذاتی حیثیت سے تھی۔ محکمہ اور حکومت نے کسی طور اس امر کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔

اسی دوران عبداللہ سعید کی ترقی کا معاملہ بھی زیرِ غور تھا اور بظاہر روکاوٹیں بھی آئیں۔ بلکہ مخالفین نے یہاں تک تاثر دیا کہ اُس کو ترقی نہیں مل رہی ہے۔ وہ اپنی ملازمت سے موقوف ہو گیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا۔ اس کی ترقی ہوئی اور حسبِ پروگرام اسے کوئٹہ میں جنرل آفیسر کمانڈنگ (GOC) بنا دیا گیا۔ کوئٹہ میں جی او سی کے لیے جو رہائش گاہ مختص تھی۔ وہ آرچرڈ ہاؤس (Orchard House) یعنی ثمر بار بنگلہ کہلاتی تھی۔ اس میں پھول اور پھلوں کے بے شمار درخت ہیں۔ کاکول میں تو خوبانی کے ایک دو ہی درخت تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے اُس کی صلہ رحمی کے صلہ میں پھلوں پھولوں کا باغ دے دیا۔ بعدازاں صوبہ بلوچستان کے گورنر (مارشل لا ایڈمنسٹریٹر) ہوئے۔ پھر ایک دو جگہ، پاکستان کے سفیر بھی بنے۔ اب وہ بیرون ملک امریکہ کے شہر ہوسٹن میں مقیم ہیں اور ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ خدمت دین ہے۔ چنانچہ ان کی کوشش اور جدوجہد کے نتیجہ میں قرآن کریم کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ مع متن وتفسیر چھپ چکا ہے۔ اور اب حضرت مولٰنا محمد علیؒ کی شہرہ آفاق کتاب ”ریلیجن آف اسلام“ اور محمد دی پرافٹ کے ہسپانوی تراجم کرانے کے بعد پریس میں جانے کے لیے تیار کر چکے ہیں اور مغربی ممالک میں اشاعتِ دین کے کام میں حصہ لے رہے ہیں۔

دورانِ تحریر دُعا

اپنی تحریر میں جس مقام پر آپ نے اپنے خاندان اور اولاد کی احمدیت پر ثابت قدمی کا ذکر فرمایا ہے وہاں آپ کا دِل رقت سے بھر گیا اور نوکِ قلم سے یہ دُعا نکلی جو درج ذیل ہے:

اے اللہ ہم بہت کمزور ہیں۔ تو ہم پر رحم فرما۔ اور میری ہر دو بیویوں کے دل کی گہرائیوں میں بعض محرومیوں کا ملال تھا، جس کا اظہار انہوں نے شاذ و نادر ہی کیا، اسے بھی تو مٹا دے۔ اور انہیں اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ (یہی وہ ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے) (البقرۃ ۲:۱۵۷) کا سچا مصداق بنا دے۔ اور میرے لیے اگر یہ سب کچھ میری بے حد وحساب تقصیرات کے کفارے کے طور پر قبول فرما کر تو میرا خاتمہ بالخیر کرے اور ایسی حالت میں مجھے اس دنیائے فانی سے اٹھائے کہ تو مجھ سے راضی ہو اور مجھے وہاں کی باز پرس سے آزاد کر دیا جائے تو میرے لیے

یہ سودا بہت ہی نفع والا ہوگا۔ میں تجھ سے بہت ہی راضی ہوں کہ رحیم و کریم اللہ تو باوجود میری نالائقیوں، ناپاکیوں، ناسپاسیوں، طرح طرح کی نافرمانیوں اور اپنے حقوق اور تیرے بندوں کے حقوق میں فروگذاشتوں کے، مجھ سے خوش ہوجا۔ اگر لائقِ قبولیت نہیں ہے تو اس نالائق کو اس امتحان کے عوض میں جو اس پر گذرا اور اس پر تیری رضا سمجھ کر اور امرِ ربی جان کر یہ ناخوش نہیں ہوا تو اس ناکارہ کو قبول فرمائے۔

اے میرے پروردگار! میں تو اس سانحہ کے حالات قلمبند کر رہا تھا تو نے میرے دل کو اس مقام پر رقت سے بھر دیا اور میری آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور میرے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نوک قلم پر جاری ہوئی۔ اے میرے اللہ! تو میری اس دعا کو رد نہ فرمانا کہ تو دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔ آمین۔



دسواں باب

پاکستان کی قومی اسمبلی کا فیصلہ۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء

روئیداد کی ایک جھلک

پاکستان میں مئی، جون ۱۹۷۴ء کی شورش اور فسادات کی خبروں کی اشاعت پر بندش تھی۔ تاہم پاکستان میں احمدیوں پر توڑے جانے والے ظلم وستم، قتل وغارت اور لوٹ مار کی خبریں بیرونِ ملک مقیم احمدیوں سے پوشیدہ نہ رکھی جاسکیں۔ جب اُنہوں نے اس پر کھلم کھلا احتجاج کیا تو دوسرے ممالک میں انسانی حقوق کے حوالے سے سوال اُٹھنے لگے۔ حکومتِ پاکستان نے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے جسٹس صمدانی صاحب کو اِن فسادات کی تحقیقات پر مامور کیا، جسے ”صمدانی کمیشن“ کا نام دیا گیا۔ جسٹس صاحب موصوف نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی مگر اُسے صیغۂ راز میں رکھا گیا اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کی حقیقت کو کبھی منظرِ عام پر نہ آنے دیا گیا۔

ایک طرف تو حکومت کی یہ برائے نام سی تحقیق تھی اور دوسری طرف شورش پسند عناصر بدستور سرگرمِ عمل تھے۔ اُن کی طرف سے حکومت پر مسلسل یہ دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ احمدیت کے مسئلہ کو مستقل طور پر حل کیا جائے۔ فتنہ پردازوں کے مطالبات میں سرفہرست یہی مطالبہ تھا کہ احمدیوں کو 'غیر مسلم اقلیت' قرار دیا جائے اور اُنہیں شعائرِ اسلام پر عمل کرنے سے روکنے کے لیے قانون بنایا جائے۔ حکومتِ وقت بہرطور اپنے اقتدار کا قیام چاہتی تھی، اور احمدیت کے مخالف عناصر کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اُٹھانے پر آمادہ تھی۔ چنانچہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے اِس مسئلہ کے حل کے لیے، جسے وہ ”نوے سالہ مسئلہ“ قرار دیتے تھے، قومی اسمبلی کے ارکان پر مشتمل ایک خصوصی کمیٹی قائم کی، جسے یہ کام سونپا گیا۔ اِس کمیٹی نے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور جماعتِ احمدیہ لاہور

اور جماعتِ احمدیہ ربوہ کو ہدایات جاری کیں کہ دونوں جماعتوں کے وفود، الگ الگ مقررہ اوقات میں اِس مخصوص کمیٹی کے روبرو پیش ہو کر اپنے موقف کی وضاحت کریں۔

طریقۂ کار یہ مقرر کیا گیا کہ پہلے دونوں جماعتوں کی طرف سے اپنے اپنے عقائد سے متعلق بیانات پیش کیے جائیں گے اور پھر دونوں جماعتوں کے وفود سے کمیٹی کی طرف سے سوالات ہوں گے اور بحث کی جائے گی۔

اُن ایام میں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کاکول میں مقیم تھے۔ آپ کی تمام تر سوچ، فکرمندی، دُعائیں، تضرع اور گریہ زاری صرف اور صرف جماعت کے مستقبل پر مرکوز تھی۔ اُن ایام میں اللہ تعالیٰ آپ کو رویا اور الہامات سے تسکین پہنچاتا رہا۔ ۱۲ اگست کو فجر کی نماز اور سیر کے بعد آپ استراحت فرما رہے تھے کہ یہ الفاظ زبان پر جاری ہوئے: 'الیس اللہ بکافٍ محمد ابن الجلال'۔ اس سے قبل آپ کو مرکز کی طرف سے اطلاع موصول ہو چکی تھی کہ آپ کو اُس آٹھ رُکنی وفد کا ممبر نامزد کیا گیا ہے جو اسمبلی کے سامنے پیش ہوگا۔ اِس الہام سے آپ کو تسکین نصیب ہوئی کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ آپ نے وفد میں شامل ہونا قبول فرما لیا۔ اپنی جماعت کی پراگندگی اور ضعف آپ کے لیے غم کا موجب تھا، اور اُس کے مستقبل میں اپنے ذاتی کردار کے متعلق آپ متفکر رہتے تھے، اور ہر قسم کی قربانی کے لیے ہر وقت آمادہ تھے۔ ۲۴ اگست نمازِ فجر کے بعد آپ تھوڑی دیر کے لیے بغرضِ آرام لیٹے۔ ابتدائی غنودگی میں یہ الہام ہوا:

اَنَّہٗ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَاَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ

(کہ وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے) (الحج ۲۲:۶)

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے ۲۴ اگست ۱۹۷۴ء کو آپ اسلام آباد پہنچ گئے اور محترم

ممتاز احمد فاروقی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے خالد عمر فاروقی کے گھر قیام فرمایا۔ فاروقی صاحب خود بھی مستقل طور پر اپنے فرزند کے ساتھ رہائش رکھتے تھے۔

جماعتِ ربوہ کے وفد کو پہلے پیش ہونے کی دعوت دی گئی تھی اور اُس کی تمام کاروائی مکمل ہونے کے بعد، جس میں چند ہفتے لگے، اب لاہور کے وفد کے پیش ہونے کی باری تھی۔ جماعت احمدیہ ربوہ کی قیادت خود خلیفہ سوم (ربوہ جماعت) مرزا ناصر احمد صاحب نے فرمائی۔ چونکہ کاروائی کی اشاعت پر پابندی تھی اس لیے اِس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا۔

جماعتِ احمدیہ لاہور کے نامزد وفد میں حضرت امیر مولٰینا صدرالدینؒ صاحب اور جنرل سیکرٹری مرزا مسعود بیگ صاحب کے علاوہ مولوی عبدالمنان عمر صاحب اور اُن کے معاونین مرزا عبدالطیف صاحب اور مرزا اسلیم صاحب، چوہدری فتح محمد عزیز صاحب، عبدالرحمان مصری صاحب، ڈاکٹر اللہ بخش صاحب اور ڈاکٹر سعید احمد صاحب شامل تھے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے علاوہ تمام اراکین وفد محترم فاروق اے شیخ صاحب کے مہمان تھے۔ ۲۵ اگست کی صبح آپ اراکین وفد سے ملاقات کے لیے وہاں تشریف لے گئے۔ باہمی صلاح مشورہ کے دوران آپ نے حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> دیکھیں! دو باتیں واضح اور قطعی ہیں۔ اُن کے بارے میں کوئی ابہام اور شک باقی نہ رہ جائے۔ اِس بات کو آپ مدِنظر رکھیں کہ حضرت صاحب کا دعویٰ نبوت کا نہیں تھا۔ ہم نے اُن کو کبھی نبی نہیں مانا اور وہ نبی نہیں تھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اُن کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا۔ یہ دو باتیں ہیں۔ ان کو بنیاد رکھ کر آپ بڑی ثابت قدمی سے یہ بات پیش کریں اور اگر ابہام والی باتوں میں وہ آپ کو اُلجھائیں تو آپ اُن میں نہ پڑیں چنانچہ آپ اِس اصول کو مدِّ نظر رکھیں۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

میری بات کی کیا وقعت تھی؟ لیکن اُنہوں نے کہا کہ یہی تو ہمارا اصول ہے۔ اسی لیے تو ہم آئے ہیں۔

۲۶ اگست کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب دوبارہ شیخ صاحب کے دولت خانہ پر تشریف لے گئے، تو مرزا مسعود بیگ صاحب نے یہ اطلاع دی کہ اسمبلی میں صرف پانچ افراد کو پیش ہونے کی اجازت ہے۔ درخواست کی گئی تھی کہ آٹھ افراد کے وفد کو پیش ہونے کی اجازت دی جائے، مگر منظور نہیں ہوئی۔ البتہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر چاہیں تو باقی ممبران اینٹی روم میں بیٹھ سکتے ہیں، اور بصورتِ ضرورت اُن سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔

آٹھ میں سے پانچ افراد کا مسئلہ زیرِ غور آیا، تو اُس وقت وہاں پر نامزد اراکینِ وفد کے علاوہ ارجمند صادق صاحب، کرنل عبداللطیف صاحب اور محمد انور صاحب بھی موجود تھے۔ حاضرینِ مجلس کی طرف سے یہ تجویز سامنے آئی کہ حضرت امیر، سیکرٹری صاحب، مولوی عبدالمنان عمر صاحب بمع ایک معاون کے اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اسمبلی میں جائیں۔ لیکن مولوی عبدالمنان صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ جائیں گے تو اپنے دونوں معاونین کے ساتھ ہی جائیں گے۔ اُن کے بغیر وہ نہیں چل سکتے۔ اُنہوں نے ایک پلان اور تدبیر کے تحت تیاری کی ہوئی ہے۔ اِس طرح ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی شمولیت کی گنجائش باقی نہ رہی۔ تاہم ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا تھا کہ آپ فاروقی صاحب کے گھر اپنی قیام گاہ پر واپس تشریف لے گئے۔ لیکن رُخصت ہونے سے پہلے اتنا ضرور کہا:

میں اِسی غرض کے لیے آیا ہوں۔ میں اب چلتا ہوں۔ اگر یہ فیصلہ ہوا کہ مجھے اسمبلی میں پیش ہونا ہے تو مجھے خالد فاروقی صاحب کے گھر فون پر اطلاع دے دیں۔ میں صبح سویرے تیار رہوں گا اور اگر مجھے نہ جانا ہوا تو وہیں بیٹھ کر اللہ اللہ کروں گا۔ اور جو بھی فیصلہ ہوا اُس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

۲۷ اگست اسمبلی کی کاروائی کا پہلا دِن تھا۔ روانگی سے قبل سیکرٹری صاحب نے فون پر آپ کو اطلاع دیتے ہوئے فرمایا کہ مولوی عبدالمنان دونوں معاونین کو ہمراہ لے جانے پر مصر تھے۔ چنانچہ اب حضرت امیر، جنرل سیکرٹری صاحب اور وہ تینوں ارکان ہی اسمبلی میں پیش ہوں گے۔ اِس پر آپ نے فرمایا: ”میں یہیں پر بیٹھ کر دُعا کرتا ہوں“۔ سیکرٹری صاحب نے کہا: ”مصری صاحب اور ڈاکٹر اللہ بخش صاحب نے بھی یہی جواب دیا ہے“۔

اِس سے قبل ۲۰ جولائی ۱۹۷۴ء کو ایک پانچ رُکنی وفد امیر قوم کی سربراہی میں پیش ہوا تھا اور مرزا مسعود بیگ صاحب نے ایک بیان پڑھا تھا جو جماعتِ احمدیہ لاہور کے عقائد کے بارے میں تھا۔ یہ بیان محترم میاں نصیر احمد فاروقی صاحب کا تحریر کردہ تھا، جو نہایت واضح اور جامع تھا۔ شنید یہی ہے کہ اِس بیان کو سُننے کے بعد خصوصی کمیٹی کے ارکان میں سے اکثریت کی رائے یہی تھی کہ اِس بیان کی روشنی میں لاہوری احمدیوں کو کسی صورت غیر مسلم قرار نہیں دیا جا سکے گا۔

۲۷, ۲۸ اور ۲۹ اگست کو اسمبلی کی کاروائی کے اوقات میں ممتاز احمد فاروقی صاحب اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب باہم مل کر نوافل ادا کرتے رہے اور دُعاؤں میں مصروف رہے۔ آپ کو یقین کامل تھا کہ جماعتِ احمدیہ لاہور کا وفد اپنا موقف واضح طور پر بیان کرے گا اور یہ بات گمان میں بھی نہ گذری تھی کہ اِس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ۲۹ اگست کو بعد از دوپہر، اسمبلی کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد جب کچھ احباب آپ سے ملاقات اور کاروائی کی روئیداد سے آگاہ کرنے آئے تو یہ خبر لائے کہ وفد اپنے مؤقف کی واضح اور حتمی صورتِ حال پیش نہ کر سکا تھا۔ بالخصوص اختلافِ سلسلہ اور حقیقی اور غیر حقیقی مسلمان کے حوالے سے۔

مرزا مسعود بیگ صاحب نے اسمبلی کی روئیداد بیان کرتے ہوئے بتایا کہ حلف برداری کے بعد حضرت امیر مولٰنا صدرالدینؒ صاحب نے فرمایا کہ اُن کی سماعت اتنی اچھی نہیں ہے، اس لیے مولوی عبدالمنان صاحب اُن کی نمائندگی کریں گے۔ مولوی عبدالمنان صاحب نے عمدہ بحث

کی ،لیکن اختلافِ سلسلہ کے سوال پر مبہم سے جواب دیئے۔ اور اِس سوال پر کہ آیا احمدی دوسرے مسلمان کو مسلمان سمجھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا کہ مسلمان تو ہیں مگر حقیقی مسلمان نہیں۔

اِس موقعہ پر مرزا مسعود بیگ صاحب نے بولنے کی اجازت چاہی اور ہر دو امور کی مکمل وضاحت کی جو نوٹ کر لی گئی۔ تاہم حالات زیادہ امید افزا معلوم نہ ہوتے تھے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا اب اسلام آباد میں مزید رُکنا بے مقصد ہوتا۔ چنانچہ آپ ۳۰ اگست کی صبح ،نہایت افسردہ دِل کے ساتھ بمع اپنی زوجہ (والدہ محمد سعید) کے، جو اِس سفر میں آپ کے ہمراہ تھیں، خالد فاروقی صاحب اور اُن کی بیگم شوکت فاروقی صاحبہ کی آرام دہ، باعزت و بامروت اور پاکیزہ مہمان نوازی کی یادیں دل میں بسا کر اور اُن کے لیے تہہ دل سے دُعا کرتے ہوئے واپس پی ایم اے تشریف لے آئے۔

اب آپ کو اسمبلی کے فیصلے کا انتظار تھا، اور جماعت کی بقا اور سلامتی کے لیے شب و روز دُعائیں ہی ان کا معمول تھا۔ یہاں آپ کے ان ایام کے الہامات و رویا کا ذکر کر دینا نا مناسب نہ ہو گا گو کہ اُن کی تعبیر اور حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ خبیر و علیم کے علاوہ کسی کو نہیں۔ وہی قدرت رکھتا ہے کہ وہ کب اور کس رنگ میں اُنہیں ظاہر فرمائے۔

۶ ستمبر ۱۹۷۴ء کے الہامات آپ نے اپنی ڈائری میں اِس طرح تحریر فرمائے ہیں:

۱۔ Rome was retaken

(اپنی جماعت کی دوبارہ شاندار زندگی بعد از حالتِ مظلومیّت کے متعلق تعبیر کی)

۲۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الَّذِیْنَ لَا یُصْلِحُوْنَ۔ (اللہ کے نزدیک سب جانداروں سے بدتر وہ ہیں جو اصلاح نہیں کرتے)۔

(اُس وقت کی طوفانی مخالفت کے حامیوں کے متعلق معلوم ہوا (واللہ اعلم بالصواب)۔

۳۔ ۶ ستمبر دِن کسی وقت خواب میں موٹے سفید کاغذ کا ایک چھوٹا ٹکڑا دکھایا گیا جس پر صرف ایک لکیر کچھ اِس شکل میں ہے ـــــ ۔ کاغذ اور لکیر بہت خوبصورت اور اُوپر تھوڑی خالی جگہ پر نہایت خوش خط اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ لکھا ہے۔

۴۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء: صبح سویرے طلوعِ فجر سے پہلے جب آنکھ کھلی تو بے ساختہ یہی الفاظ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ زبان پر جاری تھے۔

اُسی شام ساڑھے چھ بجے پشتو خبروں میں اسمبلی کے فیصلہ کی، کہ احمدی کافر غیر مسلم اقلیت ہیں، خبر سُنی ۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کی کاروائی کے بعد پاکستان کے دستور ۱۹۷۳ء میں یہ ترمیم کی گئی:

A person who does not believe in the absolute and unqualified finality of the Prophethood of Muhammad (peace be upon him) the last of the Prophets or claims to be a prophet in any sense of the word or of any description whatsoever, after Muhammad (peace be upon him) or recognises such a claimant as a Prophet or religious reformer is not a Muslim for the purpose of

Constitution or law.

(جو شخص حضرت محمد ﷺ کو غیر مشروط طور پر خاتم النبیین نہیں مانتا یا آپؐ کے بعد کسی بھی مفہوم اور معنوں کے لحاظ سے نبوت کا دعویٰ کرتا ہے یا ایسے مدعی کو نبی یا مصلح مانتا ہے وہ دستور اور قانون کی رُو سے مسلمان نہیں ہے)۔

اور اس ترمیم کے ذریعہ جماعت احمد یہ ربوہ اور جماعتِ احمد یہ لاہور ہر دو فریق کو غیر مسلم قرار دے کر دوسری اقلیتوں یعنی، ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں، بدھوں اور پارسیوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

اپنے آپ کو اہلِ بصیرت جاننے والے کُور نظروں کو یہ بھی نظر نہ آیا کہ ہزاروں کلمہ گوؤں کی تکفیر کیا معنی رکھتی ہے؟ اِس کا اثر جو احمد یوں پر ہوا، وہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ اور یہ بھی اُس کے علم میں ہے کہ مسئلہ ختم نبوت کا کون قائل ہے اور کون منکر۔ تاہم احمدی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کبھی تھے اور نہ ہیں اور نہ ہوں گے۔

اِس اعلان کے بعد دیگیں پکائی اور تقسیم کی گئیں، مٹھائیاں بانٹی گئیں اور خوب جشن منائے گئے اور ہفتۂ تشکر منایا گیا، کہ اب یہ سرزمین کفر سے پاک ہوگئی۔ اور اب اس پاک سرزمین، کشورِ حسین میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہو جائیں گی۔

اسمبلی کی تمام کاروائی، فیصلے اور جماعت کے بیانات سے متعلق ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح فرمایا ہے:

ہماری جماعت کی طرف سے یہ بیانات جس شخص اور جس صورتِ حال میں ہوئے، ہمارے موقف کی واضح اور حتمی صورت حال پیش نہیں کر رہے تھے۔ اور اس وجہ سے اور اس بیان سے اسمبلی کا نقطہ نظر ہماری جماعت کے

بارے میں بدل گیا۔ میری سوچ یہ ہے کہ ملک کے جو حالات اس وقت تھے، ان کے پیش نظر لاہوری جماعت کو اپنے عقائد اور مؤقف بیان کرنے کا کتنا ہی زیادہ سے زیادہ وقت ملتا، اور سوال وجواب میں کتنی ہی حقیقت، اصلیت و صحت و درستی کو سامنے رکھا جاتا، اور کتنے ہی دلائل وحقائق پیش کیے جاتے، اور اسمبلی کو مطمئن کرنے کی کتنی ہی کوشش کی جاتی، مگر نتیجہ تو موجودہ صورت میں ہی نکلتا۔ یعنی ربوہ اور لاہوری ہر دو جماعتوں کو غیر مسلم قرار دیا جاتا۔ کیونکہ اس سے کم تر فیصلہ پر ملاں لوگ راضی نہ ہوتے۔

باوثوق ذرائع کا کہنا ہے کہ PPP کے اراکین نے قبل ازیں ایک ایسا مسودہ قرارداد کا تیار کر لیا تھا جس کے مطابق لاہوری جماعت کو غیر مسلم قرار نہیں دیا جانا تھا۔ یہ جماعت اس سے exclude (مستثنٰی) کی جارہی تھی۔ مگر ہماری جماعت کے ساتھ بحث وتمحیص کے ماحول اور اس کے جائزے سے یہ انداز بالکل بدل گیا۔

مفتی صاحب نے ایک مجلس میں کہہ دیا تھا کہ اگر لاہوری جماعت کو مستثنٰی کیا گیا تو ہم پھر تحریک چلائیں گے۔ اِس موقعہ پر اُس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہمیں مزید دردِ سر نہیں لینا چاہئے۔ اور اُس نے پوچھا کہ لاہوری جماعت کے افراد کی تعداد کتنی ہے۔ تو بتایا گیا کہ چند ہزار سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ قلتِ تعداد دیکھ کر اور پھر اس پر بھاری دباؤ دیکھ کر بھٹو نے اس جماعت کو بھی غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

اس وقت کے اسمبلی کے اسپیکر نے بیان دیا کہ ربوہ جماعت تو غیر مسلم ہیں ہی، لاہوری جماعت اپنے عقائد کے لحاظ سے 'منافق' ہے اور منافق کافر سے بھی

بدتر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحئی سعید کی اُس وقت کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار سے قرابت داری تھی۔ ان ایام میں یحییٰ بختیار نے عبدالحئی سعید سے کہا کہ لاہوری جماعت اسمبلی میں اپنا صحیح مؤقف پیش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت میں ففتھ کالم کام کر رہا ہے اور وہاں کوئی اینٹی جماعت پودا پلانٹ کیا گیا ہے۔

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کا فیصلہ اور آپ کا ردِّ عمل

آپ کی اپنی تحریر سے:

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو جو اعلان احمدیہ تحریک کے خلاف سرکاری سطح پر کیا گیا تھا۔ اس کا ردِّعمل ہم لوگوں پر کچھ سِوا نہ تھا۔ کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس تحریک کے خلاف نہ جانے کتنی بار کفر کے فتوے لگائے گئے تھے۔ حضرت بانیٔ سلسلہ نے بھی اس پر کوئی شدید ردِّعمل کا اظہار نہیں فرمایا تھا۔ بلکہ آپ نے نثر کے علاوہ منظوم کلام میں اس بارے میں یوں فرمایا:

تم ہمیں دیتے ہو کافر کا خطاب کیوں نہیں لوگو تمہیں خوفِ عِقاب

اور فرمایا:

بعد از خدا بعشقِ محمد مخمرم گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

کیونکہ اس قسم کے فتوے دینا دلانا ملاں لوگوں کا شغل عام ہے، کوئی جماعت، گروہ، طبقہ اور کوئی شخص ایسا نہیں گذرا جس پر علماء نے کفر کے فتوے نہ لگائے ہوں۔ اس لیے یہ امر ہمارے دلوں پر گراں نہ گذرا۔ بلکہ قوم کی حالت پر ترس اور رحم آتا تھا کہ یہ لوگ اس خرابے کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں اور دل سے دعا نکلتی

تھی کہ اے خدا تو ان کے دلوں کو کھول دے اور ان کی عقل و سمجھ کو روشن کر، ان کے بغض و کینہ کو دور کر کہ وہ حق کو پہچان سکیں۔ پھر اس اعلان پر ہم لوگوں کو چنداں گھبراہٹ اور فکرمندی نہیں ہوئی اور ہمارے دل پر کوئی رنج وغم نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس موقعہ پر جس دن وزیراعظم پاکستان نے احمدیوں کی تکفیر اور غیرمسلم اقلیت ہونے کے فیصلہ کا اعلان کیا۔ کرنل حفیظ کے اہل خانہ ہمارے پاس ہماری دلداری اور اظہار افسوس کے لیے آئے۔ تو انہوں نے خلاف توقع ہمیں مطمئن پایا، تو وہ حیران رہ گئے۔ کہ ہم لوگ اس قدر مطمئن اور طمانیت قلب کے ساتھ بیٹھے ہیں جبکہ ان کے خیال کے مطابق ہمیں غم واندوہ میں مبتلا ہونا چاہیئے تھا۔

میری دلی کیفیت

بے وفائی اور ناقدرشناسی کا جو مظاہرہ میں نے اس ابتلاء اور آزمائش کے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ زندگی کا سب سے بھاری حادثہ بصورت قحط الرجال پیش آیا۔

کلینک معہ تنصیبات اور بالائی مکان سے موٹر اور جملہ اسباب جلایا گیا اور کھنڈرات کی شکل اختیار کر گیا۔ مجھے چنداں اس کا غم نہ تھا، کیونکہ میرا ایمان ہے کہ ہر مکان خرابے کے لیے بنتا ہے اور ہر انسان موت کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اور میں سمجھتا تھا کہ میں حق پر ہوں۔ یہ سب کچھ ناروا سلوک میرے ساتھ اس لیے ہو رہا ہے کہ میں نے اللہ کے ایک فرستادہ بزرگ کا دامن پکڑا ہے۔ جو برحق ہے۔ سچا ہے۔ چنانچہ یہ دکھ درد میرے لیے عذاب نہیں، بلکہ آزمائش ہے۔ اللہ مجھے آزما رہا ہے۔ لہذا، اگر میری یہ آزمائش ہے تو الحمدللہ۔ میں ذرا

بھی آزردہ خاطر نہیں ہوں۔ یہ تکلیف میرے لیے کوئی تکلیف نہیں ہے اور اگر یہ میرے لیے عذاب ہے، تو اے اللہ! مجھ پر رحم فرما میری خطاؤں کو معاف کر میری لغزشوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کر، میری غلطیوں سے درگذر کر۔ میرے گناہوں کو بخش دے اور تو اپنی پناہ میں لے لے۔

تو اس خوف وخطر کے جان لیوا حالات میں میرے دل کی کیفیت یہ تھی کہ مجھے پریشانی اور گھبراہٹ سے بڑھ کر کچھ عجیب سا انجانا سکون وقرار میسر تھا۔ بعد کے واقعات نے مجھ پر انعامات الٰہی کے دروازے کھول دیئے۔ مجھے دنیا کے جھگڑوں بکھیڑوں سے نجات دی۔ مجھے روزی کمانے کے دھندوں سے آزاد کر دیا۔ دنیاداری اور دنیوی الائشوں کی محبت مجھ پر ٹھنڈی کر دی۔ وہ اب خود دیتا ہے اور بغیر حساب دیتا ہے۔اس کے لیے اور اس کی راہ میں کام کرنے کا زیادہ سے زیادہ وقت ملتا ہے، اور اسی میں مجھے راحت ملتی ہے اور اسی سے مجھے چین و قرار نصیب ہوتا ہے۔ مجھے نہ ماضی کا خوف وغم ہے اور نہ مستقبل کا حزن۔ مجھے اگر کسی امر اور احتیاج کی ضرورت ہے، تو وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے اور اس کی بخشش وفیض ہے۔ میں محتاج ہوں تو اسی کے در کا محتاج ہوں۔

اب بظاہر ہم بے نوا ہیں، بے دست و پا ہیں، حکومت اور عوام کی ہر ہر سوچ ہمارے خلاف ہے۔مسلم ہونے اور مسلم کہلانے کے ہر تشخص سے ہمیں محروم کر دیا گیا ہے۔ اور ہمارے لیے مسلم کہلانے اور کہنے پر قدغن ہے۔کلمہ پڑھنے بولنے کی ممانعت ہے۔اذان دینے کی بندش ہے۔مساجد کی علامات ختم کرنے کے آرڈیننس جاری کیے گئے ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر سزائیں اور

تعزیرات مقرر ہیں۔خوف و ہراس کے سارے کے سارے سامان اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔اور احمدیوں کو جانی و مالی نقصان پہنچانے کی ہرممکن تدابیر کی جاتی ہیں،لیکن ان سب حالات میں ہم چنداں گھبراتے نہیں ہیں۔کہ ایک حکومت اور بادشاہت اس خدا کی بھی ہے،جس کے رحم وکرم کی ہم بھیک مانگتے ہیں۔وہ بادشاہ اور بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہے اس کی بادشاہت میں عدل ہے،انصاف ہے،احسان ہے۔صلہ ہے،انعام ہے،بخشش ہے،رحم ہے،کرم ہے۔اور اس بادشاہ سے ہم فریادی ہیں۔کہ اللہ ہم پر رحم فرما۔ہمارے بھائیوں پر ہدایت اور راہنمائی کے دروازے کھول دے کہ وہ حق و باطل کی پہچان کریں۔بغض وکینہ سے دور ہو جائیں۔اے اللہ ان کی آنکھیں کھول دے۔اوران کو یہ حقیقت سمجھا دے کہ اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ، کہ ملک کفر وعصیان کے ہوتے ہوئے تو برقرار رہ سکتا ہے،مگر ظلم کے ہوتے ہوئے برقرار نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی ایک تحریر بعنوان ”ایک تلخ حقیقت“

سانحہ ۱۹۷۴ء میں ایبٹ آباد کی املاک کو نقصان پہنچا تھا۔کلینک اور عمارت کو نذر آتش کر دیا گیا تھا جس سے بھاری مالی نقصان ہوا تھا۔جو کچھ ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور منشاء کے مطابق ہوا۔اس اتلاف پر مجھے چنداں رنج و ملال نہ تھا،اوراس کے اتلاف کا ذکر مجھے کسی طور بھی پسند نہیں ہے۔اوراس کی تلافی کے متعلق کسی امداد کی طلب بھی میری طبیعت کے خلاف ہے۔مگر اس اتلاف کا ذکر اور تلافی کے متعلق امداد کی طلب کا بیان آئندہ صفحات میں کر رہا ہوں۔اس کا مقصد قارئین سے اظہار افسوس کی طلب گاری نہیں۔ بلکہ اس کا

مقصد قارئین پر یہ تلخ حقیقت واضح کرنا ہے کہ احمدیت کو ختم کرنے کے لیے ۱۹۷۴ء کی تحریک صرف اور صرف عوامی ہی نہ تھی، بلکہ حکومت وقت اور اس کی تمام تر سوچ اور قوت بھی عوام کے ساتھ تھی۔ اور پاکستان کے اندر جو ملک گیر مخالفت کی آگ بھڑکی اس کو سرکاری سطح پر بھی تائید و حمایت حاصل تھی۔ ہر دو طبقے ہر صورت اور ہر رنگ میں احمدیوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے اور ان کی جان و مال کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اور جان و مال اور عزت و آبرو کے دشمن تھے۔ قارئین سے گذارش ہے کہ وہ آئندہ صفحات کو اسی حقیقت سے آگاہی کے لیے پڑھیں-واللہ اعلم ما فی الصدور-

میں نے کسی دیگر شخص کی تحریک پر، معاوضہ نقصان کے حصول کی درخواست دفتر سرکار میں گذاری۔ ڈپٹی کمشنر، وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد، گورنر صوبہ سرحد، اور حتیٰ کہ وزیر اعظم کو بھی عرضداشتوں کی صورت میں بھجوائیں۔ میں نے اپنی درخواست پر اپنے تمام نقصان کا تخمینہ بہ تفصیل حاضر کیا تھا۔ یہ درخواستیں، یہاں شامل ہیں۔ ایک موقعہ پر ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے مجاز عملہ نے میری درخواست پر کاروائی کے طور پر خود موقعہ پر چھ لاکھ روپے لگایا۔ اور اس کی رپورٹ افسران بالا کو کر دی۔ ڈپٹی کمشنر نے میرا کیس مکمل کر کے کمشنر پشاور ڈویژن کو فنڈ مخصوص کرنے کی غرض سے ارسال کر دیا۔ اور مجھے اطلاع کر دی۔

مقامی طور پر ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کی سطح تک تو میرا معاملہ آگے بڑھا، مگر اوپر کی سطح پر یہ کہیں گم ہو کر رہ جاتا۔ اور اس پر نہ تو کسی قسم کا غور ہوتا اور نہ اس کا کوئی جواب آتا۔ آخر کار میں نے اس معاملہ کو اپنے دل سے نکال ہی دیا۔ اور میں

ایک وقت کے بعد اسے بالکل بھول گیا۔ سرکاری دفاتر کی طرف سے بھی آج تک کوئی کسی قسم کی کارروائی نہیں ہوئی۔

بھٹو دور کے بعد ضیاء حکومت آئی۔ میرا بیٹا عبداللہ سعید ایک دفعہ اپنے دورے پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ان دنوں ہم ایبٹ آباد میں تھے۔ بھوگڑ منگ کے محمد ریاض خاں کی دعوت پر، صوبہ سرحد کے گورنر، اپنے دورے پر آئے اور وہاں سے فراغت کے بعد کچھ وقت کے لیے مجھے بھی ملنے میرے مکان پر آ گئے۔ وہ عبداللہ کے کولیگ اور مخلص دوست تھے۔ وہ عبداللہ سے دوست یاری کے ناطے مجھے بھی عام طور پر جان جی کہہ کر پکارتے تھے۔ کہ گھر میں عام طور پر میرا نام یہی لیا جاتا ہے۔ بہرحال انہوں نے مختصر قیام کیا اور ہمیں مقررہ تاریخ کو نتھیا گلی گورنر ہاؤس میں آنے اور وہاں قیام کی دعوت دی۔ مجھے بھی عبداللہ کی ہمراہی میں آنے کی تحریک کی۔

ہم مقررہ تاریخ کو ان کی دعوت پر نتھیا گلی چلے گئے۔ وہاں گورنر ہاؤس میں قیام کیا۔ ایبٹ آباد سے روانگی کے وقت عبداللہ سعید نے مجھے کہا کہ مکان وغیرہ کے معاوضہ کے سلسلے میں جو کاغذات ہیں وہ بھی ساتھ لے چلیں۔ وہاں گورنر صاحب سے ذکر کریں گے۔ پہلے تو میں نے تامل کیا۔ اور ایسا کرنے سے احتراز کیا۔ مگر عبداللہ سعید کے تاکیدی اصرار پر میں کاغذات ساتھ لے گیا۔

نتھیا گلی میں ایک موقعہ ایسا آیا کہ اس سلسلہ میں ذکر چلا۔ میں نے گورنر صاحب سے کہا۔ کہ میرا یہ نقصان ہوا ہے۔ اور میں نے مختلف اوقات میں حصول معاوضہ کے لیے درخواستیں گذاری ہیں، جن کا کسی قسم کا جواب نہیں ملتا۔ نقصان کا اندازہ میرے نزدیک پانچ لاکھ روپے ہے، جبکہ سرکاری عملہ نے چھ

لاکھ روپے لگایا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس اینٹی احمدیہ تحریک کے دوران نقصان ہوا ہے، لیکن میں اس کے بارے میں مطمئن ہو چکا ہوں۔ اور کوئی خواہش نہیں۔ اور اس کے لیے مزید کوشش کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ میرے آبائی گاؤں دیب گراں میں، میرے بزرگوں کی نشانیاں ہیں۔ وہاں ہمارے آباؤ اجداد کی قبریں ہیں۔ اور قیمتی یادگار وہ مسجد ہے، جس میں ہمارے بزرگوں نے سجدے کیے ہیں اور اللہ کی یاد کی ہے۔ وہ ہمارے لیے ایک تاریخی اور مقدس و محترم جگہ ہے۔ نیز ہم گاہے گاہے وہاں جاتے ہیں، ہمیں بھی اپنے بزرگوں کی سجدہ گاہوں پر سجدہ کرنے کی قدرتی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ مگر ہم وہاں کسی طور پر داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ مسجد مخالفین کی مسجد سے ملحق تھی، جس پر انہوں نے قبضہ کرلیا ہے اور ملحق دیوار گرا کر انہوں نے اسے اپنی مسجد میں شامل کرلیا ہے۔ اور یہ امر ہمارے لیے تکلیف دہ ہے۔ اس معاملہ میں ہم لوگ از خود مقدمہ کرنے سے گریز کرتے ہیں، تاہم ہمارے گاؤں کے لوگ متحمل مزاج اور سمجھدار ہیں۔ اور بات پر کان دھرتے ہیں اور وہ مفسد و فتنہ پرداز نہیں ہیں۔ اگر آپ مناسب طور پر اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کر کے ان پر دباؤ ڈالیں اور کہیں کہ درمیانی دیوار کی حد بندی جوں کی توں قائم رہے تو بہت ممکن ہے کہ ہمارے بزرگوں کی سجدہ گاہ پھر ہماری تحویل میں آجائے۔

میری یہ ساری باتیں سن کر گورنر صاحب کچھ سوچ کے بعد کہنے لگے۔ کہ یہ کام ذرا مشکل ہے، لیکن آپ کے ذاتی املاک کے نقصان کے معاوضہ کے معاملہ میں کچھ خدمت کرسکوں گا۔ میں نے کہا یہ تکلیف آپ نہ فرمائیں۔ لیکن انہوں نے اصرار سے کہا کہ اس کے لیے کچھ کروں گا۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ گورنر صاحب نے عبداللہ سعید کو پشاور آنے کی دعوت دی اور مجھے بھی ہمراہی کی تاکید کی۔ چنانچہ ہم پشاور گئے اور گورنر ہاؤس میں دو تین روز قیام کیا۔ ہمارے قیام کے دوسرے دن دفتر سے فارغ ہو کر آئے تو ہاتھ میں کچھ ٹائپ شدہ کاغذات تھے۔ اور مجھ سے ان پر دستخط کرنے کو کہا۔ میں نے وہ کاغذات پڑھے تو وہ ایک درخواست گورنر کے نام میری طرف سے تھی۔ کہ مجھے اس قدر معاوضہ میری جائیداد و اموال پر نقصان کی تلافی کے طور پر دیا جائے۔ میں نے کچھ پس و پیش کے بعد اس پر دستخط کر دیئے۔ اور ضروری احکام صادر کرنے کے بعد برائے مزید کارروائی چیف سیکرٹری کو یہ درخواست روانہ کر دی۔ مگر ہوا یہ کہ دوسرے ہی دن وہ درخواست چیف سیکرٹری کے اختلافی نوٹ کے ساتھ گورنر صاحب کو واپس مل گئی۔ اس پر لکھا تھا کہ اینٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں ہونے والے نقصانات کی ادائیگی مرکزی حکومت کے احکام کے خلاف ہے۔

تو یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس کے بیان و اظہار کے لیے میں نے قارئین کرام کو اتنی زحمت دی اور اس قدر تفصیلات سے گذارا۔ اس موقعہ یا واقعہ سے پتہ چلا کہ اس وقت پاکستان بھر میں عوام سے لے کر سرکار تک ہر سطح اور ہر نہج سے ہر طرح کی مخالفانہ قوتیں جمع ہو کر احمدیت کشی کے درپے ہو گئی تھیں۔ اور ان کو بے یارو مددگار چھوڑ کر اور ان کے ہر نقصان و اتلاف کی پرواہ نہ کر کے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر غیر اسلامی اقدام اٹھانے پر مجبور تھیں۔

گورنر صاحب اس دفتری کارروائی پر مایوس بھی ہوئے اور کچھ خجالت بھی محسوس کی۔ ان کی سبکی ہوئی تھی اور بے طلب میری امداد کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرنا

چاہتے تھے۔ گورنر صاحب نے ایک دوسرے موقعہ پر ایک دوسرے رنگ میں میرے نقصان کی تلافی کی تجویز میرے ایک عزیز کی معرفت مجھے بھیجی، تو میں نے اپنے عزیز سے کہا کہ آپ اس مسئلہ کو بھلا ہی دیں۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ گورنر صاحب کو بھی یہ مسئلہ بھول گیا جبکہ میں تو یہ مسئلہ ایک عرصہ سے بھلا چکا تھا۔



گیارھواں باب

دارالسعید سے دارالسلام

وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَیَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ○

اور اللہ سلامتی کے گھر (دارالسلام) کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے۔ (یونس ۱۰:۲۵)

دارالسعید سے ہجرت کے بعد ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی کاکول کی پناہ گاہ مستقل نہ تھی۔ عبداللہ سعید کا تبادلہ ہو چکا تھا اور وہ کسی بھی وقت رختِ سفر باندھ کر نئی منزل کی طرف روانہ ہو سکتے تھے۔ یہ الفاظ قرآنی اِنِّیۡ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَھۡدِیۡنِ ، جو دارالسعید چھوڑتے ہوئے بےساختہ آپ کی زبان پر جاری ہوئے تھے، یہی آپ کے فیصلوں کے رہنما بن گئے، اور آپ نے اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد فرما دیے کہ جس ذات کی راہ پر چل پڑے ہیں وہی رہنمائی بھی فرمائے گی۔

۱۱ جون کے سانحہ کے بعد آپ کا دِل اپنے علاقے سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ اب وہ ایبٹ آباد یا ضلع ہزارہ کے کسی بھی مقام پر اپنا گھر بسانے پر اپنے دِل کو آمادہ نہ پاتے تھے۔ لاہور میں مقیم آپ کے عزیزوں کی دلی تمنا تھی کہ آپ لاہور تشریف لے آئیں اور مستقل طور پر یہاں ہی رہائش اختیار کریں۔ جماعت کے متعدد احباب بھی آپ سے یہی استدعا کر رہے تھے۔ مختلف اطراف سے آپ کو یہ بھی پیشکش کی جا رہی تھی کہ ایبٹ آباد کی کلینک کو بحال کر دیا جائے، ان میں سیمن کمپنی والوں کی بھی پیشکش شامل تھی کہ وہ آپ کی کلینک میں نیا ایکسرے پلانٹ لگا کر دیں گے۔ لاہور میں کلینک

بنانے کی بھی پیشکش کی گئی تھی، مگر اب آپ کا دِل اِس طرف مائل نہ تھا۔ آپ اپنی بقایا زندگی کا ہر لمحہ جماعت احمدیہ کے لیے وقف کر دینا چاہتے تھے۔ اگرچہ اِس سے قبل بھی آپ کا بیشتر وقت اسی کام میں صرف ہوتا رہا تھا، اور اب کچھ عرصہ سے یہ ارادہ رکھتے تھے کہ کلینک کے کام کے اوقات میں کمی کر کے زیادہ وقت دین کے کاموں میں صرف کریں گے۔ اِس کے لیے اُنہیں مناسب وقت کا انتظار تھا۔ آپ کے فرزند ڈاکٹر عبدالکریم سعید بیرون ملک اپنی تعلیم مکمل کرنے کے آخری مراحل میں تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ وہ آ کر آپ کی کلینک سنبھال لیں، اور جو خلقِ خدا اُس وقت اُس سے مستفید ہو رہی تھی وہ اِس فیض سے محروم نہ رہے۔

فروری ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی طبیعت قدرے ناساز رہی تھی۔ محترم نصیر احمد فاروقی صاحب نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کلینک کے اوقات میں کمی فرما کر اپنی صحت کی طرف توجہ دیں۔ آپ نے فاروقی صاحب سے بھی یہی فرمایا تھا کہ آپ، عبدالکریم سعید کی واپسی تک ہر صورت کلینک کے فیض سے عوام کو محروم نہیں کرنا چاہیں گے۔ یہ سن کر محترم فاروقی صاحب نے فرمایا: "میں بھی پاشا کو لکھوں گا کہ وہ جلد واپس آنے کی کوشش کرے"۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب جن لوگوں کی خدمت کے لیے صبح و شام ایک کرتے رہے تھے، اور اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کلینک جاری رکھنا چاہتے تھے، اُنہی کے ہاتھوں وہ کلینک برباد ہوئی۔ یہ اُن لوگوں کی اپنی بدقسمتی تھی کہ اُنہوں نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔ اور آپ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ ابتلاء کی اِن گھڑیوں میں اہالیانِ ہزارہ کی طرف سے جس بے وفائی اور ناقدرشناسی کا مظاہرہ ہوا تھا اُس سے آپ نہایت آزردہ خاطر تھے، اور اب مزید اِن لوگوں میں زندگی گزارنے کی کوئی تمنا آپ کے دل میں باقی نہ رہی تھی۔

ترکِ وطن کے بعد قدرتی طور پر آپ کا انتخاب لاہور تھا، جو جماعتِ احمدیہ کا مرکزی مقام تھا۔ لیکن ابھی آپ فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ آپ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہوگا۔ انہی ایام میں

آپ کے فرزند اکرام سعید، پیش آمدہ واقعات کے مدّنظر اپنے والدین کی ملاقات کے لیے کاکول آئے تو آپ سے اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ اُن کے ساتھ رہائش اختیار کریں، اور اس کے لیے وہ اپنا تبادلہ لاہور کروا لیں گے، کیونکہ آپ کی رہائش کے لیے موزوں ترین مقام لاہور ہی ہے۔ آپ نے اکرام کی اِس پیشکش کو پسند فرمایا۔ چنانچہ اکرام نے اپنے تبادلے کی کوشش شروع کر دی اور جلد ہی یہ ممکن بھی ہو گیا۔

مجلس منتظمہ کی میٹنگ کے لیے لاہور تشریف آوری۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۴ء

پاکستان کی قومی اسمبلی نے ۷ ستمبر کو جو فیصلہ صادر فرمایا تھا، اُس سے جماعتِ احمدیہ کو شدید ترین دھچکہ لگا تھا۔ اور تمام جماعت بے اطمینانی اور اضطراب کا شکار تھی۔ مذہبی رہنماؤں کی طرف سے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں کہ جماعتِ احمدیہ سے وابستگی رکھنے والوں کا انجام معاشرتی مقاطعہ اور جان و مال کی اتلاف کی صورت میں ہوگا۔ بہت سے مقامات پر ہر وقت اسی قسم کے خطرات منڈلا رہے تھے۔ کسی بھی احمدی کی جان و مال یا آبرو محفوظ نہ تھی۔ متعدد افراد، بااکراہ (تکلیف سے) ہی سہی، مگر جماعت سے لاتعلقی کا اعلان کر چکے تھے۔ جماعت کے کئی سرکردہ ممبران کی رائے یہ تھی کہ جماعت کا قیام موجودہ صورتِ حالات میں اپنے لیے خطرات کو دعوت دینے کے مترادف ہو گا۔ اس لیے اسے کالعدم قرار دے کر کسی نئے نام سے جماعت قائم کی جائے، اور اس وقت تک مرکزی دفاتر سے ہر قسم کے کام معطل کر دیے جائیں۔

چنانچہ مشاورت اور کوئی دستور العمل طے کرنے لیے لاہور میں ۱۳ ستمبر ۱۹۷۴ء کو ایک میٹنگ کا انعقاد طے پایا۔ اِس میں شرکت کے لیے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ۱۲ ستمبر کو بذریعہ ریل کار لاہور تشریف لے آئے اور اپنے داماد محمد احمد صاحب کے یہاں میئو گارڈنز میں قیام فرمایا۔

اُسی شام ساڑھے پانچ بجے چند صاحب الرائے حضرات کو میاں فضل احمد صاحب نے

اپنے دولت خانہ پر ایک مشاورتی میٹنگ کے لیے مدعو فرمایا۔ اظہارِ رائے کا موقعہ ہر ایک کو دیا گیا مگر کوئی حتمی فیصلہ کسی طرح بھی سامنے نہ آ سکا۔ اِس مشاورت میں مسعود اختر صاحب بھی شامل تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے اپنے مضمون بعنوان "حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب مرحوم و مغفور" (شمارہ پیغام صلح نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء) میں یوں تحریر فرما ہے:

حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ نے جو باتیں اس میٹنگ میں کہیں، وہ میری روحانی زندگی کا سرمایہ بن گئیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "میں کیسے حق کو باطل کہہ دوں۔ میں کیونکر حضرت مرزا صاحب کو مفتری اور کذاب قرار دے دوں۔ کیا منہ دکھاؤں گا میں حضرت صاحب کو اور اپنے بزرگوں کو قیامت کے روز۔ جہاں تک دنیاوی زندگی کے نفع اور نقصان کا تعلق ہے۔ میرا گھر تو جل ہی چکا ہے۔ اگر اللہ کو اس راہ میں جان لینا درکار ہوگا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں نے جو بیعت امام وقت کے ہاتھ پر کی تھی اس میں عہد ہی دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا کیا تھا۔ اگر تمام لوگ بھی چھوڑ جائیں میں اپنا عہد نبھاؤں گا۔" ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ الفاظ دل کی گہرائی سے ادا کیے تھے۔ ان الفاظ سے ان کی قوت ایمان اور عزم صمیم ظاہر تھا اور شاید میری طرح دیگر سامعین کو وہ قائد مل گیا جس کی ہر ایک کی نگاہیں متلاشی تھیں۔

۱۳ ستمبر ۱۹۷۴ء کی منتظمہ کی میٹنگ میں کئی آراء سامنے آئیں۔ اور ممبران کے درمیان پیش آمدہ حالات پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ میٹنگ کے بعد میجر عبدالطیف صاحب اور مسعود اختر صاحب نے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب سے ملاقات کی اور میٹنگ کے بارے میں استفسار کیا۔

مسعود اختر صاحب کی مذکورہ تحریر سے اقتباس:

مرحوم بھائی بریگیڈئرعبدالطیف صاحب جواُن دنوں میجر تھے،تشریف لائے اوران کی معیت میں، مَیں حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ سے پہلی بار ذاتی حیثیت میں ملا۔ ان سے بات چیت کے دوران میں نے محسوس کیا کہ وہ نہ صرف جماعتی معاملات پر بلکہ اپنے نجی معاملات پربھی بہت بے تکلفی سے،بغیر کسی بناوٹ ولگاوٹ کے بات کرتے ہیں۔ بالکل سیدھی سادی صاف ستھری بات۔ہم نے اس جلسہ کے متعلق ان کی رائے دریافت کی تو فرمانے لگے۔ مَیں نے تو اپنی پوزیشن واضح کردی ہےلیکن ہرممبرکوحق ہے کہ وہ اپنی پوزیشن کا خودفیصلہ کرے۔دین کے معاملہ میں کسی پرکسی قسم کا جبرنہیں ہونا چاہیے۔انشاء اللہ ان سے ایک فعال اورمضبوط جماعت ابھرے گی۔ یہ بڑاامتحان کا وقت ہے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں استقامت عطافرمائے۔

احمدیت کے اس شدیدترین ابتلاء کے دورکا ذکرکرتے ہوئے ڈاکٹرزاہدعزیز صاحب نے اپنے مضمون "ہمارے شفیق رہنمااورایک درخشندہ مثال" مطبوعہ پیغام صلح نومبردسمبر۱۹۹۷ءمیں تحریر فرمایا:

ہمارے احباب کو پاکستان کے مذہبی رہنماؤں کی جانب سے تحریک احمدیہ کا ساتھ نہ چھوڑنے کی صورت میں جان ومال کے نقصان اورمعاشرتی مقاطعہ کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔فطری طور پرہم سب جماعت کے مستقبل کے بارے میں اندیشوں، بےیقینی اورشکوک وشبہات کا شکار تھے۔اِن حالات میں ڈاکٹر سعیداحمدخان صاحب کی جانب سے سچائی کے نصب العین کے حصول اورتمام مشکلات اورخطرات کا ذاتی طور پرمضبوط کرداراورمستقل مزاجی کا مظاہرہ کرنے سے ہمیں نہ صرف بے پناہ تقویت حاصِل ہوئی بلکہ تحریک پر ہمارا

ایمان مزید پختہ ہو گیا۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

> انہی دنوں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اگر اللہ نے اِس جماعت کے خاتمے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر ہم اسے بچانے کے لیے جو کچھ چاہے کر لیں ہم اسے نہیں بچا سکتے۔ مگر میرا خیال نہیں ہے کہ اللہ نے اِس جماعت کے خاتمے کا ارادہ کیا ہے۔"

منتظمہ کی اِس میٹنگ کے بعد ایک مجلس عام ممبران کی بھی ہوئی۔ افرادِ جماعت میں کافی بے چینی پائی جاتی تھی اور وہ جماعت کے مستقبل کے بارے میں اطمینان چاہتے تھے۔ تمام افراد مسجد میں جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے نہایت دھیمے انداز میں، نہایت تسلی آمیز گفتگو فرمائی۔ اُس روز دارالسلام کے رہائشی بالخصوص خواتین اور بچے نہایت پر جوش نظر آ رہے تھے۔ ہاتھوں میں جھنڈے اُٹھا رکھے تھے، جن پر "احمدیت عین اسلام ہے" تحریر کیا گیا تھا۔ اُن کے جوش و ولولہ کو آپ نے سراہا، مگر تلقین کی کہ یہ وقت مظاہروں کا نہیں، بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے اور استقامت دکھانے کا ہے۔

مجلسِ منتظمہ اور مجلسِ معتمدین کے اجلاس۔ ۲ اور ۳ نومبر ۱۹۷۴ء

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب انجمن کی نہایت اہم مجالس کے لیے ایک بار پھر لاہور تشریف لے آئے۔ ۲ نومبر کی صبح کو آپ چوہدری فتح محمد عزیز صاحب (ایڈووکیٹ) کی معیت میں جسٹس محمد منیر صاحب سے ایک مشاورتی میٹنگ کے لیے تشریف لے گئے۔ جسٹس محمد منیر صاحب ۱۹۵۳ء کے احمدیوں کے خلاف اجتماعات اور فسادات کے بعد حکومتِ پنجاب کی طرف سے، ان معاملات کی تحقیقات کے لیے بطورِ کمیشن مقرر ہوئے تھے۔ یہ تقرری اور اُن کی پیش کردہ تحقیقاتی رپورٹ

"منیرکمیشن" اور"منیر رپورٹ" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اِس بناء پر جسٹس صاحب احمدیوں کے ہر دوفریق کے اعتقادات سے بخوبی واقف تھے۔ اِس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی ڈائری میں تحریر فرمایا تھا:

ہفتہ ۲ نومبر ۱۹۷۴ء

سابق چیف جسٹس محمد منیر سے مشورہ کے لیے آخری میٹنگ ہوئی۔ میں بھی گیا۔ چوہدری فتح محمد عزیز صاحب ایڈووکیٹ سے بہتر رائے جسٹس صاحب نہیں دے سکے۔ تاہم بعض باتیں تبادلۂ خیالات سے واضح ہوگئیں کہ نام تبدیل کرنے میں فائدہ نہیں۔ جماعت اگر رکھنی ہے اور عقائد بھی رکھنے ہیں، تو اپنا کام کر سکتے ہیں۔ مسلمان نہ کہلانا صرف قانونی اور آئینی مقاصد کے لیے ہے۔ باقی مسلمان کہلانے، لکھنے وغیرہ میں کوئی امر مانع نہیں جب تک آئندہ کوئی قوانین وضع نہیں کیے جاتے جو مزید پابندیاں لگانے والے بنیں۔

جماعت کے چند احباب کی طرف سے یہ تجویز پیش ہو چکی تھی کہ نام تبدیل کیا جائے، مگر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اور چوہدری فتح محمد عزیز صاحب اِس معاملے میں ہم خیال تھے کہ ایسا کرنا فی الحال ضروری نہیں اور اِسی امر کی تائید جسٹس منیر صاحب نے بھی کی کہ جب تک کوئی نئے قوانین وضع نہیں ہوتے، جن سے مزید پابندیاں عائد ہوں، انجمن بدستور اسی نام سے اپنا کام جاری رکھ سکتی ہے۔

دو اور تین نومبر کے اجلاس میں شرکت فرمانے اور متعدد احبابِ سلسلہ سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد آپ ۴ نومبر کو کاکول لوٹ گئے۔ وہاں ایک ہفتہ مزید قیام فرما کر اپنے چند ذاتی کام سمیٹے۔ دارالسعید پر ابھی پولیس متعین تھی اور مرمت کا کام بھی جاری تھا۔ اُسے دیکھا۔ اِس کے علاوہ آپ نے ایک قطعۂ اراضی واقع سپلائی، ایبٹ آباد، جو آپ کی اپنی ملکیت تھی، کی

فروخت کا انتظام کیا۔ یہ قطعۂ زمین چند برس قبل آپ نے اِس خیال سے خرید فرمایا تھا کہ مستقبل میں اُن کے فرزندان اپنے اپنے رہائشی مکان اس پر تعمیر کر لیں گے۔مگر موجودہ حالات میں، جب آپ کے ذاتی ذرائع آمدن مفقود ہو گئے، تو اپنے گزراوقات کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو عبداللہ سعید کو راولپنڈی وزیراعظم کے عصرانہ میں شرکت کے لیے تشریف لے جانا تھا۔ چنانچہ آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے دیگر اہل خانہ کے ہمراہ، آپ راولپنڈی تک اُن کے ہمراہ چلیں۔ چنانچہ وہ راولپنڈی اور اُس کے بعد بذریعہ تیز گام، لاہور میں مستقل رہائش کے ارادہ سے تشریف لے آئے۔ چوہدری منصور احمد صاحب نے آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔اُسی رات کو عبداللہ سعید کی بریگیڈئر سے میجر جنرل کے عہدے پر ترقی کی نوید آپ کو ملی، جس پر آپ سجدۂ شکر میں گر گئے۔

آپ نے اپنی ڈائری میں تحدیثِ نعمت کے طور پر تحریر فرمایا:

منگل ۱۲ نومبر

> رات کو عبداللہ کا پنڈی سے فون آیا کہ وزیراعظم کا عصرانہ، جس میں نو بریگیڈئر جن کی ترقی زیرِ غور تھی، مبارک ہوا۔ان سب کو ترقی کی منظوری کی۔ وزیراعظم نے مبارک باد دی۔الحمدللہ۔ ثم الحمدللہ۔

دارالسلام میں رہائش کی پیشکش

دارالسلام کی بستی کو آباد ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا، اور بہت سا حصہ ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ تاہم ایک رہائش گاہ امیرِ جماعت کے لیے تعمیر ہو چکی تھی۔ امیر دوم مولینا صدرالدین صاحب نے اپنی احمدیہ بلڈنگس کی رہائش کو ترک کرنا پسند نہ فرمایا تھا۔اس لیے وہ عمارت ابھی کسی کے زیرِ استعمال نہ تھی۔ چنانچہ مرکز کی طرف سے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو اِس میں رہائش اختیار کرنے کی پیشکش

کی گئی۔ متعدد احبابِ جماعت جنرل سیکرٹری صاحب سے زبانی اور تحریری طور پر استدعا کرتے رہے تھے کہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب سے دارالسلام میں اقامت پذیر ہونے کی درخواست کی جائے۔

محترم میاں فضل احمد صاحب کی زیرِ قیادت ایک وفد، آپ کے پاس یہ درخواست لے کر حاضر ہوا تھا۔ اور محترم میاں نصیر احمد فاروقی صاحب نے پُرزور الفاظ میں اصرار فرمایا تھا کہ دارالسلام میں آپ کی تشریف فرمائی جماعت کے لیے خیر و برکت اور ترقی کا موجب ہو گی۔

اہالیانِ دارالسلام بھی ایک وفد کی صورت میں آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ اِس کا ذکر ۱۹۷۵ء کی ایک محفل میں شیخ حفیظ الرحمان صاحب نے اِن الفاظ میں کیا تھا۔ یہ محفل ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے پہلے بیرونِ ملک دورے کے بعد اُن کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔ شیخ حفیظ الرحمان صاحب نے فرمایا:

> معزز حاضرین! اہالیانِ دارالسلام کی عرصہ سے آرزو تھی کہ ان کے درمیان ایک ایسی بزرگ ہستی موجود ہو جو انہیں احمدیت کی خصوصیات اور اعلیٰ نظریات سے گاہے گاہے آگاہ کرتی رہے اور خود ایک نمونہ ہو اور ان کے لیے دینی راہبر و راہنما ثابت ہو۔ جب بھی یہ لوگ آپس میں مل بیٹھتے تو ایسی جامع صفات بزرگ ہستی کی کمی کا ذکر ضرور کرتے۔ آخر خدا نے ہماری سُن لی اور ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے لاہور آنے کے اسباب پیدا فرما دیے۔ جب ڈاکٹر صاحب لاہور آئے تو ہم ان کی خدمت میں وفد کی صورت میں یہ التجا لے کر حاضر ہوئے تھے کہ وہ دارالسلام میں آ کر قیام فرمائیں۔ تا کہ اس بستی میں جو دینی سرگرمیوں کا فقدان ہے، ختم ہو۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے ہماری

درخواست کوشرفِ قبولیت بخشا۔آج آپ کی ذاتِ بابرکات ہمارے درمیان ہے اور اپنے فیوضِ روحانی سے ہمیں فیض یاب فرما رہی ہے۔ اور دارالسلام میں آپ کے آنے سے درس اور باقاعدہ نمازوں کا سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔

مجلسِ منتظمہ کے اجلاس منعقدہ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۴ء میں جملہ ممبران کی طرف سے آپ کو پریذیڈنٹ ہاؤس، دارالسلام میں رہائش کی پیشکش کی گئی تھی۔آپ نے قدرے تامل کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ وہ استخارہ کے بعد جواب دینا چاہیں گے۔

۱۷ ستمبر کے اجلاسِ منتظمہ میں یہ درخواست ، دوبارہ آپ کی خدمت میں پیش کی گئی تو آپ نے ممبران انجمن کا شکر یہ ادا کیا اور محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے دارالسلام میں رہائش پر آمادگی اور اپنا وقت اور زندگی کے باقی لمحات کو جماعتی اغراض کے لیے وقف فرما دینے کا اظہار فرمایا۔ممبران نے آپ کا تامل ترک کر دینے پر،خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے پریذیڈنٹ ہاؤس آپ کی رہائش کے لیے مختص کرنے کی منظوری دے دی۔

آپ کی ڈائری سے اقتباس:

مجلس منتظمہ کی میٹنگ ہوئی۔مولوی صاحب حضرت امیر کی آنکھ کا اپریشن گنگا رام ہسپتال میں دو تین دِن پہلے ہوا ہے۔ مجھے اجلاس کی صدارت کا حکم ہوا۔ ایجنڈا طویل تھا۔تاہم اکثر حصہ ۲ بجے تک ختم ہو گیا۔ایک ریزولوشن مجھ سے دارالسلام میں رہائش کی فرمائش کا تھا۔خوشنودیٔ الٰہی کی اُمید پر میں نے قبول کیا کہ جماعت کے جملہ یا اکثر حلقوں کی طرف سے اِس خواہش کا متفرق موقعوں پر اظہار اور اُس کی مجالس میں اِس پر بحث وغیرہ کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ انکار اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب نہ ہو۔تجرباتاً عارضی طور پر

یہ اقدام کررہا ہوں۔ اللہ مجھے صراط مستقیم کی ہمیشہ ہدایت فرماتا رہے۔

محترم مسعود اختر صاحب کے مضمون سے ایک اقتباس:

چراغوں کو صرف روشن چراغ ہی سے روشن کیا جا سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا تھا کہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب ایسے شخص ہیں۔ اگر وہ جماعت کی قیادت کرنے کو تیار ہوجائیں تو جماعت اس سانحہ عظیم سے بچ نکلے گی۔

چند اور احباب سے مشورہ کے بعد میجر عبدالطیف صاحب اور میں ان سے ملنے کے لیے گئے اور ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ وہ آگے بڑھ کر جماعت کو سنبھالیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مجھے میاں عمر فاروق صاحب نے لاہور میں ایک کلینک بنا کردینے کی پیشکش کی ہے۔ خود مشہور جرمن کمپنی نے بھی مجھے مفت X-Ray مشین مہیا کرنے کی پیشکش کی ہے۔ میاں فضل احمد صاحب بھی ایسی ہی پیشکش کر چکے ہیں، لیکن میں نے سوچا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو شاید یہی منظور تھا کہ میں زندگی کے باقی دن دین کی خدمت میں گذاروں، اس لیے میرا کلینک جل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو موقع مجھے دیا ہے اب میں اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں یہاں دارالسلام میں ہی رہ کر انجمن جو کام مجھ سے لینا چاہے گی وہ کروں گا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کا صرف یہاں بیٹھ جانا ہی جماعت کی تقویت کا باعث بن جائے گا۔ وہ بہت مبارک فیصلہ تھا۔ میاں فضل احمد صاحب کا خیال تھا کہ شمع روشن جہاں ہوگی پروانے وہاں خودبخود آجائیں گے۔ میاں صاحب نے جناب فاروقی صاحب کے تعاون سے مجلس منتظمہ سے ایک ریزولیوشن پاس کرایا جس میں حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو دارالسلام میں رہائش رکھنے کی درخواست کی گئی۔



پانچواں حصہ

دارلسلام میں قیام



بارہواں باب

دارالسلام میں قیام بطور سینئر نائب صدر

دسمبر ۱۹۷۴ء تا نومبر ۱۹۸۸ء

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ایک نئے ولولہ اور خدمتِ دین کے بیش بہا جذبات لیے دارالسلام میں رونق افروز ہو گئے۔ آپ کے سامنے اب جماعت کو مایوسی اور انحطاط سے نکالنے کا عظیم کام تھا، جس کو بطریق احسن انجام دینے کے لیے آپ پُرعزم اور پُراُمید تھے۔ آپ کا عزم اور حوصلہ، استقلال اور ثابت قدمی جماعت کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے اور بہت جلد جماعتِ احمدیہ لاہور میں زندگی اور اُمید کے آثار نظر آنے لگے۔ بحیثیت صدر اور چیئرمین بلا د غیر کمیٹی، آپ کی مسلسل تگ ودو اور سعی نے ایک بار پھر جماعت کو نئی زندگی بخشی۔

دارالسلام میں پنج وقتہ نماز با جماعت اور درسِ قرآن

بستی دارالسلام آپ کی ذات سے فی الفور فیض یاب ہونے لگی۔ مسجد دارالسلام میں پنج وقتہ نماز باجماعت اور باقاعدہ درسِ قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسا ہی سلسلہ آپ نے ایبٹ آباد میں ہمیشہ قائم رکھا تھا۔ اب بعینہٖ وہ سلسلہ یہاں شروع ہو گیا۔ مغرب کی نماز کے بعد درس قرآن، درس حدیث اور ملفوظات حضرت مسیح موعود پڑھے جاتے تھے۔ مجلس نماز عشاء کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی تھی۔

محترم فخر الدین صاحب کی تحریر سے ایک اقتباس:

۱۹۷۴ء میں حضرت ڈاکٹر صاحب، مستقل طور پر دارالسلام لاہور میں آ گئے۔ احمدیہ انجمن لاہور کے نائب صدر کی حیثیت سے اُنہوں نے گراں قدر خدمات دینیہ انجام دیں۔ دارالسلام میں آپ کی تشریف آوری سے رونق شروع ہو گئی۔ جامع احمدیہ میں باجماعت نمازوں، درسِ قرآن اور ملفوظات بانی سلسلہ احمدیہ میں شرکاء کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ("حضرت مسیح موعود کی صداقت کا مظہر" پیغام صلح، نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء)۔

دارالسلام میں درسِ قرآن کریم کے بارے میں پیغام صلح کی ایک تحریر:

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی روایات میں درس قرآن ایک ممتاز مقام کا حامل ہے۔ حضرت امیر مرحوم مولٰینا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرف خصوصی توجہ دی۔ سلسلہ کی اس روشن اور تابندہ روایت کو حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب دام برکاتہ نے ایبٹ آباد کے بعد دارالسلام لاہور میں بھی زندہ رکھا ہے۔ آپ جامع احمدیہ دارالسلام میں بروز ہفتہ، سوموار، منگل اور جمعرات کو بعد نماز مغرب تا قبل نماز عشاء درس قرآن کریم دیتے ہیں۔ اسی طرح جامع احمدیہ مُسلم ٹاؤن میں اتوار اور بُدھ کو قبل نماز مغرب مکرم نصیر احمد فاروقی صاحب درس قرآن کریم دیتے ہیں۔

قرب و جوار کے احباب سے التماس ہے کہ وہ ان قرآنی مجالس میں بمع عیال شریک ہو کر علمِ قرآن سے مستفید ہوں۔

محترمہ رضیہ فاروقی صاحبہ نے اپنے مضمون "شارٹ کٹ" میں چند بزرگ ہستیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے حوالے سے جو تحریر فرمایا، اُس کا ایک اقتباس:

مرکز میں پہنچ کر، جب اِس بزرگ ہستی کی زیارت ہوئی تو اللہ اکبر کیا انقلاب ہو گیا تھا۔قرأتِ قرآن میں ہمیشہ کے خوش الحان تھے۔لیکن اب جو سوز و گداز اور اثر اِس میں پیدا ہوا وہ کچھ اور ہی چیز تھی۔جب دارالسلام کی مسجد میں پہنچی تو داخلہ پر میرے قدم رُک گئے۔سبحان اللہ یہ قرأت کیا تھی ایک آسمانی نغمہ لحنِ داوٗدی سے ادا ہو رہا تھا۔فرشتوں کی حمد کی گونج اس میں شامِل معلوم ہوتی تھی۔وہ گذری ہوئی برسوں کی جدوجہد برحق تھی لیکن اب مصیبت کی اندھیری ایک ہی رات میں صبر و شکر کی مشکل گھاٹی گذار کر راہی بہت بلند اور ارفع مقام پر پہنچ چکا تھا۔(" کچھ یادیں کچھ باتیں"، صفحہ ۵۵)۔

بچوں کے لیے تعلیمِ قرآن مجید کا اہتمام

دارالسلام میں احمدی خاندان آباد تھے، مگر اب تک اُن کے بچوں کی تعلیمِ قرآن مجید کا کوئی انتظام نہ ہو سکا تھا۔ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اِس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے راجہ محمد افضل صاحب، جو اُس زمانے میں دارالسلام کی مسجد کی دیکھ بھال اور امامت فرمانے پر مامور تھے، یہ ذمہ داری بھی سنبھال لینے کی طرف توجہ دلائی تو اُنہوں نے خوشدلی سے یہ ذمہ داری اُٹھا لی اور اس فریضہ کو نہایت احسن طریق سے انجام دیتے رہے۔

شیخ حفیظ الرحمان صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:

ہمارا ایک اور مسئلہ ہمارے بچوں کی دینی تعلیم و تدریس کا تھا۔یہ بچے سارا دن بے کار کھیلتے رہتے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے راجہ محمد افضل صاحب کو دارالسلام میں منگوا کر ہماری اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا۔راجہ صاحب بڑی جانفشانی اور تندہی سے ہمارے بچوں کی دینی تربیت کر رہے ہیں جس کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ

بچے نہ صرف ناظرہ قرآن پڑھ سکتے ہیں بلکہ نماز اور بعض قرآنی سورتیں زبانی باترجمہ بخوبی سُنا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا پہلا رابطہ دورہ۔ سیالکوٹ

جماعت کو اس کٹھن دور سے گذرنے کے لیے ایک دوسرے سے رابطہ اور تعلق قائم کرنے کیلیے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے جماعتوں میں دوروں کا ایک سلسلہ شروع فرمایا۔ تاکہ مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے، مل بیٹھنے اور باہمی میل جول کی ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اِن رابطہ دوروں اور ملاقاتوں کے سلسلے کا آغاز جمعہ ۲۶ نومبر ۱۹۷۴ء کو سیالکوٹ سے کیا۔ جس کی روئیداد پیغام صلح کے ۱۱ دسمبر ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں شائع ہوئی:

> جیسا کہ احباب کو معلوم ہے کہ مکرمی ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے اپنی زندگی جماعتی امور کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس سلسلہ میں جماعتوں سے رابطہ کا پروگرام بنایا گیا ہے اس پروگرام کے تحت ۲۶ رنومبر بروز جمعۃ المبارک ڈاکٹر صاحب موصوف سیالکوٹ کے احباب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ جمعہ کے خطبہ میں احباب نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ فرداً فرداً بھی بعض احباب سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ خطبہ میں ڈاکٹر صاحب نے جماعت کو اس ابتلاء اور امتحان کے دور میں ثابت قدم رہنے اور صبر کا اعلیٰ نمونہ دکھلانے کی تلقین کی اور سورۃ عنکبوت کی ابتدائی آیات تلاوت فرما کر واضح کیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی قوم خدا تعالیٰ کے فضلوں کی وارث بننا چاہے اور کسی قسم کے امتحان میں نہ ڈالی جائے۔ آپ نے جماعت کو نصیحت کی کہ وہ اپنے اندر ایک

نیک اور پاک تبدیلی پیدا کریں تا کہ مجدد الزمان ؑ کی بعثت کا مقصد پورا ہو سکے۔ کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے آنے کا یہی مقصد بیان فرمایا ہے کہ متقیوں کا ایک گروہ پیدا کیا جائے۔ آپ کے پُرمعارف خطبہ نے احباب کو بہت متاثر کیا۔ نماز جمعہ کے بعد احباب کو حضرت صاحب کے ملفوظات سنائے گئے جس میں حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی جماعتوں کو اور نیک بندوں کو ہمیشہ امتحانوں سے گذارتا ہے تا کہ وہ صیقل ہو جاویں اور خدا تعالیٰ کے افضال کی بارش ان پر ہو۔ اور وہ خدا تعالیٰ کے وعدوں کو پورا کرنے والے بن سکیں۔

جمعہ کے روز شام کو واپس لاہور کے لیے روانہ ہونے سے قبل شیخ نثار احمد صاحب نے تمام احباب سمیت ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں دعوتِ عصرانہ دی۔ اس دورہ میں جناب شیخ عبدالحمید صاحب، شیخ برکت اللہ صاحب، شیخ نثار احمد صاحب اور جناب فاضل رمضان صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی ضیافت کا شرف حاصل رہا۔ سیالکوٹ کے اس دورہ میں محمد صالح نور محترم ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ رہے۔

جلسہ سالانہ دسمبر۔ ۱۹۷۴ء

جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسہ کی بنیاد امامِ وقت نے اِس غرض کے لیے رکھی تھی کہ سال میں کم از کم ایک بار تمام احبابِ سلسلہ ایک دوسرے سے متعارف ہوسکیں۔ باہمی میل جول بڑھے اور جلسہ کی تقاریر اور بابرکت دُعاؤں سے فیض یاب ہوکر روحانی ترقی میں قدم آگے بڑھا سکیں۔ حضرت مرزا صاحب نے اس جلسہ کے انعقاد کے لیے دسمبر کے آخری ہفتہ کی تواریخ کو اس لیے پسند فرمایا تھا، کیونکہ اِن دنوں میں عام تعطیلات ہوتی تھیں۔ اس لیے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے احباب

بآسانی شمولیت کر سکتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کا قیام ہوا، تو اِنہی ایام میں جلسہ کا انعقاد ہوتا تھا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ہر جلسہ پہلے سے زیادہ بارونق اور بابرکت ہوتا چلا گیا۔

دسمبر ۱۹۷۴ء کا جلسہ اِس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا تھا، کیونکہ اِس اجتماع کا ممکن ہونا ہی بڑی بات تھی، کیونکہ اُس وقت کے حالات اور فضا بظاہر اس کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اِس سال کے دورانیہ میں جماعت شدید ابتلاء سے گذری تھی۔ جماعت کی بقا کے حوالے سے، ذہن شبہات میں مبتلا تھے، اس جلسہ کو ممکن بنانے کے لیے اراکینِ جماعت کو خاص تگ و دو کی ضرورت تھی، جس کے لیے وہ مستعد تھے۔ منتظمینِ جلسہ کے علاوہ خواتین اور نوجوان بھی اُن کے شانہ بشانہ، گھر گھر اور بستی بستی پھر کر لوگوں کو جلسہ میں شمولیت پر آمادہ کرتے تھے، اور ذہنوں میں جنم لینے والے خدشات کو رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے ذاتی طور پر احباب کو خطوط لکھ کر جلسہ میں شرکت کی دعوت دی اور کئی احباب سے اُن کے گھروں میں جا کر بھی ملاقات فرمائی اور جلسہ میں شمولیت پر آمادہ کیا۔ اِس جلسہ میں بہت سے احباب اپنے، غیر از جماعت دوستوں کو بطورِ خاص اپنے ہمراہ لائے تھے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سُن کر جماعت کے کفر کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکیں۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا جلسہ سے پُراثر خطاب

۲۷ دسمبر بروز جمعہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے جلسہ سے خطاب فرمایا۔ آپ نے حضرت صاحب کی ایک نظم کے ایک مصرع

"آنکھ کے پانی سے یارو کچھ کرو اِس کا علاج"

کو بطورِ موضوع چنا۔ اپنے خطاب میں آپ نے گذشتہ چند سال میں، اور بالخصوص اِس سال میں

پیش آنے والے سانحات اور واقعات کو اِک زلزلہ قرار دیا جو مِن حیث الجماعت، سب کو جھنجھوڑ نے کے لیے اور مثبت تبدیلی لانے کا حامِل ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد کے لیے شام وسحر اُس ذات کے حضور گڑ گڑانے اور مناجات کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

اندریں وقتِ مصیبت چارۂ ما بیکساں
جُز دعائے بامداد و گریۂ اسحار نیست

(مصیبت کی اس گھڑی میں ہم مسکینوں کا چارہ دُعائے سحر گاہی اور گریہ زاری کے سوا دوسرا کوئی نہیں)۔

آپ نے آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود کے الحاح، تضرع اور گریہ و زاری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے حضور گریہ زاری اور دُعائیں تقدیر بدل سکتی ہیں، اور اولیاء اللہ کی یہی صفت اُن کی قبولیتِ دعا کا سبب بنتی ہے۔

آپ کی تقریر کا ایک ایک لفظ سامعین کے دل میں اتر رہا تھا، اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو پُرنم نہ ہو۔ خود آپ کی آواز میں رقت تھی۔ کئی اطراف سے سسکیوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اشکوں کا ایک سیلاب تھا جو غموں کو دھو کر دِلوں کو صاف کر رہا تھا۔ اور اِن پاکیزہ دِلوں سے نکلتی ہوئی دِلوں کی صدا، رحمتِ خداوندی کو جوش میں لاتی دکھائی دے رہی تھی۔

علاقہ اَلائی اور پالس میں شدید زلزلہ

۲۷ اور ۲۸ دسمبر کی درمیانی شب علاقہ اَلائی اور پالس میں ایک تباہ کن زلزلہ آیا۔ ۲۸ دسمبر کی صبح کو یہ خبر سنتے ہی حضرت مسیح موعودؑ کے اِس شعر کی طرف توجہ ہوئی۔

کون روتا ہے کہ جس سے آسماں بھی رو پڑا
لرزا آیا اِس زمیں پر اُس کے چلّانے کے دِن

اور نگاہوں میں ۲۷ دسمبر کے جلسہ کا وہ منظر پھرنے لگا، جب مظلوم بندگان کی آہ وبکاہ اور گریہ زاری عرشِ الٰہی تک پہنچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور شاید یہی ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے ۱۱ ستمبر ۱۹۷۴ء (بمقامِ کاکول) کے الہام کی تعبیر کا بھی دن تھا۔

آپ کی ڈائری سے اقتباس

۱۱ ستمبر ۱۹۷۴ء

سات بجے کے قریب جب بیداری ہونے والی تھی، اِس حصہ آیت سے جاگ اُٹھا، جو زبان پر جاری ہوئی: وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ (اور اگر ہم چاہیں تو اُنہیں اُن کی جگہ پر مسخ کر دیں) (یٰسٓ ۳۶:۶۷)۔

۱۱ جون ۱۹۷۴ء کے سانحۂ دارالسعید میں ملوث افراد میں ایک خاصی تعداد علاقہ الائی سے لائی گئی تھی، اور اِس علاقے کے ایک صاحبِ مرتبہ شخصیت اِس فتنہ کے رہنماؤں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے کاموں اور رازوں کو بہتر جاننے والا ہے، اور وقت آنے پر اِن باتوں کا اظہار کسی نہ کسی رنگ میں ہو کر ایمان والوں کے لیے تقویت کا موجب ضرور ہوتا ہے۔

مرکز میں کام کا باقاعدہ آغاز

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے سینئر نائب صدر اور چیئر مین تبلیغ بلادِ غیر کمیٹی کے منصب کے ساتھ باقاعدہ جماعتی کاموں کا آغاز کیا۔ 'تبلیغ بلادِ غیر کمیٹی' چند صاحب الرائے اور قابل ممبرانِ

جماعت پر مشتمل تھی۔ یہ ضرورت بہت شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ انجمن کو اپنی بقا کے لیے اِس شعبہ پر توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔ ملک کے اندر تبلیغِ اسلام کے کام میں کئی قسم کی رکاوٹیں ہیں، بلکہ تمام راہیں مسدود ہیں۔ مرکز کو اس سلسلے میں کئی آراء موصول ہوئیں۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے فرزندِ اکبر ڈاکٹر عبدالحئی سعید صاحب نے ایک تحریر بہ زبانِ انگریزی "New Horizon" یعنی 'نئے افق' کے عنوان سے بھیجی۔ جس میں پیش آمدہ حالات میں بیرونِ ملک جماعتوں کو فعال بنانے پر زور دیا گیا تھا۔ اُس تحریر سے اُردو ترجمہ شدہ چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

> موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہم اِس ملک کے علاوہ اکثر مسلم ممالک میں قانونی طور پر غیر مسلم ہیں۔ اِس حقیقت کا احساس ہمیں اُس وقت ہوگا جب ہماری ملازمت کے ریکارڈ، پاسپورٹ اور قانونی دستاویزات میں ہمارا اندراج بحیثیت غیر مسلم ہوگا۔ ہمارے بچوں کو اسکولوں اور کالجوں میں غیر مسلم کہا جائے گا۔ سرکاری طور پر ہمیں ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور بدھوں کی فہرست میں شمار کر کے راجہ تری دیورائے کی وزارت کے ماتحت کر دیا جائے گا۔ ہمارا معاشرہ غیر متحمل مزاج رکھتا ہے۔ اور قادیانیوں کی مہربانیوں سے یہ معاملات یہیں پر ختم ہونے والے نہیں اور ہمیں عملی طور پر اُنہیں کے ساتھ لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔
>
> ہمیں اپنے مستقبل کے حوالے سے مشیت ایزدی کو سمجھنا چاہیے کہ اُس نے خود ہمیں مغرب کی طرف دھکیل دیا ہے کہ اب ہم اپنا کام وہاں شروع کریں اور اپنے پاس موجود لٹریچر کی اشاعت اور تقسیم اِن ممالک سے کریں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں ہے۔
>
> مغرب میں کام کرنے کے لیے ہمیں ایک نیا وسیع خاکہ تیار کرنا ہوگا۔ ہمارے

پاس کئی ممالک میں مشنز موجود ہیں۔ ہمیں اُنہیں ترقی دینا ہوگی۔ اِن میں جزائر غرب الہند، مغربی کرۂ ارض، برطانیہ، جرمنی، ہالینڈ، نیوزی لینڈ اور افریقہ میں 'گھانا' شامل ہیں۔ یہ مشنز لٹریچر چھاپیں اور پاکستان سمیت دیگر ممالک میں بھیجیں۔ اسلام پر جو لٹریچر ہمارے پاس موجود ہے اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ ہمارے پاس لٹریچر ہے اور افراد ہیں جنہیں مغربی ممالک میں بھیجے جانے کا منصوبہ بنانا چاہیے۔ اور مرکز میں موجود ذرائع اور تنظیم کو بیرونِ ملک مشنز کی حوصلہ افزائی اور ضروریات کے لیے مختص کر دینا چاہیے، کیونکہ پاکستان میں فی الوقت اشاعت کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں، اور یہاں پر شائع ہونے والے لٹریچر کو غیر مسلم لٹریچر تصور کیا جائے گا۔ عوام اِسے ناپسند کریں گے اور ملاں عوام کو اشتعال دلانے کے لیے اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

ایسے حالات میں تبلیغ بلادِ غیر کا بیڑہ اُٹھانے کے لیے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب سے بہتر اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ وہ علم اور عمل، ہر دو لحاظ سے موزوں تھے اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دینے کو تیار تھے۔ آپ کے لیے دارالسلام میں نئے تعمیر شدہ دفاتر میں سے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا، جہاں آپ روزانہ، باقاعدگی سے خاصا وقت گزارتے تھے۔ تبلیغ بلادِ غیر کمیٹی پروگرام ترتیب دیتی، جس پر مرکز سے عمل کیا جاتا۔ اس طرح مرکز کے استحکام اور بلادِ غیر کے مشنز سے رابطوں کا آغاز ہو گیا۔ مسلسل خط و کتابت اور لٹریچر کی ترسیل سے بیرونی جماعتوں سے مستقل رابطے کی راہیں استوار ہو گئیں اور کئی غلط فہمیوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی ازالہ ہو گیا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے ۱۹۷۵ء۔ ۸۵ کی دہائی میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کئی دورے کیے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے جماعت کے استحکام اور تشکیل و تنظیم میں جو کردار ادا کیا ہے وہ تاریخِ احمدیت کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ آپ کے بیرون ملک دورے

بالخصوص تاریخی اہمیت کے حامِل ہیں، جو ایک الگ عنوان اور تفصیل چاہتے ہیں۔ چنانچہ اِس باب میں آپ کی زندگی کے اُن واقعات اور کاموں کا ذکر کیا جائے گا جن کا تعلق ملک کے اندرونی حالات سے ہے۔

اندرون ملک دوروں کا سلسلہ

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے مرکزی انجمن کے فیصلوں کے مطابق پاکستان کی مختلف جماعتوں میں دوروں کا ایک پروگرام تشکیل دیا۔ اِن ایام میں جماعت ایک دورِ انحطاط سے دوچار تھی۔ آپ کی ولولہ انگیز قیادت اِس انحطاط اور جمود سے جماعت کو نکالنے میں کامیاب رہی اور جماعتِ احمدیہ کے افراد کو نئے ارادوں سے ہم آہنگ کیا۔ اِس کے لیے عمر کے اِس حصے میں، دور دراز علاقوں کے دشوار سفر آپ نے بخوشی قبول فرمائے اور اپنے عزم اور جواں ہمتی کے سامنے مسافتوں کو سمٹتے ہوئے پایا۔ آپ سرگودھا تشریف لے گئے تو جن حالات میں آپ نے یہ سفر کیا وہ بہت کٹھن تھا۔ مگر آپ اُس کا اظہار جس خوشدلی سے کرتے ہیں وہ آپ کی تحریر سے پیش خدمت ہے:

> ۱۳ اپریل ۱۹۷۵ء کو چک ۸۱ جنوبی ضلع سرگودھا کا دورہ کرنے کا وہاں کی جماعت کی خواہش پر عزم کیا۔ سفر میں اللہ کی خاص عنایات شامِلِ حال دیکھیں۔ گیارہ بجے کے قریب منصور احمد نے سٹیشن پر پہنچانے کی از خود خواہش بذریعہ ٹیلی فون کی۔ پونے چار بجے ریل پر چڑھا دیا۔ ۹:۳۰ بجے رات، سرگودھا سٹیشن پر چوہدری عزیز احمد صاحب موٹر لے کر آئے ہوئے تھے۔ رات بہت آرام ملا۔ نمازِ فجر کے بعد گفتگو، سلسلہ کی ہوئی۔ پروفیسر خلیل الرحمٰن ہمراہ تھے۔ ۹ بجے صبح چک ۱۸۱ اپنی موٹر میں پہنچا دیا۔ بہت خلوص اہلِ چک و جماعت نے دکھایا۔ جمعہ کے خطبہ میں تائید الٰہی ساتھ پائی۔ شام واپسی سرگودھا کے لیے آئے تو بس اُسی وقت پہنچی۔ دو منٹ کا توقف بھی نہ ہوا۔

۱۵اپریل ۱۹۷۵ء نماز کے بعد چوہدری عزیز احمد صاحب نے سٹیشن پہنچایا۔ اَللّٰھمَّ فُزْنِیْ وَ اخْتُرْنِیْ (اے اللہ مجھے کامیاب فرما اور مجھے چن لے) کی دُعا کے بعد سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا۔ فرسٹ کلاس سے زیادہ آرام پایا۔ لاہور سٹیشن پر ۱۱ بجے پہنچے تو ایک نئے راستہ سے بھیڑ کے ساتھ ہی سٹیشن سے نکلے تو رکشہ تیار ملا۔ بخیر و عافیت گھر دارالسلام پہنچ کر اللہ کا شکر کیا۔ ہر قدم پر اللہ کی حفاظت ساتھ محسوس ہوئی۔ الحمدللہ۔

۱۷ مئی کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب پشاور جلسے میں شرکت کے لیے بذریعہ خیبر میل تشریف لے گئے۔ آپ کا وہاں جلسے میں شرکت فرمانا اور ملاقاتیں جماعت کے لیے تقویت کا باعث ثابت ہوئیں۔ آپ ماہ جون میں راولپنڈی اور ایبٹ آباد بھی تشریف لے گئے تھے۔

کوئٹہ کا سفر اور بیرون ملک روانگی۔ جولائی ۱۹۷۵ء

میجر جنرل عبداللہ سعید کوئٹہ میں تھے۔ اُن کے یہاں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے چند ہفتے قیام فرمایا۔ عبداللہ سعید کے علاوہ آپ کے داماد کرنل شوکت محمود اور فرزند محمد سعید بھی کوئٹہ میں موجود تھے۔ وہاں آپ نے باقاعدگی سے نماز جمعہ کا اہتمام فرمایا، جس میں جماعت کے سبھی افراد شریک ہوتے تھے۔ سب نے اپنی اپنی اقامت گاہوں پر جمعہ کے اجتماعات کے اہتمام کا شرف حاصِل کیا۔

مرکزی انجمن کی طرف سے آپ انگلستان میں منعقد ہونے والی کنونشن میں بطورِ مندوب نامزد ہوئے۔ اس لیے آپ کوئٹہ سے کراچی گئے۔ وہاں کے چند روزہ قیام میں جماعت کے احباب سے ملاقات فرمائی اور انگلستان اور جزائر غرب الہند کے کامیاب دورے کے بعد واپس مرکز میں تشریف فرما ہوئے۔

لاہور میں استقبال

۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو آپ لاہور پہنچے تو ہوائی اڈے پر آپ کا پرجوش استقبال کیا گیا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان کی تحریر سے اقتباس:

> ۱۲:۳۰ بجے جہاز لاہور پہنچا۔ ہوائی اڈے پر جملہ عزیزان اور جماعت کے کئی احباب آئے ہوئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر دِل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا۔ گھنٹہ سامان کی آمد تک لگ گیا۔ جونہی دروازہ کھلا، میاں فضل احمد، ہار ہاتھ میں لیے آگے بڑھے۔ اور میرے ہاتھ سے سامان لے لیا اور گرم جوشی سے بغلگیر ہوئے۔ باہر اپنے سب عزیز، فاروقی صاحب سب سے آگے، اور احباب صف بستہ کھڑے تھے۔ پھر مستورات علیحدہ کھڑی تھیں اتنے پُرخلوص چہروں کی حقیقی دلی مسرت دیکھ کر سفر کی سب کوفت دور ہوگئی۔ الحمدللہ''

اہالیان دارالسلام کی طرف سے ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام

حضرت ڈاکٹر صاحب کی وطن واپسی پر دارالسلام میں ایک دعوتِ عصرانہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں بعض دوسرے مقامات کے احبابِ جماعت بھی شریک ہوئے۔ شیخ حفیظ الرحمان صاحب نے، جو اُس وقت شبان الاحمدیہ کے صدر تھے، بہت خوبصورت انداز میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اور اُن کے دورے کے تاثرات سُننے کے اشتیاق کا بھی اظہار کیا اور اہالیانِ دارالسلام کی طرف سے اُن سے عقیدت اور محبت کا اظہار اِن الفاظ میں کیا:

> جب ڈاکٹر صاحب اس دورے کے سلسلے میں دارالسلام سے چلے گئے تو ہم نے ان کی عدم موجودگی کو شدّت سے محسوس کیا۔ ہم اپنی نمازوں میں ان کی کامیابی کے لیے دعائیں کرتے رہے کیونکہ ہماری توقعات کافی حد تک، اب اپنے

بیرونی مشنوں سے وابستہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس دورے کا اچھا اثر لے کر آئے ہیں۔ مجھے اور آپ سب کو ان کے دورے کے تاثرات سننے کا بے حد اشتیاق ہے لہذا میں اپنی تقریر کو طویل کر کے آپ کے اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان زیادہ دیر حائل رہنا نہیں چاہتا اس لیے مَیں جناب ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تشریف لا کر اپنے قیمتی خیالات سے ہمیں نوازیں۔

اہالیان دارالسلام سے محبت کا اظہار

ڈاکٹر صاحب نے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے جو فرمایا تھا وہ اہالیانِ دارالسلام اور اس بستی سے محبت کا دلی اظہار ہے۔ سپاسنامہ کے جواب میں جناب ڈاکٹر صاحب نے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

میرے بھائی شیخ حفیظ الرحمان صاحب نے اہالیانِ دارالسلام کی ترجمانی میں جن نیک جذبات وخیالات کا اپنے سپاسنامہ میں اظہار کیا ہے میں ان جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میرے دل میں بھی دارالسلام میں مقیم لوگوں کی بڑی محبت ہے اور وطن سے ہزاروں میل دُور لندن میں بیٹھ کر بھی آپ کی محبت کا جب تصوّر کرتا تھا۔ تو میرا دل جذباتِ تشکر سے بھر جاتا تھا۔ اور میری کیفیت یہ ہوتی تھی کہ

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کئی قسم کے جذبات وخیالات دل میں اُبھرتے تھے۔ سب سے بڑا جذبہ یہی تھا اور اللہ تعالیٰ سے یہی ہر وقت دعا تھی کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو اپنی حفظ و امان

میں رکھے اور اس پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور اپنے لطف و کرم کی بارش اس پر نازل کرے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں کہ ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں اگر وہ ہمارے لیے کفارہ بن جائیں اور اب جس بستی میں مَیں آباد ہوا ہوں، اس کے لوگ تیری رضا کی راہوں پر چلنے والے ہوں، تو مجھے اپنے گذشتہ نقصانات کا کوئی رنج اور غم نہیں ہے۔

جماعت کے اندرونی مسائل و مصائب

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی زندگی کے ہر دور میں محبتوں اور نفرتوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ جہاں آپ پر پھول نچھار کیے گئے وہیں کانٹے بھی بوئے گئے۔ مگر گذشتہ ادوار اور اس دور میں فرق یہ تھا کہ اب پھول نچھاور کرنے والے بھی اپنے ہیں اور راہ میں کانٹے بچھانے والے بھی اپنے ہی ہیں۔ اس سے قبل آپ کے ایذا رساں، آپ کے دنیاوی مناصب سے حاسد تھے یا مذہبی تعصب کا شکار افراد تھے۔ مگر اب اپنی ہی جماعت سے تعلق رکھنے والے اپنے ہی لوگ تھے۔ جماعتِ احمدیہ لاہور میں کچھ ایسے عناصر داخل ہو چکے تھے یا داخل کیے جا چکے تھے، جن کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی لاہور میں آمد، اس وجہ سے گوارا نہ تھی کیونکہ اِس طرح اُن کے اپنے منصوبے معرضِ خطر میں پڑ چکے تھے، اور وہ لاہور کو اپنی آماجگاہ بنانے میں ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اِس گروہ کی طرف سے باقاعدہ منظم طریقے پر شرارت کا آغاز بذریعہ ایذا رساں خطوط اور پمفلٹس (pamphlets) کی تقسیم سے کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک طالع آزما گروہ تھا، جو اپنی ہوشیاری سے بعض سرکردہ ممبرانِ جماعت پر اثر انداز ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو وہ یہ دھمکی دینے سے بھی باز نہ آئے تھے کہ جس طرح ایبٹ آباد سے بھاگ کر یہاں آئے ہو، تم یہاں سے بھی بھاگنے پر مجبور کر دیے جاؤ گے اور پھر تمہیں کہیں اور ٹھکانہ نہ ملے گا۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو اپنی نیکی، تقویٰ، عاجزی اور انکساری کی وجہ سے جماعت

میں ایک مقام حاصل تھا اور جماعت کے مخلص افراد کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی تھیں۔آپ کی صورت میں اُنہیں ایک ایسا رہنما نظر آ رہا تھا، جو جماعت احمدیہ کو موجودہ خستہ حالی سے نکالنے کے لیے ہر قربانی دے سکتا ہے اور اسی وجہ سے لوگ آپ کے درپئے آزار تھے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو ہر وقت جماعت کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ اپنی نیم شبی دُعاؤں میں اُن کا نالہ وفریاد صرف اور صرف جماعت کی بقا اور سلامتی کے لیے ہوتا تھا۔ اور یہی ایک ہتھیار تھا جو اُن کے ارادوں کو قوت بخشتا تھا۔ ایسے میں اُن کی فریاد کے جواب میں اُن کو بارگاہِ الٰہی سے جماعت کی سلامتی کی بشارت، آپ کی ڈائری کی تحریر میں موجود ہے:

۲۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء

> بعد از نمازِ فجر، سیر اور تلاوت کے بعد سو گیا۔ خواب میں ایک پرانا ڈاک کا لفافہ، جس پر میرا پتہ لکھا ہوا ہے، گھر کے کسی فرد کے ہاتھ میں تھا۔ (یہ یاد نہیں کہ کون فرد ہے)۔ لفافے کی دوسری یا تیسری لائن (پتہ) کے آخری الفاظ یہ ہیں: "جماعت احمدیہ سلامت"۔
>
> شب گذشتہ کی نمازِ تہجد میں خصوصیت سے گریہ وزاری کا موقعہ ملا تھا، جو تمام تر اپنی جماعت کی خستہ حالی کی وجہ سے تھا۔ اور اُس کی اصلاح اور اُس کے خارجی اور اندرونی مصائب کے سلسلہ میں تھا۔ یا ارحم الراحمین! ہم بے بسوں کا آسرا سوائے تیری ذات کے دُنیا میں کون ہے۔ رَّبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ۔

یہ جماعت کے اندرونی فتنوں کے ابتدائی مراحل تھے۔ دل آزار خطوط اور پمفلٹ تقسیم کرنے کا سلسلہ لامتناہی تھا اور سالہا سال تک چلتا رہا۔ اہالیانِ دارالسلام کو اُکسایا جاتا رہا، الزام

تراشیاں ہوتی رہیں۔مگر آپ کا وہی صبر وتحمل، وہی شفقت اور وہی مروت برقرار رہی۔ ناموافق حالات کے باوجود دارالسلام اور اِس میں منعقد ہونے والی تقریبات اور اجلاس کی رونقوں میں اضافہ ہوتا نظر آتا تھا۔ اور جماعت آپ کے بابرکت وجود سے برکات حاصِل کرتی ہوئی مضبوطی سے آگے قدم بڑھا رہی تھی۔ وہ جماعت، جو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی نظر آتی تھی، اور اُس کے مستقبل کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا جاتا تھا، اب آپ کی ہمت سے اس میں زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔اعظم علوی صاحب کا ایک شعر:

اُس کی ہمت ہے کہ سہمے ہوئے چند نفوس
شامِل زمرۂ احباب نظر آتے ہیں

رابطہ دوروں کا سلسلہ

لاہور تشریف آوری کے بعد، ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے رابطہ دوروں کے ایک سلسلہ کا آغاز کیا تھا۔ یہ سلسلہ آئندہ آنے والے برسوں میں بدستور قائم رکھا۔بعض اوقات ان کا سفر ذاتی نوعیت کا بھی ہوتا، تاہم بے حد مصروف ہونے کے باوجود جماعت کے احباب کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کرتے تھے اور اُن سے ملاقات کے لیے اُن کی رہائش گاہوں پر تشریف لے جاتے تھے۔ اِس کے علاوہ جماعت کے اجلاس، جس جگہ بھی منعقد ہوتے آپ اُن میں شرکت کے لیے دور دراز کے سفر اختیار فرماتے۔ احبابِ جماعت کی طرف سے اگر کسی قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار ہوتا تھا، تو اُس کا ازالہ آپ نہایت مؤثر انداز میں فرماتے تھے اور جماعت کو متحد رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش ضرور فرماتے تھے۔

بلالی مسلمان رہنما والس ڈی محمد کی مرکز میں آمد۔ ۲۲ اپریل ۱۹۷۶ء

جماعت احمدیہ کے ایک ممتاز رُکن محترم ماسٹر عبداللہ صاحب کے بلالی مسلمانوں کے

سربراہ والس ڈی محمد صاحب سے اچھے ذاتی مراسم تھے۔ ماسٹر عبداللہ صاحب عرصہ دراز تک فجی میں مقیم رہے تھے۔ اور پھر امریکی شہریت اختیار کر لی تھی۔ والس ڈی، محمد احمدیت کے عقائد اور لٹریچر سے بخوبی متعارف تھے، اور ماسٹر عبداللہ صاحب کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ جب بلالی رہنما، ایک نجی دورے پر پاکستان تشریف لائے تو ماسٹر عبداللہ صاحب اُن کے وفد میں شامل تھے۔ اُنہی کی تحریک پر والس ڈی محمد صاحب لاہور میں جماعت احمدیہ کے مرکز میں تشریف لانے پر آمادہ ہوئے تھے۔

۲۲ اپریل ۱۹۷۶ء کو بلالی رہنما کے اعزاز میں احمدیہ مرکز دارالسلام میں ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا۔ حضرت امیر، مولوی صدرالدین صاحب، بوجہ کمزوریٔ صحت تشریف فرما نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ معزز مہمان کے استقبال کی ذمہ داری بطور نائب صدر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے سپرد ہوئی۔ آپ نے اپنی استقبالیہ تقریر میں جماعتِ احمدیہ لاہور کی غیر متعصّبانہ روایات، ترقی پسندی اور دیگر اہم خصوصیات کا ذکر فرمایا۔ والس ڈی محمد صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں جماعتِ احمدیہ لاہور کے خالصتاً اسلامی عقائد کی تائید کرتے ہوئے، سونے کی ایک اینٹ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کی اور فرمایا کہ اسلام ایک سنہرا دین ہے اس لیے یہ عطیہ اس کی اشاعت کے لیے نہایت موزوں ہے۔

والس ڈی محمد صاحب نے نمازِ ظہر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے اقتداء میں ادا کی۔ اور جب جماعتِ عصر کی امامت کے لیے بلالی رہنما سے کہا گیا، تو انہوں نے اسے اپنے لیے باعثِ اعزاز سمجھتے ہوئے نہایت خوشدلی سے امامت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے، جماعت احمدیہ لاہور سے یکجہتی کا اظہار فرمایا۔

جنرل عبداللہ سعید کی تقرری بطورِ سفیر۔ ۱۹۷۸ء

جنرل عبداللہ سعید کوئٹہ میں بطور جنرل آفیسر کمانڈنگ تعینات تھے۔ ۱۹۷۷ء میں جب

پاکستان میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو آپ کو صوبہ بلوچستان کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔ اس عہدہ پر وہ تقریباً ایک سال تک فائز رہے تھے اور صوبہ بلوچستان میں امن و امان کی صورت کی بحالی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ عبداللہ سعید اپنی فرض شناسی، ایمان داری اور انصاف پسندی کی وجہ سے نہایت ہردلعزیز تھے۔ وہاں کے قبائلی سرداروں اور دیگر باشندوں کو آپ پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا، اس لیے وہاں کے سیاسی معاملات کو سلجھانے میں اُنہوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ حکومت نے اُن کی خدمات کے اعتراف میں اُنہیں تمغہ بسالت کے خصوصی اعزاز سے نوازا تھا۔

اپنے عمدہ ریکارڈ اور ماہرانہ عسکری صلاحیتوں کی بدولت وہ مزید ترقی کے حقدار تھے، اور سوائے سیاسی مصلحتوں کے اور کوئی امر اُن کی ترقی میں مانع نہ تھا۔ فیصلوں کے مجاز افسرِ اعلیٰ کی طرف سے یہ پیشکش ہوئی کہ لیفٹنٹ جنرل کے عہدہ کے اگرچہ وہ حقدار ہیں، مگر یہ ترقی اس بات سے مشروط ہوگی کہ وہ کور کمانڈر نہ بنائے جائیں گے، بلکہ جنرل ہیڈ کوارٹر میں صرف دفتری کام سرانجام دیں گے۔ بصورت دیگر اُنہیں عہدۂ سفارت پیش کیا جا سکتا ہے۔ عبداللہ سعید نے متبادل پیش کش کو قبول کیا اور بہت جلد پاکستان سے بحیثیت سفیر میکسیکو اور کیوبا روانہ ہو گئے۔ وہاں پر اُنہوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اُن کے اِس سفارتی دور میں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب، خود بھی اُن سے ملاقات کی غرض سے میکسیکو تشریف لے گئے تھے اور اپنے فرزند کی اعلیٰ کارکردگی آپ کے لیے اطمینان اور خوشی کا باعث ہوئی۔ آپ نے عبداللہ سعید سے قرآن کے ہسپانوی زبان میں ترجمہ کے ممکنات پر غور کرنے کے لیے کہا۔ عبداللہ سعید نے بخوشی اسے قبول کیا۔ قرآن کا ہسپانوی ترجمہ عبداللہ سعید کے ہمیشہ زندہ رہنے والے کارناموں میں سے ایک ہے۔

مظفر احمد سعید کا صدمہ

۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کو کوئٹہ کے ہوائی اڈے پر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا نوجوان سترہ سالہ پوتا مظفر احمد سعید، ایک سفاک کے خنجر کے ایک ہی وار سے، دُنیا سے مُنہ موڑ گیا۔ یہ اندوہناک

واقعہ اُس وقت رونپذیر ہوا، جب مظفر احمد سعید، جن کا پیار کا نام بابا تھا، اپنے والد ڈاکٹر عبدالحیٔ سعید کے ہمراہ کوئٹہ سے لاہور روانہ ہو رہے تھے۔ عبدالحیٔ سعید بورڈنگ کارڈ لے رہے تھے اور 'بابا' اُن کے پیچھے ہاتھ میں بریف کیس تھامے کھڑے تھے۔ عبدالحیٔ سعید کو کوئی چمکتی ہوئی چیز ہوا میں لہراتی محسوس ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا، تو بابا خون میں نہا رہے تھے۔ سفاک قاتل اپنا وار کر چکا تھا۔ خنجر بابا کے سینے میں اُتر چکا تھا۔ وہ باپ کے بازوؤں میں جھول گئے اور لمحوں میں باپ کی شفقت بھری بانہوں میں ابدی نیند سو گئے۔ باپ کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمات نکلے:

Baba! you are leaving so soon.

یعنی: بابا تم اس قدر جلدی رُخصت ہو رہے ہو۔ اور بس اس کے بعد بولنے کی سکت ہی نہ رہی تھی۔

ڈاکٹر سعید احمد خان اُن دنوں انگلستان میں تھے۔ چند روز میں واپسی کا ارادہ تھا۔ اُنہیں اِس حادثہ کی اطلاع نہیں ہوئی۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر عزیز اور احبابِ جماعت موجود تھے۔ اُداس چہرے غم کے غمّاز تھے، مگر کسی نے آپ سے کچھ کہنے کی جسارت نہ کی۔ آپ محسوس کر رہے تھے کہ یہ تاثر کسی غیر معمولی بات کا غمّاز ہے، مگر کسی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ لاہور کے ہوائی اڈے پر حالات اس سے مختلف نہ تھے۔ آپ کی پریشانی بڑھ گئی۔ اِس کا حال آپ کے اپنے الفاظ میں:

۱۰ ستمبر ۱۹۷۸ء

پانچ بجے کے قریب لاہور اُترے۔ سب سے پہلے کرنل لطیف جہاز کے پاس ہی ملے۔ ہمارے سامان کے ٹکٹ لے لیے اور ہمیں کہا: "آپ جائیں لوگ انتظار کر رہے ہیں"۔ زاہد، اکرام، ناصر، سعید سب سے آگے آگے تھے۔ ملے۔ فاروقی صاحب اور کئی دوست آئے ہوئے تھے۔ کچھ خاموشی سی تھی۔ جب منصور سامنے آیا تو اُس کے چہرے پر غم ہی غم تھا۔ رونے کو تیار تھا۔ ذرا آگے باہر گیا تو دیوار کے ساتھ لگ کر مبارکہ اور

نڑھی کھڑی تھیں۔ یہ بھی غم گین سی تھیں۔ تعجب سا ہوا اور فکر بھی۔ سعید سے پوچھا: "خیر تو ہے؟" کہا: "نہیں بابا قتل ہو گیا ہے۔ مظفر کو ایک ظالم لڑکے نے کوئٹہ ائیر پورٹ پر چاقو مار کر ہلاک کر دیا ہے"۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شوکت بھی سعید کی موٹر میں ساتھ بیٹھے اور قصہ سُنایا۔ ہم سیدھے عبدالحئی (اُس کی ساس کا بنگلہ گلبرگ میں ہے) کے گھر گئے۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو میں جذبات پر قابو نہ پا سکا اور عبدالحئی سے گلے مِل کر بہت رویا۔ یہ صدمہ بہت ہی بھاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اُن پر آسان کر دے۔ عبدالحئی نے صبر کا بھاری نمونہ دکھایا ہے۔ عطیہ کے پاس لے گئے۔ عطیہ سے گلے ملا۔ مجھے رونا تو آ ہی رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر روئی۔

کچھ دیر تک آپ عبدالحئی سعید کے ساتھ رہے اور پھر اپنا غم لیے، آپ دارالسلام تشریف لے آئے جہاں آپ کے خاندان کے تمام افراد اور احبابِ جماعت موجود آپ کے منتظر تھے۔ آپ اشکبار تھے۔ مگر ہمیشہ کی طرح صبر و رضا کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

مظفر احمد سعید کے اِس صدمہ کے حوالہ سے آپ نے ایک جگہ تحریر فرمایا:

ع مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد[۱]

(میرے دِل کے اندر ایسا درد پوشیدہ ہے کہ اگر بیان کرنا چاہوں تو زباں جل جائے)

۱: اس شعر کا دوسرا مصرع:

ع و گر پنہاں کنم ترسم کہ مغزِ اُستخواں سوزد
(اور اگر میں چھپانا چاہوں تو میری ہڈی کا گودا جل جائے)

انا للہ وانا الیہ راجعون

مظفر احمد سعید کے قاتل، عبدالناصر اچکزئی کو، اِس واقعہ کے اٹھارہ ماہ بعد مارشل لاء کی

عدالت سے سزائے موت کا فیصلہ سُنایا گیا تھا۔

نوعمر مظفر احمد سعید کا دُنیا سے اِس طرح رُخصت ہونا، خاندان بھر کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اُن کے قاتل کی سزائے موت سے انصاف کے تقاضے تو پورے ہو گئے، لیکن عبدالحیٔ سعید کا گھر ادھورا رہ گیا۔ مشیتِ ایزدی شاید یہی تھی۔ کوئٹہ کی درس گاہوں کی فضا بابا کے لیے سازگار نہ تھی۔ شاید اسی لیے اُنہیں دبستانِ خلیل میں داخلے کے لیے چُن لیا گیا۔

ملکی سیاست اور بھٹو کا انجام۔ ۱۹۷۹ء

جولائی ۱۹۷۷ء میں پاکستان کی ملکی سیاست نے ایک اور قلابازی کھائی۔ سیاسی اور مذہبی قوتیں جو ذوالفقار علی بھٹو کو برسرِ اقتدار لانے میں اُن کی معاون تھیں، اور جن کی خوشنودی اور تعاون حاصل کرنے کے لیے جماعتِ احمدیہ پر ظلم وستم توڑے گئے تھے، وہی اب اُن کے خلاف سرگرمِ عمل تھیں۔ ملک بھر فسادات کی لپیٹ میں آ گیا، اور اُس وقت کے فوجی سربراہ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو گرفتار ہو گئے۔ اُن پر محمد احمد قصوری کے قتل میں ملوث ہونے کا مقدمہ چلایا گیا، اور مجرم قرار دے کر سزائے موت کا حکم سُنا دیا گیا اور ۴/اپریل ۱۹۷۹ء کو اِس فیصلے پر عمل درآمد کر دیا گیا۔ اُس وقت نہ عوام، جنہیں وہ طاقت کا سرچشمہ قرار دیا کرتے تھے اُن کے کام آئی، نہ مال ودولت اور نہ تعلقاتِ قرابت ورفاقت ہی کام آ سکے۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے ۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو اپنی ڈائری میں تحریر فرمایا تھا:

> آج سپریم کورٹ آف پاکستان نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزائے موت کے خلاف نظرثانی کی اپیل بھی مسترد کر دی۔ آج صبح دس بجے یہ آخری فیصلہ سنایا۔ آج سے ٹھیک نوے سال پہلے یعنی ۲۳ مارچ ۱۸۸۹ء کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب، مسیح موعود نے جماعتِ احمدیہ کے لیے پہلی بیعت لی

تھی۔ یہ ہے نوے سالہ مسئلہ کا تکرار، کہ اُس نے حل کیا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

مکافاتِ عمل میں انسانی خواہشات کا کوئی دخل نہیں ہوتا

ایک نجی محفل میں ۱۹۷۴ء کے سانحات کے حوالے سے، ڈاکٹر سعیداحمد خان صاحب کی موجودگی میں، کسی فرد کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: ''اللہ‌تعالیٰ ہمیں، ہماری زندگیوں میں ان ظالموں کا انجام دکھائے''۔ اِس ذکر کو ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے ناپسند فرماتے ہوئے نصیحت کی کہ اِس طرح کہنا اور سوچنا درست نہیں۔ االلہ‌تعالیٰ کی رسی دراز ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کے ماہ و سال اُس کے فیصلوں کے پابند نہیں۔ وہ قادر ہے، جب اور جیسے چاہے گا ظلم کی سزا دے گا یا معاف فرما دے گا۔

یہ االلہ‌تعالیٰ کا اپنا فیصلہ تھا کہ یہ مکافاتِ عمل ہم میں سے اکثر نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا۔ (راقمہ)

اللہ کی عجیب باتیں

پروفیسر خلیل الرحمان صاحب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر سے اقتباس:

حضرت صاحب کا یہ الہام ۱۸۹۱ء کا ہے اور آپ کی کتاب "ازالہ اوہام" کی پرانی ایڈیشن کے صفحہ ۱۸۷ اور نئی ایڈیشن کے صفحہ ۶۸ پر ان الفاظ میں درج ہے:

اور ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص کی موت کی نسبت خدائے تعالیٰ نے اعدادِ تہجی میں مجھے خبر دی جس کا ماحصل یہ ہے کہ کَلْبٌ یَمُوْتُ عَلٰی کَلْبٌ۔ یعنی وہ کتا ہے اور کتے کے عدد پر مرے گا، جو باون سال پر دلالت کر رہے ہیں۔ یعنی اس کی عمر باون سال سے تجاوز نہیں کرے گی۔ جب باون سال کے اندر قدم دھرے گا تب اُسی سال کے اندر اندر راہی ملکِ بقا ہوگا۔

بھٹو جب جیل میں تھا تو ۵۱ سال پورے ہونے پر جیل میں اس کا birthday منایا گیا۔ کیک کاٹا گیا۔ یہ خبر اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ساری دنیا میں نشر ہوئی۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ بھٹو ۵۱ سال پورے کر کے، اب ۵۲ سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ ابھی اس سال کے غالباً چار ماہ ہی گذرے تھے کہ بھٹو کو پھانسی ہو گئی اور اس طرح ایک اور ۹۰ سالہ مسئلہ حل ہو گیا۔ بھٹو عام جلسوں میں بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ میں نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوا کر ۹۰ سالہ مسئلہ حل کیا ہے جو مجھ سے پہلے کوئی بھی نہ حل کر سکا۔ سپریم کورٹ کے سامنے بھی اپنی اسلامی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا کہ میں نے ۹۰ سالہ مسئلہ حل کر کے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ بے دین انسان

جس کو خدا اور رسولؐ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا خدا کی گرفت سے کتنا بے خوف اور نڈر تھا۔ وہ جب اپنی شوخی اور شرارت میں حد سے بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے آخر کار بُری طرح پکڑ لیا۔ اس کے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بھی نہ اس کا جنازہ نصیب ہوا اور نہ وہ اس کا منہ دیکھ سکے۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ۔ (سوائے بصیرت والو عبرت حاصل کرو) (الحشر ۵۹:۲)۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی ذمہ داریوں میں اضافہ

حضرت امیر دوم مولانا صدرالدین صاحب بوجہ پیرانہ سالی اور علالت، مجلسِ منتظمہ اور معتمدین میں اکثر تشریف لا کر صدارت نہ فرما سکتے تھے۔ اِس طرح بہت سے فیصلوں میں التواء کی وجہ سے مرکز کے کاموں میں حرج واقعہ ہو رہا تھا۔ اِس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے جون ۱۹۷۹ء سے انجمن کے سینئر نائب صدر کو، امیرِ قوم کی عدم شرکت کے موقع پر فیصلوں کی توثیق اور اُن پر عملدرآمد کرانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ اُس وقت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب سینئر نائب صدر تھے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری آپ ہی کے کندھوں پر آن پڑی اور آپ نے اِسے بطورِ احسن ادا کیا۔ تاہم امیرِ قوم سے رہنمائی حاصِل کرنے اور اُن سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے آپ بالالتزام احمدیہ بلڈنگس تشریف لے جاتے تھے اور اپنے امیر اور استادِ محترم کی معیت میں خوشگوار لمحات گزار کر دارالسلام واپس لوٹتے تھے۔

جماعت بندی، اندرونِ ملک دوروں اور جماعت کے احباب کو فعال بنانے کے لیے آپ بدستور کوشاں رہتے تھے۔ ہر تقریب میں آپ، ضرور رونق افروز ہوتے اور اپنے نصائح اور مؤثر تقاریر سے جماعت میں ایک نیا ولولہ اور شوق پیدا کرنا آپ کے معمولات میں شامل رہتا تھا۔

دفاتر انجمن کی دارالسلام میں منتقلی مارچ۔ ۱۹۸۰ء

دارالسلام میں دفاتر کی عمارت مکمل ہو چکی تھی۔ یکم مارچ ۱۹۸۰ء کو باقاعدہ طور پر تمام دفاتر یہاں منتقل کر دیے گئے۔ اس سے قبل اکثر دفاتر احمدیہ بلڈنگس ہی میں تھے، اور منتظمہ اور معتمدین کے اجلاس کا انعقاد بھی وہیں ہوتا تھا۔ اب دارالسلام جماعت کا مرکز بن گیا، تاہم امیرِ جماعت مولٰنا صدرالدین صاحب احمدیہ بلڈنگس میں ہی اقامت پذیر تھے اور احمدیہ بلڈنگس کو ایک خاص روحانی اہمیت حاصل تھی، اور ہمیشہ رہے گی۔

تربیتی کورس دارالسلام لاہور میں

ایبٹ آباد کے سمر سکول کی افادیت کی تمام جماعت معترف تھی۔ ہر دل میں یہ خواہش تھی کہ اُسی قسم کا کوئی سلسلہ کسی دوسرے مقام پر قائم کیا جائے۔ مگر لاہور کے علاوہ کوئی ایسی موزوں جگہ نظر میں نہ تھی۔ لاہور میں موسم گرما میں ایسا انتظام ناممکنات میں سے نظر آتا تھا اور کوئی دوسرا موسم ایسا نہ تھا جب ملک میں بیشتر مقامات پر تعطیلات ہوں۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی اپنی یہی آرزو تھی کہ ایبٹ آباد کا پُرفضا ماحول نہ سہی مگر نوجوانوں کی تربیت کو کسی صورت نظر انداز نہ کیا جائے۔ آپ نے تجویز دی، ہمت دکھائی، حوصلے بڑھائے تو انجمن نے لاہور میں تربیتی کورس کے آغاز کی اجازت دے دی۔ ابتدائی سالوں میں اپریل مئی کے مہینوں میں اِس کا انعقاد کیا گیا، اور پھر موسمِ گرما کی تعطیلات کو ہی زیادہ موزوں سمجھا گیا۔ ڈاکٹر سعید احمد خان، خود اِس کے لیے تحریک فرماتے تھے۔ کسی بھی مقام پر جلسے میں شرکت کے لیے جاتے تو ذاتی طور پر نوجوانوں کو لاہور آنے کی دعوت دیتے تھے۔ ۱۹۸۰ء کے تربیتی کورس میں پچاس کے قریب طالب علم شریک ہوئے۔ پندرہ روزہ تربیتی کورس کے اختتام پر آپ باہر سے شرکت کے لیے آنے والے طلباء اور تمام اساتذہ کو اپنے گھر پر دعوتِ طعام دیتے تھے، تاکہ اُن کی عزت افزائی ہو، اور جماعتی کاموں میں حصہ لینے کے لیے

حوصلے بڑھیں۔

قرآن اور عربی زبان کی تعلیم کا انتظام

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریک پر دارالسلام میں قرآن باترجمہ پڑھانے اور عربی زبان کی تعلیم کے لیے انتظام کیا گیا۔ مرزا عبدالطیف شاہد صاحب اُستاد مقرر ہوئے۔ کچھ حضرات و خواتین نہایت ذوق وشوق سے اِس میں شمولیت کرنے لگے اور اِس سے کافی مستفید بھی ہوئے۔ مگر تعلیم کا یہ سلسلہ اِس سبب سے جاری نہ رہ سکا کہ اِن پُرشوق طلباء و طالبات میں سے اکثریت کا تعلق لاہور کے مستقل رہائشیوں کا نہ تھا۔ اور وہ لاہور سے باہر چلے گئے۔ باقی کے طالب علم عدم دلچسپی اور کم فُرصتی کا شکار ہو گئے تو یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔

صالحہ ظہور احمد میموریل لائبریری

دارالسلام کے داخلی دروازے کے قریب دائیں ہاتھ پر واقع خوبصورت عمارت صالحہ ظہور احمد میموریل لائبریری کی ہے، جو جماعت کی ایک فیاض اور مخیر خاتون صالحہ ظہور احمد صاحبہ کے نام پر اُن کی عطا کردہ رقم سے تعمیر ہوئی تھی۔ وہ ایک سماجی کارکن اور جماعت احمدیہ لاہور کی ایک سرگرم رُکن تھیں۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ دارالسلام میں جو لائبریری بنائی جائے، اُس کے تمام تر اخراجات وہ اُٹھائیں۔ چنانچہ اُن کی وفات سے چند ماہ قبل ہی اِس کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا تھا، مگر تکمیل بعد میں ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں نقشہ کے مطابق، ایک بڑا ہال تعمیر کیا گیا جس کے اخراجات بھی محترمہ صالحہ ظہور احمد اور چوہدری ظہور احمد صاحب کے اموال سے ہی ادا کیے گئے تھے۔

محمد علی میموریل فری ڈسپنسری

مولانا محمد علی فری ڈسپنسری کا قیام بھی ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی مساعی کا مرہون منت

ہے۔عمارت کی تکمیل اورآراستگی کے بعد ایک جز وقتی ڈاکٹراورایک معاون کا انتظام کردیا گیا تھا اور ڈاکٹرسعید احمد خان صاحب ذاتی طور پر اس کی نگرانی فرماتے تھے۔ چند سال یہ سلسلہ اس طرح چلتا رہا۔بعد میں اِس کی نگرانی مقامی جماعت کے سپرد کردی گئی تھی۔

میاں محمد احمد، خلف الرشید مولانا محمد علی کی وفات

۲۳ جنوری ۱۹۸۱ء کو میاں محمد احمد صاحب انگلستان میں انتقال فرما گئے۔ میاں محمد احمد امیراول، جماعت احمدیہ لاہور مولانا محمد علی کے صاحبزادے اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے داماد تھے۔اُن کی وفات سے، جہاں آپ کے عزیز واقارب اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب بہت رنجیدہ خاطر تھے، وہاں اُن کے یوں بے وقت اِس جہاں سے منہ موڑ لینے سے جماعت ایک قیمتی اثاثے سے محروم ہوگئی۔ جماعت کے کاموں میں وہ غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے کاموں میں نہایت مستعدی سے آپ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔اپنے دفتری اوقات کے بعد،عموماً شام کے وقت وہ دارالسلام تشریف لاتے اور وہ تمام کام جواُن کے سپرد ہوتے تھے،اُن کی تکیمل فرماتے تھے۔میاں محمد احمد صاحب ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنا تمام وقت جماعت کے لیے وقف کرنے کی آرزو اور ارادہ رکھتے تھے،مگر اِس کا موقع اُنہیں نہ مل سکا۔مگر اس نیک ارادے سے وہ اجرِ عظیم کے حقدار ضرور ٹھہریں گے۔ چند ماہ قبل محمد احمد صاحب کا مرض، کینسر تشخیص ہوا تھا، اور وہ علاج کے لیے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔لیکن حکمِ خداوندی دُعا اور دوا سے نہ ٹل سکا اور آپ ۲۳ جنوری ۱۹۸۱ء کو اپنے مولیٰ سے جا ملے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی ڈائری کی تحریر:

> ۲۴ جنوری ۱۹۸۱ء۔ چار پانچ روز پہلے محمد احمد کی شفایابی کے لیے بہت دُعا کی۔آواز آئی: ”جنازہ“۔ میں گھبرا کر چونک گیا اور بہت دُعا کی کہ یہ آواز

درست نہ ہو۔لیکن قضائے مبرم کا علاج نہیں۔ یہ بات نوٹ کرنے یا کسی سے ذکر، طبیعت کو گوارا نہ تھا۔ دِل میں ایک کھٹکا بہرحال غیر اختیاری تھا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۸۱ء جمعہ، محمد احمد لندن میں وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اللہ نے اُنہیں ہمارے ہاں چھوڑنے کے بجائے اپنے ہاں اُن کا بلانا پسند فرمایا۔ اَلْقَلْبَ یَحْزَنَ وَالْعَیْنَ نَدْمَعُ وَ لَا نَقُوْلُ اِلَّامَایَرْضٰی بِہٖ رَبَّنَا۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اَللّٰھمَّ اُجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْھَا۔(میرا دل غم زدہ ہے اور میری آنکھ آنسو بہاتی ہے مگر ہم وہی کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو۔ بے شک سب اللہ کے لیے ہے اور سب نے اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اے اللہ مجھے میری مصیبت کے بدلے اجر دے اور اس کا نعم البدل عطا فرما)۔

محمد احمد صاحب کی وفات پر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے پیغام صلح کے لیے ایک مضمون بعنوان "سب کا پیارا۔محمد احمد" تحریر فرمایا تھا۔اُس سے چند اقتباسات:

ادارہ پیغام صلح کی طرف سے عزیزم محمد احمد مرحوم کی زندگی کے متعلق کچھ لکھنے کی مُجھ سے بھی فرمائش کی گئی ہے۔ میں اپنی موجودہ ذہنی اور قلبی حالت میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے کلماتِ طیبہ سے بہتر کوئی چیز نہیں پاتا جو بیان کرسکوں اور وہ الفاظ ہیں:

اَلْعَیْنَ نَدْمَعُ وَ الْقَلْبَ یَحْزَنَ وَ لَا نَقُوْلُ اِلَّامَایَرْضٰی بِہٖ رَبَّنَا۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ (میری آنکھیں روتی ہیں اور دِل غمگین ہے مگر میں صرف وہی کہوں گا جس سے میرا رب راضی ہو کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)۔

اتنے قریبی تعلقات کے باوجود اُن کی کم گوئی اور انتہائی سنجیدگی اور ہر قسم کی خود نمائی اور تصنع سے مبرّا ہونے کی وجہ سے محمد احمد کو سمجھنے میں مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح کچھ وقت لگا اور اُن کے صحیح مقام کا تعین مدتوں بعد ہوا۔ اور آہستہ آہستہ ان کی مخفی استعدادیں سامنے آئیں اور جب مرحوم کی عظمت پورے طور پر ہمارے لیے نمایاں ہوگئی تو مولا کریم نے اپنی کسی خاص حکمت کے تحت انہیں اپنے پاس بلا لیا اور وہ ہم سے جدا ہو گئے۔

آپ نے مزید تحریر فرمایا:

۱۹۷۴ء میں میرے لاہور آنے کے بعد جب ہمیں زیادہ قریب رہنے کا موقع ملا۔ تو محمد احمد مرحوم کی شخصیت کے مختلف حسین پہلو مجھ پر زیادہ واضح ہوتے گئے۔ اور جب انہوں نے تبلیغ بلادِ غیر کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے میرا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو اُن کے بارہ میں مجھ پر "الولد سر لابیہ" کے معنی کھلے اور اُن میں حضرت امیر مرحوم کی ظاہری اور باطنی خُوبیاں نمایاں نظر آئیں۔ مرحوم کو میں نے تحریر و تقریر دونوں میں اپنے عظیم باپ کا مُثنّیٰ پایا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت کے لیے ہماری بہت سی اُمیدیں اُن سے وابستہ ہوگئی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے اپنے راز خود ہی جانتا ہے اور ہم اس کی رضا پر راضی ہیں۔

محمد احمد صاحب کے اخلاقِ فاضلہ اور حسنِ کارکردگی کی ایک دُنیا مداح ہے۔ مولانا محمد علیؒ کی سوانح کی تالیف میں آپ نے جس قدر لگن اور محنت سے کام کیا، وہ کوئی اور اِس احسن طریق پر نہ کر سکتا تھا۔ "مجاہد کبیر" کی صورت میں یہ تالیف سلسلہ احمدیہ کی کتب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔

دارالسلام میں پُر رونق تقاریب

دارالسلام میں مواقع کے لحاظ سے تقاریب کا انعقاد کوئی نئی بات نہیں۔ مگر دو تقاریب جن کا ذکر مقصود ہے اپنی نوعیت میں منفرد تھیں۔

ہسپانوی مترجم کے اعزاز میں تقریب

ستمبر ۱۹۸۱ء میں، ڈاکٹر سعید احمد صاحب اپنے بیرون ملک دورے سے واپس تشریف لے آئے تو آپ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ ہسپانوی مترجم، مس فرینکی، اپنے وطن واپسی کے لیے تیار تھیں۔ وہ جو گذشتہ چند ماہ سے لاہور میں اِس غرض سے مقیم تھیں کہ محترم نصیر احمد فاروقی صاحب کے ساتھ ہسپانوی ترجمہ کی جانچ پڑتال کر لیں۔ وہ اپنا یہ کام مکمل کر چکی تھیں اور واپسی کے سفر کے لیے تیار تھیں۔ ڈاکٹر سعید احمد خان چاہتے تھے کہ مس فرینکی کی کسی طور پر عزت افزائی کی جائے۔ مگر مرکزی یا مقامی جماعت کی طرف سے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جا رہا تھا۔ آپ کی اِس خواہش کا علم کچھ افراد کو ہوا تو اُنہوں نے رضا کارانہ طور پر ایک تقریب منعقد کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ اہالیانِ دارالسلام سے عطیات کی تحریک ہوئی، اور ہر بچے، جوان اور بزرگ نے اِس میں خوشی خوشی حصہ لیا، اور ایک دن میں رقم بھی جمع ہو گئی، تقریب کا اہتمام بھی ہو گیا اور محترمہ مترجم صاحبہ کو ایک اُونی شال اور چار روپہلی چوڑیوں کا تحفہ بھی نذر کیا گیا۔ جس سے وہ بے حد متاثر اور خوش ہوئیں۔ اہل دارالسلام کے اِس جذبے نے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو بے حد سرور اور طمانیت بخشی۔

تقریب یومِ محمد علیؒ

مولٰینا محمد علیؒ کی یاد میں ہر سال ۱۳ اکتوبر کو ایک تقریب کا انعقاد ہوتا تھا۔ اِس سال بھی یہ تقریب ہوئی، جس میں مقررین نے مولٰینا محمد علیؒ کے افکار اور شخصیت کے حوالے سے تقاریر کیں۔ مرزا مسعود بیگ صاحب اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تقاریر بالخصوص بے حد مؤثر ثابت

ہوئیں۔ اس تقریب کو ایک خصوصیت یا انفرادیت اِس طرح سے حاصل ہوئی کہ حاضرین کو ہالینڈ کی کنونشن کی ایک ویڈیو فلم دکھائی گئی۔ یہ فلم ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اپنے ہمراہ لائے تھے اور محترم اعزاز الٰہی ملک کے تعاون سے یہ فلم تمام حاضرین کو دکھائی جا سکی تھی۔ اور اِس طرح پہلی بار یہ اہتمام ہوا کہ بیرون ملک جماعتوں کی کارکردگی کو پاکستان میں بچشمِ خود دیکھا گیا تھا۔

حضرت امیر مولانا صدر الدینؒ صاحب کی رحلت۔ ۱۵ نومبر ۱۹۸۱ء

حضرت امیر دوئم مولانا صدرالدین صاحب کچھ عرصہ سے صاحبِ فراش تھے۔ جلسہ سالانہ ۱۹۸۰ء میں بھی جماعت آپ کی ملاقات اور جلسہ میں رونق افروز ہونے سے محروم رہی تھی۔ اس کمی کو حاضرین جلسہ نے بے حد محسوس کیا تھا اور ہر ایک لب پر اُن کی صحت اور زندگی کی دُعا تھی۔ ۱۹۸۱ء کے ابتدائی مہینوں میں آپ کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور کمزوری بہت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اکثر احمدیہ بلڈنگس آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے تھے، مگر آپ کے آرام میں خلل واقع ہونے کے احتمال سے آپ کے اہل خانہ ملاقات کی اجازت کم ہی دیتے تھے۔ اس لیے آپ اُن کی دُختران اور فرزند سے احوال پوچھ کر لوٹ آتے تھے۔ آپ کی وفات سے دو روز قبل جمعہ کی شام کو ڈاکٹر صاحب بمع اپنی اہلیہ کے احمدیہ بلڈنگس مولانا صاحب کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اولاً تو ملاقات کی اجازت نہ ملی، مگر آپ کی اہلیہ محترمہ نے اتنا اصرار کیا اور مولوی صاحب سے اپنی عقیدت کی بنا پر، ملاقات کی اجازت نہ ملنے سے اتنی بے چین ہوگئیں کہ مولوی صاحب کے فرزند انکار نہ کر سکے اور کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے امیر کو اتنا کمزور اور بیمار دیکھ کر بہت آزردہ خاطر ہوئے اور اشکبار آنکھوں سے اپنے امیر کی خدمت میں آخری سلام پیش کر کے واپس لوٹ آئے۔

۱۵ نومبر ۱۹۸۱ء، طلوعِ صبح سے قبل حضرت مولانا صدرالدین صاحب، جماعتِ احمدیہ کو سوگوار چھوڑ کر، اپنے مولاءِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب فوراً احمدیہ بلڈنگس تشریف لے گئے اور کچھ وقت آپ کے اہلِ خانہ کے ساتھ گذارا اور ہر طرح سے اُن کی دلجوئی فرمائی۔ سہ پہر کے بعد آپ دوبارہ احمدیہ بلڈنگس تشریف لے گئے، تا کہ وہاں سے جنازہ کے ساتھ دارالسلام آئیں۔ مولٰینا صاحب، امیر دوم کے جنازہ کی امامت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے خود فرمائی تھی۔ دو سو سے زائد لوگ جنازہ میں شریک ہوئے۔ حضرت مولٰینا صدرالدین صاحب کو تقریباً ۳۰ برس تک جماعتِ احمدیہ لاہور کی امامت و قیادت نصیب ہوئی۔ وفات کے وقت آپ کی عمر تقریباً ایک سو ایک برس تھی۔

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے آپ کے جنازہ کا ذکر کرتے ہوئے، تحریر فرمایا تھا:

> بعد از نمازِ جنازہ میرے دِل میں رقت پیدا ہوئی اور لمبی دُعا کی توفیق ملی۔
> لوگوں نے میت کی زیارت منظم طریق سے کی جس کی میں نے ہدایت دی تھی۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اُس وقت تک قبرستان میں موجود رہے جب تک آپ کے اُستادِ محترم اور امیر کی میت کی تدفین کا کام مکمل نہ ہو گیا۔

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے حضرت امیر دوم کی وفات پر جو مضمون "حضرت مولٰینا صدرالدین صاحب مرحوم و مغفور" کے عنوان سے لکھا اُس میں سے چند اقتباسات:

> ۱۴/۱۵ نومبر کی درمیانی شب کو جماعتِ احمدیہ لاہور پر ایک بہت بھاری سانحہ گذرا۔ حضرت مولانا صدرالدین صاحب امیرِ جماعت اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے ساتھی، تبلیغِ دین کے سلسلہ میں طویل اور قیمتی خدمات بجالانے کے بعد، اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے اور جماعت کو ایک نا قابلِ تلافی نقصان اور صدمہ سے دو چار کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ آپ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے بانیوں

میں سے ایک تھے اور ۳ مئی ۱۹۱۴ء کو اس انجمن کے قیام کے سلسلہ میں جو پہلی مجلس معتمدین قائم ہوئی آپ اُس کے رکن تھے۔

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ۱۹۱۳ء، ۱۴ء سے حضرت مولٰنا سے متعارف تھے جب وہ قادیان کے تعلیم الاسلام اسکول کے پرنسپل تھے اور ڈاکٹر صاحب ایک طالب علم۔ اُس قت کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے:

> مجھے آپ کو ۱۹۱۳ء۔ ۱۴ میں بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کیونکہ آپ اس زمانہ میں تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے ہیڈ ماسٹر اور مَیں اس سکول کا طالب علم تھا۔ آپ کی پرکشش شخصیت کے جو گہرے اثرات اس مختصر عرصہ میں میرے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے وہ آج تک نہیں مٹ سکے اور نہ مٹ سکیں گے۔
>
> ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت مولانا مرحوم قرآنِ کریم بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ سننے والوں پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا تھا۔ خواہ وہ درس دیتے وقت پڑھتے یا تقریر سے پہلے اور خواہ نماز پڑھاتے وقت۔ قادیان میں طلباء بڑے اصرار سے آپ کو اس پر رضامند کرتے کہ عشاء کی نماز آپ پڑھائیں۔ آپ ان کے اِس مطالبہ کو کبھی قبول کر لیتے اور اُن کی خوشنودی کے لیے نماز پڑھا دیتے۔ اُن کی قرأت سے خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہوتی، قرآن کریم کے الفاظ دلوں میں اُتر جاتے۔ اِس رنگ میں آپ نے جماعت کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں جو کردار ادا کیا ہے اس میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔

حضرت مولٰنا کے اعلیٰ ذوق اور بلند کردار کا ذکر آپ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

آپ کی خوش لباسی، خوش کلامی، نفاست وظرافتِ طبع، جرأت مندی، مہمان نوازی اور بے داغ بلند اخلاقی کی بدولت آپ کی شخصیت میں ایک خاص جاذبیت تھی۔ بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کا یہ عالم تھا کہ جوانی کے عالم میں، انگلستان اور جرمنی میں تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے۔ مردانہ حُسن و وجاہت سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا تھا، لیکن آپ نے اپنے دامن کو کبھی تر نہ ہونے دیا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ہمارے احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کے اخلاق وکردار پر کسی کو کبھی اُنگلی اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ وہ جہاں بھی گئے، لوگوں کے سامنے اپنا پاک نمونہ چھوڑ کر آئے۔ مغربی تہذیب کی حیاسوزی اور بے باکی اُنہیں متاثر نہ کرسکی۔ برلن کی خوبصورت مسجد اور اس کا محل وقوع اور جرمن ترجمۃ القرآن آپ کی نفاستِ طبع کے مُنہ بولتے ثبوت ہیں۔

حضرت مولٰینا کی خوش بیان اور پرتاثیر تقاریر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے تحریر فرمایا:

آپ ایک نہایت خوش بیان مقرر تھے۔ سیرت پر جب آپ اپنے مخصوص انداز میں بولتے تو سامعین پر ایک وجد طاری ہو جاتا۔ اس موضوع کو نبھانے میں آپ کی نظیر دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک بار، حضرت امیر جناب مولٰینا محمد علی صاحب (اللہ کی رحمتیں ان پر ہوں) نے بھی آپ کی تعریف فرماتے ہوئے کہا کہ اللہ نے مولوی صدرالدین صاحب کو سیرت پر تقریر کرنے کا ایک خاص ملکہ عطا فرمایا ہے اور یہ اُن کا ہی حصہ ہے۔

حضرت امیر دوم کی خدماتِ دینیہ بطور اُستاد، بطور امام، بطور مبلغ اور بطور امیر جماعت احمدیہ لاہور کا اعتراف کرتے ہوئے اور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنی تحریر کو اِن الفاظ پر ختم فرمایا:

آپ کی وفات سے جماعت کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور آپ کی جدائی کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی قربت سے نوازے اور جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔آمین۔ جماعتِ احمدیہ کیلیے آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں اُن کی وجہ سے اُن کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ قائم رہے گی اور ہم اُنہیں کبھی نہ بُھول سکیں گے۔

پروفیسر نورالدین زاہد نے حضرت امیر مولٰینا صدرالدین صاحب کی وفات پر ایک نظم لکھی تھی۔اُس کا آخری شعر یہ تھا:

دمبدم یا رب رساں بر روحِ پاکش صد سلام
کہ براہِ حق متاع جان قربان کرد و رفت

اور یہ ایک شعر حضرت امیر مرحوم کی تمام زندگی کا خلاصہ ہے کہ حق کی راہ میں اپنی متاعِ جان تک قربان کر دی،اور اِس دارِفانی سے رُخصت ہو گئے۔



تیرہواں باب

بطور امیر جماعتِ احمدیہ لاہور

نومبر ۱۹۸۱ء تا نومبر ۱۹۹۶ء

حضرت مولانا صدرالدین امیر دوئم، جماعت احمدیہ لاہور کی اِس جہان فانی سے رحلت کے بعد جماعت کی نظرِ انتخاب ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب پر پڑی اور اتفاقِ رائے سے آپ اِس منصبِ اعلیٰ کے حقدار قرار دیئے گئے۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک اچھے قائد کے لیے بطورِ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

ابتدائے عمر ہی سے آپ کو صحبتِ صالحین میسر آتی رہی تھی، جس کی جھلک آپ کی شخصیت میں نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ آپ کو جماعت میں زمانۂ طالب علمی سے ہی ایک امتیازی مقام حاصل رہا تھا۔ لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں آپ احمدی نوجوانوں کی تنظیم کے صدر تھے، بلکہ آپ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ آپ اِس تنظیم کے پہلے صدر تھے۔ اور اِس حیثیت میں نمایاں کارکردگی دکھا چکے تھے۔

۱۹۳۴ء میں مانسہرہ کے سول ہسپتال میں بطور اسسٹنٹ سرجن تعینات تھے، اور اچھی شہرت اور کامیاب معالج کی حیثیت سے حکومتِ برطانیہ سے 'خان صاحب' کے خطاب کے حقدار ٹھہرے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب جماعتِ احمدیہ لاہور نے بھی آپ کی دینی خدمات کی وجہ سے آپ کو ایک اعزازی حیثیت، بطور دوامی ممبر جنرل کونسل عطا کی۔ اِس سے قبل آپ ایک عرصہ سے مجلسِ منتظمہ کے رُکن بھی چلے آتے تھے۔ سالانہ اجلاس میں آپ کی تقاریر ذوق وشوق سے سُنی جاتی

تھیں۔ اور آپ کی رقت آمیز قرأت دِلوں کو مسحور کر دیتی تھی۔ حضرت مولانا محمد علی امیرِ اول آپ کے حُسنِ قرأت کے معترف تھے اور اکثر موقعوں پر آپ کا ہاتھ پکڑ کر امامت کے لیے کھڑا کر دیتے اور خود آپ کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو جب حضرت امیرِ اوّل انتقال کر گئے اور مولانا صدرالدین صاحب رُتبہ امارت پر فائز ہوئے اور شیخ میاں محمد صاحب جماعت کے صدر قرار پائے، اُسی موقعہ پر مجلسِ معتمدین نے چار بزرگانِ جماعت کو بیعت لینے کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ یہ اعزاز محترم سید عبدالجبار شاہ صاحب المعروف بادشاہ صاحب، محترم مولوی عزیز بخش صاحب، محترم سید اسداللہ شاہ صاحب اور ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو حاصل ہوا۔

۱۹۷۴ء کے ناگزیر حالات میں، ترکِ وطن کے بعد آپ لاہور میں پناہ گزین ہوئے، تو اپنے آپ کو کلی طور پر جماعت کے کاموں کے لیے وقف کر دیا اور بطور سینئر نائب صدر اور چیئرمین بلاد غیر کمیٹی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اندرون ملک اور بیرونِ ملک جماعت بندی میں آپ کا کردار ایک تاریخی اہمیت کا حامِل رہا تھا اور جماعت کے تمام ممبران کی یہی رائے تھی کہ اعزازِ امارت کے لیے آپ موزوں ترین انسان ہیں۔ مستقبل میں جماعت کی رہنمائی کے لیے ہر نگاہ آپ پر مرکوز تھی۔ خود ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اتنی بڑی ذمہ داری اُٹھانے سے گریزاں تھے۔ آپ کو اپنی ضعیف العمری اور کمزور صحت کا احساس تھا اور یہ گمان تھا کہ آپ کے کمزور کندھے اِس بوجھ کے متحمل نہ ہو سکیں گے۔ تاہم جماعت کے مفاد اور مستقبل کی خاطِر، اتفاقِ رائے کے سامنے اپنے آپ کو یہ بوجھ اٹھانے پر مجبور پا کر رضامندی کا اظہار فرما دیا۔

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی ڈائری سے ایک تحریر:

آج ہی ۴ بجے عصر کو مختصر میٹنگ چند دوستوں سے ہوئی۔ میں نے اپنے دلی خیالات کا

اظہار کیا کہ میری کوئی خواہش امارت، صدارت کے لیے نہیں۔ میری عمر، صحت اور ہر طرح کی حالت کا تقاضا یہی ہے کہ مجھ پر یہ ذمہ داری نہ ڈالی جائے۔ سب سے پہلے میاں فضل احمد صاحب نے کہا، کوئی دوسرا آدمی جماعت میں موجود نہیں جس پر نظر پڑتی ہو۔ سب کی نظر آپ پر ہے۔ مرزا مسعود بیگ نے اُن کی تائید میں اور پھر فاروقی صاحب نے حوصلہ افزاء رنگ میں اِس پر اظہارِ خیال کیا۔ میں نے بار بار، ہر مجلس میں اپنی معذوری مجبوری کا بیان کرنے کا خیال ترک کر دیا اور کہا کہ جماعت کے مفاد کو میرے انکار کرنے سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے تو میں انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

۱۶ نومبر جمعۃ المبارک۔ جماعت کا تاریخی دن

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی تحریر:

۱۶ نومبر کو صبح کو منتظمہ کی میٹنگ (غیر معمولی) طلب کی گئی۔ رات ہی ممبران جو قریباً موجود تھے، اُنہیں نوٹس دیا گیا۔ پندرہ ممبر موجود تھے۔ کافی بحث کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ۲۰ نومبر کو معتمدین کی جو میٹنگ پہلے سے بجٹ اور دوسرے معاملوں کے لیے بلائی گئی ہے اُس میں انتخابِ امیر کا معاملہ پیش کیا جائے۔ منتظمہ نے کوئی نام تجویز نہ کیا اور یہی مناسب بھی تھا۔ یہ تین چار روز ۲۰ نومبر تک باقی تھے۔ اُن میں کوشش کی جائے کہ ہر جماعت بلکہ ہر فرد کو اطلاع پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ تحریری نوٹس بھی، فون، تار، ڈاک اور تین آدمی مقرر کیے گئے کہ وہ علاقوں میں جائیں۔ جو نہ آسکیں، وہ تحریر دیں، تو وہ لائیں (اُنہیں خود نام تجویز کرنے کا حق دیا جائے) چنانچہ یہ طریق مؤثر ثابت ہوا۔ یہ اجلاس آئین کے ہر لحاظ سے عین مطابق تھا۔ جمعہ کی صبح میٹنگ ہوئی

۳۳/۵۰ ممبر حاضر ہوئے۔ ۳ کی تحریری رائے آئی۔ فاروقی صاحب نے میرا نام تجویز کیا۔ مختصر تقریر کی۔ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب نے تائید کی اور عمدہ الفاظ میں اظہارِ خیال کیا۔ بیک آواز جملہ ممبران نے کہا، جماعت میں اِس نام کے بغیر کسی کے ذہن میں دوسرا نام آ ہی نہیں سکتا۔

میرا دِل عجیب قسم کے جذبات سے بھر آیا۔ اور مشکل سے رونے پر قابو پایا۔ ۳ بجے بعد دوپہر مسجد میں لوگ جمع ہوئے۔ سب نام لکھے گئے۔ ۲۵۶ نام لکھے گئے۔ کچھ لکھنے سے رہ بھی گئے۔ ہر جماعت کے نمائندے موجود تھے اور کئی خطوط آئے تھے۔ بعض جماعتوں کی دستخط کی ہوئی تحریریں تھیں۔ فاروقی صاحب نے استصواب رائے کیا کہ مجلسِ عاملہ کے ممبران جن کو اتفاق ہو ہاتھ اٹھائیں۔ ایک دو کے سوا سب نے اثبات میں ہاتھ اٹھائے۔ پھر مجھ سے کچھ کہنے کو کہا گیا۔ میں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے تقریر کی جو ریکارڈ کی گئی۔

معتمدین نے ۹:۳۰ فیصلہ کیا تھا۔ ۱۱:۳۰ بجے پنڈی سے تار آیا کہ پنڈی کی مجلس منتظمہ نے میٹنگ کر کے فیصلہ کیا ہے کہ انتخاب جلسہ سالانہ تک ملتوی کیا جائے۔ جب سب جماعت اور بیرونی جماعتوں کے بعض لوگ بھی حصہ لے سکیں گے۔ یہ تار معتمدین کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے اِس سے اتفاق کیا کہ یہ التوا دستور کے خلاف اور مضر ہے۔ فیصلے سے بیرونی جماعتوں کو بذریعہ تار اطلاع دی گئی۔ اگلے روز اخباروں میں خبر شائع ہوئی۔ بعض میں فوٹو بھی شائع ہوا۔

انتخاب کی اطلاح پیغام صلح مورخہ ۱۸ / ۲۵ نومبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی:

حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ایدہ اللہ باتفاقِ رائے صدر اور امیرِ جماعت منتخب ہوئے

ہماری جماعت کے امیر حضرت مولانا صدر الدین صاحب مرحوم و مغفور نے ۱۵ نومبر رات دو بجے کے قریب اس دارِ فانی سے انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ نئے امیر کے انتخاب کے لیے مجلسِ معتمدین کا اجلاس فوراً بلایا جانا ضروری تھا۔ لیکن مجلسِ معتمدین کا پہلے سے طے شدہ اجلاس چونکہ بیس ۲۰ تاریخ کو منعقد ہو رہا تھا اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ ۲۰ نومبر کو ہی انتخاب کا معاملہ مجلسِ معتمدین میں پیش کیا جائے۔ البتہ ۱۶ نومبر ۱۹۸۱ء کو مجلسِ منتظمہ کا غیر معمولی اجلاس بلایا گیا، جس میں حضرت امیرِ قوم کی وفاتِ حسرت آیات پر اظہار افسوس اور قراردادِ تعزیّت کے علاوہ یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ نئے امیر کے انتخاب کا معاملہ ۲۰ تاریخ کے اجلاس میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ بروز جمعۃ المبارک مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۱ء معتمدین کی کثیر تعداد نے باتفاقِ رائے حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو جماعتِ احمدیہ لاہور کا امیر اور احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کا صدر منتخب فرمایا۔ اور اسی روز بعد از نماز جمعہ مجلسِ عامہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں سینکڑوں کی تعداد میں تمام جماعتوں کے احباب شریک ہوئے۔ اور سب نے بیک آواز مجلس معتمدین کے فیصلہ کی تائید کی اور آئینی تقاضے کو پُورا کرتے ہوئے، حضرت ڈاکٹر صاحب کے انتخاب کی توثیق فرمائی۔ یہ انتخاب ہر لحاظ سے قومی امنگوں کے عین مطابق تھا اور ہر احمدی کے دل کی آواز تھی اور سب کی نگاہیں حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف کی طرف ہی اٹھتی تھیں، جو عملاً اور واقعتہً بھی گذشتہ چند سال سے قوم کی سربراہی اور راہنمائی کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے تھے اور وہی اس بات کے اہل تھے کہ

مستقلاً بھی اس منصبِ جلیلہ پر فائز ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور ہم سب کی دُعا ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف صحت و عافیت والی لمبی زندگی کے ساتھ جماعت کی راہنمائی فرماویں۔ اور اُن کا وجود جماعت کی ترقی و استحکام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے فروغ کا موجب ہو۔ آمین۔

والسّلام

خاکسار، مرزا مسعود بیگ

جنرل سیکرٹری احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور

مجلس عامہ میں امیر کے انتخاب کی توثیق اور رخطاب سے متعلق پیغام صلح کا ایک تراشہ:

دلگداز صدمہ کے بعد رُوح پرور منظر

حضرت مولانا صدر الدین کے جانشین کا متفقہ انتخاب

۲۰ نومبر ۱۹۸۱ء کو نماز جمعہ کے بعد، مسجد دار السلام میں جماعت کے ان سینکڑوں افراد نے جو پاکستان کے قریباً ہر شہر اور قصبہ سے احمدیہ کانفرنس (مجلس عامہ) میں شمولیت کیلیے آئے اور ایک غم کے بعد اتفاقِ رائے سے حضرت مجدد صد چہار دہم کے نئے جانشین کے متفقہ انتخاب کی خوشی لے کر گھروں کو واپس گئے۔ ایک طرف امیر جماعت حضرت مولانا صدر الدین کی رحلت کا صدمہ تھا اور اس بطل جلیل کی چند ناقابلِ فراموش خدماتِ جماعت کا تذکرہ مکرم مرزا مسعود بیگ صاحب جنرل سیکرٹری کی زبان سے سن کر سامعین کی پلکیں بھیگ گئیں اور پھر جب ان دلدوز لمحات میں امیر مرحوم کی جانشینی کے سلسلہ میں انجمن کی مجلس معتمدین کا متفقہ فیصلہ سنایا گیا تو ہر طرف سے لبیک لبیک

کی آوازوں کے ساتھ، تمام افراد نے اس فیصلہ کی حمایت میں اپنے اپنے ہاتھ اُوپر اٹھا لیے۔ اس رُوح پرور منظر کے بعد امیرِ قوم حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ایدہ اللہ تعالیٰ نے جس دلنواز اور رُوح پرور لہجے میں حاضرین کو اپنے ارشاداتِ عالیہ سے سرفراز فرمایا اس سے حاضرین کے حوصلے بلند ہو گئے اور ان کی سربراہی میں اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز میں بہر طور آگے بڑھنے کو مستعد ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ حضرت بانیء سلسلہ احمدیہ کے اس نئے جانشین کے پُر برکت وجود کی قیادت میں خلوص و محبت اور اخوت و عقیدت کے راستوں پر ایسے صدق سے قدم ماریں کہ دنیا کے لیے ایک مثال بن جائیں۔ اور منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے۔ (پیغام صلح، مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۸۱ء)۔

انتخابِ امیر پر ایک غیراز جماعت فرد کی مبارک باد

تراشہ پیغام صلح مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۸۱ء

مکتوب ڈیرہ غازی خان۔ از مکرم مولانا عبدالرحمٰن مبشر صاحب

گرامی قدر مکرم جناب ڈاکٹر اللہ بخش صاحب،

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

گرامی نامہ محررہ ۸۱۔۱۱۔۲۵ شرف صدور لایا۔ الحمدللہ کہ آپ نے بالکل صحیح شخصیت کو اپنی امارت کے لیے چُنا ہے۔

میں مکرم ڈاکٹر صاحب سے ایبٹ آباد میں ملا تھا جبکہ میں اپنے بیٹے کو ایبٹ آباد تبدیلئ آب و ہوا کے لیے لے کر گیا تھا۔ عزیز چسٹ کا مریض تھا۔ مکرم ڈاکٹر صاحب نے کمال شفقت اور مہربانی سے عزیز کے علاج میں مدد فرمائی تھی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔ مکرم ڈاکٹر صاحب بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ سب سے بڑی بات ان میں قربانی کا ارادہ اور شفقت علیٰ خلق اﷲ، نیز حضرتِ اقدس مرزا صاحب، بانیء سلسلہ احمدیہ سے جذبۂ محبت اور عہدِ بیعت پر مثالی استقامت ہے۔

کامل اتفاق رائے سے نئے امیرِ جماعت کے انتخاب پر اظہار اطمینان۔ اندرون و بیرون ملک جماعتوں کی طرف سے آمدہ خطوط کی ایک جھلک

مفتخر از درگہِ بندہ نواز — بانشاں ہائے نمایاں سرفراز

ازضیائے مہرِ او پُرنُور شُد — ازحقائق سینہ اش معمور شُد

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے انتخاب بحیثیت امیر پر بے شمار خطوط آپ کے نام آئے۔ اِس کے علاوہ جنرل سیکرٹری صاحب اور دیگر ممبران منتظمہ اور معتمدین کے نام بھی خطوط موصول ہوئے۔ اِن میں سے کچھ کے اقتباسات دسمبر ۱۹۸۱ء کے پیغام صلح کے شمارہ میں شامل کیے گئے تھے۔

جناب حفیظ الرحمٰن صاحب، ڈپٹی انسپکٹر سکولز گلگت

حضرت امیر قوم ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ معلوم کر کے کہ قوم نے آپ کو امیر کے عہدہ پر منتخب کر لیا ہے، اس فیصلے کا علم پا کر خوشی ہوئی، میری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی عطا فرمائے اور جو ذمہ داری قوم نے آپ کے سپرد کی ہے آپ اس سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو سکیں۔ ہمارے دلوں کو حوصلہ ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اِس ضعیف العمری کے باوجود لگن اور محنت سے دینی خدمات سرانجام فرما رہے ہیں۔ آپ کا وجود ہمارے لیے باعثِ برکت اور راہبری و راہنمائی ہے۔ آپ سے نمازوں میں اپنے لیے دعاؤں کا درخواست گذار ہوں۔ مجھے دعاؤں سے نوازیں۔

یوکے جماعت کے سیکرٹری شاہد عزیز صاحب

یوکے جماعت کے تمام ممبران حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے متفقہ انتخاب امارت و قیادت پر اظہار اطمینان کرتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ مرکزی انجمن نئے امیر کی قیادت میں ترقی کرے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم نئے امیر کی قیادت میں اپنا تن من دھن خدمتِ دین میں لگا سکیں۔

فجی جماعت کے جنرل سیکرٹری شوکت اے علی صاحب

ہماری جماعت کو حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے متفقہ طور پر امیر

جماعت منتخب ہونے پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔حضرت ڈاکٹر صاحب اپنی طویل انتھک مخلصانہ اور بے غرضانہ محنت کی بدولت اس پاکیزہ جماعت کی قیادت کے ہر طرح سے مستحق تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے دینی عزائم اور کاموں میں برکت ڈالے۔

یوتر خت جماعت (ہالینڈ) سے مولٰینا جگو صاحب

جنرل سیکرٹری صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

ہم آپ کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو متفقہ طور پر اپنا امیر وصدر منتخب کر لیا ہے۔ ہماری طرف سے انہیں دلی مبارک باد دیں۔ ہماری دُعا ہے کہ خداوند کریم انہیں اپنے دینی مقاصد میں کامیاب فرمائے۔آمین۔

بمبئی (بھارت)

جناب عبدالرزاق صاحب بذریعہ تار اطلاع دیتے ہیں:

بمبئی کے احمدی نئے امیر حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب ایدہ اللہ کو منتخب ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

کراچی سے راجہ محمد بیدار صاحب

حضرت مولٰینا صدر الدین امیر قوم کی وفات سے از حد صدمہ ہوا۔ پھر آپ کے امیر قوم منتخب ہونے پر تمام جماعتِ کراچی بالخصوص، محمد حسن خان صاحب نے بے حد اطمینان کا اظہار کیا۔ کیونکہ آپ کا وجود ایسی ہستی تھا جو اس کی اہل تھی۔

ورنہ قوم انتشار کا شکار ہو جاتی۔ فالحمدللہ علی ذالک۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر دیر تک قائم رکھے اور آپ کے وجود مبارک سے اس جماعت کو ترقی دے۔ جو کہ حضرت اقدس کی صحیح جانشین ہے۔ اِس خط کو میری بیعت کا خط سمجھیں۔

سکاٹ لینڈ (انگلینڈ) سے ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب

حضرت مولٰینا صدرالدین امیرِ قوم کی وفات کی خبر سے صدمہ ہوا ہے۔ حضرت مرحوم نے قوم و ملک اور بیرون ملک کافی خدمت کی تھی۔ یہ پڑھ کر اطمینان بھی ہوا کہ آپ کو کامل اتفاقِ رائے سے امیر و صدر منتخب کرلیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو طاقت دے اور آپ کی نصرت فرمائے۔

جماعت بدوملہی کا نئے امیر کے انتخاب پر اظہارِ اطمینان

جماعت بدوملہی نے اپنے ایک غیرمعمولی اجلاس زیرصدارت چوہدری عبدالحق ملہی صاحب حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے انتخاب پر اطمینان کا اظہار کیا اور اس کو جماعت کے لیے ایک نیک شگون قرار دیا۔ یہاں کی جملہ جماعت قلبی طور پر آپ کی تابعداری کرنے کا عہد کرتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کی راہ میں آپ کی مدد فرمائے۔ آمین۔ (شیخ اللہ بخش، سیکرٹری جماعت بدوملہی)

ڈیرہ غازخان

امان اللہ خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں: "حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب

کو اتفاقِ رائے سے نیا امیر بنایا گیا جو صحیح اور وقت کے تقاضا کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تبلیغی وتربیتی مہمات میں کامیابی دے اور صحت والی لمبی زندگی دے۔

جماعت کچھی، ہزارہ

مکرم عبدالعزیز صاحب، سیکرٹری جماعت کچھی حضرت ڈاکٹر سعید احمد خاں صاحب کی خدمت میں لکھتے ہیں کہ آپ کے متفقہ طور پر امیرِ قوم منتخب ہونے پر دلی مبارکباد قبول فرماویں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کی قیادت میں ہر قسم کی قربانی کا عہد کرتے ہیں۔

ہیورڈ، امریکہ

چوہدری مسعود اختر صاحب ہیورڈ سے حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی خدمت میں لکھتے ہیں کہ آپ کو ساری قوم نے بلا مقابلہ امیرِ جماعت اور احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور کا صدر منتخب کیا ہے۔ اس پر ہم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم سب صدقِ دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس انتخاب کو دین کی تبلیغ اور جماعت کی ترقی کے لیے باعث برکت کرے اور آپ کو صحت، ہمت اور لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ قوم نے جو ذمہ داریاں آپ کے کندھوں پر ڈال دی ہیں اُن سے آپ کماحقہٗ عہدہ برآ ہوسکیں۔ USA جماعت کے تمام ممبران آپ کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں اور آپ کے ہر حکم کی اطاعت کرنا ہمارا فرض ہوگا۔

ساؤتھ ویلز، یوکے

سید محمود حسین شاہ صاحب حضرت ڈاکٹر سعید احمد خاں صاحب کی خدمت میں تحریر فرماتے ہیں:

مولانا صدرالدین صاحب کی وفات کی خبر سنی۔ دلی صدمہ ہوا مولانا بڑے پائے کے انسان تھے۔ ایسے انسان کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کو اتفاق رائے سے امیر اور صدر منتخب کیا گیا ہے۔ مجھے یہ سُن کر نا قابلِ بیان مسرت اور اطمینان نصیب ہوا۔ میری دُعا ہے کہ رب العالمین آپ کو اس کارواں کی امارت کے لیے طویل مدت تک آپ کی رہبری فرماوے اور آپ سے اپنی منشاء کے مطابق کام لیوے۔ آمین۔

حضرت امیر کا عزمِ سفر برائے راولپنڈی اور ایبٹ آباد

حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی صحت گذشتہ چند ماہ کے دوران کافی کمزور رہی تھی۔ چند دِن کے افاقہ کے بعد اب دوبارہ کچھ علیل ہو گئے تھے۔ تاہم آپ کی باجماعت نماز میں شرکت، احباب سے ملاقات یا دفتری معمول میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ آپ کو آرام اور تبدیلیٔ آب و ہوا کا مشورہ دیا گیا، جس کے تحت آپ نے چند روز راولپنڈی اور ایبٹ آباد میں گذارنے کا ارادہ کر لیا۔ آپ ۳۰ نومبر ۱۹۸۱ء کو عازمِ سفر ہوئے۔ فلائنگ کوچ سے سفر کرتے ہوئے آپ راولپنڈی پہنچے اور ایک روز وہاں قیام فرمایا۔ اِس ایک روزہ قیام میں آپ شیخ فاروق احمد صاحب کی رہائش گاہ پر اُن کی اہلیہ محترمہ کی تعزیت کے لیے تشریف لیے گئے اور کئی دوسرے احبابِ جماعت سے ملاقات ہوئی۔

ایبٹ آباد میں آپ کو شدید سرد موسم کا سامنا کرنا پڑا، مگر ڈاکٹر عبدالکریم سعید کی توجہ اور

علاج سے آپ کافی بہتر محسوس کرنے لگے۔ ہفتہ بھر کے اِس قیام میں آپ کو جلسہ سالانہ کی تقاریر کی تیاری کا بھی موقعہ مل گیا۔ آپ ۸ دسمبر ۱۹۸۱ء کو مرکز میں تشریف لے آئے۔ اب آپ کے سامنے جلسہ سالانہ کے انتظامات و انصرام کا کام تھا، جو احسن طریق پر ہوتا چلا گیا۔

احباب راولپنڈی کا احمدیہ انجمن کے خلاف مقدمہ

جلسہ سالانہ آپ کی تمناؤں اور خواہشات کے مطابق نہایت شاندار اور کامیاب رہا۔ بطورِ امیر یہ آپ کا پہلا جلسہ تھا۔ احبابِ جماعت نے ذوق وشوق سے شرکت فرمائی۔ اور آپ کی ذات پر بحیثیت امیرِ جماعت مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا۔

تمام جماعت کا اعتماد اور خوشنودی ایک طرف، مگر جماعت کے ایک خاص گروہ کی ناخوشی دوسری طرف ایک مقدمہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ راولپنڈی کے ایک مخصوص گروہ، جس میں وہاں کے سرکردہ ممبران شامل تھے، نے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے انتخاب بطورِ امیر کے طریقہ کار کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے انجمن کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا، حالانکہ یہ انتخاب ہر طرح سے آئین کے مطابق تھا اور اتفاق رائے سے ہوا تھا۔ اور جماعت آپ پر اظہار اعتماد و خوشنودی کر چکی تھی۔

یہ مقدمہ امیرِ قوم اور جماعت کے لیے خاصی تشویش کا باعث رہا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت پر ہمیشہ آپ کا بھروسہ رہا ہے اور وہ اب بھی قائم تھا۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں آپ کو بشارات سے بھی نوازتا رہا۔ حضرت امیر کی ۲ فروری ۱۹۸۲ء کی ایک تحریر:

> نماز فجر کے بعد سویا۔ نیم خوابی میں زبان پر (جب کوئی خواب دیکھ چکا تھا اور یاد نہیں رہا) یہ الفاظ جاری ہوئے: ”یہ آگ پانچ منٹ میں اور اگر مبالغہ نہ ہو تو تین منٹ میں بجھ سکتی ہے“۔ فوراً خیال پنڈی سے نئے جوش سے جو آگ سلگائی جا رہی ہے، اُس کی طرف چلا گیا۔ (غیض وغضب کی آگ، فتنوں کی آگ)۔

اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ۔

یہ مقدمہ تقریباً تین سال تک چلتا رہا اور انجام کار انجمن کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں جس ذہنی اذیت سے آپ کو گذرنا پڑا، وہ آپ کا ہی ظرف تھا کہ آپ اِس کے متحمل ہو سکے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں پر کوئی بوجھ ڈال کر آزماتا ہے تو اُس کا متحمل ہونے کے لیے طاقت بھی عطا کر دیتا ہے۔

اندرونِ ملک دورہ جات

فروری سے مئی ۱۹۸۲ء کے چار ماہ کے دورانیہ میں حضرت امیر متعدد مقامات پر تشریف لے گئے تاکہ اندرونِ ملک جماعتوں سے رابطہ قائم کر سکیں اور فرداً فرداً احباب جماعت سے ملاقات فرما سکیں، یہ دورہ جات دوررس اہمیت کے حامِل تھے۔

جن جن مقامات پر آپ تشریف لے گئے، وہاں کی مقامی جماعتوں نے آپ کے استقبال کے لیے جلسہ کا انتظام کیا اور اکثر مقامات پر آپ نے نماز جمعہ کے خطبات دیئے اور امامت فرمائی۔ آپ احباب جماعت سے خصوصی ملاقات کے لیے، اُن کی اقامت گاہوں پر بھی تشریف لے جاتے رہے، بالخصوص آپ نے اُن ممبران کی عزت افزائی فرمائی جو بوجہ ضعیف العمری یا بیماری اور کمزوری کے نمازِ جمعہ یا جلسہ میں شامل نہ ہو سکتے تھے۔ ان دورہ جات کے سلسلہ میں آپ کراچی، ملتان، فیصل آباد، سیالکوٹ، وزیرآباد، پشاور، راولپنڈی اور ایبٹ آباد تشریف لے گئے تھے۔ ہر مقام پر ارکانِ جماعت کی طرف سے آپ پر بھرپور اعتماد کا اظہار ہوا، اور آپ نے حتی الوسع، اپنے مخصوص انداز اور بردباری سے اُن تمام غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا، جو افرادِ جماعت کے دِلوں میں مخالفین کی طرف سے پھیلائی گئی افواہوں سے پیدا ہوئی تھیں۔

راولپنڈی میں آپ کی آمد سے قبل ہی ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ جماعت

میں آپ کی پذیرائی نہ ہو سکے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال رہا اور عمومی طور پر احباب کی طرف سے گرم جوشی کا مظاہرہ ہوا۔ البتہ ایک مخصوص گروپ کی طرف سے دورانِ ملاقات طنز آمیز گفتگو اور دلآزار خیالات کا اظہار ہوا۔ مگر اپنی متحمل مزاجی اور بردباری کی وجہ سے آپ نے فضا کو مقدر نہ ہونے دیا۔ اور کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہوسکی جیسا کہ اُن ممبران کا اِرادہ تھا کہ ہو جائے۔

خواجہ خلیل کا فتنہ

حضرت خواجہ کمال الدین مرحوم ومغفور کے ورثاء میں سے ایک شخص خواجہ خلیل صاحب تھے۔ اُنہوں نے اپنی طرف سے انجمن کے لیے ایک فتنہ کھڑا کر دیا کہ احمد یہ انجمن ایک غیر مسلم جماعت قرار دی جا چکی ہے اور چونکہ اب اُس کی یہ حیثیت تبلیغ اسلام کے کام میں مانع ہے، اور چونکہ خواجہ صاحب نے اپنی املاک اِسی کام کے لیے وقف کی تھیں اس لیے اب اس انجمن کو اِس حق سے دستبردار کر کے یہ املاک خواجہ صاحب کے وارثوں کو دی جائیں۔ نہ صرف یہ مطالبہ کیا بلکہ اُس عمارت پر جہاں 'ووکنگ مسلم مشن ٹرسٹ' کا دفتر تھا، اپنے قبضہ میں لے لیا۔ انجمن کے لیے یہ صورتِ حال تشویش کا باعث بن گئی جس کے لیے فوری چارہ جوئی کی ضرورت تھی۔ حضرت امیر کا قیام اُس وقت ایبٹ آباد میں تھا۔ وہاں آپ کو اطلاع دی گئی، جو آپ کے لیے موجب پریشانی تھی۔ آپ نے مرکزی دفتر کو ضروری کاروائی کی ہدایت فرمائی۔

موضع چھپڑ کا واقعہ۔ اپریل ۱۹۸۲ء

موضع چھپڑ، بالاکوٹ روڈ پر ایک پہاڑی مقام ہے، جہاں حضرت امیر کی سسرال آباد تھی۔ یہ خاندان گذشتہ ایک صدی سے زائد عرصہ سے وہاں کے رہائشی تھے۔ حبیب الرحمن صادق صاحب کے دادا محترم نجم الدین صاحب وہاں کے پیش امام تھے۔ گاؤں میں زمین کا ایک خاصا بڑا رقبہ، بطور پیش امام اُن کے نام کیا گیا تھا، جو ۱۸۷۴ء سے اِس خاندان کی، بلاشرکتِ غیر، مسلمہ طور پر ملکیت

چلا آتا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے ملکی زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت اِس قطعۂ اراضی کا، بنام حبیب الرحمان صاحب مستقل طور پر انتقال کر دیا گیا تھا۔

چھپڑ میں یہ واحد احمدی خاندان تھا۔ حبیب الرحمن صادق صاحب ۱۹۷۰ء میں وفات پا گئے تھے اور ۱۹۷۴ء میں اِس خاندان کے افراد راولپنڈی، اسلام آباد میں رہائش پذیر تھے۔ اُن کی عدم موجودگی میں، اُن کے گھر کا تمام اثاثہ، گاؤں والوں نے ہنگامہ آرائی کر کے لوٹ لیا تھا، اور مسلسل دھمکیاں دیتے رہتے تھے کہ اگر اِن میں سے کسی نے گاؤں کا رُخ کیا تو بچ کر نہ جائے گا۔

گھر تو لوٹا جا چکا تھا۔ اب یہ قطعۂ اراضی بھی شر پسندوں کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا، جس کے لیے اُنہوں نے عدالتی کارروائی کا آغاز اِس بنیاد پر کیا کہ میاں نجم الدین صاحب احمدی نہ تھے، (وہ حضرت صاحب کے دعویٰ سے قبل وفات پا چکے تھے) اِس لیے احمدی اُن کے وارث نہیں ہو سکتے، یہ زمین گاؤں والوں کو واپس کر دی جائے۔

اپریل ۱۹۸۲ء میں ایک جج صاحب جو فیصلہ کی تاریخ سے چند روز قبل مانسہرہ تبدیل ہو کر آئے تھے، اور مقدمہ کی حقیقت اور کارروائی سے واقف نہ تھے، اپنی اس لاعلمی کی بنا پر ارجمند صادق صاحب کے خاندان کے خلاف فیصلہ دے دیا، حالانکہ اِس فیصلے کا کوئی قانونی جواز نہ تھا۔ یہ بلا جواز فیصلہ، جو محض احمدیت سے عداوت کے سبب دیا گیا تھا، اِس خاندان کے لیے کسی صورت میں قابلِ قبول نہ تھا۔ ارجمند صادق صاحب اپنے دو بھائیوں جاوید صادق، وحید صادق اور چند ننھیالی رشتہ داروں کے ساتھ چھپڑ گئے تاکہ بذریعہ بات چیت اپنی اراضی پر قبضہ بحال رکھ سکیں۔ ارجمند صادق صاحب نے گاؤں کے نمائندگان سے معقول صلح جویانہ گفتگو کی، اور اکثریت نے اُن کے حق کو تسلیم کیا۔ مگر شر پسند افراد، جن کا اصل مقصد فساد اور ہنگامہ آرائی تھا، بھلا کب چُوکنے والے تھے۔ فوراً مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے زہر اُگلنے لگے۔ اعلان ہوا کہ آج مرزائی گھیر لیے گئے ہیں، زندہ بچ کر نہ جا پائیں۔ لوگ جمع ہوئے، ڈنڈے برسنے لگے اور پتھراؤ شروع ہو گیا، اور ایک مجمع ہتھیاروں سے

لیس گھر میں داخل ہو گیا۔ گولیاں چلیں، جاوید صادق کے دائیں بازو پر گولی لگی اور چھرے گوشت کے اندر پیوست ہو گئے۔ گہرے زخم سے خون بہنے لگا۔ اُدھر وحید صادق کو ڈنڈوں سے زدوکوب کیا گیا۔ سامنے کے دانت ٹوٹ گئے کان اور سر پر گہری چوٹ لگی اور کمر پر ایک بڑا پتھر لگنے سے گہرا زخم آ گیا۔ چند دیگر افراد بھی زخمی ہوئے، اور یہ پانچ چھ افراد گھر کے اندر محصور ہو کر رہ گئے۔

محمد ارجمند جسمانی زدوکوب سے محفوظ رہے اور معجز نما طریقے سے نرغے سے نکلنے میں کامیاب ہو کر، مانسہرہ تھانے تک پہنچ گئے۔ پولیس سٹیشن سے فرنٹیئر کانسٹیبلری کا ایک دستہ بھیجا گیا، جس نے جانبین کے چند افراد کو گرفتار کر لیا اور زخمیوں کو مانسہرہ ہسپتال میں پہنچا دیا۔ جہاں جاوید اور وحید کا ابتدائی علاج معالجہ کیا گیا۔ محمد ارجمند، ضمانت قبل از گرفتاری حاصِل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور مزید کارروائی کے لیے تگ ودو کرنے میں مصروف ہو گئے۔

حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے واقعہ چھپڑ کو تاریخِ احمدیت کا ایک اہم واقعہ قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

> ہزارہ میں احمدیوں پر جو اس نوعیت کے حادثات پہلے گذر چکے ہیں اِن میں یہ پانچواں واقعہ ہے۔ ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۴ء کا دیبگراں کا، ۱۹۰۶ء کا داتہ کا، ۱۹۲۴ء میں بیدڑہ کے قریب پڑھنہ کے راستہ میں عمویم محمد یعقوب پر وار، اور ۱۱ جون ۱۹۷۴ء کا ایبٹ آباد وغیرہ کا، اور یہ تازہ واقعہ ۱۹۸۲ء کا جو چھپڑ میں پیش آیا، تصرف اور قدرت الٰہی کے معجزانہ تاریخی واقعات ہیں۔

اِس واقعہ کے بعد کی صورتِ حال ایسی تھی کہ اِس خاندان کے کسی بھی فرد کا گاؤں کی طرف رُخ کرنا، موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ عمومی طور پر انہیں یہی مشورہ دیا جا رہا تھا اور اِن میں کئی صاحبِ حیثیت و صاحبِ اختیار افراد کی رائے بھی شامل تھی کہ اپنی زندگی کا خطرہ مول لینے کے بجائے احمدیت سے دست بردار ہو جائیں، اور اپنی متاع محفوظ کر لیں۔ بصورت دیگر اپنی املاک

سے دستبردار ہو جائیں اور امنِ عامہ کے لیے خطرہ نہ بنیں۔ خود بھی جیئں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔

مگر اِس غیور اور جرأت مند خاندان کے لیے اِن میں سے ایک بات بھی قابلِ قبول نہ تھی۔ اُنہوں نے احمدیت پر ثابت قدم رہتے ہوئے اور جرأت و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے جائز حق کے لیے قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کیا۔ یہ مقدمہ مختلف عدالتوں سے ہوتے ہوئے، عدالت عظمیٰ تک پہنچا اور دس سال کے عرصہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۹۹۲ء میں اس خاندان کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔

اِن کی یہ جرأتِ ایمانی اور احمدیت کے لیے غیرت، ثابت قدمی اور جہدِ مسلسل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہوئی اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر نے اُنہیں وہ سب کچھ لوٹا دیا جو اُن کا تھا اور بطورِ اجر، بے حساب اور وسیع رزق اور وسائل سے نوازا۔ اور ایک باعزت اور باآبرو زندگی گذارنے کے اعلیٰ مواقع فراہم فرمائے۔

محترم حبیب الرحمان صادق صاحب مرحوم و مغفور کا مختصر تعارف

واقعہ چھبڑ میں متشدد ین کا براہِ راست نشانہ بننے والے اور کمال جرأت ایمانی سے اِس سے نبرد آزما ہونے والے نوجوان، حبیب الرحمان صادق کے فرزندان ہیں۔ یہ غیرتِ دین اور جرأت ایمانی انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملی ہے۔

حبیب الرحمان صادق صاحب حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے برادر نسبتی تھے۔ ہر دو کا باہمی تعلق برادرانہ محبت، بے تکلفی اور اعتماد کا تھا۔ معاملات جماعتی نوعیت کے ہوں یا گھریلو نوعیت کے، باہمی صلاح اور مشورہ سے طے پاتے تھے۔ صادق صاحب ہر آزمائش اور ہر مشکل گھڑی میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے اور ہمیشہ حوصلہ اور اعتماد بڑھانے میں نمایاں کردار

ادا کرتے تھے۔

آپ دونوں کی باہمی دوستی اور اعتماد میں جذباتیت اور جانب داری کبھی حائل نہیں رہی۔ اس کے اظہار کے لیے ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ یہ اُس دور کا ذکر ہے جب حبیب الرحمان صادق صاحب کاروباری مصروفیات کے سلسلہ میں بمبئی میں مقیم تھے۔ غالباً ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے اپنے کسی مکتوب میں اپنی صحت کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا ہوگا۔ جس کے جواب میں صادق صاحب نے اپنے خط میں یہ تحریر فرمایا تھا: " آپ فکرمند کیوں ہیں؟ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ بچے چاہے میری بہن اُمِّ کلثوم کے ہوں یا میری بہن زینب کے، وہ میری ذمہ داری ہیں۔"

یہ اُن کے اپنے اخلاص کی انتہاء تھی کہ اُنہوں نے آپ کی اولاد کو بلاتفریق ایک جیسا درجہ دیا۔ اور اگر کبھی ایسا وقت آتا تو وہ اپنے صدق پر ضرور پورا اترتے۔ مگر تقدیرِ الٰہی کو کچھ اور منظور تھا۔ اور اُن کی اپنی کم سِن اولاد اُن کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئی۔ وہ ۷ مئی ۱۹۷۰ء کو اپنے مولاءِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کی وفات حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اور اُن کی ازواج کو ایک محبت کرنے والے بھائی سے محروم کر گئی اور جماعت ایک قیمتی بےنفس خادمِ دین سے محروم ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ حبیب الرحمان صادق صاحب، جماعت کی خدمت کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ بمبئی کے قیام کے دوران، جہاں آپ کا تعلق قائداعظم محمد علی جناح جیسی بڑی شخصیات سے تھا، وہاں جماعت کے بزرگان مولٰینا محمد علیؒ، میاں نصیر احمد فاروقی صاحب اور عبدالعزیز خان آف زیدہ بھی (جو اُن ایام میں بمبئی میں رہائش پذیر تھے) آپ کے حلقۂ احباب میں تھے۔ وہ جماعت کی تمام تر سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق صادق صاحب مرحوم کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اُن کے پیش کردہ قلم سے مولٰینا محمد علیؒ نے اُن کی خواہش کے احترام میں، ترجمۃ القرآن کے کئی صفحات تحریر فرمائے۔

حبیب الرحمان صادق نے احمدیہ انجمن لاہور کے مرکزی دفتر میں بیش بہا خدمات سرانجام

دیں۔ یہ اُنہی کی محنت اور سچی لگن اور مستعدی کا نتیجہ ہے کہ انجمن کو یہ قطعۂ زمین حاصل ہو سکا، جس پر آج جماعت کے مرکزی دفاتر، خوبصورت مسجد اور ایک پُرامن اور پُرسکون بستی تعمیر ہے جو 'دارالسلام' کے نام سے آباد ہے۔ اُن کے اِس عظیم کام کے لیے جماعت کا ہر فرد اُن کا زیرِ احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اُس دارالسلام میں داخل فرمائے اور بلند مقام عطا فرمائے جس کا وعدہ اُس نے اپنے خاص بندوں سے فرما رکھا ہے۔

اِس دُنیائے فانی میں حبیب الرحمان صادق صاحب کی آخری آرام گاہ کے لیے، اُن کی اپنی اراضی میں ایک خوبصورت مقام کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مگر حیف صد حیف کہ تخریب کاروں کے دست برد سے اُن کی لوحِ تربت بھی محفوظ نہ رہی اور اُن کے والد کے نام حمید اللہ میں، اللہ کا نام بھی اُن سے برداشت نہ ہو سکا جسے اُن ظالموں نے اپنے ہاتھوں سے کھرچ کر مٹا دیا۔ اپنی جہالت کے اندھے پن میں اُنہیں یہ بھی دکھائی نہ دیا کہ وہ ہستئ باری تعالیٰ کے نام 'اللہ' کو منہدم کر رہے ہیں اور وہ یہ بھی نہ سمجھ پائے کہ "حبیب الرحمان" میں 'رحمان' بھی تو اُسی ہستی کا نام ہے جسے مٹا دینے کے وہ درپے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

ماہِ رمضان، ایبٹ آباد میں

جون، جولائی ۱۹۸۲ء میں حضرت امیر ایبٹ آباد میں تشریف فرما تھے۔ یہاں ماہِ رمضان کے بابرکت دِنوں میں آپ کو روزے رکھنے کی توفیق نصیب ہوئی، اور خوشگوار موسم اور پُرفضا گرد و پیش کے باعث عبادات اور فرائض منصبی کی ادائیگی میں سہولت میسر آئی۔ اِس رمضان میں جو خصوصی سعادت آپ کو نصیب ہوئی۔ وہ اُس مُصحفِ قرآن سے تلاوت تھی، جو حضرت مسیح موعود کے زیرِ تلاوت رہا تھا، اور مسیح موعود نے اپنے قلم سے اِس پر 'اوامر و نواہی' کی نشاندہی فرمائی تھی۔ اِس سے متعلق حضرت امیر کے جذبات:

۲۱ جولائی رمضان کا آخری دِن

آج دوپہر کو قرآن کریم، جو یکم رمضان کو شروع کیا تھا، ختم کیا۔ اور یہ دور حضرت اقدسؒ کے اُس مُصحَف سے تلاوت کرنا نصیب ہوا، جس پر حضرت صاحب نے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کتنی مرتبہ تلاوت فرمائی اور اوامر و نواہی پر سُرخ نشان لگائے ہیں۔ بعض خاص خاص مقامات پر اور بھی نشان لگائے ہیں۔ یہ بڑی سعادت ہے جو مجھ عاجز کو عجیب راستوں سے نصیب ہوئی۔

ویمبلے، لندن میں مرکز کا حصول

رمضان کے اِس ماہ میں، حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بڑی خوشخبری سے مسرور فرمایا۔ وہ یہ کہ لندن میں مرکز کے قیام کے لیے مکان کے حصول کی تمام تر کارروائی مکمل ہوگئی اور محمد انور صاحب امام لندن وہاں منتقل ہو گئے۔

حضرت امیر کے تاثرات:

لندن سے انور کا خط آیا ہے۔ ویمبلے مکان کا قبضہ مل گیا ہے۔ ۲۲ جولائی ۱۹۸۲ء، جمعہ کی شام، انور نئے مکان میں چلے گئے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ بڑی تنگی میں، ڈیڑھ، دو سال بڑے صبر سے گذارا۔ اب اللہ نے یہ بڑا اور وسیع مکان، جو ۱۱، ۱۲ کمروں پر مشتمل ہے، دیا ہے۔ اللہ انجمن اور اشاعتِ دین کے لیے مبارک کرے۔

متوازی سلسلہ کتب

یہ ۲۶ یا ۲۷ نومبر ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے۔ بعد از نمازِ عشاء، تین چار افراد حضرت امیر کی رہائش گاہ پر آپ سے ملاقات کے لیے آئے۔ ایک فرد کے ہاتھ میں چند کتب تھیں۔ رسمی گفتگو کچھ

دیر تک ہوتی رہی اور آپ کے حق میں تعریفی کلمات اور القاب کا خاصا تکرار ہوتا رہا، جو آپ پسند نہ فرماتے تھے۔

بالآخر آمدند برسرِ مطلب، اور اظہارِ مُدعا کیا کہ ’مرزا غلام احمد فاؤنڈیشن‘ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جا چکا ہے جس نے حضرت صاحب کی کتب براہین احمدیہ، شحنۂ حق اور انجام آتھم وغیرہ شائع کی ہیں اور وہ جلسہ سالانہ پر انجمن کی کتب کے ساتھ، برائے فروخت رکھنا چاہتے تھے۔ حضرت امیر نے فرمایا کہ یہ تو ایک متوازی سلسلہ قائم کیا گیا ہے اور کتب کی اشاعت میں duplication کی گئی ہے۔ آپ کے اِس جواب پر، وہ صاحب کہنے لگے کہ اچھا کام ہے کوئی بھی کر سکتا ہے، یہ کوئی متوازی سلسلہ نہیں ہے۔ حضرت امیر نے نہایت مستعدی سے یہ جواب دیا کہ وہ اِس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ فیصلہ اتفاق رائے، اور دوسرے ممبران کے مشورہ سے کیا جائے گا۔ وہ وفد مایوس لوٹا۔ درحقیقت یہ انجمن کے کاموں میں مداخلت کا ایک نیا انداز تھا، اور مسلسل ایسی کارروائیوں کی بنیاد تھی، جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

مرزا مسعود بیگ صاحب کا استعفیٰ اور چوہدری منصور احمد صاحب کی تقرری بطور جنرل سیکرٹری

مرزا مسعود بیگ صاحب گذشتہ کئی برس سے بحیثیت جنرل سیکرٹری خدمات انجام دے رہے تھے اب عارضۂ قلب کی وجہ سے اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا متحمل نہ پاتے ہوئے اس عہدہ سے سبکدوشی کی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔ انجمن کسی ذمہ دار اور قابل انسان کو یہ ذمہ داری سونپنا چاہتی تھی۔ اولاً کیپٹن عبدالواجد صاحب کو یہ پیشکش کی گئی، جسے قبول کرتے ہوئے اُنہوں نے چند ماہ بعد یہ ذمہ داری سنبھالنے کا وعدہ کیا۔ مگر اچانک شدید علالت کی وجہ سے اُنہوں نے بغرضِ علاج انگلستان جانے کا ارادہ کر لیا، اور مرکز میں تشریف نہ لا سکے۔

حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کی نظرِ انتخاب چوہدری منصور احمد صاحب پر پڑی، جو اِس سے قبل محکمہ صنعت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور انتظامی امور کا وسیع تجربہ رکھتے تھے اور اعلیٰ استعداد کے مالک تھے۔ حضرت امیر نے ذاتی طور پر ان سے اِس خواہش کا اظہار کیا تو وہ انکار نہ کر پائے۔ اُن کی تقرری بطور جنرل سیکرٹری ۲۱ جنوری ۱۹۸۳ء کو منظور کی گئی۔ منصور احمد صاحب نے اعزازی طور پر یہ ذمہ داری اُٹھالی اور انجمن کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اُن کے لیے کسی بھی کاروبار سے منسلک ہو جانے کے بے شمار مواقع اور ذرائع تھے۔ مگر اُنہوں نے دین کو دُنیا پر مقدم کرنے کا ایک عملی نمونہ دکھایا جو قابلِ قدر ہے۔

دفتر احمدیہ انجمن کی دو قیمتی نفوس سے محرومی

محمد اعظم علوی صاحب

یکم اپریل ۱۹۸۳ء کو محمد اعظم علوی صاحب اِس جہاں سے رُخصت ہو گئے۔ وہ ایک عرصہ سے انجمن میں بے لوث خدمات انجام دے رہے تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ خود سراپا انجمن تھے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انجمن کا دفتر اور اس کی تمام تر ذمہ داریاں ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور یہی اُن کی متاعِ حیات تھی۔ اُن کی دلنواز شاعری اور پھر اُس کی مترنم ادائیگی انجمن کی محفلوں کو روح پرور ماحول بخشتی تھی۔ اُن کی اچانک وفات انجمن کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان تھا، جسے حضرت امیر نے ذاتی طور پر بھی شدت سے محسوس کیا۔ اعظم علوی صاحب کے اکلوتے فرزند اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ اس عظیم غم کے لمحوں میں حضرت امیر نے اُن کی ہر طرح سے دلجوئی فرمائی، جس کا ظہار ارشد علوی صاحب نے اپنے مضمون ”اور جمعہ بھی گذر گیا“ میں کیا ہے، جو پیغام صلح میں

شائع ہوا تھا۔ مضمون سے اقتباس:

حضرت امیر کو ٹیلی فون پر اطلاع دی گئی۔ آپ کی آواز بھرا گئی تھی۔ آپ نے مجھے تسلی دی۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت امیر کی معیت میں فاروقی صاحب، میاں فضل احمد صاحب، مرزا مسعود بیگ صاحب، چوہدری منصور احمد صاحب اور دفتر کے دیگر کارکن تشریف لے آئے۔ سب نے باری باری مجھے گلے لگا کر تسلی دی۔ اندرا باجی کی میت دیکھنے گئے۔ امیر جماعت فرمانے لگے "سو رہا ہے بے چارہ" اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارشد صاحب نمازِ جنازہ کے بعد کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

امیر جماعت نے تمام لوگوں کو چائے کی دعوت دی اور اپنے گھر لے گئے۔ آپ نے فرمایا کہ علوی صاحب کی وفات پر رشتہ داروں کو تو دُکھ ہو گا اور بہت ہو گا، مگر کچھ غیر رشتہ دار بھی ہوتے ہیں جنہیں رشتہ داروں سے زیادہ دُکھ ہوتا ہے اور ہم ان لوگوں میں سے ہیں۔ غیر از جماعت احباب بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ حضرت امیر کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور تعریفیں کرنے لگے کہ جماعت کا امیر ہو تو ایسا ہو جو جماعت کے ہر فرد کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھے۔ خدا ایسے امیر کی جماعت کو کامیاب رکھے۔ آمین۔

شام کا کھانا حضرت امیر کی طرف سے تھا۔ حضرت امیر شام کو پھر مجھے ملنے آئے۔ آپ مجھے گلے لگا کر، دل کی دھڑکنوں کو سکون بخش رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: "بیٹے ہم آپ کے خادم ہیں۔ جو کچھ ہم سے ہو سکا ہم آپ کی خدمت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں گے۔ آپ ہمیں بتائیں اپنی تکلیف۔"

میری بہت دلجوئی کی آپ نے۔ خدا آپ کا سایہ تا قیامت ہمارے سروں پر قائم

رکھے۔آمین۔اور یوں جمعہ کا دن گذر گیا، اباجی کے بغیر۔

ماسٹر محمد اصغر علی صاحب

محمد اعظم علوی صاحب یکم اپریل کو رُخصت ہوئے تو ۱۷ اپریل ۱۹۸۳ء کو ماسٹر اصغر علی صاحب دائمی جدائی کا صدمہ دے گئے۔حضرت امیر سے اُن کا دیرینہ تعلق معالج و مریض کا تھا، جو رشتہ داری میں اُس وقت بدل گیا جب آپ کی اکلوتی بھانجی اُن کے نکاح میں آئیں۔ماسٹر صاحب ۱۹۷۴ء کے سانحات کے متاثرین میں سے تھے اور ایبٹ آباد سے ہجرت کے بعد دارالسلام، لاہور میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

حضرت امیر کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہوئے، اُنہوں نے دوبارہ دنیاوی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ ترک کر کے، اپنی خدمات انجمن کو پیش کر دیں اور بطور حضرت امیر کے خصوصی معاون کے کام شروع کر دیا۔ وہ حضرت امیر کی خط و کتابت اور رابطہ بلادِ غیر کمیٹی کے بہت سے معاملات کی دیکھ بھال میں معاونت کرتے تھے۔

اُن کے اِس جہاں سے رُخصت ہو جانے سے حضرت امیر کو ذاتی طور پر، اور انجمن کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔حضرت امیر بہت افسردہ تھے اور اُن جیسے مخلص اور انتھک کام کرنے والے فرد کے متلاشی تھے۔ایسے میں اُن کی نظرِ انتخاب اُنہی کے فرزند انوار احمد پر پڑی۔آپ نے انوار احمد صاحب سے اپنے والد کی جگہ پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اطاعت گذار، انوار احمد اپنی نفع بخش ملازمت اور کاروباری روشن مستقبل کو بلا تامل ترک کر کے کراچی سے لاہور منتقل ہو گئے، اور انجمن کی قلیل تنخواہ پر حضرت امیر اور انجمن کے لئے بے لوث خدمات سرانجام دیں اور دے رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ انوار احمد کو اِس قربانی کے صلے میں بہترین جزا عطا فرمائے۔آمین۔

حضرت امیر کی ڈائری سے ایک اقتباس:

> گذشتہ ایام کئی قسم کے مسائل اور مشکلات سے دو چار تھا۔ اندرونی مخالفت، اپنی قلتِ انصار، بیعت فارموں کے مسئلہ پر جو طوفان اُٹھایا گیا۔ یکم اپریل علوی صاحب اور ۱۷ اپریل کو ماسٹر اصغرعلی صاحب کی اچانک وفات۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۔ اللہ کا شُکر ہے اُس کی رحمت نے دِل کو سہارا دے رکھا ہے اور پُر امید ہوں اور آنکھیں اسی بارگاہ کے دروازہ پر لگی ہیں۔

انجمن کے بیعت فارم کا اجراء

گذشتہ ادوار میں انجمن کے دفتری کاموں میں کچھ نہ کچھ تساہل اور تعطل واقع ہوتا رہا تھا۔ جماعت کے بیعت شدہ ممبران کی صحیح تعداد کی عدم موجودگی ایک اہم اور نمایاں کمی تھی، جو انجمن کے مفاد کے خلاف تھی اور اُس کا مداوا خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کسی بھی انجمن یا ادارہ کی رُکنیت کے لیے کسی نہ کسی قسم کی شرائط اور اُن کی پابندی کا اقرار اور عہد ضروری ہوتا ہے اور یہاں اسی کا فقدان تھا۔ متعدد ایسے افراد، جو انجمن کی محافل میں اپنے آپ کو احمدی ظاہر کرتے تھے، اپنی کاروباری زندگی میں احمدیت سے لاتعلقی اورر بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ کثیر تعداد میں افراد، اخبارات میں لاتعلقی کے اظہار میں بیانات بھی دے چکے تھے۔ مگر انجمن کے معاملات میں رخنہ اندازی اور دخل اندازی کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ جلسہ سالانہ ۱۹۸۲ء کے اختتام پر ارکانِ انجمن نے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ انتخابات معتمدین ومنتظمہ سے پہلے بذریعہ بیعت فارم، بیعت یا تجدید بیعت کی جائے تاکہ جماعت کی حقیقی تعداد کا علم ہوکر، اُسی بنیاد پر اُسی کے مطابق اِن مجالس میں نمائندگی کا تعین کیا جا سکے۔

یہ ایک معقول اور قابلِ عمل تجویز تھی جو ہر طرح سے جماعت کو تقویت بخش سکتی تھی، اور اس

پر کسی قسم کے اعتراض کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاہم اِس کی مخالفت ہوئی اور بہت شدت سے ہوئی۔ مگر بالآخر ۴ مارچ ۱۹۸۳ء بروزِ جمعہ معتمدین کی میٹنگ میں اس کی منظوری دے دی گئی۔ یہ جماعت کے لیے ایک تاریخی دن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس تجویز کی حمایت کرنے والوں کو کامیابی نصیب فرمائی۔

احبابِ راولپنڈی کا شدید ردِّعمل

احبابِ راولپنڈی کی طرف سے انتخابِ امیر کے خلاف عدالتی مقدمہ ابھی تک چل رہا تھا۔ اب تجدیدِ بیعت کے معاملہ میں اُن کی طرف سے شدید ردِعمل کا اظہار کیا گیا۔ جا بجا مخالفانہ تقاریر کی جانے لگیں، اور اعتراضانہ مضامین کے پمفلٹس شائع کر کے تقسیم کروائے گئے، اور بہت سے اراکینِ جماعت کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی، جس پر حضرت امیر کی طرف سے سوائے صبر و تحمل کے اظہار کے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔

مزید تشویشناک امر

پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب اور منظور احمد چنیوٹی کے مابین ایک عرصہ سے ایک تحریری بحث چل رہی تھی۔ یہ پروفیسر صاحب کا ایک ذاتی فعل تھا، اور انجمن کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پروفیسر صاحب نے اپنے کسی مکتوب میں مباہلہ کا ذکر کیا۔ جس کے جواب میں مولوی چنیوٹی صاحب نے امیرِ جماعت کی طرف رُخ کیا اور آپ کو مباہلہ کی دعوت دی اور دریائے چناب کے پلوں کے درمیان، بادشاہی مسجد لاہور یا یادگارِ پاکستان لاہور کا میدان مباہلہ کے لیے تجویز کیا۔ اِس معاملہ میں حضرت امیر نے جماعت کے چند سرکردہ احباب سے مشورہ طلب کیا، مگر کسی سے کوئی خاص رہنمائی نہ مل سکی اور اکثر نے رائے دینے سے احتراز کیا۔ آپ جانتے تھے کہ مباہلہ کی دعوت دینے کے مجاز تو صرف اللہ کے رسول یا مامور ہی ہوتے ہیں، جو خدا کے حکم سے ایسا

کر سکتے ہیں۔ اسلیے آپ نے یہ معاملہ ذاتِ خداوندی کو ہی اپنا سہارا سمجھتے ہوئے اُس کے سپرد کر دیا۔

بیعت فارم کی مخالفت کے مسئلہ اور مباہلہ کی اِس تشویشناک صورت کے سلسلہ میں آپ کی ڈائری سے ایک اقتباس:

> بجز ذاتِ خداوندی کوئی ساتھی بظاہر نظر نہیں آ رہا۔ اِن مسائل کے علاوہ بھی مسائل ہیں۔ یہ محض اللہ کا احسان ہے کہ طبیعت میں حالات کے مطابق خوف یا پریشانی نہیں۔ کچھ مسائل احباب اور عزیزان کے بھی اللہ کے خاص رحم کے محتاج ہیں اور ذاتی امور بھی اللہ کے سپرد ہیں۔ ایسے پس منظر میں ۲۰ مارچ ۱۹۸۳ء کو صبح پونے چار بجے کے قریب یہ کلمات: ”السلام علیکم و رحمۃ اللہ“ بڑے زور سے زبان پر جاری تھے، جب بیداری ہو رہی تھی۔

آپ مزید تحریر فرماتے ہیں:

> بعض لوگوں نے دلآزار خطوط کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ اپنے احباب کی توجہ کی کمی اور دفتر کی نامساعد فضا اور دیگر کئی امور میرے صبر کے انتہائی مشکل امتحان کا موجب بن رہے ہیں۔ صحت بھی کمزور ہو رہی ہے۔ کام بہر حال کرتا ہوں اور اُس کے رحم پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔

جماعت سے چالیس رات کے مجاہدہ کی اپیل

بیان کردہ، اِن حالات کے پس منظر میں، حضرت امیر نے تمام جماعت سے درد دِل سے دُعائیں کرنے کی اپیل فرمائی۔ آپ نے یاد دہانی کروائی کہ اشاعت اور حق کی تبلیغ آسان نہیں ہوا کرتی۔ یہ بڑا صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ اِس راہ میں دشواریاں اور ابتلاء حائل رہتے

ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعودؑ اشاعتِ دین کی تڑپ کی وجہ سے راتوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑاتے تھے اور دُعائیں مانگتے تھے، رات کو اٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے گر جانے سے انسان کا نفس روند دیا جاتا ہے اور اُس کی دُعا میں اثر پیدا ہوتا ہے۔ اپنی جماعت سے دُعا کے لیے اپیل کرتے ہوئے حضرت امیر نے فرمایا تھا:

> میں اپنے مخالفین اور ان کے ذریعے اپنی تمام جماعت سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آیئے اپنی قومی زندگی کے اس نازک اور نامساعد حالات میں ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ ہمارے طرز طریق آئندہ کے لیے مذہبی، روحانی، دیانتدارانہ، مخلصانہ اور صادقانہ ہوں گے۔ ہمارا ہر فعل اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگا۔ ہم دین کو آگے اور دنیا کو پیچھے کریں گے۔ آپ نے مجھے ایک بھاری ذمہ داری کے مقام پر کھڑا کیا ہے اور میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کی راہنمائی انبیاء، اولیاء اور صلحا کے طریق کی طرف کروں کیونکہ یہی نجات کا طریق ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت کا راستہ ہے۔ کوئی اور طریق اختیار کر کے ہم کبھی کامیاب نہیں ہونگے۔

آخر میں آپ نے فرمایا:

> میں اپنی تمام جماعت سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک شخص رات کو تہجد کے لیے اٹھے۔ اگر زیادہ توفیق نہیں تو اذان سے قبل تھوڑا وقت ہی سہی، اٹھے اور کم از کم دو رکعت نماز ہی پڑھ لے۔ اپنی نماز میں اللہ تعالیٰ سے گڑ گڑا کر یہ دعا کرے: اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ۔ میں مغلوب ہوں میری مدد فرما (القمر ۵۴:۱۰)۔ مجھے دین کی خدمت کی توفیق عطا فرما۔ میری جماعت کو ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی فتنے سے محفوظ رکھ اور اس کے ذریعے اسلام کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کر کے دکھا، کیونکہ یہی تیرے

مسیح موعود کا مشن ہے۔ صبح کی نماز میں بھی چالیس روز تک وہ قرآنی دُعائیں کریں جو انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے مصائب کے وقت میں کیں۔ اگر عربی الفاظ یاد نہ ہوں تو اپنی زبان میں وہ مفہوم ادا کرنے کی کوشش کریں۔ آج رات سے ہی اپنا یہ مجاہدہ شروع کر دیں۔ یہ سونے اور غفلت کا وقت نہیں۔ جاگنے اور دن رات مجاہدہ کا وقت ہے۔ خدا سے صلح کا وقت ہے۔ اپنی جماعت کے ہر فرد سے میری یہ توقع ہے کہ وہ جماعت کی اصلاح، اسلام اور قرآن کے غلبہ کے لیے میری اس تجویز پر ضرور عمل کرے گا۔ ہمارا کام مقدور بھر کوشش کرنا ہے۔ اس کو پھل لگانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ نے اگر اخلاص کے ساتھ اس راہ میں قدم اٹھایا تو آپ محسوس کریں گے کہ اللہ کی رحمت اور فضل آپ کے شامل حال ہے۔

آپ کی آسانی کے لیے قرآن کریم کی چیدہ چیدہ اور کچھ مسنونہ دعائیں جو موجودہ حالات میں ہمیں خصوصیت سے کرنی چاہئیں معہ ترجمہ اس خطبہ کے ساتھ پیغامِ صلح میں شائع کی جا رہی ہیں۔ ان سے بھی استفادہ کریں اور اپنی زبان میں بھی سجدوں میں دعائیں کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مجھے بھی اس کی توفیق دے۔ آمین۔

حضرت امیر کی اس اپیل پر جماعت نے لبیک کہا اور اکثریت نے اِس مجاہدہ کو ایک فریضہ جان کر ادا کیا، جس سے دِلوں کو طمانیت اور سکون حاصِل ہوا۔

بدوملہی کی مسجد پر غیر احمدیوں کا قبضہ

حضرت امیر، موسمِ گرما کے ایام میں ایبٹ آباد میں مقیم تھے کہ آزمائش کی ایک اور خبر آپ کو موصول ہوئی۔ ۹ ستمبر بروز جمعہ بدوملہی کی احمدیہ مسجد کو وہاں کے رہائشیوں میں سے مفسد عناصر

نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔غنڈوں کے مقابلے میں افرادِ جماعت نے اپنے آپ کو مدافعت کے قابل نہ پایا اور مسجد ہاتھ سے جاتی رہی۔تمام جماعت اور امیرِ قوم پر افسردگی چھا گئی ،مگر ظالموں کے مقابلے میں سوائے دعا اور صبر کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

مرزا مسعود بیگ صاحب (سابق جنرل سیکرٹری) کی وفات ۔اگست ۱۹۸۳ء

مرزا مسعود بیگ عارضہ قلب سے وفات پا گئے۔ جماعت احمدیہ کے لیے یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا اور ایک ایسا نا قابلِ تلافی نقصان جس سے جماعت اور امیرِ جماعت یکساں طور پر غم زدہ تھے۔مرزا صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ،مختلف حیثیتوں میں انجمن کی خدمت میں گذار دیا۔ وہ انجمن کے اسسٹنٹ سیکرٹری، مسلم ہائی سکول نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے یکے بعد دیگرے ہیڈ ماسٹر، افسرِ تعلیم ، جنرل سیکرٹری، سیکرٹری فارن مشن کمیٹی اور نائب صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔غرض جب بھی ، جو بھی فرض انجمن نے اُن کو سونپا آپ نے اُسے بطورِ احسن ادا فرمایا۔حضرت امیر نے اُن کی وفات پر ایک مضمون "مرزا مسعود بیگ کی وفات" کے عنوان سے تحریر فرمایا۔ جو پیغام صلح کے ۱۵/اکتوبر ۱۹۸۳ء کے شمارہ میں شائع کیا گیا۔حضرت امیر نے مراز صاحب کی علمی کاوشوں ،تحریر وتقریر کے جادو اور انجمن کے لیے گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی وفات کو ایک سانحہ قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا:

> مرزا مسعود بیگ صاحب کی وفات حسرت آیات کی اندوہناک خبر سن کر مجھے بے حد دکھ ہوا اور صدمہ ہوا ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں اپنے دل کی کیفیت اور جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا کیونکہ مرزا صاحب کی وفات سے نہ صرف اُن کے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو ہی ایک صدمہ عظیم پہنچا ہے بلکہ یہ ہماری جماعت کے لیے بھی ایک بہت بڑا سانحہ اور نا قابلِ تلافی نقصان ہے۔اُن کے چلے جانے سے ایک ایسا خلا پیدا

ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ ہمارے اِس نقصان کو پورا کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے۔ ہم اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ پڑھنے کے سوا کر بھی کچھ نہیں سکتے۔ قضا وقدر کے فیصلے کے سامنے ہمیں اپنا سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔

اسی مضمون میں حضرت امیر مزید رقم طراز ہیں:

گذشتہ نو دس سال مجھے، مرزا صاحب مرحوم کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا۔ انہوں نے میرا دست و بازو بن کر میرے ساتھ ہر طرح تعاون کیا۔ اور ہر کام میں میرا ہاتھ بٹایا خصوصاً دفتری خط و کتابت کا بوجھ زیادہ تر آپ کے کندھوں پر ہی پڑا رہتا، جسے وہ بڑی خوش اسلوبی سے نمٹاتے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا ایک بازو ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ رحم کرنے والا ہے۔

اس سال ہمیں یکے بعد دیگرے بڑے صدمات برداشت کرنے پڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ میری دُعا ہے، اللہ تعالیٰ مرزا صاحب کی رُوح پر اپنی رحمتوں اور مغفرت کی بارش نازل فرمائے اور اپنے مقرب بندوں میں داخل کرے۔ اور آپ کے پس ماندگان کو یہ صدمہ صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان کا خاندان ہی ایک شفیق سر پرست سے محروم نہیں ہوا ساری جماعت ہی ایک بہت بڑے انسان سے محروم ہو گئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس چھوٹی سی جماعت کے لیے یہ صدمات ناقابل برداشت ہیں۔ ہمیں دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے اور اپنے اِس مشن کو جاری رکھنے کے لیے اپنی جناب سے ہمارے لیے معاون اور مددگار پیدا فرمائے۔ آمین۔

عبداللہ سعید کی صحت کے متعلق تشویشناک خبر

حضرت امیر، ایبٹ آباد سے لاہور کے سفر کے درمیان راولپنڈی میں بریگیڈیئر عبداللطیف صاحب کے یہاں شب بسری کے لیے رُکے۔ ۱۶ اکتوبر کی رات تقریباً ایک بجے بریگیڈیئر صاحب نے آپ کو جگایا کہ آپ کے لیے ضروری فون ہے۔ فون پر آپ کی صاحبزادی زبیدہ نے ایک نہایت تشویشناک خبر سنائی۔ جس کا ذکر آپ نے اِن الفاظ میں تحریر فرمایا:

> زبیدہ نے نہایت تشویشناک خبر سنائی کہ ۱۱ بجے ہیوسٹن سے زاہد کا اور انجم کا فون آیا ہے کہ دو گھنٹے بعد عبداللہ کا اپریشن ہو گا۔ intestinal obstruction (آنت میں رکاوٹ) کی وجہ growth (رسولی) ہے جس کی صرف ایک ہفتہ پہلے تشخیص ہوئی ہے۔ وضو کیا اور جس قدر جسم کی طاقت ہے۔ برداشت کیا۔ اللہ تعالیٰ سے زاری کی۔ تھوڑی دیر سو گیا۔ پھر سوا چار بجے جاگا اور نمازِ فجر لطیف کی معیت میں پڑھی۔

لاہور پہنچنے پر، اگلے روز زاہد سعید نے بھی آپ کو اپنے لالہ کی بیماری کی تفصیل بتائی۔ عبداللہ سعید کا مرض کینسر تشخیص ہوا تھا۔ آپ نے اپنے غم واندوہ کو اپنی ذات تک محدود رکھا، اور عام طور پر اِس کا ذکر بھی نہ کیا۔ عبداللہ سعید کی ایک بہن نے اپنے دِل سے مجبور ہو کر باپ سے یہ کہنے کی جرأت کی کہ اِس غم کا اظہار کریں، اور سب سے دُعا کے لیے کہیں۔ مگر آپ نے فرمایا: ”میں نہیں چاہتا کہ میرے غم سے میری تمام جماعت رنجیدہ خاطر ہو۔ اِس لیے اسے اپنے تک ہی رکھتا ہوں۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ (یوسف ۸۶:۱۲)۔

جلسہ سالانہ ۱۹۸۳ء کی غیر متوقع کامیابی

یوں تو جماعت کا ہر جلسہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، لیکن یہ جلسہ اس لیے خصوصی ذکر

چاہتا ہے، کیونکہ اسے ناکام بنانے کے لیے کافی تگ و دو کی گئی تھی، جماعت کے اندر موجود مخالف عناصر ہر طرح سے سرگرم عمل تھے، راولپنڈی اور پھر سیالکوٹ میں جلسے اور محافل منعقد کی گئیں۔ ہر قسم کا غلط پروپیگنڈا کر کے لوگوں کو جلسہ سے بائیکاٹ پر آمادہ کیا گیا تھا۔

حضرت امیر ماہ اکتوبر سے کچھ علیل تھے۔ مزید برآں کچھ جماعتی اور ذاتی تفکرات نے گھیر رکھا تھا۔ مخالفین کی طرف سے بائیکاٹ کی تیاریاں اور مقدمات کا سامنا تھا۔ ایسی حشر سامانیاں تو ایک تندرست جوان انسان کی کمر بھی توڑ دیتی ہیں، مگر آپ کی طرف سے جلسہ کی تیاری یا روزمرہ دفتری کاموں میں کوئی کمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ البتہ، باجماعت نمازِ فجر میں بوجہ علالت چند ہفتے تک آپ شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس جلسہ کی روئیداد سے متعلق حضرت امیر کی تحریر:

۲۲ دسمبر ۱۹۸۳ء

آج خواتین کا جلسہ ہونا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ نماز فجر (ایک ماہ سے زیادہ عرصہ کے بعد پہلی بار) مسجد میں گیا، اور نماز کی امامت کی۔ خلاف توقع ایک سو کے قریب لوگ موجود تھے۔ دوسری رکعت کے بعد چند ادعیہ بطور قنوت پڑھیں۔ اپنی کمزوری جسمانی سے خائف تھا۔ اللہ نے خاص رحم شاملِ حال رکھا۔ مہمانوں سے مل کر راحت ملی۔ تھوڑی دیر بونداباندی ہوئی۔ گرد و غبار بیٹھ گیا۔

مستورات کا اجلاس بہت کامیاب اور بابرکت ہوا۔ تقاریر بھی عمدہ ہوئیں۔ سیالکوٹ میں جس بائیکاٹ اجلاس کا فیصلہ ہوا، ایک اطلاع کے مطابق یہ کہا گیا کہ جلسہ فیل کرانا ہے۔ یہ منصوبہ اللہ نے فیل کر دیا۔ دِن بھر کوئی بارش بھی نہ ہوئی اور کوئی پریشانی درپیش نہ آئی۔ سرینام سے ایک اور فجی سے ایک مہمان ڈاکٹر شمس الدین ساہو خان اور کشمیر سے عبدالعزیز کاشمیری بغیر سابقہ اطلاع

پہنچے۔معقول انتظام ہو گیا۔ ہماری ہمتیں اللہ نے ہر طور پر بلند کیں۔ جملہ نمازیں، میں پڑھا سکا اور بیماری کی جملہ علامات تصرف الٰہی سے دور ہو گئیں۔

دِن بھر کی مصروفیات کے بعد، خواتین جب گھر لوٹیں تو اُن کی خوشی قابلِ دید تھی۔ ہر زبان پر اللہ کے شکر کا کلمہ تھا۔مغرب عشاء کی نماز میں مسجد لوگوں سے بھری دیکھ کر دِل سجدہ میں گر گئے۔ میری رات بہت اچھی گذری۔سب کوفت کم ہو گئی۔

۲۳دسمبر ۱۹۸۳ء

آسمان صاف ہے۔ بادل کا نام ونشان تک نہیں۔ موسم بہت عمدہ ہے۔آج میرے لیے بہت بڑے امتحان کا دِن ہے۔ ہرگز یقین نہ ہو سکتا تھا کہ میں نماز فجر، افتتاحی تقریر، خطبہ جمعہ اور نمازِ جمعہ یہ سب کچھ کر سکوں گا۔لیکن اللہ نے یہ سب کچھ میرے لیے ممکن کر دیا۔کس زبان سے شکر کروں۔فجر کے بعد درس فاروقی صاحب نے دیا۔

آپ نے مزید تحریر فرمایا:

خطبہ جمعہ کے دوران بھی اللہ کا خاص فضل شاملِ حال رہا۔طبیعت پر مزید خوشگوار اثر ہوا۔اللہ کا شکر۔لوگوں میں جوش اور جذبہ نمایاں تھا۔ پہلے سالوں سے بڑھ کر۔ ہر ایک مہمان سے ملاقات ہوئی اور راحت ملی۔سب نمازیں بھی پڑھائیں۔ پنڈال تمام دِن بھرا رہا۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ اِس سال چند چہرے بوجہ بائیکاٹ نظر نہ آئے۔۔۔۔۔نوجوان والنٹیر وں (رضا کار) نے بہترین شاندار ڈسپلن رکھا۔کھانے کی تقسیم کی بھی تعریف سنی گئی۔

۲۴ دسمبر کے جلسہ اور چندہ کی اپیل کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا:

میری اپیلِ چندہ کرنے سے پہلے میاں عمر فاروق صاحب نے جو صدر اجلاس تھے، اپنی تقریر میں اعلان کر دیا کہ وہ پانچ لاکھ روپیہ چندہ دیں گے۔ اِس کا عجیب اثر ہوا۔ رقت سے میری آنکھیں تر ہوگئیں۔ میں تقریر کرنے کے لیے اُٹھا تو میں رو رہا تھا۔ اور تقریر بعد از تلاوت اسی تمہید سے شروع کی کہ میاں کے اعلان نے مجھے رُلا دیا ہے۔ اِس تقریر کو اللہ نے تاثیر بخشی۔ تقریر کے دوران انجمن کے دورانِ سال کاموں کے ذکر میں میں نے عبداللہ (پسرم) کو، جو ہسپانوی ترجمہ قرآن ساتھ لائے ہیں بلایا۔ اس نے مترجمین سرجیو Sergeo اور اُس کی بیوی کا خط سنایا اور نہایت پیاری، مؤثر، مختصر تقریر کی۔ پھر میں نے اُٹھ کر اپنی تقریر مکمل کی اور اپیل کی۔۔۔ گیارہ لاکھ ستر ہزار دوسو روپیہ چندہ ہوا، اتنی ساری رقم کسی کے تصور میں بھی نہ آ سکتی تھی۔ اللہ کا شکر کن الفاظ میں کریں۔ ساری جماعت کو حیرت میں ڈال دیا۔

۲۵ دسمبر جلسہ کا آخری دن تھا۔ اُس دن مزید دو لاکھ کے قریب چندہ ہوا۔ حاضرین کا جوش اور جلسہ قابلِ دید تھا۔ اُس دِن کی اپنی اختتامی تقریر اور دُعا کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا:

اُس وقت جو آیت دِل میں گذری تلاوت کی اور تقریر شروع کی۔ خیالات اور الفاظ اور اُن کا اثر اپنے دِل پر اور سامعین پر جو ہوا، اور دِل جس طرح گداز ہوئے، وہ کیفیات غیر معمولی تھیں اور الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتیں۔ دعائیں، جو زبانِ پُر اثر اور جِس حضورِ قلب اور اشکبار آنکھوں سے بارگہِ ایزدی میں پیش ہوئیں، یہ سب کچھ اللہ کی حمایت سے تھا۔ پنڈال میں کوئی نشست خالی نہ

تھی۔ اور پیچھے کئی لوگ کھڑے تھے۔ اللہ تیرا شکر کیسے ادا ہو۔ ارحم الرحمٰن تو ہماری سعی کو قبولیت بخش۔ کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسا منظر کسی جلسے پر نہیں دیکھا گیا۔ البتہ مجھے امیر مرحوم مولانا محمد علیؒ کے زمانہ کے ایسے بعض مناظر یاد ہیں۔ میں ان لوگوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ بہرحال اللہ کا لاکھوں بار شکر۔ یوں لگتا تھا جماعت دوبارہ زندہ ہو گئی - الحمدللہ- ثم الحمدللہ رب العالمین-

جلسہ سالانہ کی کامیابی کے بعد حضرت امیر کا تجویز کردہ لائحہ عمل

جلسہ سالانہ کے بعد پہلا جمعہ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء کا تھا۔ اس موقعہ پر جو خطبۂ جمعہ حضرت امیر نے ارشاد فرمایا تھا وہ پیغام صلح کے ۱۸ جنوری ۱۹۸۴ء کے شمارہ میں بعنوان ”جلسہ سالانہ کی شاندار کامیابی کے بعد ہمارا فرض کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہئے“ شائع کیا گیا۔ حضرت امیر نے سورۃ آل عمران کی ۱۳۳ تا ۱۳۹ آیات کی تلاوت کے بعد فرمایا:

یہ آیات میں نے ان احساسات اور مشاہدات کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے پڑھی ہیں جو اس جلسہ سالانہ کی محض تائید اور نصرت الٰہی سے غیر متوقع کامیابی کے بعد میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے متعلق ہر ایک کا اپنا مشاہدہ اور احساسات ہیں، اور جو کچھ آپ میں سے ہر ایک نے دیکھا ہے، اس کے متعلق ہر ایک کا نظریہ اور کیفیت اسی پر موقوف ہے۔ میں صرف اپنے ہی جذبات اور اپنی دلی کیفیت کا اظہار کر سکتا ہوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے نہایت نامساعد حالات اور بیم و رجا کی حالت میں اس جلسہ کی ابتداء کی۔ لیکن ہم نے اس کی غیر معمولی کامیابی میں اللہ تعالیٰ کا

غیبی ہاتھ کارفرما دیکھا، جس کے اثر سے میرا دل، جب بھی میں فارغ ہوتا ہوں، اس کے سامنے سجدہ میں گرا رہتا ہوں کہ اے اللہ ہم تیرا شکر کیسے ادا کریں۔ کیونکہ مجھے اس جلسے میں وہ جھلک نظر آئی جس کے لیے میری آنکھیں سال ہا سال سے منتظر اور ترستی تھیں اور میری یہ آرزو تھی کہ یہ جماعت ایک بار پھر حضرت مسیح موعود کی جماعت سے تھوڑی بہت مشابہت پیدا کر لے۔ میں نے اس جلسہ کے دوران میں ایسا ہی محسوس کر لیا۔

حضرت امیر نے جلسہ سالانہ کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے اُن حالات کی طرف اشارہ فرمایا، جو اِس کے انعقاد سے پہلے پیدا کیے گئے تھے اور جس کی بنیاد مرکز کی طرف سے 'بیعت فارم' کے اجراء کو بنایا گیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

آپ میں سے اکثر یہ جانتے ہیں کہ ہمیں اس سال کے دوران میں طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیاں لاحق رہیں۔ چونکہ ان کا تعلق میرے ایک اقدام سے ہے اس لیے میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے سارا سال ہی بہر حال یہ یقین رہا کہ میرا یہ اقدام کسی طرح غلط نہ تھا۔ اگر مجھے اس کی صحت پر یقین نہ ہوتا تو میں اس پر کبھی مصر نہ ہوتا۔ انسان عاجز ہے۔ اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور اس کے دل میں یہ شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ میری کسی غلطی اور خطا سے جماعت کے اتحاد کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ لیکن اسی جلسہ سالانہ میں میں نے جو کچھ دیکھا ہے اُس سے میرے اس یقین کو مزید تقویت ملی ہے کہ میرے اس اقدام میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل تھی۔ میں اس سے زیادہ اس معاملہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

حضرت امیر نے جماعت کے افراد کے سامنے ایک لائحہ عمل رکھا، جو اُنہیں مزید کامیابیوں

سے ہم کنار کرے گا اور تمام افراد اور جماعت کے لیے موجب تقویت ہو گا اور وہ یہ ہے کہ ہر فرد تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو جائے اور صحیح معنوں میں متقی بننے کے لیے کوشش کرے تا کہ جماعت آئندہ اللہ تعالیٰ کے افضال کی مستحق ٹھہرے۔ آپ نے تین ایسے اعمال کی نشاندہی فرمائی جو متقی بننے کے لیے ضروری ہیں۔ اور وہ ہیں:

(۱) انفاق فی سبیل اللہ۔

(۲) غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو رکھنا اور عفو و درگذر سے کام لینا۔

(۳) استغفار پر مداومت اختیار کرنا۔

یہ تھے امیر قوم کے ارشادات اور جماعت سے توقعات۔ آپ نے اپنی جماعت کو ہمیشہ قدم آگے بڑھانے کی تلقین فرمائی اور جماعت کو کامیاب و کامران دیکھنا ہی اُن کی زندگی کا اولین مقصد رہا تھا۔

رفیقانِ امیر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے

جلسہ سالانہ کا اختتام ہوا تو مہمانوں کے اعزاز میں تقریبات کا سلسلہ چل پڑا۔ احبابِ جماعت کو کئی خوشگوار صبحیں اور پُر رونق شامیں میسر آئیں۔ کچھ ایسا ہی ماحول تھا، کہ دو ایسی ہستیوں کی دائمی جدائی کے غم نے مسرور دلوں کو حزن و ملال سے بھر دیا۔ یہ دو ہستیاں ڈاکٹر نظیر الاسلام اور عبدالرحمان صاحب تھے، جو ہر محفل کی جان ہوا کرتے تھے۔ یکے بعد دیگرے، یکم اور تیرہ جنوری ۱۹۸۴ء کو اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ یہ دونوں بزرگ حضرت امیر کے قریبی رشتہ دار تھے۔ آپ کے مزاج شناس اور دلسوز رفیق تھے۔ ڈاکٹر نظیر الاسلام آپ کی بیگم اُم کلثوم کے بھتیجے اور خانوادۂ چھچھ کا روشن ستارہ تھے۔ جبکہ عبدالرحمان صاحب حضرت امیر کے چچازاد اور آپ کی بیگم زینب کے چھوٹے بھائی اور آپ کے اپنے ہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ حضرت امیر اور اُن کے خاندان کا رنج

وحزن اپنی جگہ مگر اُن کی رحلت سے جماعت کو بھی ایک نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا۔

ڈاکٹر نظیر الاسلام صاحب

ڈاکٹر نظیر الاسلام کی ذہانت اور علم کی وسعت کا اندازہ تو اُن کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی ہوجاتا تھا۔ وہ عربی، انگریزی اور جرمن زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ جلسہ سالانہ ۱۹۸۳ء میں اُن کی عالمانہ تقریر کا چرچا ابھی تک زبان زدِ عام تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں جرمنی کے قیام کے دوران آپ نے مسجد برلن اور اس سے منسوب احمدیہ مشن کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں اور پھر انگلستان میں انتہائی نامساعد حالات میں بطورِ مبلغ نہایت اہم کام کیا۔ اُن کی خوش خلقی، استقلال، قناعت وغنا کی ایک دُنیا گواہ ہے۔

۳۱ دسمبر کی شام، ڈاکٹر نظیر الاسلام صاحب کے یہاں عشائیہ کا انتظام تھا۔ اپنے عزیز، دوست اور غیر ملکی مہمان مدعو تھے۔ وہ نہایت ہشاش بشاش تھے۔ دن بھر میں دو مرتبہ دارالسلام تشریف لائے تھے، اور غیر ملکی طالب علموں کے تدریس کے فرائض انجام دے کر گئے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے تندرست دکھائی دے رہے تھے۔ عشائیہ کے دوران چہرے پر تھکن کے آثار نہ تھے۔ مہمان خوشی خوشی رُخصت ہوئے اور شاید کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ دروازے پر کھڑے مہمانوں کو رُخصت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا متبسم چہرہ وہ آخری مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ نئے سال کی پہلی صبح اُن کی دائمی جدائی کا پیغام لے کر طلوع ہوئی۔ وہ چند گھنٹے پہلے بعارضۂ قلب اِس جہاں سے رُخصت ہو گئے تھے۔ اُنہیں دارالسلام میں واقع قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

عبدالرحمان صاحب

محبت اور جذبۂ وفا سے لبریز دِل کے مالک، حضرت امیر کے عم زاد عبدالرحمان، آپؒ سے بہت قریب تھے۔ وہ ایک خوش وضع، خوش خلق اور منکسر المزاج شخص تھے۔ خوش طبعی اور حاضر جوابی

باپ سے ورثہ میں پائی تھی۔ اپنی ازدواجی زندگی میں ناکامی کی وجہ سے، وہ زندگی کی حقیقی خوشیوں سے خود تو محروم رہے، مگر دوسروں کے راحت و آرام اور خوشی ہمیشہ اُن کے مدِّ نظر رہی، اُنہوں نے اپنی تمام زندگی خدمتِ خلق میں بسر کر دی۔ ناسازگار حالات نے اُنہیں بہت جلد کمزور و ناتواں کر دیا تھا اور وہ زندگی کی چھٹی دہائی بھی مکمل نہ کر پائے تھے کہ مالکِ حقیقی کا بلاوا آ گیا۔ عبدالرحمان، اپنی وفات سے حضرت امیر، اپنے بھائی، بہن اور ماں کو رنجیدہ اور افسردہ تو کر ہی گئے تھے، مگر جماعت کے لیے بھی یہ ایک بھاری غم تھا۔ جماعت ایک بے تیغ لڑنے والے سپاہی سے محروم ہو گئی۔ ۱۹۷۴ء میں اٹھنے والے طوفان بڑے بڑے پہاڑوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گئے۔ ایسے وقت میں اپنے گاؤں میں تن تنہا احمدی، عبدالرحمان، ایک چٹان کی طرح مضبوط کھڑے رہے۔ معاشرتی مقاطعہ اور جان و املاک کے اتلاف کی دھمکیاں بھی اُن کے قدم متزلزل نہ کر سکیں۔

۱۹۸۳ء کے جلسہ سالانہ میں وہ اپنی کمزوریٔ صحت کی بنا پر شرکت سے محروم رہے، جس کا اُنہیں بہت دُکھ تھا۔ جلسہ سے واپس لوٹنے والوں سے تمام روئیداد سُنی، بالخصوص میاں عمر فاروق صاحب کے جذبہ اور مالِ کثیر کی قربانی سے بے حد متاثر ہوئے۔ اپنے آخری خط میں حضرت امیر کو، میاں عمر فاروق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: ”عمر فاروق تو واقعی عمر فاروق نکلا“۔

حضرت امیر دیبگراں تشریف لے گئے۔ نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے غم گسار و جاں نثار بھائی کو اپنی دادی کے پہلو میں، اُن کی آخری آرام گاہ تک پہنچا کر واپس لوٹے۔ اَللّٰھمَ اِلٰی رَفِیْقَ الْاَعْلٰی۔

۱۹۸۴ء کے مارشل لاء آرڈیننس کا نفاذ

جولائی ۱۹۷۷ء میں، اُس وقت کے عساکرِ پاکستان کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق، بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر برسرِ اقتدار آ گئے۔ جنرل ضیاء تمام اُن عناصر کی سرگرمیوں اور مقاصد

سے بخوبی واقف تھے جو بھٹو حکومت کے زوال کا سبب بنے تھے۔ اس لیے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد ملاؤں اور مشائخ کی حمایت حاصل کرنا اُن کی ترجیحات میں سے تھا۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے اُن کے اجلاس بلائے اور 'نظامِ اسلام' کے نفاذ کے لیے اُن سے مشاورت اور عملی تعاون کے طلب گار ہوئے۔ وہ اُن عناصر کے تعاون سے خود اقتدار پر قابض رہنا چاہتے تھے، جبکہ ملاں اور مشائخ خود مکمل اقتدار کے خواہاں تھے۔ چنانچہ یہی عناصر اُن کے مقابل آن کھڑے ہوئے۔

۱۹۸۳ء میں ملاؤں نے ایک بار پھر احمدیوں کے خلاف تحریک چلائی اور ہر مکتبۂ خیال سے تعلق رکھنے والے علماء اور مشائخ کی ایک مشترکہ کنونشن کا انعقاد لاہور کے موچی دروازہ میں ہوا، جس میں اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ موجودہ وقت میں "قادیانیت" سے ہر طرح کے خطرے پیدا ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس لیے اِس کے انسداد کے لیے "تحفظِ ختمِ نبوت" کی تحریک کو پھر زندہ کیا جائے اور حکومت سے اِن کو مکمل طور پر ختم کر دینے کا مطالبہ کیا جائے۔

اِس تحریک کے رہنماؤں نے جنرل ضیاء الحق کے احمدی ہونے کے گمان کا اظہار کیا اور اُس کی جلسہ عام میں وضاحت چاہی۔ جنرل صاحب نے علی الاعلان فرمایا کہ نہ صرف وہ خود احمدی نہیں ہیں بلکہ وہ احمدیوں کو کافر بلکہ اِس سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔

جنرل صاحب سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ 'نفاذِ اسلام' چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ بذریعہ قانون احمدیوں کو شعائرِ اسلام پر عمل سے روکا جائے اور احمدیوں کو تمام سرکاری قلیدی اسامیوں سے برطرف کر دیا جائے۔ اِس اقدام کے لیے ۳۰/اپریل ۱۹۸۴ء تک کی آخری میعاد مقرر کر دی گئی اور کہا گیا کہ اگر اس سے پہلے ایسا نہ کیا گیا تو وہ خود مرزائیوں کا مکمل استحصال کر دیں گے۔ ملک میں "مارشل لاء" نافذ تھا، مگر پھر بھی حکومت نے ملاؤں کے اس مطالبہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور تعزیراتِ پاکستان میں صدارتی آرڈیننس کے ذریعہ ترمیم کر دی گئی، جس کا فوری نفاذ ناگزیر قرار دیا گیا۔ یہ ترمیم ۱۹۸۴ء کے صدارتی آرڈیننس نمبر XX کے تحت تعزیراتِ پاکستان

کے باب xv کے سیکشن A 298 کے بعد 298B اور C 298 کے اضافہ سے کی گئی۔

اِس حکم نامے کا مقصد ۱۹۷۴ء میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے بعد ایک ضروری عملی قدم قرار دیا گیا، جو ابھی تک نہیں اٹھایا جا سکا تھا۔ تاکہ احمدیوں کو شعائرِ اسلامی پر عمل کرنے سے روکا جا سکے اور ایسا ہر فعل اور قول جو اُنہیں مسلمان ظاہر کرے، قابلِ سزا جرم قرار دیا جائے۔ مزید برآں کہ احمدی (قادیانی اور لاہوری گروپ) اپنی عبادت گاہ کو مسجد یا اپنی عبادات کو وہ نام نہ دیں جو مسلمانوں کی عبادات کے ہیں، نہ اذان دیں اور نہ کسی کے لیے ایسے القاب استعمال کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اہلِ بیعت یا اصحابِ رسول کے لیے مختص ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ قابلِ مواخذہ ہوں گے اور اُن پر قید اور جرمانہ کی سزاؤں کا اطلاق ہوگا۔

۲۶ اپریل ۱۹۸۴ء کے اِس صدارتی حکم کے بعد لاہور احمدیہ انجمن نے ۲۷ اپریل کو مجلس منتظمہ کا ایک غیر معمولی ہنگامی اجلاس منعقد کیا، جس میں چوہدری فتح محمد عزیز صاحب، مشیرِ قانونی نے اِس قانون کی دفعات کی مکمل وضاحت کی اور مجلسِ منتظمہ نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، حالیہ آرڈیننس کی تعمیل کرنا مناسب ہوگا اور فوری طور پر تمام جماعتوں کو اِس کی اطلاع کر دی جائے۔ اِس کے علاوہ یہ بھی تجویز پیش ہوئی اور منظور کی گئی، کہ اِن ناگزیر حالات میں انجمن کے نام میں مناسب ترمیم کی جائے اور اِس کا نام اب 'احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور' کی بجائے صرف 'احمدیہ انجمن لاہور' کر دیا جائے۔

اِن تجاویز کی منظوری اور مزید ضروری اقدامات کے فیصلے کے لیے مجلسِ معتمدین کا ایک اجلاس بلایا گیا، جس میں مناسب ترامیم کی گئیں اور فیصلہ ہوا کہ انجمن کے آئین وقواعد میں جہاں جہاں لفظ اسلام، اشاعتِ اسلام، علیہ السلام، اسلامی تعلیم یا مسجد وغیرہ درج ہیں اُن کو حذف کر دیا جائے۔ مبلغ کی جگہ واعظ اور مسجد کی بجائے جامعہ کے لفظ استعمال کیے جائیں۔ آئندہ کے لیے خانۂ خدا سے بذریعہ اذان اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرنا بھی منسوخ ہوگیا۔

قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ

مشیرِ قانونی، محترم فتح محمد عزیز صاحب نے وفاقی شرعی عدالت سے دادرسی کے امکانات کا جائزہ لینے کے بعد، اس عدالت سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اور خود چوہدری صاحب موصوف اور کیپٹن عبدالواحد صاحب نے الگ الگ درخواستیں دائر کر دیں، جو ۱۲ اگست ۱۹۸۴ء کو نا قابل سماعت قرار دیتے ہوئے مسترد کر دی گئیں۔ انہیں دونوں احباب نے سپریم کورٹ کے شریعت بنچ میں اپیل دائر کر دی اور اِس کے ساتھ ہی لاہور ہائی کورٹ میں صدارتی آرڈیننس کے قانونی نکات کے حوالے سے مقدمہ دائر کر دیا۔

اِن تمام مقدمات کی پیروی اور تیاری، چوہدری صاحب کے ہی سپرد تھی جس کے لیے اُنھوں نے بہت محنت کی اور وقت صرف کیا۔ احمدیہ انجمن کے نمائندگان کے علاوہ، جماعت ربوہ کے ایک قابل وکیل مجیب الرحمان صاحب نے بھی صدارتی آرڈیننس کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیتے ہوئے، اِسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کر دیا اور نہایت مدلل بحث سے اپنا موقف بیان کیا۔ لیکن عدالتی فیصلے، حکومت کے فیصلے کے خلاف نہیں ہوا کرتے، بلکہ اُس کے اشارے سے ہوتے ہیں۔ اس لیے، دو تین ہفتہ کی طویل اور مفصل بحث کے بعد یہ فیصلہ دیا گیا کہ احمدیوں کی طرف سے دیئے گئے دلائل میں کوئی وزن نہیں اور یہ کہ احمدیوں کو پاکستان میں تمام مذہبی حقوق حاصل ہیں۔ اُنہیں مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی، مسیح موعود اور مہدی موعود ماننے کی اور اپنے عقائد کے مطابق اپنے طریق پر عبادات کرنے کی آزادی اور اجازت ہے۔ مگر حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ اِس آرڈیننس نے احمدیوں کی مذہبی آزادی مکمل طور پر سلب کر لی، جو اِنسانی بنیادی حقوق کی سراسر منافی ہے۔

قانون کا نفاذ ہوتے ہی ایسے واقعات رونما ہونے لگے جہاں معمولی معمولی باتوں پر احمدیوں پر ستم توڑے گئے۔ ایک احمدی نے کسی کے السلام علیکم کہنے پر وعلیکم السلام کہہ دیا تو کئی دن تک حوالات میں بند رہا اور ضمانت بھی بڑی مشکل سے ہوئی۔ دو احمدی اعتکاف بیٹھنے پر گرفتار

ہوئے۔لوگ اللہ کے ڈر سے ایسے بے خوف ہو گئے تھے کہ اسلام کے تحفظ کے لیے کلمہ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ تک کو مٹانے ،شہید کر دینے کو اپنا قانونی حق اور مذہبی سعادت سمجھنے لگے تھے۔

آرڈیننس ۱۹۸۴ء سے متعلق حضرت امیر کی ایک تحریر

۲۶ اپریل ۱۹۸۴ء کے آرڈیننس اور مولویوں کے نہ ختم ہونے والے تنافر کی مہم اور جُہلا پر اُس کے اثر، اور ہمارے پیش آمدہ خطرات کی شکایت ہم کس کے آگے کریں۔

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ نَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِنَا وَقِلَّتَ حِیْلَتِنَا وَھوَا نِیْنَا عَلَی النَّاسِ یَآ اَرْحَمَ لرَّاحِمِیْنَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ وَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَ اَنْتَ رَبُّنَا۔

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ نَسْتَغِیْثُ۔ اَللّٰھمَّ اَرْحَمْ اَنْتَ خَیْرُالرّٰحِمِیْنَ وَ تُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ تَوَّابُ الرَّحِیْمُ۔

یہ حالات جماعت کے لیے نا قابلِ برداشت تھے۔حضرت امیر کی ناتواں جان پر اِس کا بہت بڑا بوجھ،غم اور ذمہ داری تھی۔شعائرِ اسلام کی ادائیگی، یہاں تک کہ کسی کو'السلام علیکم' کہہ دینا یا اِس کا جواب دے دینا، احمدیوں کے لیے قابلِ سزا جُرم بن چکے تھے۔ جامعہ دارالسلام سے اب اذان کی آواز بلند نہ ہوسکتی تھی۔اہلِ دارالسلام اور گردونواح کے رہائشی، انڈونیشی طالب علم یا تیمین کی مسحورکُن اذان سے محروم ہو چکے تھے۔عبادات کی حاضری گھڑی کے وقت سے ہوتی تھی۔ایسے میں اکثر اوقات فجر میں حضرت امیر کی رہائش گاہ سے اذان کی ہلکی ہلکی مترنم آواز کانوں میں پڑتی تھی۔حضرت امیر اپنے گھر کے مغربی صحن میں خوداذانِ فجر دیا کرتے تھے۔ یہ آپ کا اپنا ذاتی فعل، گھر کی چاردیواری کے اندر کیا جاتا تھا،شاید قابلِ گرفت نہ ہوگا۔وگرنہ حضرت امیر کی خاص ہدایات

ملکی قوانین کی پابندی اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کی تھیں۔

فخر الدین صاحب کے مضمون "حضرت مسیح موعود کی صداقت کا مظہر" سے اقتباس

۱۹۸۴ء میں ضیائی قانون کا نفاذ ناقابلِ برداشت تھا۔ مگر ہمارے قائد کی استقامت میں فرق نہ آیا۔ اُنہوں نے جماعت کو تلقین کی کہ جہاں تک ممکن ہو، اِس ملکی قانون کی پابندی کریں۔ البتہ اللہ تعالیٰ سے دُعاؤں میں زیادہ مستعد ہو جائیں، کیونکہ ہمارے امام نے ہمیں یہی وصیت کی تھی۔

؎ اندریں وقتِ مصیبت چارۂ ما بے کساں

جُز دُعائے بامداد و گریۂ اسحار نیست

(اس مصیبت کے وقت ہم غریبوں کا علاج سوائے صبح کی دعا اور سحری کے رونے کے اور کچھ نہیں)۔ (پیغام صلح نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء)

پروفیسر اعجاز احمد کے مضمون "الحمد للہ" سے اقتباس

۱۹۸۴ء میں ضیاء الحق کے آرڈیننس کے زمانہ میں جماعت کے لیے حالات خراب ہو گئے تھے۔ انہیں دنوں ربوہ جماعت کے خدام الاحمدیہ کے ناظم واصف صاحب دارالسلام آئے اور اصرار کیا کہ وہ حضرت امیرؒ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت امیرِ سوم سے اُنہیں ملوایا گیا تو وہ بولے کہ حضرت آج کل حالات بہت خراب ہیں اِس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے اور آپ کے لیے خدام کے گارڈ پہرہ دیا کریں۔ اِس پر حضرت امیرؒ نہایت پُرسکون انداز میں مسکرائے، اور فرمایا: " آپ کا بہت بہت

شکریہ۔ ہمارے لیے اللہ کی ہی حفاظت کافی ہے"۔

اور یہ بات ریکارڈ میں رہے کہ ہمارے کسی بھی امیر کا کبھی کوئی گارڈ نہیں رہا سوائے اللہ کے۔ خیر بعد میں کسی موقع پر پتہ چلا کہ اُنہی دنوں حضرت امیر نے رویا دیکھا تھا کہ اُن کے گھر کے ساتھ گراؤنڈ میں ایک کشتی ہے۔ جو مانند کشتیٔ نوح ہے۔ جو کوئی اُس میں سوار ہوگا محفوظ رہے گا۔ یہ کشتی دراصل احمدیت کی کشتی تھی۔ (پیغام صلح نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء)۔

جنرل ضیاء الحق صاحب کے فخریہ اعلان

اس نئے قانون کے نفاذ پر جنرل ضیاء الحق صاحب کو بہت فخر تھا کہ جو کام اُن کے ہاتھوں انجام پایا ہے، اس سے قبل کوئی نہ کر سکا تھا۔ اِس بات کو اُنہوں نے بار بار دُہرایا۔ حتیٰ کہ لندن میں منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس کے لیے اُنہوں نے جو پیغام بھیجا تھا، اُس کے ایک اقتباس کا اُردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

> بالخصوص گذشتہ چند برسوں میں، حکومتِ پاکستان نے متعدد ایسے انتظامات اور قانونی اقدامات کیے ہیں، جن کو احمدیوں کو بطورِ مسلمان دندناتے پھرنے اور شعائرِ اسلامی اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے روکا گیا ہے۔ ہم آئندہ بھی ایسے اقدامات مستعدی سے کرتے رہیں گے تا کہ احمدیت کے کینسر کا مکمل خاتمہ ہو جائے۔

جنرل ضیاء الحق کا ریفرنڈم

آرڈیننس کے نفاذ سے جنرل صاحب کو متوقع مقبولیت اور کامیابی حاصل ہوگئی تو ۱۹ دسمبر کو اُنہوں نے نظامِ اسلام کے نفاذ کے نام پر ایک ریفرنڈم کروایا۔ جس میں کامیابی کو اُنہوں نے اپنے

آپ کو آئندہ پانچ سال کے لیے پاکستان کا صدر منتخب ہونا قرار دیا۔ اور وہ اب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ ساتھ مزید پانچ سال کے لیے صدرِ مملکت قرار پائے۔

جامعہ ایبٹ آباد کا واقعہ

جامعہ ایبٹ آباد کی پیشانی پر اُبھرے ہوئے پاکیزہ کلمات لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ ۱۹۸۴ء کے آرڈیننس کے نفاذ کے بعد اس کلمہ کی شکستگی کا ذکر پروفیسر خلیل الرحمٰن کی تحریر سے بہتر ممکن نہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ہماری ایبٹ آباد کی مسجد پر سیمنٹ سے اُبھرے ہوئے الفاظ میں نہایت خوبصورت کلمہ لکھا ہوا تھا۔ اُسے تڑوا دیا گیا۔ 'اللہ' اور رسول کے نام 'محمد' کے شکستہ ٹکڑے زمین پر گرے، اور ہم نے اُنہیں چُن چُن کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا اور اسے ڈاکٹر عبدالکریم سعید خلف الرشید حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان کے حوالے کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

حضرت امیر کی تحریر:

> دارالسعید ایبٹ آباد کی تاریخی احمدیہ مسجد، جس کے لیے اور دیگر احمدیہ مساجد کے لیے لفظ مسجد کا استعمال نئے آرڈیننس مجریہ ۲۶ اپریل ۱۹۸۴ء کے ماتحت تعزیری جرم ہے اور جس کی سزا تین سال قید و جرمانہ ہے، ایک نہایت اندوہناک حادثہ پیش آیا۔ اِس کی تفصیل ریکارڈ کرنا ازبس ضروری ہے۔
>
> ایک عرصہ سے پریس میں ہمارے خلاف منافرت کا جو ماحول پیدا کیا جا رہا تھا، اُس نے علماء کی طرف سے گورنمنٹ کو الٹی میٹم کی صورت اختیار کر لی، جس کے نتیجے میں آرڈیننس مذکورہ جاری ہوا۔ مساجد سے اذان بند کر دی۔

مساجد کو مساجد کہنا وغیرہ جرم قرار دیا گیا۔ مساجد کی ظاہری صورت بدلنے کا بھی مطالبہ ہوا اور بعض مقامات پر احمدیوں کی مساجد کو لوگوں کی طرف سے نقصان بھی پہنچایا گیا۔ مسجد کو ہم نے 'جامعہ' کا نام دیا ہے۔ دارالسعید کی جامعہ احمدیہ کی شمالی دیوار پر پتھروں کے اندر اُبھرا ہوا کلمہ طیبہ جو میں نے مرزا عبداللطیف بیگ احمدی ڈرائنگ ماسٹر کی مدد سے بنوایا تھا جو خود اُنہوں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ عجب نمونہ کاریگری کا تھا۔ دور سے سڑک سے نظر آتا جاذبِ نظر تھا۔ اِس کلمہ کو منٹوں میں شہید کر دیا گیا۔ اُس کا وجود ختم ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ جس طریق پر ہوا وہ طریق از حد دلخراش ہے۔

مجھ سے پاشا نے ایک ہفتہ اُس سے پہلے ٹیلی فون پر پوچھا کہ اِس کلمہ کی طرف مخالفین کی توجہ ہے، اور کیا ہمیں اِسے دور کر دینا چاہیے۔ تو میں نے تاکید کی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔

حضرت امیر نے اِس تحریر کو اِسی طرح نامکمل چھوڑ دیا ہے۔ شاید اگلے واقعات اتنے ہی دلخراش تھے کہ وہ نوکِ قلم سے بھی ادا نہ کر سکے۔ پروفیسر صاحب کی تحریر میں بھی اصل واقعہ کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب سے استفسار پر معلوم ہوا کہ حضرت امیر نے اُن سے یہ فرمایا تھا کہ کلمہ کے سامنے لکڑی کا ایک بڑا تختہ نصب کر دیں تاکہ کلمہ کی عبارت نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور ظالموں کی دستبرد سے محفوظ رہے۔ مگر اِس سے قبل کہ ڈاکٹر عبدالکریم سعید اس طرح کے حفاظتی اقدام کر پاتے، اُن کی اور پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب دونوں کی غیر موجودگی میں، ہتھوڑوں اور دیگر ایسے آلات سے کلمہ کو مسمار کر دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالکریم سعید، جب کالج سے گھر واپس لوٹے تو کلمہ کے شکستہ ٹکڑے پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب نے اُن کے حوالے کر دیے۔ اِس پُرتشدد واقعہ سے آپ کے دل پر جو گذری وہ اولاً آنسو بن کر بہتی رہی۔ اور پھر نوکِ قلم سے جو اظہار ہوا وہ ایک نظم کی

صورت میں صفحہ قرطاس پر بکھر گیا۔ اِس نظم کا فریم شدہ عکس اِس تحریر میں شامل کیا گیا ہے۔

انسانی حقوق کمیشن اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی طرف سے مذمت کا اظہار

انسانی حقوق کمیشن اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی طرف سے ۱۹۸۴ء کے آرڈیننس xx کی مذمت کی گئی اور حکومتِ پاکستان سے اسے منسوخ کرنے کے لیے کہا گیا، کیونکہ آرڈیننس xx کے تحت مذہبی اقلیتوں کو اپنے عقائد اور خیالات کے اظہار اور اُن پر عمل کی سزا گرفتاری اور قید قرار دی گئی ہے جو آزادیٔ خیال، آزادی ضمیر اور آزادیٔ اظہار کے بنیادی انسانی حقوق کے منافی ہے اور اِس قسم کے اقدامات بین الاقوامی امنِ عامہ کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہیں۔ اس لیے حکومتِ پاکستان اِس آرڈیننس کو فوراً کالعدم قرار دے کر اُن تمام انسانی حقوق کو بحال کرے جن پر اِس کا اطلاق ہوتا ہے۔

مگر قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ تاحال بین الاقوامی اداروں کی اِس مذمت کو نہ تو کسی فوجی حکومت نے اور نہ منتخب جمہوری حکومت نے ہی قابلِ اعتنا سمجھا، یا اس کی طرف توجہ دی۔

سالانہ دعائیہ ۱۹۸۴ء

ملک کے موجودہ حالات میں، نئے قانون کے نفاذ سے، سالانہ دعائیہ اگر ناممکنات میں سے نہ تھا تو اُسے ممکن بنانا بھی آسان نہ تھا۔ مگر امیرِ قوم اور اراکین جماعت کو حضرت مسیح موعود کے قائم کردہ ایسے اجتماع کی برکات سے محروم رہنا بھی گوارا نہ تھا۔ اِس لیے یہی فیصلہ ہوا کہ ہر ممکنہ کوشش سے ایسا اجتماع ممکن بنایا جائے اور ۲۵ سے ۲۸ دسمبر تک کی تواریخ مقرر کر کے جماعت کو اطلاع کر دی جائے۔ ۲۵ دسمبر خواتین کے اجتماع کے لیے مقرر کیا گیا۔

اجتماع کے انعقاد کی اجازت طلب کی گئی، مگر حکومت کی جانب سے انکار یا منظوری کوئی بھی اطلاع موصول نہ ہوئی۔ اس صورت حال میں چوہدری منصور احمد صاحب (جنرل سیکرٹری) ذاتی طور

پر ڈپٹی کمشنر صاحب سے ملاقات کے لیے گئے، مگر صورتِ حال زیادہ اُمید افزا نہ پائی۔ اور بروقت اجازت مل سکنے کی توقع کم نظر آئی۔ اِس لیے جماعت نے مسجد کے اندر ایک 'دُعائیہ اجتماع' کے انعقاد کا فیصلہ کر کے، ڈپٹی کمشنر صاحب کو بذریعہ تحریر اطلاع دے دی۔

اس سال کا جلسہ سالانہ گذشتہ سالوں کی طرح مسجد کے صحن میں شامیانہ لگا کر نہیں کیا گیا تھا، جس میں صحن کے جنوب میں ایک سٹیج بنائی جاتی تھی اور صاحب صدر، سٹیج سیکرٹری اور دیگر بزرگان تشریف فرما ہوتے تھے، اور حاضرین و سامعین، قطار در قطار کرسیوں پر تشریف رکھتے تھے۔ اب جلسہ ایک 'دعائیہ' کی صورت میں جامعہ کے اندر منعقد کیا گیا تھا۔

۲۶ دسمبر کی صبح نماز فجر کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ اس سال باقاعدہ جلسہ نہ ہوگا بلکہ جامعہ کے اندر تین 'ایام اللہ'، دعا و مناجات میں گزارے جائیں گے۔ تمام احباب مقررہ وقت سے پہلے تشریف لا کر اشراق کے نفل ادا کریں اور اس کے بعد وعظ اور نصائح سے فیض یاب ہوں۔ وقت سے پہلے جامعہ حاضرین سے بھر گئی۔ حضرت امیر نے افتتاحی دُعا فرمائی۔ اگلے تین ایام میں متعدد، نہایت پُرمغز اور عالمانہ تقاریر حاضرین نے جامعہ کے فرش پر بیٹھ کر نہایت اطمینان سے سُنیں۔ ایک عجیب روحانیت سے لبریز ماحول قائم رہا۔ جامعہ تمام اوقات میں بھری رہی۔ اور آخری روز جمعہ کی نماز میں دو صفیں برآمدہ میں بھی بنیں۔ ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال رہا اور کسی قسم کی بدامنی کا واقعہ جس کا خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا، پیش نہیں آیا۔ اور یہ سب جماعت کی بلند حوصلگی اور عمدہ تدابیر کا نتیجہ تھا۔

جماعت کو درپیش مسائل، بیرونی دباؤ اور خطرات تو اب جماعت کا مقدر بن ہی چکے تھے اور امیرِ قوم مستعدی سے اِن کا مقابلہ بھی فرما رہے تھے، مگر جماعت کے اندر جو فساد اور فتنہ، کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا تھا، وہ ایک افسوس ناک امر تھا۔ سالِ گذشتہ جماعت کے ایک مخصوص گروپ نے جلسہ کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اِس سال بھی سالانہ دُعائیہ میں وہ افراد شریک نہ ہوئے تھے۔

البتہ بالالتزام دلآزار پمفلٹ تقسیم کروائے گئے، جو عام طور پر اکثریت کے ہاتھوں تک پہنچے اور یوں جلسہ کی فضا کو مکدر کرنے کی ایک مذموم کوشش کی گئی۔ البتہ نماز جمعہ میں اِن میں سے چند لوگ شامل ہوئے تھے اور اس طرح افراد جماعت سے رابطہ قائم کر کے چند احباب کو بطورِ خاص اُس میٹنگ میں شمولیت کے لیے مدعو کیا جو اُسی شام کو فاروق شیخ صاحب کے مکان واقع دارالسلام میں 'مرزا غلام احمد فاؤنڈیشن' کے زیرِ اہتمام ہونا قرار پائی تھی۔ مقررین میں جماعت ربوہ کے احباب بھی شامل تھے۔ ملک کی موجودہ صورتِ حال میں جماعت کے اندر خلفشار اور نااتفاقی کی فضا پیدا کرنا نہایت افسوس ناک امر تھا۔ اور یہ جماعت کے مفاد کے منافی تھا۔ وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ دِلوں میں خوفِ خدا پیدا ہوتا اور ایسا ماحول پیدا کیا جاتا جو سب کے لیے اچھا ہوتا اور جماعت کو استحکام بخشتا۔ مگر ذاتی مفادات ایسا ہونے نہیں دے رہے تھے۔

نمازِ فجر میں قنوت کی دُعاؤں کا سلسلہ

جماعت کو درپیش اندرونی اور بیرونی مصائب و شدائد کا سامنا کرنے کے لیے رب العالمین کے حضور عجز و انکسار سے عرض و نیاز کر کے تقویت حاصل کرنا ہی مومنین کا شیوہ رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی مصائب اور ظلم و ستم کا سامنا ہوتا تو وہ نمازِ فجر میں دوسرے رکوع کے بعد حالتِ قومہ میں دعا فرمایا کرتے تھے۔ اسی سنتِ رسول کی پیروی کرتے ہوئے حضرت امیر نے خطبہ جمعہ (۴ جنوری ۱۹۸۵) میں جماعت سے اِس کی تحریک کی اور ۵ جنوری کی نمازِ فجر سے جامعہ دارالسلام میں اِس کا آغاز کر دیا جو چالیس روز تک جاری رکھا گیا۔ حضرت امیر کی صحت خاصی کمزور ہو چکی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے ہمت عطا فرمائے رکھی، اور آپ کی قرآنی اور مسنون دُعاؤں کی رِقت آمیز ادائیگی کے ساتھ جماعت کی باآواز بلند "آمین" عرشِ عظیم تک پہنچتی رہی اور قلوب اطمینان و تقویت حاصل کرتے رہے اور یہ یقین قائم ہوتا رہا کہ یہ دُعائیں ضرور مستجاب ہوں گی۔

بیان القرآن کی طباعت میں مسائل

جماعت کو ایک لامتناہی مسائل کے سلسلے کا سامنا تھا۔ اب جنوری ۱۹۸۵ء میں سَن رائز پریس کے مالک نے بیان القرآن کی طباعت سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ وہ پریس کے ضبط ہوجانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ جماعت کے وہ افراد جو اِس کام سے منسلک تھے اُن کا اپنا رویہ بھی حوصلہ افزاء نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے متبادل انتظامات کی طرف رہنمائی فرمائی، اور اپریل ۱۹۸۵ء تک بیان القرآن کی طباعت کے بعد، احمدیہ بلڈنگس کے پرانے دفتر میں جلد بندی کا کام شروع ہوگیا۔ انگریزی ترجمۃ القرآن جو پہلے تیار ہو چکا تھا، اُس کی جلد بندی کا کام اپریل تک تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ موجودہ حالات میں اِس کام کا ممکن ہوجانا نہایت خوش آئند اور حوصلہ افزا تھا۔

فجی مسجد کا افتتاح اور وفد کی روانگی

حضرت امیر مارچ ۱۹۸۵ء میں فجی مسجد کے افتتاح اور کنوینشن میں بذاتِ خود شمولیت کا ارادہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ انگریزی میں چند تقاریر کے مسودے بھی تیار کر چکے تھے۔ مگر چند ناگزیر حالات آپ کی روانگی میں مانع تھے، اس لیے ایک متبادل وفد نامزد کیا گیا۔ اُن ایام میں ڈاکٹر عبدالکریم سعید کسی ذاتی کام کے سلسلہ میں لندن گئے ہوئے تھے۔ حضرت امیر نے اُن سے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ وہیں سے فجی چلے جائیں اور اپنی تقاریر بھی اُنہیں بھجوا دیں، کہ آپ کی طرف سے پڑھ کر سنا دی جائیں۔ ڈاکٹر عبدالکریم سعید نے اطاعتِ امیر اور فرمانِ پدر کو فرض جانتے ہوئے تعمیل کی۔ اُن کے علاوہ حافظ شیر محمد صاحب اور ظفر عبداللہ صاحب امریکہ سے اور شاہد عزیز صاحب لندن سے تشریف لے گئے۔ آپ وفد کی کامیابی کے لیے دُعا گو رہے۔ یہ وفد ۲۸ مارچ تک فجی پہنچ چکا تھا۔ ڈاکٹر عبدالکریم صاحب وطن واپس لوٹے تو حضرت امیر کی خدمت میں حاضر ہو کر مسجد کے افتتاح اور کنونشن کی روئیداد گوش گذار کی۔

حضرت امیر کی ڈائری سے ایک تحریر:

۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء

پاشا فجی کے سفر سے واپس ایک بجے دوپہر پہنچا۔ کامیاب سفر کے حالات سنائے۔ شاہد اور ظفر عبداللہ و حافظ شیر محمد کا تعاون مفید رہا۔ پاشا کو ویزا کی وجہ سے پریشانی آئی اور چھ سات ہزار روپیہ زیادہ خرچ جو آیا، یہ سب کچھ اُس نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ تین اہم تقاریر انگریزی میں اور چھ درس مختلف مقامات پر اُس نے دیئے۔ اللہ تعالیٰ کو اُس نے اپنے ساتھ پایا۔ الحمدللہ۔ مجھے زندگی میں یہ دِن دکھایا۔ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ۔ (میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑیو اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے)(الانبیاء ۲۱:۸۹)۔

امریکہ سے ماسٹر عبداللہ صاحب نے حضرت امیر کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا جس میں فجی کی کنونشن سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

پاشا نے حکام اور جماعت دونوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ شاہد نے بھی اچھا کردار ادا کیا ہے۔

اندرون ملک دورہ جات

حضرت امیر فجی نہ جا سکتے تھے۔ تاہم اندرونِ پاکستان مختلف مقامات، کراچی، ملتان، فیصل آباد، سیالکوٹ، وزیر آباد، راولپنڈی اور پشاور تشریف لے گئے۔ آپ کے یہ سفر بامقصد اور کامیاب رہے۔ ہر مقام پر خطباتِ جمعہ آپ نے دیے اور جماعتی تقریبات میں تقاریر فرمائیں اور احبابِ جماعت سے ملاقات کے لیے اُن کی رہائش گاہوں پر تشریف لے گئے، بالخصوص ایسے

احباب سے ملاقات فرمائی جو بوجہ عوارضِ صحت یا ضعیف العمری جامعات میں تشریف نہ لا سکتے تھے۔آپ نے یہ سفر زیادہ تر تنہا ہی کیے۔ ہر مقام پر جہاں آپ تشریف لے گئے احبابِ جماعت سے جماعت کے موجودہ اور مجوزہ منصوبہ جات پر تبادلۂ خیال اور مشورہ کیا۔ملکی سیاسی حالات اور اُن سے پیدا ہونے والا دباؤ اور مشکلات، جماعت کے اندرونی مسائل اور اپنے ہی دوستوں کی زیادتیوں، دروغ بافیوں اور جماعت پر اُس کے اثر پر بحث کی۔ملکی حالات سے شکستہ خاطر اور افسردہ اور اندرونی حالات سے بددل اور مایوس دلوں کو طمانیت اور حوصلہ بخشا۔

آپ نے اپنی ملاقاتوں میں احبابِ جماعت کی توجہ تعاون اور حسنِ ظن سے کام لینے کی طرف دلوائی۔آپ نے اپنے دورہ جات کے ذکر میں اپنی ڈائری میں یوں تحریر فرمایا ہے:

> گذشتہ دو سال سے اُن احباب کا مرکز میں نہ آنا اور جلسہ سالانہ میں عدم شمولیت بے حد تکلیف دہ واقع ہوئی ہے۔اور اِن جلسوں میں، خصوصاً ۲۵ تا ۲۸ دسمبر (۱۹۸۴ء) کو غیر معمولی حالات میں دارالسلام میں جو مجلس ہوئی، اُس کی ہر بات سے اُن کی اپنی محرومی کوئی معمولی بات نہ تھی۔اور بعض ایسی غلط فہمیاں جو مرکز کے متعلق پھیلائی گئی تھیں اور غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا، وہ حقائق کھل کر سامنے آ گئے تو کافی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا۔

مجلس مشاورت

۲۵ اپریل ۱۹۸۵ء کو دارالسلام میں ایک مشاورت ہوئی، جس میں معتمدین کے اراکین کے علاوہ بھی بہت سے احباب شامل ہوئے۔

حضرت امیر کی تحریر:

> مشاورت میں ساٹھ کے قریب افراد حاضر تھے۔قریباً چار گھنٹے نہایت پرسکون

اور پہلی بار مثالی طور پر اچھے ماحول میں تمام کاروائی ہوئی۔ مجلس میں بہترین سنجیدہ اور پُرخلوص ماحول قائم رہا۔ کئی مفید تجاویز پیش ہوئیں، جو ریکارڈ کی گئیں۔ میرے تازہ دوروں کا جو خاطر خواہ اثر ہوا ہے، اُس کی وجہ سے چند قیمتی ممبران بھی شامل ہوئے اور جماعت میں ایک عمدہ تبدیلی اور ربانی کیفیت کے آثار نمایاں لگے۔ اِس تحریک پر کہ لوگ زندگیاں وقف کریں۔ سب سے پہلے حنیف اختر نے کہا کہ وہ تیار ہیں۔ انجمن ملک کے اندر یا باہر اُن سے خدمت لے۔ محمد سعید فرزند م نے کہا وہ اس وقت ملازمت میں ہے لیکن انجمن کو ضرورت پر وہ اُسے چھوڑنے پر تیار ہوگا۔ عبدالعزیز بن محمد دین نے کہا کہ اُس نے بی اے کیا ہوا ہے وہ دینی تعلیم یہاں حاصل کر کے مبلغ بننے کے لیے تیار ہے، جون میں آسکتا ہے۔ حاضرین خوش ہوئے۔

جنوبی افریقہ کیس

اکتوبر ۱۹۸۲ء میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) جنوبی افریقہ کے ممبران کی طرف سے کیپ ٹاؤن کی عدالت میں اپنے حقوق کی بحالی کے لیے ایک مقدمہ دائر کیا تھا جس کا فیصلہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۵ء کو جماعتِ احمدیہ کے حق میں ہوا۔ کیپ ٹاؤن میں لاہور احمدیہ تحریک کی ایک شاخ ۱۹۵۰ء سے قائم تھی۔ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی، جماعت کو مخالفت کا سامنا رہتا تھا، اور ۱۹۶۵ء سے احمدیوں کو کافر قرار دینے کے لیے فتویٰ جاری کیا گیا اور اُس کے بعد احمدیت کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈا جاری رہا۔ اور لوگوں میں منافرت پھیلانے کی کوشش میں پمفلٹ، مضامین اور کتابیں لکھی گئیں۔ اکثر اوقات حضرت مرزا غلام احمد، مجدد صد چہار دہم کی ذات کو نشانہ بنانے کے لیے کارٹون تک بنا کر چھاپنے سے بھی گریز نہ کیا گیا، تا کہ اس طرح عام مسلمانوں کے جذبات کو اُبھارا جا سکے۔

مئی ۱۹۸۲ء میں کیپ ٹاؤن کی احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے جنوبی افریقہ کی حکومت سے ایک لائسنس حاصل کرنے کے لیے درخواست دائر کی، تا کہ اِس اجازت سے وہ ایک اسلامی مرکز بنانے کے لیے رقم جمع کر سکیں۔ قانونی کارروائی کی تکمیل کے لیے اِس کا نوٹس اخبار میں بھی چھپوایا گیا، جس پر مسلم جوڈیشل کونسل کیپ ٹاؤن نے جو مذہب پر اپنی اجارہ داری کا دعویٰ رکھتی تھی، ایک اعلان جاری کروا دیا کہ احمدیوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کوئی اسلامی مرکز بنائیں کیونکہ وہ خود مسلمان نہیں بلکہ کافر ہیں اور اِس حیثیت سے وہ کوئی اسلامی ادارہ یا مسجد بنانے کے مجاز نہیں ہو سکتے، اور اُنہیں ایسی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اس کے لیے فنڈ جمع کریں، اور اس کے خلاف محکمہ سے شکایت کی دھمکی دی۔

ایک عرصہ دراز سے احمدی اسی طرح نفرت اور تعصب کا شکار بن رہے تھے۔ اب اس بے جا دخل اندازی نے احمدیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ چارہ جوئی کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ چنانچہ جماعت کے ایک رُکن کی طرف سے مقدمہ دائر کیا گیا کہ احمدی مسلمان ہیں اور مساجد میں نماز ادا کرنے اور مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین کے وہ تمام حقوق اُنہیں حاصل ہونے چاہئیں جو دوسرے تمام مسلمانوں کو ہیں۔

یہ مقدمہ تین سال تک چلتا رہا۔ اِس اثناء میں جنوبی افریقہ کی جماعت کو مرکز اور احمدیہ جماعت کی تمام شاخوں کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اور ہر قسم کی افرادی اور مالی امداد بہم پہنچائی جاتی رہی۔ مرکز کی طرف سے حافظ شیر محمد صاحب کو بطورِ گواہ نامزد کیا گیا۔ اور ڈاکٹر زاہد عزیز بطور ترجمان اُن کے ہمراہ کیپ ٹاؤن تشریف لے گئے۔ چوہدری فتح محمد عزیز صاحب کو بطور قانون دان نامزد کیا گیا، مگر ویزا حاصل نہ ہو سکا، جس کی وجہ سے وہ تشریف نہ لے جا سکتے تھے۔ محترمہ ثمینہ صاحبہ، بطورِ خاص کینیڈا سے تشریف لے گئیں، اور غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، دورانِ مقدمہ لمبے عرصہ تک وہاں قیام فرمایا۔

اِس مقدمہ کی بازگشت پاکستان میں بھی پہنچی اور کافی شور وغوغا ہوا، اور جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی مدد کے لیے ملک کے نامی گرامی دانشور اور مذہبی رہنما ایک وفد کی صورت میں وہاں تشریف لے گئے۔ مگر حافظ شیر محمد صاحب کے مدلل بیانات اور اسلام کی صحیح تعریف اور تصویر کشی نے اُنہیں راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ عدالتی فیصلہ آنے سے پہلے ہی میدان چھوڑ گئے، اور اپنی فتح کے جھوٹے افسانے سُنانے کے علاوہ اُن کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۸۵ء کو مقدمہ کا فیصلہ جماعتِ احمدیہ کے حق میں سُنایا گیا۔

اس مقدمہ میں ہر قدم پر تائیدِ الٰہی کے مناظر دیکھنے میں آئے۔ اللہ تعالیٰ کی تائید کے واقعات میں سے ایک چھوٹا سا واقعہ ازدیادِ ایمان کا باعث ہوگا۔

حافظ شیر محمد صاحب اسلام آباد سے لندن اور لندن سے جنوبی افریقہ کے لیے عازمِ سفر ہوئے، تو اُن کے ہمراہ ایک آہنی صندوق تھا، جس میں بے شمار کتب تھیں، جو اُنہیں مقدمہ میں اپنی شہادت کے حوالہ جات پیش کرنے کے لیے بطورِ خاص ساتھ لے جانا مطلوب تھیں۔ اِس آہنی صندوق کا بذریعہ جہاز ساتھ جانا ممکن ہی نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی اور تائید کا ایسا مظاہرہ ہوا جو سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال گیا۔ ہوا یوں کہ نجیب صادق صاحب جو اُس زمانہ میں انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے، حافظ صاحب کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ کسٹم آفیسر نجیب صادق کو اُن کے پشاور کے زمانۂ طالب علمی سے بطور کرکٹ کے کھلاڑی کے پہچانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ انگلستان میں بھی کرکٹ کھیلتے ہیں۔ اُس افسر کے اپنے اندازے کے مطابق یہ آہنی صندوق نجیب صادق کے کھیل کا سامان ہے۔ اس لیے بغیر اُسے کھولے سامان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور یوں محترم حافظ صاحب اپنی تمام کتب ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

جنوبی افریقہ کے مقدمہ کی تمام تر تفاصیل پر مبنی ایک کتاب بعنوان "South Africa Case" (جنوبی افریقہ کا مقدمہ) محترم زاہد عزیز صاحب نے تحریر فرمائی ہے۔ جو ساڑھے تین سو

صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس کتاب کا پیش لفظ حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے تحریر فرمایا تھا، جس کا خاتمہ اُنہوں نے اِن الفاظ پر کیا:

اِس کتاب میں احمدیہ انجمن لاہور کے عقائد کو جامع طور پر پیش کیا گیا ہے۔ میں اسلامی تعلیمات کے محققین سے اور بالخصوص مسلمان محققین سے اِس کتاب سے استفادہ کی گذارش اِس دُعا کے ساتھ کرتا ہوں کہ سچائی اُن کے قلوب میں گھر کر جائے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ کتاب تمام احمدیوں کے لیے اور بالخصوص احمدی نوجوانوں کے لیے، حضرت مرزا غلام احمد صاحب کے دعاوی سے متعلق گراں قدر معلومات فراہم کرے گی۔ (انگریزی سے ترجمہ)

دوسرا جنوبی افریقہ کیس

احمدیت سے عناد ایک مقدمہ کے فیصلے سے ختم تو نہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے جماعت احمدیہ کو ۱۹۸۷ء۔ ۱۹۹۰ء میں ایک اور مقدمہ کا سامنا کرنا پڑا۔ مرکز سے ہر طرح کی مالی امداد اور دُعا سے روحانی طور پر تقویت پہنچانے کی سعی کی گئی، تاکہ ان حالات کا سامنا کیا جا سکے۔ ثمینہ صاحبہ حضرت امیر کو تمام کاروائی سے مطلع رکھتیں، اور مالی ضروریات کی طرف توجہ دلاتی تھیں۔ حضرت امیر کی اپیل پر صاحبِ ثروت مخیر حضرات فوراً عطیات فراہم کرنے کو تیار رہتے تھے۔ حضرت امیر کی ڈائری کی ایک یادداشت:

۱۸ فروری ۱۹۹۰ء۔ کینیڈا سے ثمینہ کا رات ۹ بجے فون آیا۔ نعمان بھی موجود ہے۔ ساؤتھ افریقہ کیس کے لیے مزید روپیہ کی ضرورت ہے۔ خود ثمینہ کو جانا ہو گا۔ ملتان سے امداد کی کوشش کرنے کا کہا۔ میاں عمر فاروق کو فون کرنا ہے۔

ثمینہ اور نعمان کے علاوہ، شاہد عزیز نے اپنے وقت اور مالی منفعت کی قربانی دیتے ہوئے

حافظ صاحب کا ساتھ دیا۔ چوہدری مسعود اختر صاحب ایک ماہ تک وہاں مقیم رہے اور ہر طرح سے مدد فرماتے رہے۔وہ حضرت امیر کو بذریعہ فون تمام کاروائی سے آگاہ رکھتے رہے۔ بالآخر ۲۳ فروری ۱۹۹۰ءکو اللہ تعالیٰ نے جماعتِ احمدیہ لاہور کو فتح بخشی۔

حضرت امیر کی تحریر

۲۳ فروری ۱۹۹۰ء۔نمازِ جمعہ کے بعد (۲ بجے) کینیڈا سے مسز ثمینہ ساھو خان کا ٹیلی فون آیا۔ساؤتھ افریقہ کے مقدمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح مبین نصیب فرمائی۔حضرت امام زمان کی ذات پر معاندین مکذبین کے الزامات سے بریت، ایک غیر جانبدار سپریم کورٹ کی عیسائی جج کے ذریعہ کرائی۔ جو فیصلہ عدالت میں سنایا گیا وہ fax کے ذریعہ اتوار ۲۵ فروری تک متوقع ہے۔ اکثر جماعتوں میں بذریعہ ٹیلی فون خوش خبری پہنچائی گئی۔

راہِ حق کا مسافر محمد انور شہید۔یوم شہادت ۱۹ اپریل ۱۹۸۶ء

جماعت احمدیہ کے ایک اور بطلِ جلیل، محمد انور کو گلستانِ احمدیت کو اپنے خون سے سینچنے کی سعادت نصیب ہوئی۔محمد انور جارج ٹاؤن، گیانا میں، تبلیغ حق کا فریضہ ادا کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔محمد انور امام لندن، جارج ٹاؤن میں مسجد کے افتتاح اور احمدیہ کنونشن میں بطور مندوب، شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔اِن کے علاوہ اس کنونشن میں جنرل عبداللہ سعید، مسز انجم سعید، کرنل محمود شوکت اور جماعت کے کئی دوسرے سرکردہ ممبر شامل ہوئے تھے جو کنونشن کے بعد جلد ہی واپس لوٹ گئے۔محمد انور صاحب کو ابھی اور کچھ فرائض انجام دینا تھے، جس کے لیے وہ چند دن مزید رُک گئے تھے۔

۹ اپریل کو محمد انور صاحب بمعہ اپنے میزبان مولوی محمد رشید اور اُن کی اہلیہ کے، مغرب و

عشاء کی نمازوں کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچے۔ مولوی صاحب نے انہیں اور مسز رشید کو گھر کے صدر دروازہ کے قریب گاڑی سے اُتارا، اور خود گاڑی کھڑی کرنے چلے گئے۔ مسز رشید ابھی دروازہ کھول نہ پائی تھیں کہ اُنہیں کسی کے گرنے کی آواز سُنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو محمد انور کو فرش پر گرے ہوئے پایا۔ وہ جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا اور نہ گولی کی آواز ہی کسی کو سُنائی دی تھی۔ اُس روز محمد انور صاحب اپنے معمول سے پہلے ہی اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر آرام فرمانا چاہتے تھے، تاکہ اگلے روز علی الصبح ریڈیو سٹیشن پر اپنی تقریر ریکارڈ کرواتے ہوئے وہ تازہ دم ہوں۔ مگر اُن کا سفاک قاتل اُن سے بھی پہلے پہنچ کر اُن کا منتظر تھا، جو چند لمحوں میں اپنا مقصد پورا کر کے فرار ہو گیا۔

محمد انور صاحب کی شہادت ایک عام حادثہ نہ تھا۔ اِس کے لیے با قاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ ایک شخص، وقوعہ سے ایک روز قبل مسجد میں آکر معلومات حاصل کر چکا تھا کہ کنونشن کے شرکاء میں کون اب تک جارج ٹاؤن میں ہے، اور کہاں قیام پذیر ہے۔ ۱۹ اپریل کو طلوعِ فجر سے بہت پہلے محمد رشید صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجنبی شخص نے فون پر محمد انور صاحب سے بات کرنا چاہی۔ مولوی صاحب، اپنے مہمان کے آرام میں مخل نہ ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے معذرت کر دی۔ ۹ اپریل کا دن مصروفیت میں گذر گیا اور اُس شخص نے دوبارہ ملاقات کے لیے رابطہ نہیں کیا۔ اب اُسے مزید معلومات کی ضرورت نہ رہی تھی، اور جو کام اُسے سونپا گیا تھا اُس کے لیے اُس نے موقعہ اور وقت ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

پولیس کی تحقیقات سے معلوم ہوا، کہ کنونشن کے دوران، ایک شخص ایک بڑا بیگ ہاتھ میں لیے کنونشن ہال میں داخل ہونا چاہتا تھا، مگر سخت حفاظتی اقدامات کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ درحقیقت یہ منصوبہ ایک فردِ واحد کی شہادت کا نہ تھا، بلکہ بڑے پیمانے پر کنونشن میں تباہی پھیلانے کا تھا، جو ناکام رہا۔ انور کا قاتل ٹرینیڈاڈ سے گیانا آیا تھا، اور کسی دوست کا مہمان تھا۔ پولیس نے

اِس شخص کو گرفتار کیا اور ڈیڑھ سال قید کی سزا دی۔ اصلی مجرم فرار ہو کر ٹرینیڈاڈ واپس جا چکا تھا۔

چند برس بعد، انور شہید کا قاتل، ٹرینیڈاڈ میں، وہاں کی حکومت کے خلاف سازش میں ملوث پایا گیا اور گرفتار ہو گیا۔ اُس نے اقبالِ جرم میں یہ بھی اقرار کیا کہ اُس نے محمد انور کو کسی غیر ملکی تنظیم یا حکومت کے ایما پر شہید کیا تھا۔

محمد انور صاحب، شہادت کے وقت ابھی زندگی کی پچاس بہاریں بھی نہ دیکھ پائے تھے، مگر اپنی شہادت سے احمدیت کی تاریخ میں لازوال قربانی کی داستانوں میں، ایک انوکھے سنہرے باب کا اضافہ کر گئے۔ محمد انور کے والدین احمدی نہ تھے۔ البتہ اُن کے قریبی عزیز داری میں چند افراد احمدی ضرور تھے۔ محمد انور کے دل میں احمدیت کی جستجو اُس وقت پیدا ہوئی جب وہ مانسہرہ ہائی سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ اُن کی حساس طبیعت نے یہ محسوس کیا تھا کہ تقریباً سبھی احمدی طالب علم اچھے اخلاق وعادات کے مالک ہیں۔ وہ شرارت اور فساد سے دور رہتے ہیں، پھر بھی دوسرے طالب علم اُن سے استہزاء کر کے اُنہیں اذیت پہنچانے سے باز نہیں آتے۔ ڈاڈر سینی ٹوریم کے ایک احمدی طالب علم، محمد یونس، اُن کے ہم جماعت تھے۔ اُن سے تبادلۂ خیالات بھی ہوتا رہتا تھا۔

راہِ حق کا یہ متلاشی جلد ہی اپنے قریبی احمدی عزیزوں کی طرف کھنچا چلا آیا۔ حبیب الرحمان صادق صاحب اُن کے رشتے کے چچا تھے، اور حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان کی زوجہ اُسی رشتہ سے محمد انور کی پھوپھی تھیں۔ وہ دونوں بزرگوں سے رہنمائی حاصل کرتے رہتے، اور جب احمدیت کی سچائی اُن پر کھل گئی تو وہ جادۂ حق پر گامزن ہو گئے۔ تعلیم سے فراغت پائی تو محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی اور حبیب الرحمان صادق صاحب کی صاحبزادی ارجمند بانو سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

۱۹۷۸ء میں محمد انور صاحب نے سرکاری ملازمت ترک کر دی اور خدمتِ دین کے لیے زندگی وقف کر دی۔ دارالسلام لاہور میں دو سال زیرِ تربیت رہ کر علم وعرفان کی منازل بہت جلدی

طے کر کے قدم اور آگے بڑھایا تو انگلستان میں امامت اُن کے سپرد ہوئی۔ اُن کی مستعدی، لگن، تقویٰ اور یقین محکم کی وجہ سے جماعتِ انگلستان ہر روز آگے قدم بڑھانے لگی۔ گیانا کا سفر فرائض منصبی کے سلسلہ ہی میں تھا۔ انگلستان سے روانگی کے وقت کون جانتا تھا کہ اپنی کم سن بچی حبیبہ اور جوان شریک حیات ارجمند بانو سے اُن کی یہ آخری ملاقات ہوگی اور یہ کہ فرشتہ اجل دور دراز ملک میں اِس مسافر کا منتظر ہے۔ انور کی شہادت جماعت کو ایک نہایت قیمتی وجود سے محروم کر گئی۔ امیرِ قوم اور جماعت کی بہت سی اُمیدیں اُن سے وابستہ تھیں جو مستقبل کے معماروں میں سے تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اُن کی شہادت پر اشکبار نہ ہو، اور کوئی دِل ایسا نہ تھا جو مغموم نہ ہو۔ حضرت امیر کا دُکھ سب سے سوا تھا۔ راہ وفا کے اِس مسافر کی آخری منزل شہادت تھی۔ احمدیت کا یہ شہید، احمدیہ قبرستان دارالسلام میں مدفون ہے، جس کی لوحِ تربت کی زینت جنرل محمود الحسن صاحب کا یہ شعر، حضرت امیر کا انتخاب ہے:

مر کر راہِ وفا میں جو ملتی ہے زندگی
وہ زندگی خدا کی قسم لاجواب ہے

حضرت امیر کی ڈائری سے ایک تحریر:

محمد انور شہید کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے عبدالغفور ثاقب، نماز عید کے بعد حاضر ہوئے تو شاعر امجد اسلام کے یہ مصرعے اُن کے دِل میں ابھرے:

کئی مہتاب خُو، سورج بکف ایسے بھی ہوتے ہیں
کہ جو خود ٹوٹ بھی جائیں تو اُن کی روشنی موجود رہتی ہے

صدائے بازگشت اُن کی ہوا کے ساتھ بہتی ہے
وہ اپنی موت سے لوحِ ابد پر زندگی تحریر کرتے ہیں
فنا تسخیر کرتے ہیں

سعید احمد، ایبٹ آباد
۱۰ جون ۱۹۸۶ء

سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۸۰﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۸۲﴾ (تیرا رب (ہاں) عزت والا رب اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ اور رسولوں پر سلام ہے۔ اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے) (الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۸۰-۱۸۲)۔

علالت اور کامیاب علاج۔ اگست ۱۹۸۶ء

اگست ۱۹۸۶ء میں حضرت امیر دارالسعید ایبٹ آباد میں مقیم تھے۔ کوئی عارضہ لاحق نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کمزور پا رہے تھے۔ اس لیے طے شدہ پروگرام کے مطابق انگلستان کے سفر کا ارادہ ترک فرما دیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب کو، اُس دور کے صدر جنرل ضیاء الحق کے ہمراہ کوہستان دورے پر جانے والی میڈیکل ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا گیا، تو اپنے والد کو حالت صحت میں چھوڑ کر اپنے فرائض منصبی کے لیے کوہستان روانہ ہو گئے۔ یہ دورہ کئی دنوں کے دورانیہ کا تھا۔ اُن کی غیر موجودگی میں حضرت امیر نے اپنے بلڈ پریشر میں غیر معمولی بے قاعدگی محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالکریم سعید کے قائم مقام ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے دوا کی مقدار بڑھا دی، جس سے اُن کی نبض کی رفتار میں کمی واقع ہو گئی، جو کافی پریشان کن بات تھی۔ مگر حضرت امیر نے گھر میں کسی سے ذکر

نہیں فرمایا اور اپنے فرزند کی واپسی کے منتظر رہے۔

ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب واپس لوٹے تو والد محترم کو پہلے سے بہت کمزور پایا۔ وہ خود امراضِ قلب کا تجربہ رکھتے تھے، حرکتِ قلب میں بے قاعدگی کو فوراً محسوس کرتے ہوئے گھر میں موجود آلہ سے اِس کی تشخیص کر لی، اور فوراً علاج کی طرف متوجہ ہوئے۔ راولپنڈی ملٹری ہسپتال کے امراضِ قلب کے ماہر کرنل نُوری صاحب (ڈاکٹر نُوری فوج سے بطور جنرل ریٹائر ہوئے) سے فوری رابطہ کیا۔ ڈاکٹر نُوری صاحب اور ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب کے مابین، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے زمانۂ طالب علمی سے مراسم تھے۔

حضرت امیر کو بذریعہ ایمبولینس ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں پہنچایا گیا، تو نُوری صاحب نے فوراً نہایت شفقت اور محبت سے آپ کا معائنہ کیا اور حرکت قلب میں با قاعدگی پیدا کرنے کے لیے pace maker نصب کرنا تجویز کیا۔

حضرت امیر کے تپ دق کا علاج جس اپریشن سے ہوا تھا، اُس میں آپ کی کئی پسلیاں نکال دی گئی تھیں۔ اب لمبا عرصہ گذر جانے کے بعد آپ کے جسم کی ساخت کافی تبدیل ہو چکی تھی۔ pace maker نصب کرنے کے لیے ایک تار کا دِل تک پہنچانا ضروری تھا، جس کے لیے بظاہر کوئی ممکن صورت نظر نہ آتی تھی۔ یہ ایک نازک مسئلہ تھا، اور ڈاکٹر صاحبان یہ خطرہ مول لینے کی جرأت نہ کر پا رہے تھے۔ لیکن کرنل نُوری صاحب نے اُس وقت بہت ہمت اور اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے یہ جرأت مندانہ قدم اُٹھانے کا ارادہ کر لیا۔ اُنہیں حضرت امیر سے ایک خاص اُنس تھا، جس نے اُنہیں اِس ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اُدھر حضرت امیر کو بھی اپنے معالج پر اعتماد اور بھروسہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہر کام کی ابتداء بسم اللہ پڑھ کر کرتے، جس نے حضرت امیر کا اعتماد ان پر اور بڑھا دیا۔ معالج و مریض کا یہ باہمی اعتماد، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسے سے یہ علاج جو بظاہر ناممکن تھا، ممکن ہو گیا۔ اپریشن کامیاب رہا۔ حضرت امیرؒ نے ایک نئی زندگی پائی

اور اُن کے معالج نے آپ کی اور آپ کے خاندان کے ہر فرد کی بے شمار دُعائیں اور محبتیں سمیٹیں۔ آج بھی ڈاکٹر نُوری صاحب کا نام آپ کے خاندان میں نہایت محبت بھرے احترام اور دُعا کے ساتھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نُوری کے اس جرأت مندانہ اقدام سے ہی ان کے جان جی مزید دس برس تک اُن کے درمیان رہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو اُس کی بہترین اور احسن جزا عطا فرمائے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خاص تصرفات میں سے تھا کہ اِس آلہ (pace maker) میں جو حضرت امیر کے جسم میں پیوند کیا گیا تھا۔ تاحیات کسی وقت بھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِہٖ۔

ملٹری ہسپتال کے قیام کے دوران جنرل عبداللہ سعید کے بے شمار فوجی رفقاء، حضرت امیر کی عیادت کے لیے تشریف لاتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ جنرل محمود الحسن صاحب جو حضرت امیر سے ذاتی وابستگی رکھتے تھے متعدد بار آئے اور آپ کی صحبت میں وقت گذارتے رہے۔

ہسپتال سے آپ اپنے فرزند محمد سعید صاحب کے گھر منتقل ہو گئے۔ چند دِن کے قیام کے بعد ایبٹ آباد جانے کی خواہش کا اظہار فرمایا، تو ملک اعزاز الٰہی صاحب نے سفر کے لیے اپنی بڑی آرادم دِہ کار پیش کی اور آپ باسہولت ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ وہاں دو ماہ قیام کے بعد آپ اچھی صحت اور بلند ہمت اور ارادوں کے ساتھ نومبر کے آخری ہفتہ میں لاہور تشریف لے آئے۔

حکومتِ وقت کا ایک اور تازیانہ۔ قانونِ توہینِ رسالت کا نفاذ

قانونِ فوجداری ترمیمی ایکٹ III مجریہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے ذریعہ مجموعہِ ضابطہِ فوجداری (Code of Crimonal Procedures) جو ۱۸۹۸ء سے مروج تھا، میں ترمیم کی گئی۔ یہ ترمیم مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کی طرف سے پیش کی گئی تھی اور صدر مملکت جناب جنرل ضیاء الحق صاحب نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو اپنے دستخط کے ساتھ فوری نفاذ کے لیے منظور فرما دی۔ اور یہ ترمیم تعزیراتِ پاکستان (Pakistan Penal Code) کے ایکٹ XLV مجریہ ۱۸۶۰ء کے

سیکشن 295A کے بعد بطورِ سیکشن 295 B اور 295 C داخل کر دی گئی۔

اس نئی ترمیم کی رُو سے یہ قرار پایا کہ کوئی بھی شخص، براہ راست یا اشارہ اور کنایہ سے، زبانی یا تحریری طور پر کسی ایسی حرکت یا الفاظ کے استعمال کا مرتکب پایا گیا، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی یا توہین کا عنصر پایا جاتا ہو یا ایسا کوئی پہلو نکلتا ہو، جس سے گستاخی سرزد ہوتی ہو تو وہ سزائے موت، عمر قید اور جرمانہ کی سزا کا مستحق ہوگا۔ اور یہ بھی ضروری قرار پایا کہ فیصلہ کرنے والی عدالت کا سربراہ مسلمان ہو۔

سیکشن B 295 کی رو سے قرآن کی بے حرمتی کرنے والے کے لیے بغیر وارنٹ گرفتاری، عمر قید اور جرمانہ کی سزا دینا قرار پایا۔ اور توہینِ رسالت کے مرتکب کے لیے بغیر وارنٹ گرفتاری، سزائے موت اور عمر قید اور جرمانہ کی سزائیں دینا قرار پایا۔

اس نئی ترمیم سے، جو بالعموم قانونِ توہینِ رسالت یا Blasphemy Law کے نام سے جانی جاتی ہے۔ بظاہر کوئی بھی فرد، مسلم یا غیر مسلم نعوذ باللہ، ایسے گھناؤنے فعل کا مرتکب پایا جا سکتا ہے۔ مگر درحقیقت اِس نئی ترمیم کا مقصد بھی احمدیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنا تھا۔ کیونکہ مذہب کے اجارہ داروں کی سوچ یہیں تک محدود ہے کہ صرف احمدی ہی توہینِ رسالت کے مرتکب پائے جائیں گے اور اُنہیں تختۂ مشق بنایا جا سکے گا۔

اِس نئے قانون پر بھی جماعت احمدیہ کے پاس اپنے امام کے اِن الفاظ پر کہ ”چارۂ ما بیکساں، جز گریۂ اسحار نیست“، پر عمل کرنا ہی تھا۔ اور ایک بار پھر یہ استغاثہ ’احکم الحاکمین‘ کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

صحت یابی کے بعد حضرت امیر کی لاہور تشریف آوری

لاہور تشریف آوری کے بعد حضرت امیر چند ماہ تک دفتری کام گھر پر ہی انجام دیتے رہے

تھے۔ مشاورتی میٹنگز بھی آپ کی رہائش گاہ پر ہی منعقد کی جاتی تھیں۔ عموماً جنرل سیکرٹری صاحب آپ کے پاس تشریف لا کر معاملات پیش کر کے ہدایات لے لیتے تھے۔

۹ اپریل ۱۹۸۷ء سے آپ باقاعدہ دفتر میں تشریف فرما ہونے لگے۔ پہلے ہی روز اڑھائی گھنٹے تک، بلاتوقف مصروفِ کار رہے اور تھکن کا احساس تک نہ ہوا۔ جلد ہی خطباتِ جمعہ، نمازوں کی امامت، اور جماعتی تقریبات میں شرکت، غرض ہر قسم کے کام اپنے معمول کے مطابق انجام پذیر ہونے لگے، جو آپ کے لیے دِلی سکون اور راحت کا باعث تھا۔ لاہور میں سات ماہ قیام کے بعد آپ دوبارہ ایبٹ آباد تشریف لے گئے تھے۔

حضرت امیر کی ایک تحریر:

> راولپنڈی ۱۷ جون ۱۹۸۷ء۔ وسط نومبر ۱۹۸۶ راولپنڈی میں اپنے بیٹے محمد سعید کے مکان پر دو روز قیام کے بعد لاہور، اُس کی معیت میں پہنچا تھا۔ اور آج ۱۷ جون ۱۹۸۷ء محمد سعید کی معیت میں دوبارہ اُسی گھر میں راولپنڈی پہنچا ہوں۔ سعید مجھے سہولت کے ساتھ لانے کے لیے کل رات لاہور پہنچا تھا۔ اِس اثناء میں محمد سعید کی بعہدہ کرنل ترقی کی منظوری ہو چکی ہے۔ الحمدللہ۔ صحت غالباً اچھی ہوگی اور دماغی کام کی زیادتی کی وجہ سے کمزوری ہونے لگی ہے۔ بہرحال اللہ کا بے حد شکر ہے۔
>
> گذشتہ سات ماہ لاہور کے قیام کے دوران بلا ناغہ نمازِ فجر کی امامت کی سعادت نصیب ہوئی، اور قرآن کریم کا جتنا جز و حفظ ہے اور محض اللہ کے فضل اور رحم سے تا حال ذہن میں محفوظ ہے، جو ثُلث قرآن سے کچھ زیادہ ہے۔ سلسلہ وار ہر نمازِ فجر میں پڑھنے کی توفیق ملی اور یہ تصرفِ الٰہی ہے کہ آج فجر کی نماز، جو اِس دفعہ کی آخری نماز تھی، دوسری بار سورۃ الناس پر پہلی رکعت میں ختم ہوا۔ اِس

میں میری طرف سے کوئی تکلف یا کوشش نہیں ہوئی تھی۔ محض تصرفِ الٰہی سے
ہوا۔ دوسری رکعت میں سورۃ بقرہ کا پہلا رکوع پڑھا۔ نماز کے بعد دوستوں سے
کچھ گفتگو کے بعد دُعا کی گئی اور ملاقات کے بعد رُخصت ہوا۔ الحمدللہ۔

ایک پریشان کُن خبر

آپ ایبٹ آباد میں قیام فرما تھے کہ ۲ جولائی ۱۹۸۷ کو اخبار 'مسلم' میں ایک ایسی خبر شائع ہوئی، جو جماعتِ احمدیہ کے لیے خاصی تشویشناک تھی۔ یہ ایک خفیہ احمدیت دشمن نئی تحریک کے "قہاری زون" کی طرف سے ایک اعلامیہ برائے پریس (Press Release) تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ ۳ جولائی بروز جمعہ، سِول کوارٹرز پشاور کی قادیانی مسجد میں نماز جمعہ نہ پڑھی جائے، ورنہ وہاں حملہ کر دیں گے۔ وہاں اسلحہ کا ذخیرہ ہے۔ اُس ذخیرے کو ختم کیا جائے گا اور وہاں موجود تمام قادیانی قتل کیے جائیں گے۔ اور اُس کے علاوہ اس تنظیم نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ تمام احمدیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ وہ دن جماعت بھر کے لیے پریشانی کا رہا۔ لیکن کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ حکومت کی طرف سے سخت حفاظتی انتظام کر دیئے گئے تھے۔ بعد میں اِس تنظیم نے یہ خبر پھیلا دی کہ چونکہ قادیانی باخبر ہو گئے تھے اور اُنہوں نے اسلحہ کسی اور خفیہ مقام پر منتقل کر دیا تھا، اس لیے فی الحال ایسے اقدامات غیر ضروری تھے۔

دارالسعید کی احمدیہ مسجد کو خطرہ

حضرت امیرؒ کی تحریر سے:

۳ جولائی ۱۹۸۷ء، ۱۱ بجے احمد صادق گھبرایا ہوا آیا کہ اُس کی دُکان پر مردان
کا کوئی نوجوان دو تین بار آ چکا ہے اور مسجد 'دارالسعید' کے بارے میں دھمکیاں
دے گیا ہے کہ وہاں اذانیں دی جاتی ہیں، اور باجماعت نمازیں ہو رہی ہیں

اور کہا کہ مردان کے میجر کا حشر آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا اور اُن کی مسجد کا حال۔ پھر یہ نوجوان مسجد دارالسعید کی سڑک پر وکیل صاحب کے گھر کے پاس موجود رہا۔ احمد صادق آیا تو وہ وہاں کھڑا تھا، اور مسجد کی بات پھر اُس نے کی۔ تھوڑی دیر بعد چلا گیا، پھر آ گیا۔ کسی سے یہ بھی کہا کہ ساتھیوں کے انتظار میں کھڑا ہوں اور عجیب حرکتیں کرتا رہا۔ مسجد کی طرف آنے والی بچیوں سے پوچھتا رہا تم احمد صادق کی بیٹیاں ہو؟ ڈرائیور نواز سے بھی باتیں ہوئیں۔ ۱:۳۰ بجے پاشا آیا تو ابھی وہ لڑکا کھڑا تھا۔ پاشا کو گھر آنے سے پہلے یہ حال معلوم ہو چکا تھا۔ وہ واپس گیا اور کمشنر اعجاز رحیم سے بات کی۔ پولیس کے دو افسر، دو سپاہی آئے۔ وہ لڑکا اُس وقت موجود نہ تھا۔ فون نمبر دیئے گئے۔ چار بجے کے قریب پھر آ گیا۔ پولیس کو فون کی۔ فوراً آ گئے اور اُسے ساتھ لے گئے۔ بعد میں اُسے چھوڑ بھی دیا گیا مگر اس کے بعد کلی طور پر امن رہا۔ الحمدللہ۔ (سعید احمد ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء)۔

انجمن کے حق میں مقدمہ کا فیصلہ

۱۹۸۷ء کے سال کو حضرت امیر نے اپنی زندگی کے ذاتی خانگی اور جماعتی معاملات کے لیے اہم زمانہ قرار دیتے ہوئے، کئی واقعات نوٹ فرمائے ہیں۔ گھریلو طور پر خوشی اور غم، اطمینان اور بے اطمینانی، ساتھ ساتھ رہے۔ اسی طرح جہاں جماعت کے حالات، اندرونی اور بیرونی مسائل، بیرون از ملک جماعتوں کی پریشانیاں اور جنوبی افریقہ کے نئے مقدمہ کا آغاز پریشانی کا سبب بنا رہا۔ وہاں چار سال کے بعد انجمن کے خلاف دائر شدہ مقدمے کا بھی انجمن کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ جو موجبِ راحت و اطمینان ہوا۔

عبداللہ سعید داغِ مفارقت دے گئے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء

سعید احمد کا سعادت مند لختِ جگر، پاک فوج کا فتح نصیب جرنیل و کامیاب و کامران سفارت کار، وطن سے دور، امریکہ کے شہر ہیوسٹن میں، سرطان کے جان لیوا مرض سے جان کی بازی ہار گیا۔

عبداللہ سعید نہایت خوبرو، خوش خصال، خوش پوشاک وخوش گفتار اور مسحور کُن شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے پُرخلوص اور محبت سے لبریز دِل کی وجہ سے حلقۂ احباب میں بے حد مقبول تھے۔ وہ ہر ماحول میں ڈھل جانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ گھریلو ماحول میں وہ مزاج شناس، نرم خو، شفیق اور بے تکلف فرزند، شوہر، والد اور بھائی تھے۔ فرائض منصبی کی ادائیگی میں ایک ناقابل تسخیر چٹان اور اپنے ایمان اور عقائد میں جرأت منداور پر استقلال شخص تھے۔ عبداللہ سعید کی مومنانہ شان کا اظہار مندرجہ ذیل شعر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

۱۹۸۳ء میں عبداللہ سعید کا مرض سرطان تشخیص ہوا تھا۔ آپریشن کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو صحت اور قوت عطا کی تو اُنہوں نے بہت سا وقت خدمتِ دین میں گذار دیا۔ گیانا اور کینیڈا جیسے دور دراز مقامات پر احمدیہ کنونشنز میں شرکت فرمائی اور اِس عرصہ میں دو مرتبہ پاکستان بھی آئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش باش اور زندگی کی اُمنگ سے بھرپور نظر آتے تھے۔ کبھی تکلیف یا فکر کا سایہ تک اُن کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔

اپریل ۱۹۸۷ء میں اُن کا مرض عود کر آیا۔ اطلاع کے لیے اپنے والد کو اپنی میڈیکل رپورٹس بھجوا دیں۔ مگر اُن کی اپنی تحریر سے کسی تردد یا پریشانی کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ حضرت امیر نے

اِس اطلاع کے بارے میں اپنی ڈائری میں یوں تحریر فرمایا:

> ۲۰ مئی ۱۹۸۷ء۔عبداللہ کا خط آیا۔ساتھ ڈاکٹری رپورٹ تھی جو فکرمندی کا موجب ہوئی۔ بیماری active ہوگئی ہے۔فکرمندی ہوئی اور دِل میں دُعا کے لیے درد پیدا ہوا۔عبداللہ کا اپنا خط حسب معمول انتہائی حوصلہ مندی، اورتوکل الی اللہ کا الگ نمونہ تھا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۔ وَهوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ۔ وَهوَ الشَّافِىْ۔

۲۴ مارچ ۱۹۸۸ءکواُن کی تشویشناک حالت کی خبر ملی تو اُن کے جان جی، اپنا درِدِل سب سے چھپائے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں، اپنے پیارے فرزند کی زندگی اور صحت کے لیے عاجزی و تضرع سے دُعائیں مانگتے رہے۔مگر تقدیر مبرم ٹل نہ سکی اور آپ کا فرزند، اِس جہانِ فانی کا مہرِ عالم تاب، زندگی کا سفر عجلت سے طے کرتا ہوا، ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ءکو افقِ بقا پر طلوع ہوگیا۔

والد نے بیٹے کی دائمی جدائی کی خبر سُنی ۔ چند لمحے مُہر بہ لب بیٹھے رہے۔ پھر خدا جانے کون سی غیبی طاقت نے آپ کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔آپ نے وضو کیا، جانماز بچھایا اور نوافل ادا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ حالِ دل اور اپنا سوزِ دروں اُسی ذات کے سامنے رکھا، جو آپ کی واحد راز دان تھی۔ جب اشکوں کے سیلاب سے اپنا غم ہلکا کر چکے تو اپنے گھر کے لوگوں کے پاس آئے، جو سب غم سے نڈھال آپ کے منتظر تھے۔آپ نے باری باری سب کو صبر کی تلقین فرمائی کہ اللہ کی رضا کے سامنے سر جھکا دیں۔آنکھوں کی اشک باری قدرتی امر ہے مگر کوئی شوروغل نہ ہو، کوئی اونچی آواز میں فریاد نہ کرے۔ وہ کچھ دیر سب کے ساتھ رہے۔آنکھوں سے اشک جاری تھے۔مگر لب خاموش تھے۔

آپ کی ڈائری کی تحریر

پہلی سطر میں سُرخ روشنائی سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ تحریر ہے۔ اُس کے بعد لکھا ہے:

اَلْعَیْنَ تَدْمَعُ وَ الْقَلْبَ یَحْزَنَ وَ لَا نَقُوْلُ اِلَّامَایَرْضٰی بِہٖ رَبَّنَا۔ وَ اِنَّا بِفَرَاقِکِ یَا عَبْدُ اللّٰہِ لَمَحْزُوْنَ۔

(میری آنکھیں روتی ہیں اور دِل غمگین ہے مگر میں صرف وہی کہوں گا جس سے میرا رب راضی ہو۔ اور بے شک، اے عبداللہ، ہم تیری جدائی پر غمگین ہیں)۔

اور پھر سُرخ قلم سے لکھا ہے:

اللہ تعالیٰ ہی صبر اور ہمت بخشنے والا ہے۔

عبداللہ سعید کی تدفین ہیوسٹن، امریکہ میں ہوئی۔ یکم اپریل بروزِ جمعہ دارالسلام میں اُن کا جنازۂ غائبانہ ادا ہوا۔ جمعہ کا خطبہ محترم فاروقی صاحب نے دیا۔ نمازِ جمعہ کی امامت ڈاکٹر عبدالکریم سعید نے کی۔ اُس کے بعد حضرت امیر نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی اور مختصر سا خطاب فرمایا۔ مسجد حاضرین اور شرکائے جنازہ سے کھچا کھچ بھرئی ہوئی تھی۔ جماعت کی کثیر تعداد کے علاوہ متعدد غیر از جماعت دوست واحباب شریکِ جنازہ ہوئے۔

صدرِ پاکستان جنرل ضیاءالحق کی تعزیت کے لیے تشریف آوری

حضرت امیر کے لختِ جگر کی تعزیت کے لیے آنے والوں کا ہفتوں تانتا بندھا رہا۔ عزیز واقارب، احباب وخواتینِ جماعت، دوست احباب، عبداللہ سعید کے اپنے ذاتی دوست و مداح اور عساکرِ پاکستان سے تعلق رکھنے والے افراد، پاکستان بھر کے ہر علاقے سے کھنچے چلے آئے

تھے۔ چند اہم شخصیات میں سے جنرل صفدر بٹ، جنرل جیلانی، نواب صادق حسن قریشی، جنرل فضل حق اور سرتاج عزیز صاحب تھے۔ اور پھر بطورِ خاص صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق صاحب اور گورنر پنجاب کی تشریف آوری عزت افزائی اور دلجوئی کا موجب ہوئی۔ صدرِ مملکت، حضرت امیر کی رہائش گاہ واقع دارالسلام پر تشریف فرما ہوئے۔ تعزیتی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھی اور دُعائے مغفرت کی۔ صدر صاحب کچھ دیر تک آپ کے ساتھ رہے۔ چائے اور سادہ لوازمات سے تواضع کے بعد حضرت امیر سے رُخصت چاہی۔

صدر صاحب نے دارالسلام اور گردونواح کی شکستہ سڑکوں کو دیکھا تو جاتے جاتے گورنر صاحب کو اِس طرف فوری توجہ کا حکم دے گئے۔ اور جلد ہی اِس حکم کی تعمیل بھی ہوگئی۔ عبداللہ سعید اِس جہان فانی سے رحلت کے بعد بھی دارالسلام کو فیض پہنچا گئے۔ سُننے میں آیا تھا کہ صدر صاحب نے فرمایا کہ اتنی عظیم شخصیت، جو ایک عظیم شخص کا والد بھی ہے کی رہائش گاہ تک پہنچنے کا راستہ اِس قدر خستہ حالت میں دیکھ کر افسوس ہوا ہے۔

اوجھڑی کیمپ کا المناک قومی حادثہ

۱۰ اپریل ۱۹۸۸ء کو قومی سطح پر ایک بہت بڑا اور المناک حادثہ رونما ہوا۔ صبح دس بجے کے قریب راولپنڈی، اسلام آباد میں ایک قیامت خیز دھماکہ ہوا۔ اوجھڑی کیمپ کے اسلحہ کے ڈپو میں، جہاں ہر قسم کے راکٹ، بم، میزائل اور دیگر آتشیں اسلحہ رکھا ہوا تھا، وہاں ایک فلک شگاف دھماکہ کے ساتھ آگ لگ گئی۔ دھماکہ کی وجہ سے اردگرد کے آٹھ دس میل تک کے تمام علاقہ میں ہزاروں جانیں اور عمارات تباہ و نیست و نابود ہوگئیں۔ قومی سطح پر صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہر پاکستانی اس غم سے نڈھال تھا اور مستقبل کے بارے میں خدشات پیدا ہو رہے تھے۔

فوجی طیارہ کا اندوہناک حادثہ

ابھی اوجھڑی کیمپ کے غم کا مداوا نہ ہو پایا تھا کہ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو تاریخ کا ایک ناقابلِ تلافی اندوہناک حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ سی ۱۳۰ (C-130)، فوجی طیارے کا یہ حادثہ بہاولپور کے قریب ہوا، جہاں صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق صاحب بمع عساکرِ پاکستان کے چیف آف جنرل سٹاف (CGS) جنرل اختر عبدالرحمان، امریکہ کے سفیر اور کئی دوسرے جرنیلوں اور اعلیٰ افسران کے ہمراہ تشریف لے گئے تھے۔ اُنہوں نے وہاں ایک خصوصی فوجی تقریب میں شرکت کی جو نئے ٹینکوں (tanks) کی تجرباتی مشقوں پر مشتمل تھی۔ تمام افسران نے اُسی طیارے سے، جس سے وہاں پہنچے تھے، واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ہوائی اڈے سے پرواز کے آغاز کے چند لمحوں بعد ہی طیارہ فضا میں پھٹ گیا اور اس میں سوار، تیس قیمتی جانوں میں سے کوئی بھی سلامت نہ بچ سکا۔ انہی شہدا میں بریگیڈئر عبداللطیف بھی تھے۔ حادثہ کی خبر شام کے وقت ریڈیو اور ٹیلی وژن سے نشر ہوئی اور ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

بریگیڈئر عبداللطیف شہید

بریگیڈئر عبداللطیف صاحب بھی اُس وفد کے رُکن تھے جو صدرِ مملکت کے ہمراہ بہاولپور گیا تھا۔ وہ جماعتِ احمدیہ لاہور کے، ایک اہم رُکن اور قیمتی اثاثہ تھے۔ وہ ایک ہونہار افسر اور اپنی جماعت میں نہایت مقبول اور ہر دلعزیز بھائی تھے۔ اُن کا وجود حضرت امیر کے لیے بطورِ خاص تقویت کا باعث تھا۔ وہ آپ سے بہت قریب تھے، اور آپس میں دونوں کا عقیدت وشفقت کا تعلق تھا۔ اِس حقیقت کا ذکر امیرِ چہارم ڈاکٹر اصغر حمید صاحب نے اپنے مضمون بعنوان ”حضرت امیر مرحوم ومغفور ڈاکٹر سعید احمد خان“ (پیغام صلح نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء) میں کیا ہے۔ اُنہوں نے تحریر فرمایا:

مکانوں کی تعمیر کے حوالے سے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ میرے ساتھ والا پلاٹ نمبر

۵۸ بریگیڈئر عبداللطیف مرحوم کا تھا۔ اُس سے اگلا پلاٹ نمبر ۵۹ خود حضرت امیر مرحوم کا تھا۔ بریگیڈئر صاحب سے شاید کسی نے کبھی مکان کا سودا کرنے کو کہا تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میں کسی قیمت پر بھی یہ مکان نہ بیچوں۔ اُس کے ایک طرف حضرت امیر ہیں اور دوسری طرف آپ۔ وہ میری بھی عزت کرتے تھے، کیونکہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں، میں نے اُن کی کلاس کو پڑھایا تھا۔

خاندانی لحاظ سے بریگیڈئر صاحب کی حضرت مولٰینا محمد علی امیرِ اوّل سے قرابت داری تھی۔ وہ حضرت مولٰینا کے بھائی کے پوتے تھے۔

۱۷ اگست کی شام کو جماعتِ احمدیہ، ایک بھاری قومی جانی نقصان کے غم کے ساتھ ساتھ، اپنے پیارے بھائی کی دائمی جدائی کے ناقابلِ برداشت غم سے بھی دوچار تھی۔ جمعرات ۱۸ اگست کی شام کو عبداللطیف شہید کی تابوت بندمیت دارالسلام پہنچائی گئی۔ ۵:۳۰ بجے جامعہ دارالسلام کے سامنے لان میں حضرت امیر کی اقتداء میں سات آٹھ سو سے زائد افراد نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ جنازہ میں احبابِ جماعت کے علاوہ سینکڑوں فوجی اور دیگر اعلیٰ افسران شریک تھے۔ بریگیڈئر شہید کو، پورے فوجی اعزاز اور توپوں کی سلامی کے ساتھ رُخصت کیا گیا۔ وہ احمدیہ قبرستان دارالسلام میں آسودۂ خاک ہیں۔

شہادت کے وقت آپ لگ بھگ پچاس سال کے تھے۔ وہ اپنے پیچھے سوگوار بیوہ، کم عمر بیٹا اور بیٹیاں چھوڑ گئے ہیں۔ جنہوں نے اِس غم کو بہت صبر اور حوصلہ سے برداشت کرنے کا مظاہرہ کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

رفیقۂ حیات بی بی اُمِّ کلثوم داغِ مفارقت دے گئیں۔ ۲۰ فروری ۱۹۸۹ء

اللہ تعالیٰ کے بندے سعید احمد کو، اُس کے مولیٰ کی طرف سے ایک اور آزمائش اور امتحان اُس وقت پیش آیا، جب آپ کی زوجہ اُم کلثوم، ستر سالہ رفاقت کے بعد داغِ مفارقت دے گئیں۔ ابھی عبداللہ سعید کی جدائی کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ اُن کی وفات کے وقت اُن کی والدہ ہسپتال میں تھیں۔ اور پیش آمدہ صدمہ سے بے خبر تھیں۔ اور یہ بات باقی سب کے لیے مزید تکلیف کا باعث تھی۔

حسنِ صورت و سیرت سے آراستہ، سلیقہ شعار اور وفا شعار اُم کلثوم (بے بے جی) ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں حضرت امیر سے رشتۂ زوجیت میں منسلک ہوئیں اور ۲۰ فروری ۱۹۸۹ء کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ وہ ڈیڑھ سال تک، بوجہ فالج ہسپتال میں تھیں۔ ستمبر ۱۹۸۷ء میں، جب حضرت امیر بمع اپنی ہر دو رفیقہ ہائے حیات، دارالسعید ایبٹ آباد میں تشریف رکھتے تھے، کہ ایک صبح کو ڈاکٹر عبدالکریم سعید اپنے والد کے کمرے میں آئے۔ وہ اشکبار تھے اور بصد مشکل یہ الفاظ اُن کی زبان پر آئے کہ بے بے جی کو فالج ہو گیا ہے۔ بے بے جی کو سِول ہسپتال ایبٹ آباد میں منتقل کیا گیا اور پھر بہت جلد خاص انتظام سے اُنہیں ریلوے ہسپتال لاہور میں منتقل کر دیا گیا، جہاں اُنہوں نے اپنی بیماری اور تکلیف کے دِن گذارے۔ اِس ہسپتال کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر عبدالحئی سعید اِس ہسپتال سے منسلک رہ چکے تھے۔ اُن کی وجہ سے دیکھ بھال کی اچھی سہولت اور آرام میسر تھا۔ اُن کی تمام تر تیمارداری، آپ کی بیٹی زبیدہ نے بہت حوصلہ اور صبر سے کی۔ وہ ہر وقت اُن کی خدمت میں موجود رہتی تھیں۔ حضرت امیر تقریباً ہر شام وہاں جا کر اُن کے ساتھ وقت گذارتے تھے۔ ۲۰ فروری رات دس بجے، بے بے جی حضرت امیر، اپنے بچوں اور عزیزوں کو سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

حضرت امیر کی ڈائری کی تحریر:

۲۰ فروری ۱۹۸۹ء۔ ۱۰ بجے رات میری رفیقۂ حیات، میری ستر سالہ رفاقت کا حق کمال وفاداری سے ادا کر کے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ رات ۷ بجے عبدالحیٔ بھی آ گئے تھے۔ اور میت اپنے مسکن دار السلام میں لے آئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بے بے جی مرحومہ دُکھ سُکھ، بیماری اور صحت ہر حال میں حضرت امیر کے ساتھ رہیں۔ آپ کی لمبی تپِ دق کی بیماری اور علاج میں نہایت صبر و حوصلے، قناعت اور بُردباری سے زندگی گذاری۔ ۲۱ فروری ۱۹۸۹ء کو اُنہیں اُن کی آخری آرامگاہ، احمدیہ قبرستان دار السلام میں پہنچا دیا گیا۔

والدہ عبدالغفور ثاقب کی وفات

محترمہ بے بے جی کی وفات کو دو ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ حضرت امیر کی چچی محترمہ بی بی زیب النساء رُخصت ہو گئیں۔ اِن دونوں ہستیوں کا زندگی میں ایک لمبے عرصہ تک ساتھ رہا تھا۔ اب اُس جہاں میں جلد ہی ایک دوسرے سے جا ملیں۔ محترمہ بی بی صاحبہ حضرت امیر کے 'کا کا جی' کی زوجہ تھیں، اور آپ اُنہیں 'کا کی' کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ عبدالرحمان اور عبدالغفور ثاقب کی والدہ تھیں۔ آپ کی زوجہ زینب بی بی نے بھی انہی کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ وہ ایک نہایت فیاض اور دردمند دِل رکھنے والی خاتون تھیں۔ خدمت گزاری اور بےنفسی اُن کی خاص خوبیاں تھیں۔ اُن کی تدفین بھی دار السلام کے قبرستان میں ہوئی۔ اُن کے فرزند عبدالغفور ثاقب ایک دوست نواز شخصیت کے حامِل ہیں اور اُن کا حلقۂ احباب نہایت وسیع ہے۔ اِس لیے اُن کی والدہ کے جنازہ میں بےشمار غیر از جماعت افراد بھی شریک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں غریقِ رحمت فرمائے۔ آمین۔

جامعہ احمدیہ مسلم ٹاؤن پر غاصبانہ قبضہ

جمعۃ المبارک ۸ جون ۱۹۹۰ء ۱۱:۳۰ بجے دِن، نامعلوم افراد نے جامعہ احمدیہ مسلم ٹاؤن

پر اپنا قبضہ جما لیا۔ یہ قبضہ ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا، جو ملاؤں اور دیگر شر پسند عناصِر نے اسعد حسین شاہ اور چند دوسرے مفاد پرست افراد کی پشت پناہی سے کیا تھا۔ یہ واقعہ شہر لاہور کے ایک اعلیٰ رہائشی علاقہ مسلم ٹاؤن میں ہوا، مگر ذرائع ابلاغِ عامہ نے اِس کی طرف سے مکمل بے توجہی برتی، اور ملک کے کسی اخبار میں اِس کا ذکر تک نہ کیا گیا۔ جماعت احمدیہ کے لیے یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ اور جماعت پر ٹوٹنے والے مظالم کی ایک اور کڑی۔ مرکزی احمدیہ دفتر سے تمام احباب جماعت کو ایک مفصل خط کے ذریعہ باخبر کر دیا گیا تھا۔

یہ جامعہ، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب نے تعمیر کروائی تھی، جو جماعتِ احمدیہ لاہور کے بانی ممبران میں سے ایک تھے۔ شاہ صاحب مرحوم نے، نہر کے کنارے ایک احمدیہ بستی کا منصوبہ بنایا تھا، اور یہ مسجد اُسی کا حصہ تھی اور اِسے وقف کر کے جماعتِ احمدیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ بعد میں اِس بستی کا نام 'مسلم ٹاؤن' رکھ دیا گیا تھا۔ اِس مسجد کے ساتھ ملحق زمین کا ایک بڑا قطعہ، جو شاہ صاحب کی ذاتی ملکیت تھا، انجمن کے نام ہبہ کر دیا تھا، جہاں انجمن نے ادارہ تعلیم القرآن اور چند عمارات اور دکانیں تعمیر کروالی تھیں۔

اِس تمام جائیداد پر غاصبانہ بالجبر قبضہ کا واقعہ یوں ہوا کہ ۸ جون ۱۹۹۰ء کو ایک ہجوم، ہر قسم کے اسلحہ سے لیس، مخالفانہ نعرے لگاتا ہوا آیا اور جامعہ پر قبضہ کر لیا۔ بیرونی دیوار اور دروازہ توڑ دیا گیا۔ مرکز میں اطلاع ہوئی تو انجمن کے کارکن اور سیکرٹری صاحبان موقع پر پہنچے۔ اِس سے قبل، پولیس سٹیشن وحدت کالونی میں اطلاع کر دی گئی تھی۔ اور اے سی صاحب تشریف لے آئے تھے اور تین چار سپاہیوں کی گارڈ وہاں متعین کر گئے تھے۔ مگر اے سی صاحب کے چلے جانے کے فوراً بعد مولویوں اور بازاری لوگوں نے مکانات پر پتھراؤ شروع کر دیا اور وہاں کے رہائشیوں کو دھمکایا کہ اگر مکانات خالی نہ کیے گئے تو اُنہیں خطرناک نتائج بھگتنا پڑیں گے۔

چودھری فتح محمد عزیز صاحب سے قانونی مشورے کے بعد افسرانِ اعلیٰ سے رابطہ قائم کیا

گیا اور سر براہان حکومت پنجاب کو بذریعہ ٹیلیگرام تمام واقعہ کی اطلاع کر دی گئی۔ قانونی چارہ جوئی کے لیے عدالت میں درخواست بھی دائر کی گئی۔ لیکن گذشتہ سالوں کے واقعات اور مقدمات کی طرح اِسے بھی کسی ادارے نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور کوئی پیش رفت نظر نہ آئی۔ جامعہ احمدیہ تا حال غاصبین کے قبضہ میں ہے۔ اور احبابِ جماعت اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا استغاثہ پیش کرنے کے سوا اور کوئی چارہ جوئی نہیں کر پاتے۔ اللہ تعالیٰ ہی یہ طاقت رکھتا ہے کہ اِس جامعہ کو غاصبین سے رہائی دلوائے۔

کرنل شوکت محمود کی تقرری بطور امام لندن (انگلستان)

کرنل (ریٹائرڈ) شوکت محمود صاحب نے یکم جولائی ۱۹۹۰ء سے 'لندن مشن' کے سربراہ کے طور پر اپنے فرائض سنبھال لیے۔ اُنھوں نے اپنی یہ خدمات اعزازی طور پر انجمن کو پیش کی تھیں اور اِس کے لیے کسی قسم کا کوئی حقِ خدمت قبول نہ فرمایا تھا۔ کرنل شوکت صاحب نے ۱۹۷۴ء کے سانحات کے زمانہ میں بذریعہ خط حضرت امیر سے اِس ارادہ کا اظہار کیا تھا، کہ وہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنا وقت انجمن کے لیے وقف کر کے خدمتِ دین کریں گے۔

لندن کے امام محمد انور صاحب کی شہادت کے بعد، ہنگامی صورتِ حال میں، کرنل شوکت محمود صاحب کو امریکہ سے لندن بلوایا گیا تھا، تا کہ وہ محمد انور صاحب کی شہادت سے وہاں پر جو خلاء پیدا ہو گئی تھی اُسے پُر کر سکیں۔ کرنل صاحب ایک سال وہاں مقیم رہے اور بلا معاوضہ تمام خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ مگر اُن کی بینائی کم ہو جانے کی وجہ سے اُنہیں بغرضِ علاج امریکہ واپس جانا پڑا تھا۔ کرنل صاحب کے وہاں سے چلے جانے کے بعد شیخ شریف احمد صاحب وہاں بطورِ امام مقرر ہوئے اور وہاں خدمات انجام دِیں۔ اب وہ پاکستان آ چکے تھے اور وہاں کے حالات اِس بات کے متقاضی تھے کہ وہاں کے لیے کوئی قابل امام مقرر کیا جائے۔ کرنل شوکت صاحب پر سب کی نظر تھی اور بالاتفاقِ رائے تمام ممبرانِ مجلسِ معتمدین، اُنہیں لندن میں امام مقرر کر دیا گیا۔ کرنل صاحب ہمیشہ دین کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہتے تھے اور دینی خدمت کے لیے وہ کبھی کسی معاوضہ کے

خواست گار نہ تھے۔ انجمن کے اِس فیصلے کو اُنہوں نے برضا و رغبت قبول فرمایا اور امریکہ سے 'دارالسلام' لندن تشریف لا کر مشن کا چارج سنبھال لیا۔

ڈاکٹر عبدالحیٔ سعید کا اغوا

حضرت امیر کے صبر کا ایک کڑا امتحان عبدالحیٔ سعید کے اغوا کی صورت میں پیش آیا۔ یہ اغوا ۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ء کو صوبہ سندھ میں گلارچی کے قریب واقعہ 'سعید فارم' سے ہوا۔ حضرت امیر نے، جنرل ایوب خان کے دور میں صوبہ سندھ میں چند مربع اراضی خریدی تھی اور وہاں پر 'سعید فارم' کے نام سے آبادکاری کی تھی۔ ابتدائی زمانے میں حضرت امیر وہاں کثرت سے تشریف لے جاتے اور کام کی نگرانی فرماتے تھے۔ آپ کے فرزندان اپنی اپنی رُخصت کے زمانہ میں کچھ دن وہاں ضرور گذارتے تھے۔ جب ڈاکٹر عبدالحیٔ سعید مستقل طور پر کراچی میں رہائش پذیر ہو گئے تو فارم کی تمام ذمہ داری اُنہوں نے سنبھال لی، اور فارم پر جانا اُن کے معمولات میں شامل ہو گیا۔ وہ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۰ء کو وہاں تشریف لے گئے تھے۔ اگلی صبح فارم کے ملازمین نے اُنہیں اطلاع کی کہ ایک گاڑی میں قریب کے علاقہ سے چند افراد آئے ہیں۔ ایک مریض سخت تکلیف میں ہے، اُسے دکھانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُنہیں اندر کمرے میں بلا لیا۔ اِس ڈرامے کا مریض سخت کراہ رہا تھا اور درد سے بے حال تھا۔ دوسرے دو افراد اُسے سہارا دے کر اندر لائے اور بستر پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر صاحب جھک کر معائنہ کرنے لگے، تو دوسرے دو ساتھیوں نے اُنہیں پشت کی طرف سے پکڑ کر مضبوطی سے جکڑ لیا، اور موقعہ پر موجود ملازمین کو پستول دکھاتے، دھمکاتے، گاڑی میں سوار ہو کر بمع اپنے قیدی کے فرار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں پر ایسا چشمہ لگا دیا گیا تھا کہ اُنہیں کچھ نظر نہ آتا تھا کہ وہ کس سمت میں جا رہے ہیں۔ فارم پر موجود سواری کے ٹائر پنکچر کر دیئے گئے تھے اور کوئی تعاقب نہ کر سکا تھا۔ بعد میں ملازمین نے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کروائی اور اُن کے گھر پر اطلاع پہنچائی۔

لاہور میں ڈاکٹر عبدالحئی سعید کے اغوا کی خبر ۲۸ ستمبر کی شام کو ہو گئی تھی۔ مگر اُس وقت حضرت امیر کو یہ اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا گیا۔ اگلے روز اخبار میں بھی خبر چھپ گئی، تو آپ کی دُختر زبیدہ نے، دِل مضبوط کر کے آپ سے بات کرنے کا حوصلہ دکھایا۔ ابھی عبداللہ سعید کی دائمی جدائی کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا، اور اب یہ خبر آپ پر پہاڑ بن کر ٹوٹی۔ مگر اُن کا حوصلہ اور صبر کسی مضبوط پہاڑ سے بھی مضبوط تر تھا۔ اُس دن اُن کے نوکِ قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اُن کی ڈائری میں محفوظ ہیں:

لَّنۡ يُّصِيۡبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوۡلٰٮنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ۔ (ہم کو ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیئے)۔ (التوبہ ۹:۵۱)۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ۔

عبدالحئی سعید کی قیدِ تنہائی ایک جھونپڑی نما مکان میں تھی، جہاں رات دِن ایک سی تاریکی رہتی تھی۔ کبھی کبھار کاٹھ کباڑ کی چھت کی کسی درز سے، کوئی ٹمٹماتا تارہ نظر آتا تو اُنہیں معلوم ہوتا کہ رات ہو گئی ہے۔ اُن کے اغوا کنندگان، اُن کی درخواست پر ایک بالٹی پانی کی اُن کے لیے مہیا کر دیتے تھے، جس سے وہ غسل بھی کر لیتے اور باوضو نمازیں بھی ادا کر سکتے تھے۔ جب اُنہیں ملیریا ہو گیا تو اُن کی اپنی تجویز کردہ ادویہ اُنہیں منگوا دیں۔ ورنہ اُن کے لیے اور کوئی سہولت میسر نہ تھی۔

ڈاکٹر عبدالحئی سعید کی اِس قید کا، کہ جس کا انجام جانے کیا ہو گا، یا ہو سکتا ہے۔ اُن کے والد کو مضطرب رکھتا تھا۔ وہ اکثر رات کی تنہائی میں، جامعہ میں وضو خانے کے سامنے راستے پر پہروں ٹہلتے رہتے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا استغاثہ پیش فرماتے۔ اور دُعائیں مانگتے رہتے تھے کہ اُن کا نورِ نظر اُن کے سامنے آ کر اُن کی نگاہوں کو ٹھنڈک بخشے۔ دُعاؤں کی قبولیت کی گھڑی ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ء کی صبح، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہو چکی تھی، اور یہی وقت عبدالحئی سعید کی بازیابی کا تھا۔

حضرت امیر کی تحریر:

آج ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ء چار بجے صبح جاگا تو سورۃ الملک کی پہلی دو آیات بے ساختہ زبان پر جاری ہو گئیں۔ میں بار بار یہ آیات پڑھتا رہا۔ یہی آیات ۱۱ جون ۱۹۷۴ء سانحہ ایبٹ آباد کی فجر کو پڑھتے جاگا تھا۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۨ ۝۱ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ ۝۲

وہ ذات بابرکت ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے۔ (الملک ۶۷: ۱۔۲)

دس بجے کے قریب سلیمہ (دُختر عبدالحیٔ سعید) کا کراچی سے فون آیا کہ عبدالحیٔ کی رہائی کا بندوبست مکمل ہو گیا ہے۔ آج شاید کراچی آ جائے گا۔ ایک ماہ سولہ دن کی ظالمانہ قید کے بعد یہ رہائی، الحمدللہ۔ کس زبان سے تیرا شکر ادا کیا جائے۔

میں نے ٹیلی فون پر یہ آیات سُنائیں اور اُن کا انگریزی ترجمہ اُسے لکھوایا اور اُسے ہدایت کی کہ جونہی عبدالحیٔ پہنچے، پہلی فرصت میں اُسے میرا پہلا پیغام، اِن دو آیات کی تلاوت اور انگریزی ترجمہ سنا کر میرا سلام دینا۔ اِن میں خدا کی طرف سے گویا اس پیغام کی تحریک سمجھی۔

چند دنوں بعد عبدالحیٔ نے فون پر مجھے بتایا کہ یہ پیغام اُسے مل گیا تھا اور یہ واقعی

اللہ کے تصرف سے ہے، کیونکہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ء کی صبح ٹھیک ۴ بجے اُنہیں ایس۔ پی موسٰی نے اپنے عزیزوں کے سپرد کر دیا تھا۔ سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

حضرت امیر کی ۳۰ ستمبر کی ایک تحریر:

کی حال سناواں دل دا   کوئی محرم راز نہ مل دا

(غلام فرید)

رَبّا میرے حال تو واقف توں۔ (شاید یہ مصرع حسین فقیر کا ہے)

چھیالیس دِن کے اس عرصہ میں حضرت امیر کی عاجزانہ تضرع کے ساتھ اہل خاندان اور احبابِ جماعت کی دُعائیں بھی شامل تھیں۔ محترمہ نسرین گل صاحبہ کی تحریک پر دارالسلام کی مستورات ہر صبح جامعہ میں آ کر نوافل ادا کرتیں اور اجتماعی طور پر اپنے امیر کے فرزند کی بازیابی کے لیے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتی رہیں۔

۱۷ نومبر ۱۹۹۰ء کو حضرت امیر نے یہ یادداشت، سپردِ قلم کی:

عبدالحئی سعید کا سانحہ اپنے فارم گلارچی سے اغواء، بروزِ جمعہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ء صبح سویرے کیا گیا۔ اور کراچی کے اپنے گھر بعد از رہائی واپسی ۲:۳۰ بعد دوپہر بروز سوموار ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ء، ۴۶ روز کی اذیت ناک زندگی کے بعد ہوئی۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾

(پس اللہ کے لیے ہی سب تعریف ہے (جو) آسمانوں کا رب اور زمین کا رب، سب جہانوں کا رب ہے، اور اُسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں بڑائی ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ (الجاثیہ ۴۵:۳۶۔۳۷)۔

ایک ایمان افروز واقعہ

ہمارے بڑے لالہ (عبدالحئی سعید) نے اپنے اغوا کے حوالے سے یہ ایمان افروز واقعہ خود مجھے سُنایا تھا۔ اُن کے اِن ایامِ بلا میں، جو شخص اُن کی ضروریاتِ خوردونوش مہیا کرتا تھا، ایک دن اُس سے لالہ نے کہا کہ اگر وہ اُن کی وہاں سے رہائی میں مددگار ہو تو وہ انعام میں اُس کے لیے بہت کچھ کریں گے۔ اُس نے خاموشی قائم رکھتے ہوئے سَر کی جنبش سے انکار کیا۔ شاید اُسے اذنِ گفتگو نہ تھا۔ لالہ نے اُس سے کہا: ”مجھے یقین ہے کہ میں جلدی رہائی پائوں گا، مگر تم یہ یاد رکھنا کہ وہ قادرِ مطلق ایک دن تمہیں میرے قدموں میں ضرور گرائے گا۔“

رہائی کے بعد عبدالحئی سعید نے ایک پولیس افسر سے کہا کہ جرائم پیشہ لوگوں میں اگر اس حلیے کا شخص کبھی بھی گرفتار ہوا تو مجھے ضرور اطلاع کرنا۔ اُس کی خاص نشانی یہ بتائی کہ قدرے لنگڑا کر چلتا ہے۔

آخر وہ دِن آ ہی گیا۔ لالہ کلینک میں مصروف کار تھے، کہ وہ

پولیس افسر اندر داخل ہوئے اور کہا "آپ کا مجرم حاضر ہے" اور اگلے ہی لمحے وہ شخص جو پولیس افسر کے ہمراہ آیا تھا، لالہ کے قدموں پر سر رکھے اپنی جان کی معافی کے لیے گڑگڑا رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا۔ یہ ذکر لالہ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر کیا تھا۔ (صفیہ سعید)

خلیجی جنگ ۱۹۹۱ء

۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ اور اُس کے نتائج سے دُنیائے اسلام میں جس پُرآشوب دور کا آغاز ہونے کو تھا، اُسے حضرت امیرؒ اپنی بصیرت سے اُس وقت محسوس کر رہے تھے۔ آپ کو اِس بات کا اِدراک تھا کہ انسان خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں۔ آپ کے دِل میں انسانیت اور اسلام کی محبت کا ایک جوش تھا، جو آپ کو بے چین کرتا تھا اور آپ اپنی نیم شبی عبادات میں مصروفِ دُعا رہتے تھے۔ اِس سلسلے میں ۱۵ فروری ۱۹۹۱ء کے پیغامِ صلح کے شمارے میں آپ نے "احبابِ جماعت کے نام" ایک پیغام میں دُعا کے لیے ایک پُردرد اپیل کی، جو مندرجہ ذیل ہے:

میرے محترم بھائیو اور بہنو،

السلام علیکم۔

جماعت کے سب احباب وخواتین کے نام، جہاں بھی وہ ہوں، میرا یہ پیغام ہے کہ وہ میرے ہم نفس ہو کر بارگاہِ الٰہی میں گریہ وزاری کریں۔ اور اس کے خاص الخاص رحم و کرم کے طالب ہوں۔ آپ میں سے کسی سے بھی، یہ امر مخفی

نہیں کہ آج بنی نوع انسان بڑے پرآشوب دور سے گذر رہا ہے۔ انسان نے انسان کے خلاف جہنم کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ اس وقت مجھے خلیجی جنگ کے اسباب وعوامل پر بحث نہیں، تاہم روزمرہ واقعات سے افسوسناک نتیجہ ظاہر ہے کہ مسلم امہ کے مفادات پر کاری ضرب لگ رہی ہے۔ طاقتور قوتیں اس میدان کارزار میں New World Order یعنی نئے نظامِ عالم کے خواب دیکھنے لگی ہیں، جو مسلم اُمّہ کے لیے انجام کار کسی بھی صورت میں خیروبرکات کا موجب نہیں۔

اس وقت جان و مال کا اتلاف جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی، ہمارا اپنا اتلاف ہے۔ اس سانحہ والمیہ پر ہمارے دل بہت رنجیدہ اور مضطرب ہیں کیونکہ جہاں آج کل ہلاکت خیزی کا دور دورہ ہے وہاں کے خطہ اور دیار کے رہنے والوں سے ہمیں دلی وابستگی ہے۔ چند ہی روز پہلے جو زلزلہ آیا اس کی تباہی اور آج کل ملک کے بعض علاقوں میں جو بارشیں ہو رہی ہیں اس کی بربادی اس امر کا نشان ہیں کہ زمین وآسمان کی دیگر آفتوں نے بھی اپنے منہ کھول لیے ہیں۔ جن سے معاش ومعیشت کے سینکڑوں مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں زمین پر رہنے والوں کے طرح طرح کے فسادوں نے جرائم میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے اور ان کی عمومی سفلی خواہشوں نے گناہ در گناہ کو فزوں تر کر دیا ہے۔ ان سب کا باعث اللہ تعالیٰ سے دوری اور اس کی اطاعت سے روگردانی ہے۔

اس پریشاں حالی میں میرا خیال بار بار بانی سلسلہ احمدیہ کے اس ارشاد کی طرف جاتا ہے:

آنکھ کے پانی سے یارو کچھ کرو اس کا علاج
آسماں اے غافلو! اب آگ برسانے کو ہے

لہذا اے میری جماعت کے بھائیو اور بہنو! ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم نہایت تضرع و الحاء کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں جھکیں اور گریہ زاری کریں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کے حضور گڑگڑائیں کہ دعا ہی آج اس عالم گیر ابتلاء کے دور کی دوا ہے۔ بقول بانی سلسلہ احمدیہ:

اندریں وقت مصیبت چارہ ما بے کساں
جُز دعائے بامداد و گریہ اسحار نیست

(اس مصیبت کے وقت ہم غریبوں کا علاج سوائے صبح کی دعا اور سحری کے رونے کے اور کچھ نہیں)۔

دعا ایک زبردست ہتھیار ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے مہلک ہتھیاروں سے بھی بڑھ کر۔ اس موثر ہتھیار سے انبیاء کرام، اولیاء اللہ، ہمارے بانی سلسلہ اور ہمارے بڑے بزرگوں نے بھی اس ہتھیار سے کام لیا ہے۔ لہذا آپ سے میری عاجزانہ اور دردمندانہ استدعا ہے کہ، کارآزمودہ ہتھیار سے کام لیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو اور آپ کی اضطراری دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔

والسلام

آپ کا عاجز دینی بھائی

سعید احمد

دارالسلام کالونی لاہور

گنج ہائے گراں مایہ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

جماعت احمدیہ لاہور اعداد و شمار میں کثیر نہ سہی، مگر اس کے افق پر ایسے ضوفشاں ستارے طلوع ہوتے رہے ہیں کہ جن کی ضیائے علم و آگہی نے اِک عالَم کو پُرنور بنا دیا تھا۔ مگر اِس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اِن رہنما ستاروں میں سے جو بھی اپنے مقام پر نہ رہا، اُس کی جگہ خالی ہی رہی۔ اس دورِ قحط الرجال میں، جب امیرِ قوم ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے جماعتِ احمدیہ کی باگ ڈور سنبھالی، ایک ایک کر کے کئی قیمتی نفوس اِس جہاں سے رُخصت ہو گئے۔ حضرت امیر کو اپنے قلتِ انصار اور پھر اِس میں بڑھتی ہوئی کمی کا بے انتہا احساس تھا۔ اور جب بھی آپ کے اِن رفقاء میں سے کوئی رُخصت ہو جاتا تو آپ اس کی کمی کو بے انتہا محسوس فرماتے۔

۱۹۸۵ـ ۱۹۹۴ء کے عرصہ کے دوران رُخصت ہو جانے والوں میں سب سے پہلے بزرگ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب تھے۔ پھر حافظ شیر محمد صاحب، میاں نصیر احمد فاروقی صاحب اور پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب یکے بعد دیگرے چل بسے۔

ڈاکٹر اللہ بخش صاحب

۲۷ جولائی ۱۹۸۵ء کو جب حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان کو اپنے دیرینہ دوست اور ساتھی ڈاکٹر اللہ بخش صاحب کی وفات کی اطلاع ملی، تو اُس وقت کے اپنے احساسات کو قلم بند کرتے ہوئے آپ نے پیغام صلح کے لیے اپنے مضمون بعنوان "ڈاکٹر اللہ بخش صاحب مرحوم و مغفور" میں تحریر فرمایا:

یہ خبر سُن کر میرے دل و دماغ پر جو گذری اور جو مجھے صدمہ ہوا ہے اسے الفاظ

میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں اس کی برداشت اور صبر کی توفیق اپنے رب سے ہی مانگتا ہوں اور اپنے جدا ہونے والے بھائی کے لیے یہی دعا مانگ سکتا ہوں کہ رَبِّ اغْفِرْہُ وَارْحَمْہُ وَاَدْخِلْہُ فِیْ عِبَادِکِ الصَّالِحِیْنَ الَّذِیْنَ لَا خَوْفُ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْن۔

اس وقت ہماری جماعت جن مشکلات اور مصائب میں سے گذر رہی ہے ان کو سامنے رکھتے ہوئے جب میں سوچتا ہوں کہ گذشتہ چند ہی سالوں میں ہم سے ہمارے بڑے قیمتی اور صاحب علم بزرگ یکے بعد دیگرے جدا ہوتے چلے گئے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کی جدائی کا غم اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ مگر ہم اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سے راضی اور خوش ہیں۔

ع چل نہیں سکتی کسی کی کچھ قضا کے سامنے۔

ڈاکٹر اللہ بخش صاحب سے حضرت امیر کی رفاقت کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے زمانۂ طالب علمی سے تھی۔ کالج کے ہاسٹل میں دِن رات کا ساتھ تھا۔ نماز روزے کا ساتھ تھا۔ احمدیہ بلڈنگس کی مجالس ومحافل کا ساتھ اور سب سے بڑھ کر بزرگوں کی ہم نشینی اور صحبت سے حصولِ فیوض و برکات کا ساتھ تھا۔ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب ایک باعلم و باعمل شخص تھے۔ اُنہوں نے بحیثیت مجلسِ منتظمہ اور مجلسِ معتمدین کے ممبر اور بحیثیت جنرل سیکرٹری گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ تقریر و تحریر ہر دو میں یکتا اور منفرد تھے۔ وہ نہایت نڈر اور مخلص احمدی تھے۔ وہ نہایت مضبوط ارادوں کے مالک اور بااصول انسان تھے اُنہوں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا اور حق کے لیے آواز اٹھائی۔

حضرت امیر کی تحریر سے اقتباس:

ڈاکٹر صاحب اپنے جس نقطہ نظر اور مؤقف کو اپنے خیال کے مطابق درست

سمجھتے تھے اس پر وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔لیکن اپنے خیال کے خلاف جب کبھی حق بات ان کی سمجھ میں آ جاتی تو اس کی تائید میں چٹان کی طرح ڈٹ جاتے اور اس کی مخالفت کرنے والے کا ناطقہ بند کر دیتے تھے۔

۱۹۷۴ء کے ابتلاء میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی جرأت کا مظاہرہ فرمایا۔ وہ اُن چند ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے جماعت کے نام کی تبدیلی کی تجاویز کو مسترد کرنے میں ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کا بھرپور ساتھ دیا اور فرمانے لگے کہ جس دِن ہم نے یہ نام ہٹایا ہم ختم ہو جائیں گے۔

حضرت امیر نے اپنے مذکورہ بالا مضمون کا اختتام اِس عبارت سے کیا ہے:

اپنے اس محترم بھائی کی جدائی سے جو غم اور دُکھ مجھے ہوا ہے اسے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ میرے لیے وہ خاص کر تقویت کا باعث تھے کیونکہ وہ بااصول انسان ہونے کی وجہ سے انجمن کی اکثریت سے کیے گئے فیصلوں کے پابند تھے اور مرکز سے وفاداری کو وہ جزو ایمان سمجھتے تھے۔

میری دعا ہے اللہ تعالیٰ میرے مرحوم بھائی کی مغفرت فرمائے۔ ان کے درجات بلند کرے اور اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین۔

ڈاکٹر اللہ بخش صاحب کی وفات اور تدفین انگلستان میں ہوئی۔

حافظ شیر محمد صاحب خوشابی

ایک گراں قدر شخصیت، ایک عالم بے بدل جو اکتوبر ۱۹۹۰ء میں داغِ مفارقت دے گئے، وہ محترم جناب حافظ شیر محمد صاحب خوشابی تھے۔قرآن وحدیث اور حضرت مسیح موعود کی کتب

پر انہیں مکمل عبور حاصِل تھا۔ اس لیے اِن موضوعات پر اُن کی مدلل گفتگو اور بحث وتمحیص میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ جماعت کے افراد اُن کے گرویدہ تھے اور ایک عالَم اُن سے متاثر تھا۔ اُنہوں نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کئی مقامات پر بطور مبلغِ اسلام، گراں قدر خدمات انجام دیں اور ہر جگہ پر کامیابی وکامرانی نے اُن کے قدم چُومے۔ مگر جو فتحِ مبین اُن کے ہاتھوں جماعتِ احمدیہ لاہور کو جنوبی افریقہ کے مشہور مقدمات میں حاصِل ہوئی، وہ ایسا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے جو تاریخ احمدیت میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ 'ختم نبوت' کے موضوع پر اُن کی تحریرات وتقاریر، بحث ودلائل کا توڑ کسی کے پاس نہ تھا۔ بڑے بڑے علماء ومفکرین اُن کے سامنے میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ 'وفاتِ مسیح' اور 'لا نبی بعدی' آپ کی ایسی لازوال تحریرات ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا باعث ہوں گی۔

حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب حافظ صاحب کو بہت قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ حافظ صاحب کی اُس کامیابی پر، جو اُنہیں جنوبی افریقہ میں حاصِل ہوئی، آپ کو بے حد فخر تھا۔ آپ حافظ صاحب سے ملاقات کے مشتاق رہتے تھے اور اُن سے اکثر موضوعات پر تبادلۂ خیال فرماتے تھے۔ محترم حافظ صاحب کی وفات سے جماعت ایک عالِمِ بے بدل سے محروم ہوگئی، جس کا صدمہ بے حد گہرا تھا۔ مگر رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے، اِس گوہرِ بے بہا کو دارالسلام کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

جب حافظ صاحب کی وفات ہوئی، اُس وقت وہ جماعتِ احمدیہ لاہور کے نائب صدر تھے۔

میاں نصیر احمد فاروقی صاحب

حافظ شیر محمد صاحب کی دائمی جدائی کے صدمے کے زخم ابھی مندمل نہ ہو پائے تھے کہ دسمبر

۱۹۹۱ء میں میاں نصیر احمد فاروقی صاحب کی رحلت سے امیرِ قوم اور جماعتِ احمدیہ ایک مخلص انسان اور علم و افضال کے قیمتی خزانہ سے محروم ہو گئے۔ میاں نصیر احمد، ڈاکٹر بشارت احمد کے چھوٹے فرزند تھے۔ عشقِ قرآن اور تفہیم و بیانِ قرآن اُنہوں نے اپنے والد سے ورثہ میں پائے تھے جسے حضرت مولٰینا محمد علی کی صحبت اور توجہ نے جلا بخشی۔ سلسلۂ احمدیہ سے وارفتہ لگاؤ اور حضرت مرزا صاحب سے رشتۂ محبت و وفا بھی انہی شخصیات کی صحبت سے آپ کو ودیعت ہوا۔

میاں نصیر احمد صاحب فاروقی کو اللہ تعالٰی نے اعلٰی دُنیاوی مناصب سے نواز رکھا تھا۔ دورِ برطانیہ میں بمبئی کے سرکاری ایوانوں کے بعد پاکستان کے اُس وقت کے دارالخلافہ کراچی اور پھر اسلام آباد کے ایوان صدارت تک وہ اعلٰی سے اعلٰی تر مناصب پر فائز رہے۔ اِن تمام ادوار میں، اور ہر مقام پر اُنہوں نے احمدیت کی شمع کو روشن کیے رکھا اور احباب، پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو کر علومِ قرآنی سے فیض پاتے رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ نے لاہور کو محض اس لیے اپنا مسکن بنانا پسند فرمایا تا کہ مرکز سے وابستہ رہ کر خدماتِ دینیہ سرانجام دے سکیں۔ لاہور میں سکونت اختیار کرنے کے معاً بعد پہلے گھریلو سطح پر، پھر مسلم ٹاؤن کی جامعہ آپ کے درسِ قرآن کا مرکز بنی رہی۔ جب دارالسلام کی جامعہ آباد ہوئی تو درسِ قرآن وخطبات جمعہ میں سامعین، اُن کے معارفِ قرآنی سے مستفید ہوتے رہے۔ فاروقی صاحب معارفِ قرآنی کا ایک بحرِ بے کراں تھے۔ آپ کے بیان کردہ معارف اب کتابی صورت میں طالبانِ علم کی تشنگی بجھانے کا سرچشمہ اور اُن کی حیاتِ جاودانی کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب اور میاں نصیر احمد فاروقی صاحب کے درمیان دیرینہ دوستانہ مراسم اور ایک خاص تعلقِ خاطر ہمیشہ استوار رہا۔ فاروقی صاحب کے زمانۂ ملازمت میں، ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب جب بھی کراچی، لاہور یا اسلام آباد تشریف لے جاتے تو فاروقی صاحب کے دولت خانہ پر اُن سے ملاقات فرماتے تھے۔ ایسے مواقع پر فاروقی صاحب دعوتِ طعام کا خاص اہتمام

فرماتے تھے۔ اسی طرح جب فاروقی صاحب ایبٹ آباد میں تشریف فرما ہوتے تو بالالتزام آپ سے ملاقات فرماتے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب آپ کے اعزاز میں اہتمام ضیافت فرماتے تھے۔ اگرچہ فاروقی صاحب کا قیام اپنی ہمشیرہ محترمہ حامدہ رحمان صاحبہ کے یہاں ہوتا تھا، مگر وہ جامعہ احمدیہ ایبٹ آباد کو کثرت سے رونق بخشتے تھے، اور جماعت کو اپنے درسِ قرآن اور خطبات سے مستفید فرماتے تھے۔

جب ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب لاہور تشریف لے آئے، تو میاں نصیر احمد صاحب سے دیرینہ مراسم کا سلسلہ اُسی طرح قائم رہا۔ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کو بطور سینئر نائب صدر اور پھر امیرِ جماعت احمدیہ فاروقی صاحب کی بھرپور حمایت و تعاون حاصل رہا۔ بیرونی جماعتوں کے معاملات ہوں یا اندرونِ ملک جماعتی مسائل، فاروقی صاحب بطور سینئر نائب صدر آپ کے شانہ بشانہ چلتے رہے، اور اپنے وجود سے امیرِ قوم کو تقویت پہنچاتے رہے۔ نجی محافل ہوں یا جماعتی اجلاس آپ دونوں کا تشخص منفرد اور ممتاز ہوتا تھا۔ اور حاضرین آپ سے متاثر دکھائی دیتے تھے۔

میاں نصیر احمد فاروقی اپنی وفات سے چند ہفتے قبل بغرض علاج سروسز ہسپتال میں داخل تھے۔ حضرت امیر تقریباً روزانہ اُن کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کا وقتِ رخصت مقرر ہو چکا تھا۔ اور سروسز ہسپتال ہی میں آپ کی وفات ہوئی۔

میاں نصیر احمد فاروقی صاحب نے اِس دارِفانی سے رحلت سے قبل علاقہ شادمان لاہور میں واقع اپنی شاندار رہائش گاہ احمدیہ انجمن لاہور کے نام وصیت فرما دی تھی، جس کے اجر کے طور پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت الفردوس میں یقیناً اعلیٰ و ارفع مقامِ جاودانی عطا فرمایا ہوگا۔ اِس جہانِ فانی میں آپ کی آخری آرام گاہ دارالسلام کا قبرستان ہے۔

محترم نصیراحمد فاروقی کی اہلیہ محترمہ سلیمہ فاروقی صاحبہ اپنے مرحوم شوہر کی دوستانہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے عیدین اور دیگر مواقع پر مٹھائی اور پھل وغیرہ، بطور تحفہ حضرت امیر کو بھجوایا کرتی تھیں۔ جسے آپ نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ مسز فاروقی صاحبہ سنتِ رسول پر عمل کر رہی ہیں۔ حضرت نبی صلعم بھی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ کی سہیلیوں کو تحائف بھیجا کرتے تھے۔

حضرت امیر اور فاروقی صاحب کی باہمی محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ کسی موقع پر حضرت امیر کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے کہ فاروقی صاحب کے پہلو بہ پہلو دفن ہونا بھی خوش‌نصیبی ہو گی۔ یہ بات محترمہ سلیمہ فاروقی کے کانوں تک بھی پہنچی تو انہوں نے حضرت امیر کو اُس جگہ کی پیشکش کر دی، جو وہ اپنے لیے مخصوص کروا چکی تھیں۔ حضرت امیر اُن کے اس جذبۂ ایثار سے بے حد متاثر ہوئے مگر فرمایا: ”فاروقی صاحب کے قرب کا پہلا حق آپ کا ہی ہے۔ مجھے تو فاروقی صاحب کے قدموں میں جگہ مل جائے تو وہ بھی میری خوش نصیبی ہو گی“۔

پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب

۲۳ جنوری ۱۹۹۴ء کو سلسلہ احمدیت کا ایک اور روشن چراغ بجھ گیا۔ پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب اِس دارِفانی سے رُخصت ہو گئے۔ اُن کی جدائی کئی دِلوں کے لیے حزن و ملال کا سبب تھی۔ حضرت امیرؒ کے لیے اُن کی جدائی ایک بھائی کی جدائی جیسی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اُسی گھر میں اُنہی بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی، جن کی اولاد ہونے کا شرف ڈاکٹر سعید احمد خان کو نصیب ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب کے دِل پر بھی اُسی بام سے وہ نُور برسا تھا، جس نے حضرت امیرؒ کے دل میں دین کی محبت کا چراغ روشن کیا تھا۔ خلیل الرحمٰن صاحب اِس خاندان کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ بزرگوں اور ہم عمروں کے لیے 'خلیل' اور اپنے سے چھوٹوں کے لیے 'خلیل پاجی' تھے، (پاجی 'ہندکو' برائے بھائی جی)۔

پروفیسر صاحب محکمۂ تعلیم سے منسلک تھے اور مختلف مقامات پر تعینات رہے۔ مگر اپنی لمبی تعطیلات میں وہ ہمیشہ ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے گھر تشریف لایا کرتے تھے اور نہایت محنت اور لگن سے آپ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کرتے تھے۔ آپ کی تمام اولاد کو 'خلیل پاجی' کی شاگردی سے فیض یاب ہونے کا موقعہ ملا ہے۔ وہ آپ کے خاندان کے ہر فرد سے بے لوث محبت کرتے تھے۔ اسی طرح خاندان کے بچے بچے کے دِل میں 'خلیل پاجی' کے لیے بے حد محبت، احترام و عقیدت ہے۔

وہ حضرت امیر کے اُن مخلص دوستوں میں سے تھے جو آپ کے ہر دُکھ سُکھ کے ساتھی تھے۔ ایبٹ آباد میں پروفیسر صاحب کی سکونت آپ کے پڑوس میں تھی۔ ۱۹۷۴ء کے ابتلاء میں وہ ثابت قدم رہے، اور آپ کے جلو میں ہجرت فرما کر لاہور منتقل ہو گئے۔ یہاں پیغام صلح کی ادارت اُن کے سپرد ہوئی، جسے وہ چند سال تک بخوبی نبھاتے رہے۔ پروفیسر صاحب کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع تھا۔ سائنس کی ضخیم کتب ہوں یا انگریزی اور اُردو ادب، یا سلسلہ احمدیہ کی کتب و رسائل، ہر

ایک اُن کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ اِس قدر وسیع مطالعہ کے سبب تحریر وتقریر میں ایک خاص پختگی اور نکھار کا پہلو نمایاں تھا۔ گفتگو میں شائستگی اور برجستگی کا عنصر نمایاں نظر آتا تھا۔ بطور سٹیج سیکرٹری جلسہ سالانہ ان کی برجستہ گفتگو اور حاضر جوابی حاضرین کو محظوظ کرتی تھی۔ اور وہ حاضرین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے رکھتے تھے۔

پروفیسر صاحب کی وفات ایبٹ آباد میں ہوئی، اور دارالسلام کے قبرستان میں اُن کی تدفین ہوئی۔



بطور سٹیج سیکرٹری، پروفیسر صاحب کی حاضر جوابی کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

ایک مقرر، جو امریکہ سے تشریف لائے تھے، دارالسلام میں رہائش اور خوردونوش کے غیرمعیاری انتظامات کی لمبی فہرست گِنوا کر جب سٹیج سے اُترے تو پروفیسر صاحب نے ایک ہی شعر میں تمام گفتگو کو سمیٹ لیا۔ فرمایا:

ے ہم مشرق کے مسکینوں کا دِل مغرب میں جا اٹکا ہے
وہاں کنڑ سب بلوری ہیں، یہاں ایک پرانا مٹکا ہے



عام الحزن

اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں، حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کئی جماعتی

اور ذاتی صدمات سے دو چار ہوئے۔ اور ہر صدمے کو صبر سے برداشت کرتے چلے گئے۔ مگر جس عام الحزن کی ابتداء ۲۱ جون ۱۹۹۳ء کو آپ کی زوجہ زینب کی وفات سے ہوئی اور انتہا مئی ۱۹۹۴ء آپ کی بہو انجم کی وفات پر ہوئی، اس عالمِ پیری اور ضعفِ جسمانی کے باعث ناقابلِ برداشت حد تک صبر کا ایک کڑا امتحان تھا، جس کے بعد آپ کی صحت بتدریج گرتی چلی گئی۔

محترمہ زینب بی بی صاحبہ کی وفات

زینب بی بی، سعید احمد خان صاحب کے جان نثار چچا مولوی محمد یعقوب کی نیک خو دُختر اور آپ کی وفا شعار اہلیہ تھیں۔ ساٹھ برس کے دُکھ سُکھ کے ساتھ کے بعد، یوں اچانک گھر سے اور آپ سے دوری کے عالم میں چپ چاپ زندگی سے مُنہ موڑ جانا ایک ایسی حقیقت تھی جسے تسلیم کر لینا نہایت کٹھن تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا ظرف عطا کر رکھا تھا کہ اپنے حزن و ملال کا اظہار سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے، کسی کے سامنے نہیں فرمایا۔

وفات سے چار پانچ ہفتے قبل، زینب بی بی اپنے فرزند محمد سعید کے ہمراہ راولپنڈی گئی تھیں۔ وہ اکثر وہاں جایا کرتی تھیں، مگر اِس بار اس سبب سے جانے کو زیادہ آمادہ نہ تھیں کہ زاہد سعید کی شادی چند ہفتے قبل ہوئی تھی اور نو بیاہتا دُلہن کو گھر پر چھوڑتے ہوئے، اُنہیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ شاید دُلہن کو یہ اچھا نہ لگے گا۔ مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر جانا ضروری ہو گیا۔ وفات سے دو روز قبل اُن کی طبیعت کچھ مضمحل سی تھی اور وہ لاہور واپس جانے کے لیے بضد تھیں۔ یہ تسلی دلانے پر کہ، اگلی صبح ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے بعد چلیں گے، تو یہی کہا کہ تم لوگ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اُن کی ایسی ہی بے چینی کے سبب، اگلی صبح، سی ایم ایچ میں معائنہ کی غرض سے لے جایا گیا اور وہاں داخل کروا دیا گیا۔

اُن ایام میں ناصر سعید بھی راولپنڈی میں تعینات تھے۔ ایبٹ آباد سے عبدالکریم سعید اور

اکرام سعید بھی آ گئے۔ وہ ہسپتال میں مطمئن سی ہو گئیں۔ بظاہر پُرسکون تھیں۔ اگلی صبح عام گفتگو کے ساتھ اپنے بچوں سے پُرمزاح گفتگو بھی کرتی رہیں۔عبدالکریم سعید اور اکرام سعید اُنہیں حالتِ اطمینان میں چھوڑ کر ایبٹ آباد لوٹ گئے۔مگر دو چار گھنٹے بھی نہ گزر پائے تھے کہ اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اُن کا انتقال ہو گیا۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

زینب بی بی، اپنے متقی باپ کی پاکیزہ، باکردار و باوقار بیٹی تھیں۔ جذبۂ ہمدردی اور محبت سے لبریز دل اپنے باپ سے ورثہ میں پایا تھا۔اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت میں اُنہوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی، بلکہ کئی دوسرے بچوں کی پرورش اور تربیت بھی اُن کے ہاتھوں میں ہوئی۔ان کی محبت اور ہمدردی ہر کس و ناکس کے لیے تھی۔حضرت امیر کو ان کی وفات پر کئی تعزیتی خطوط موصول ہوئے، اور ان تمام خطوط میں اُن کی جن خوبیوں کا ذکر کسی نہ کسی رنگ میں موجود تھا، وہ تھیں، اُن کا محبت بھرا سلوک، اخلاص، شفقت اور مہمان نوازی۔زینب بی بی کی وفات سے جہاں اُن کی اولاد اور اہلِ خانہ کے لیے ایک خلا سا پیدا ہو گیا وہاں تنظیمِ خواتین کی دستکاری کی نمائش میں دیدہ زیب کڑھائی کے شاہکار بھی معدوم ہو گئے۔

زینب بی بی کی میت راولپنڈی سے لاہور لائی گئی۔اُن کی بڑی صاحب زادی خدیجہ اور چھوٹے فرزند زاہد وطن سے دور تھے اور اُن کے آخری دیدار سے محروم رہے۔ چار سال کے اِس قلیل عرصہ میں سعید احمد خان نے، سوگوار دِل کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے، اپنی دوسری زوجہ کو بھی ردائے خاکی اوڑھا دی۔اب زینب بی بی اپنی بی بی، اپنی ماں کے پہلو میں ابدی نیند سو رہی ہیں۔

محترمہ نسرین گل محمد صاحبہ

۲۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو جماعتِ احمدیہ کی جذبۂ اخلاص وایثار سے سرشار دُختر، نسرین گُل محمد اس جہان فانی سے رُخصت ہو گئیں۔

اِکیّ جُون

اِکیّ جُون دِی لَمی گرم دِیہاڑ
بُجھڑ گئی مَڑی اَمڑی تے میں رَوندی زار قطار

رَوندے، کُرلاندے پتّر تیاں کوئی دیس تے کوئی پردیس
رِکتھا گئی او ببُّو سوہنڑی ریہیا نہ کوئی غم خوار

کلّیاں تَو رُڑھدے سچے موتی چیڑے نال بندھ دی جُلے
نہ کدّے دِلاّ دِیاں دَسّیاں مائے نہ کِیتا اِظہار

دُکھ بکھیڑے گنڈ ڑی بَن کے اللہ اگّا فریاداں
پَل پُل جُلّن جَندق سارے تُوں اِی پالن ہار

دُکھی جَدَ وُں ہونواں تے رُوکُتھا لاواں
کونڑ سُنڑے مَڑے دِلا دے دُکھڑے مِلّے نہ کوئی دلدار

جیندے رِہونڑ مَڑے اَپنڑے سارے سدار ہوَنڑ آباد
بُوَا کھُلا ہر کدّے آون، قدم رکھنڑ تے کار گلزار

ماُوُ دا حق ادا نہ ہویا بِنتِ زینب دا پچھتاوا
اک واری جی مُڑ آوَیں مائے جِند جان دیواں میں وار

بنتِ زینب (بزبان ہندکو)

اگرچہ نسرین گل کا حضرت امیر سے رشتۂ قرابت نہ تھا، مگر محبت وعقیدت کے جذبہ نے اُنہیں آپ سے بہت قریب کردیا تھا۔آپ کی خدمت اور تعمیلِ حکم میں وہ آپ کی بیٹیوں سے بڑھ کر مستعد رہتی تھیں۔کبھی وہ آپ کی خواب گاہ کو آرام دِہ بنانے کے انتظامات کرتی نظر آتیں، اور کبھی اُسے پھولوں کی خوشبو سے معطر کر جاتیں اور کبھی آپ کو صحت بخش اور مقوی غذا بہم پہنچانے کی غرض سے یخنیاں اور مربے بناتی نظر آتیں۔نسرین گل کے علم میں یہ بات آئی کہ گلاب کے عرق میں بھیگی ہوئی کشمش دِل کو طاقت بخشتی ہے تو فوراً خدمت میں پیش کردی۔

جامعۂ احمدیہ بلڈنگس کے در پر تحریر کلمۂ طیبہ کے سلسلہ میں امیرِ جماعت کے خلاف مقدمہ درج ہوا تھا۔مگر آپ کے نام عدالتی حکم کے اجراء سے قبل ہی کسی انصاف پسند شخص کی بدولت یہ اطلاع دفتر انجمن میں ہوگئی۔فیصلہ ہوا کہ فوراً حضرت امیر کے لیے ضمانت کا بندوبست کیا جائے۔محترمہ نسرین گل صاحبہ بلا تامل آپ کی دُختر کے ہمراہ کچہری روانہ ہوگئیں اور ضروری اقدامات سہولت سے کروا لیے گئے۔

نامساعد حالات، خاندانی اور معاشرتی دباؤ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے نسرین گل کو احمدیت پر ثابت قدمی نصیب فرمائی۔ بلکہ اکثر محافل میں معترضین کو ایسے مُنہ توڑ جواب دیتیں کہ معترض خود ہی لاجواب ہو کر خاموش ہو جاتا تھا۔ جماعت کی ہر قسم کی خدمت کے لیے، وہ ہر دم کمربستہ رہتی تھیں۔ اُنہوں نے تنظیمِ خواتین کی سیکرٹری کی حیثیت سے نہایت مؤثر کردار ادا کیا تھا جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

نسرین گل کی صحت کچھ عرصہ سے کمزور چلی آرہی تھی۔جگر کا مرض آخر کار جان لیوا ثابت ہوا۔اگرچہ وہ اب اِس دنیا میں نہیں مگر اُن کی نیکیاں اور خوبیاں اُن کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

لیفٹننٹ کرنل فیروز عالم خان

نسرین گل کی تدفین کو چند گھنٹے ہی گزر پائے تھے اور ابھی اُن کی جدائی سے دل مغموم تھے کہ اچانک رات کے تقریباً بارہ بجے حضرت امیرؒ کے گھر فون کی گھنٹی نے سب کو چونکا دیا۔ فیروز عالم ہسپتال لے جائے جا چکے تھے اُن کی بیٹی رفیعہ سی ایم ایچ سے آنسوؤں اور سسکیوں سے مغلوب آواز میں اطلاع دے رہی تھیں۔ فیروز عالم کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ کانوں نے جو سُنا، دل اُسے ماننے کو تیار نہ تھے۔ تقریباً تین گھنٹے پہلے تو وہ دارالسلام میں سب سے مل ملا کر رُخصت ہو کر گھر گئے تھے۔ فیروز عالم کا معمول تھا کہ جمعرات کی شام کو گالف کھیلنے کے بعد وہ دارالسلام آیا کرتے تھے۔ ۲۸/اکتوبر کو بھی وہ مغرب کے قریب پہنچے تھے اور کچھ وقت حضرت امیر اور دیگر اہلِ خانہ کی معیت میں گزارا۔ رات کا کھانا تناول فرما کر، دوبارہ حضرت امیر کے کمرے میں گئے اور کھڑے کھڑے ہی آخری مرتبہ خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل گئے اور احمد پارک میں چوہدری منصور احمد سے ملاقات کرتے ہوئے گھر تشریف لے گئے۔ اچانک ہی اُنہیں کسی تکلیف کا احساس ہوا تو اپنی اہلیہ سے ہسپتال چلنے کو کہا۔ وہاں پہنچنے کے بعد چند گھڑیاں بھی نہ گزری ہوں گی کہ پاک فوج کا یہ جان باز سپاہی عارضۂ قلب کے شدید حملے کی تاب نہ لا سکا اور جان کی بازی ہار گیا۔ کرنل فیروز عالم، حضرت امیر کے وہی دلیر اور جری داماد تھے جو ۱۹۷۴ء کے سانحات میں آپ کی اور آپ کے نہتے ساتھیوں کی ڈھال بنے رہے تھے۔

فیروز عالم کی وفات کی خبر سُن کر حضرت امیر نڈھال سے ہو گئے۔ چند ہی برسوں میں آپ کی دوسری بیٹی کے نام کے ساتھ بیوگی کا لفظ منسوب ہو گیا تھا۔ اُس وقت آپ نے ہمت سے کام لیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حوصلہ عطا فرمایا کہ اپنی غم زدہ بیٹی کو دلاسہ دینے کے لیے اُن کے گھر تشریف لے جا سکے اور پھر جنازہ میں شرکت فرمائی۔

لیفٹیننٹ کرنل فیروز عالم کا نام پاکستان کی عسکری تاریخ میں ایک بااصول، بااعتماد، حق پرست اورنڈر افسر کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گا اور اُس کے ساتھ ساتھ تاریخِ احمدیت میں ۱۹۷۴ء کے سانحات سے جُڑی اُن کی جرأت اور دلیری کی داستان کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

ع خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

انجم عبداللہ سعید کی بے وقت جدائی

کرنل فیروز عالم کی وفات کے بعد اور انجم سعید کی وفات سے قبل پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۲۳ مئی ۱۹۹۴ء کو انجم سعید کی وفات اس 'عام الحزن' کا پانچواں بڑا صدمہ تھا، جو حضرت امیر کو پہنچا۔ انجم سعید آپ کی وہی نیک دِل فیاض وخوش خصال بہو تھیں، جن کی گرہستی بہتّر (۷۲) بے خانماں احمدیوں کی پناہ گاہ بنی رہی۔ اور یہ اُنہی کی اعلیٰ ظرفی کی بدولت ممکن ہو سکا تھا کہ اِن پناہ گزینوں نے اپنے رنج وکلفت کے ایام سہولت سے وہاں گزارے تھے۔

انجم سعید کی بے وقت وفات حضرت امیر کے لیے دُہرے رنج کا باعث تھی۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ اپنے بچوں پر سایہ فگن تھیں۔ اُن کے یوں دُنیا سے مُنہ موڑ جانے سے آپ کے دونوں پوتے اور پوتی تنہا ہو گئے تھے۔ اب اُن کا پرسانِ حال کون ہوگا؟ پوتی شادی شدہ تھی، مگر اُسے بھی والدین کی شفقت اور محبت کی ضرورت بہر حال تھی۔ مگر دونوں لڑکوں کی تعلیم ادھوری تھی۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے اُنہیں ماں کے سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ دونوں ڈاکٹری کی تعلیم حاصِل کر رہے تھے۔ مگر جب والدہ کی بیماری نے شدت اختیار کر لی تو وہ اُن کی دیکھ بھال میں لگ گئے اور تعلیم چھوڑ دی تھی۔ بس ایسے ہی تفکرات آپ کو گھیرے رہتے تھے۔ مگر آپ کے صبر و برداشت میں وہ مومنانہ شان نظر آتی تھی جو اِس سے قبل بھی ہر دُکھ کے موقعہ پر عیاں ہوتی تھی۔ آپ دوسروں کو صبر کی تلقین فرماتے اور خود دُعا میں مصروف رہتے تھے، کیونکہ مومنوں کے لیے رنج والم

کے مقابلے کے لیے یہی ایک واحد ہتھیار رہوا کرتا ہے۔

محترمہ طاہرہ فضل احمد صاحبہ نے حضرت امیر کی وفات پر پیغام صلح کے لیے ایک مضمون ’ہمارے پیارے امیر‘ کے عنوان سے لکھا تھا۔ اُس سے ایک اقتباس پیش ہے:

اُن کی زندگی میں صدمے بھی بہت آئے۔ جوان پوتے کی حادثاتی موت کی خبر بیرونِ ملک سے واپسی پر ملی۔ پھر اُس داماد (محمد احمد) کی مہلک بیماری جو کہ جماعت کے کاموں میں اُن کا دستِ راست تھا۔ دعائیں اور التجائیں کام نہ کر سکیں اور وہ پردیس ہی میں اپنے مولا سے جا ملا۔ لیکن اس مردِ مجاہد (ڈاکٹر سعید احمد خان) نے اپنی کوشش جاری رکھی۔۔۔۔۔۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جوان بیٹے عبداللہ سعید کی جدائی کی آزمائش آئی۔ اور جوان بہو بھی چھوٹے بچوں کی ذمہ داری ان نحیف کندھوں پر ڈال اپنے مولا سے جا ملی۔ غرض کیا بتاؤں یہ اسی مردِ مجاہد کا دِل تھا جس نے یہ سب غم سہے لیکن کمر باندھ کر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے کام پر لگے رہے۔ کبھی ظاہر نہ کیا کہ دِل پر کیا گذرتی رہی۔“

میاں فخر الدین احمد کی تحریر ”حضرت مسیح موعود کی صداقت کا مظہر“ سے ایک اقتباس:

مرحوم (حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان) کی سوانح میں یہ پہلو نمایاں ہے کہ آپ نے زندگی بھر دس شرائط بیعت پر عمل کر کے دکھایا۔ رنج و راحت، عسر و یسر، نعمت و بلا میں اللہ تعالیٰ کی قضا پر رضا اور کمال وفاداری کا نمونہ دکھایا۔ اپنے خوش خصال بیٹے جنرل عبداللہ سعید اور اُن کی نیکوکار بیگم، اپنے دامادوں، اپنی بیگمات کی وفات پر صبر و استقامت دکھلائی۔ اپنے عم زاد ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب، پروفیسر ڈاکٹر نظیر الاسلام، پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب، محترم محمد انور صاحب مبلغ انگلستان، ماسٹر اصغر علی صاحب، حافظ شیر محمد صاحب خوشابی، الحاج

شیخ محمد طفیل صاحب مبلغ انگلستان و ہالینڈ، بریگیڈئر عبداللطیف شہید، الحاج میاں نصیر احمد فاروقی روشن ستارے تھے جو ڈوب گئے اور جماعت کے لیے سانحۂ عظیم ہوئے۔ اُن کی مفارقت کا ڈاکٹر صاحب کو بڑا صدمہ ہوا۔ مگر دامنِ صبر اُن کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔

انتظامی امور کے لیے بورڈ کی تشکیل۔ ۲۲ اپریل ۱۹۹۴ء

حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب فطرتاً حساس طبع تھے۔ آپ کو یہ گوارا نہ تھا کہ آپ کی جسمانی کمزوری یا دوسری ذاتی وجوہات کی بنا پر، جماعت کے مفاد نظر انداز ہوں یا انتظامی امور میں کوئی تعطل واقعہ ہو۔ اس لیے بہت غور و فکر اور مشاورت کے بعد آپ نے مجلسِ منتظمہ کے ۱۸ اپریل ۱۹۹۴ء کے اجلاس میں ایک ایسے بورڈ کے تقرر کی تجویز پیش کی، جو انتظامی امور میں آپ کا مددگار ہو، اور فیصلہ جات کرنے کا مجاز ہو۔ اس کی تفصیل مجلس کی کاروائی میں اِن الفاظ میں درج ہے:

کاروائی ہنگامی اجلاس مجلسِ منتظمہ مورخہ 8-4-94

حاضرین: حضرت امیر ایداللہ تعالیٰ (ڈاکٹر سعید احمد خان)

۲۔ منصور احمد صاحب ۳۔ میاں ظہور احمد صاحب

۴۔ میاں فضل احمد صاحب ۵۔ ڈاکٹر مبارک احمد صاحب

۶۔ عبدالغفور ثاقب صاحب ۷۔ شیخ محمد سلیم صاحب

۸۔ سردار علی خان صاحب ۹۔ اسداللہ خان صاحب

(۳۶۴)۔ حضرت امیر (ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب) نے دعا کے بعد فرمایا:

اللہ تبارک و تعالیٰ کا احسان و شکر ہے کہ باوجود جسمانی عوارض، کمزوری اور

پیرانہ سالی کے میں جماعت و انجمن کے امور میں روزانہ اپنی طاقت سے کچھ بڑھ کر ہی کام کرتا ہوں۔ تاہم بحیثیت امیر وصدر، احمدیہ انجمن لاہور، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک ایسے بورڈ کا تقرر کیا جائے جو امورِ انجمن کے فیصلے کرے اور ان فیصلوں کی منظوری مجھ سے لی جائے۔ یہ صورتِ حال میری زندگی تک رہے گی۔ میرے بعد مذکورہ بورڈ کو فوری طور پر تمام اختیارات حاصل ہو جائیں جو کہ امیر وصدر انجمن کو آئین کے مطابق حاصل ہیں۔ آئندہ مجلس معتمدین اس بورڈ کے متعلق ہر قسم کا فیصلہ کرنے کی مجاز رہے گی۔ مجلس منتظمہ حسبِ سابق آئین کے مطابق کام کرتی رہے گی۔

میں مندرجہ ذیل احباب کو بوڑد کے ممبران نامزد کرتا ہوں:

1۔ صاحبزادہ محمد احمد صاحب۔

2۔ ڈاکٹر وحید احمد صاحب۔

3۔ میاں فضل احمد صاحب۔

4۔ محمد یوسف خان صاحب۔

5۔ چوہدری منصور احمد صاحب۔

ڈاکٹر وحید احمد صاحب بورڈ کے چیئرمین اور منصور احمد صاحب بورڈ کے سیکرٹری ہوں گے۔ اس تجویز کی منظوری انجمن سے حاصل کی جائے۔

تمام احباب نے اتفاق کرتے ہوئے حضرت امیر کے ارشادات مجلسِ معتمدین میں پیش کرنے کی ہدایت فرمائی۔

۲۲ اپریل ۱۹۹۴ء کو مجلسِ معتمدین میں یہ تجویز پیش ہوئی اور اِس کی توثیق کی گئی۔ رجسٹر کاروائی کے اندراج کی نقل:

صاحب صدر کی اجازت سے جنرل سیکرٹری نے ضمیمہ ایجنڈا نمبر ۲۰۳ پیش کیا، جس پر فیصلہ ہوا کہ حضرت امیر ایدہ اللہ تعالیٰ کی تجویز پر ایک ایسا بورڈ تشکیل کیا جاتا ہے جو امیر اور صدر کے حقوق و اختیارات زیرِ آئینِ انجمن کو استعمال کرے گا اور ان امور میں اُن کی معاونت کرے گا اور مشورے دے گا۔

خدا تعالیٰ حضرت امیر کا سایہ طویل عرصہ تک ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ اُن کے بعد مذکورہ بورڈ کو فوری طور امیر اور صدر کے اختیارات زیرِ آئین حاصل ہو جائیں گے۔ اس بورڈ کی، حضرت امیر کی وفات کے بعد، مجلس معتمدین کے پہلے اجلاس تک عمر قائم رہے گی۔

جنرل سیکرٹری انجمن کوشش کریں گے کہ حضرت امیر کی وفات کے بعد ۴۰ دن کے اندر اندر مجلس معتمدین کا اجلاس طلب کریں گے، جس میں امیر اور صدر کے منصب کے فیصلے کرے گی یا بورڈ کے قیام اور مہلت میں اضافہ کرے گی۔

بورڈ میں مندرجہ ذیل اصحاب کے نام منظور کیے جاتے ہیں

صاحبزادہ محمد احمد صاحب۔

ڈاکٹر وحید احمد صاحب۔ (صدر)

میاں فضل احمد صاحب۔

محمد یوسف خان صاحب۔

چوہدری منصور احمد صاحب۔ (سیکرٹری بورڈ)

قطع نظر اس کے کہ موجودہ آئین انجمن میں کوئی شق یا قانون اس ریزولیوشن کے متضاد یا خلاف ہو یہ ریزولیوشن موثر اور قابل عمل رہے گا۔

حضرت امیر کی رہائش گاہ پر ادائیگی فرائضِ منصبی اور جامعہ سے رابطہ کا اہتمام

حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب کے جسم و جان اب اس بات کے متحمل نہ ہو سکتے تھے کہ وہ باقاعدگی سے کئی کئی گھنٹے دفتر میں بیٹھ کر اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ چنانچہ انجمن کی طرف سے آپ کو یہ سہولت دے دی گئی کہ آپ اپنی رہائش گاہ پر آرام دِہ ماحول میں دفتری کام کر سکیں۔ محترم انوار احمد صاحب بطور ذاتی معاون ہمہ وقت آپ کے ہمراہ رہتے تھے اور آپ کے کاموں میں معاونت فرماتے تھے۔ محترم جنرل سیکرٹری صاحب اور دفتر کے مختلف شعبہ جات سے منسلک احباب ضروری مشورے اور راہنمائی کے لیے آپ کے پاس تشریف لے آتے تھے، اور اِس طرح بغیر کسی تعطل کے تمام کام ہوتے چلے جاتے تھے۔ آپ کے گھر پر ایک فیکس مشین نصب کر دی گئی تھی، جس سے بیرونی جماعتوں سے رابطہ اور مراسلات کی ترسیل اور وصولی، آپ کی اپنی نگرانی میں ممکن ہو گئی تھی۔

مجلس منتظمہ اور مجلس معتمدین کے اجلاس کا انعقاد بھی آپ کی نشست گاہ میں، کرسیوں کے اضافے سے بسہولت ہو جاتا تھا۔ اور اس طرح تمام کاروائی میں شرکت کے باوجود، آپ زیادہ تھکن محسوس نہ کرتے تھے۔

حضرت امیرؒ کی خواب گاہ میں سپیکر نصب کر کے، جامعہ سے براہِ راست رابطہ قائم کر دیا گیا تھا، اور آپ جامعہ میں منعقد ہونے والے تمام اجلاس اور محافل میں شریک رہتے تھے۔ جلسہ سالانہ ہو یا تقریباتِ یومِ وصال۔ اجلاس سیرت النبی ہوں یا شبان واطفال کی محافل۔ آپؒ ہر ایک کی تمام

تر کاروائی بہت شوق سے سنتے تھے۔

اِسی طرح نمازِ جمعہ اور دیگر تمام نمازوں کے دوران سپیکر کی آواز کھول دی جاتی تھی اور آپ اپنی سہولت کے مطابق، کرسی پر بیٹھ کر یا بستر پر لیٹ کر خطبہ سماعت فرماتے تھے۔ اِن انتظامات کی بدولت اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندگی کے اُن لمحات تک باجماعت نماز ادا کرنے کی سعادت نصیب فرمائی، جب تک آپ کا قیام اِس رہائش گاہ پر رہا۔

اپنی زندگی کے اِن آخری چند برسوں میں آپ عیدین پر اور جلسہ سالانہ کی افتتاحی تقریر اور 'دعائے وداع' کے لیے جامعہ میں ضرور تشریف فرما ہوتے تھے، جو حاضرین کے لیے نہایت مسرت اور برکات کا موجب ہوتا تھا۔ ایسے مواقع کا ذکر کرتے ہوئے زاہد عزیز صاحب نے اپنے مضمون "ہمارے شفیق رہنما اور ایک درخشندہ مثال" (پیغام صلح نومبر۔دسمبر ۱۹۹۷ء) مین تحریر فرمایا ہے:

> جب آپ سالانہ جلسہ کے موقع، پر آ کر جلسہ گاہ میں تشریف رکھتے تھے تو یوں محسوس ہوتا کہ جلسہ کی حرمت اور تقدیس میں کئی درجہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ہم آپ کے افتتاحی اور اختتامی خطبات کے بے چینی سے منتظر رہتے تھے۔ خاص طور پر ہر جلسہ کے اختتام پر آپ کا اختتامی خطبہ دلوں کو پگھلا دینے والا اور روح کو مصفا کر دینے والا ہوتا تھا۔ اس اثر کو الفاظ میں مناسب طور پر بیان کرنا ممکن نہیں، اور نہ دماغ میں دوبارہ دہرایا جا سکتا ہے۔ بلکہ اسے صرف اس موقع پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اختتامی دُعا جس میں دوسرے لوگ بھی ہاتھ اٹھا کر شامل ہوتے، آپ کی اللہ کے حضور عاجزانہ گڑگڑاہٹ ہر آنکھ سے اِس طرح آنسو بہا دیتی تھی کہ وہ دلوں کی گہرائی سے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے اور ہمیں یونہی احساس ہوتا جیسے ہم اللہ کے حضور بذاتِ خود حاضر ہو کر دُعا کر رہے ہیں۔

> ۱۹۹۴ء کے سالانہ دُعائیہ کے ایک ایسے ہی اختتامی اجلاس کا میں شاہد ہوں (جوکہ آپ کی زندگی کے آخری جلسوں میں سے تھا)۔ اِس موقع پر قوتِ تحریک اور روحانی طاقت کا شاندار مشاہدہ کرنے کو ملا۔ آپ کا اختتامی خطبہ اور دُعا، حتیٰ کہ آپ کی موجودگی اُس وقت انتہائی متاثر کرنے والی تھی۔ اور جب آپ جلسہ گاہ میں لوگوں کے درمیان سے سلام کرتے ہوئے گزر رہے تھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں اصل حاضرین سے کہیں زیادہ ایک جم غفیر موجود ہے۔ بعد ازاں اگلے سالانہ دعائیہ کے موقع پر حضرت ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے بذاتِ خود اِس بات کا ذکر کیا کہ اُنھوں نے مذکورہ موقع پر ایک غیر معمولی روحانی کیفیت محسوس کی تھی۔

جامعہ دارالسلام میں ۲۶ مئی ۱۹۹۶ء کو یومِ وصالِ مسیح موعود کے موقع پر حضرت امیر نے جماعت سے آخری بار خطاب فرمایا تھا۔

حضرت امیر کے مصاحب ۔ چہار درویش

حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب زندگی کے تمام ادوار میں، معاشرہ کے ہر طبقہ میں ہر دلعزیز رہے تھے۔ بزرگانِ سلسلہ سے عقیدت و محبت کا رشتہ تھا، اور احباب سلسلہ سے مہر و محبت اور رفاقت کا۔ آپ کے حلقۂ احباب میں امراء، خوانین و نواب، سرکاری عہدہ داران، رفقائے کار، صنعت کار، تاجر، زمیندار اور عام کاروبارِ زندگی سے منسلک افراد سب ہی شامل تھے۔ لاہور منتقل ہونے کے بعد اگرچہ میل ملاقات کا وہ پہلے جیسا سلسلہ تو اب نہ رہا تھا، تاہم آپ سے ملاقات کے مشتاق تشریف لے آتے تو آپ خوشی محسوس کرتے تھے۔ مگر آپ کی زندگی کے اِن آخری چند برسوں میں جن مخصوص درویش صفت احباب نے آپ کا حقِ مصاحبت نہایت خلوص و محبت سے ادا فرمایا وہ خصوصی ذکر کے لائق ہیں۔ اِن کے اسمائے گرامی راجہ محمد بیدار صاحب، قاضی عبدالاحد صاحب،

سردار علی خان صاحب اور عبد السلام صاحب ہیں۔ از راہِ محبت، آپ انہیں ”چہار درویش“ کہا کرتے تھے۔ آپ کے یہ چاروں درویش بعد از نمازِ عصر آپ سے ملاقات فرماتے تھے۔ کچھ دیر تک آپ سے مجلس رہتی تھی۔ آپ اُن کے لیے چائے کا اہتمام فرماتے تھے۔ اِس اثناء میں ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ، جماعتی امور پر بھی تبادلہ خیال ہو جاتا تھا۔ بعد ازاں قاضی عبدالاحد صاحب قرآن پاک کے اُن حصوں کی قرأۃ فرماتے، جو اگلی نمازِ فجر کے لیے اُن کا انتخاب ہوتا تھا۔ حضرت امیرؒ کو اگرچہ قرآن کی یہ سورتیں حفظ تھیں، تاہم وہ قاضی صاحب سے سُننا پسند فرماتے تھے۔ اِن مختصر مجالس کا آپ کی طبیعت پر بے انتہا خوشگوار اثر رہتا تھا۔

آپ کو اپنے اِن چہار درویش رفیقوں سے ایک خاص اُنس تھا، جس کا ذکر وہ اکثر فرماتے تھے۔ اِن چار اصحاب کے علاوہ انوار احمد صاحب ہمہ وقت آپ کی خدمت میں موجود رہتے تھے۔ مہمان رُخصت ہو جاتے تو آپ انوار احمد صاحب کی معیت میں دار السلام کے اندرون راستوں پر چہل قدمی کے لیے باہر تشریف لے آیا کرتے تھے۔

چہار درویش ۔ مختصر تعارف

چہار درویش میں سے ہر ایک درویش اپنے اپنے رنگ میں پُراعتماد، ثابت قدم اور مخلص احمدی کی حیثیت سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ دمِ تحریر درویش راجہ صاحب اور قاضی صاحب اِس جہاں میں اپنا سفر مکمل کر کے اپنے مولیٰ سے جا ملے ہیں۔

راجہ محمد بیدار صاحب کا تعلق ضلع مانسہرہ کے بہالی نامی

گاؤں سے تھا۔ اِس گائوں میں وہ تنہا احمدی تھے۔ ایک عرصہ تک جامعہ احمدیہ کراچی میں خدمات انجام دیتے رہے جہاں اُنہیں بہت مقبولیت حاصل رہی۔ کچھ عرصہ کے لیے سرینام میں بطور مبلغ گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اور پھر مرکز میں اسسٹنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ خرابی صحت کے باعث وہ اپنے گاؤں واپس تشریف لے گئے۔ اور وہیں پر اُن کی وفات و تدفین ہوئی۔

قاضی عبدالاحد صاحب کا خاندان ریاست امب کے صدر مقام شیرگڑھ میں آباد تھا۔ بطورِ عالمِ دین، اُن کے چچا کو ریاست میں خاص قدر ومنزلت حاصل تھی۔ قاضی صاحب نے احمدیت قبول کی تو اُن کے چچا اور دیگر تمام رشتہ دار اُن کے دشمن ہو گئے اور ہر طرح سے اُن کو ایذا پہنچاتے رہے۔ اور بالآخر معاشرتی مقاطعہ کے بعد وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے اور ایبٹ آباد تشریف لے آئے، اور جامعہ احمدیہ کے امام مقرر ہوئے۔

۱۹۷۴ء کے سانحات کے کچھ عرصہ بعد لاہور مرکز میں صالحہ ظہور احمد لائبریری کے انچارج اور امام الصلوٰۃ مقرر ہوئے۔وہ حافظِ قرآن تھے اور عربی زبان و گرائمر پر مکمل عبور رکھنے کے علاوہ تمام علومِ دینیہ میں دسترس رکھتے تھے اور تا دمِ آخر اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے۔ اپنی شدید علالت میں بھی اُنہوں نے اپنے اہل ِخانہ

کی آرام دِہ رہائش گاہوں کی بجائے دارالسلام میں مسافرت کی زندگی گذارنے کو ترجیح دی۔ یہیں پر اُن کی وفات اورتدفین ہوئی۔

سردار علی خان صاحب کا تعلق پشاور سے ہے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد مرکز میں بطور اسسٹنٹ سیکرٹری خدمات انجام دیں۔ وہ ایک نہایت مخلص، نڈر اور ثابت قدم احمدی ہیں اور احمدیت سے وابستگی کی بنا پر پیش آمدہ ابتلاؤں اور آزمائشوں کا مردانہ وار مقابلہ فرما رہے ہیں۔

عبدالسلام صاحب بدوملہی کے رہنے والے ہیں۔ وہ محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ دورانِ ملازمت، اپنے فرصت کے اوقات میں حضرت امیر کے کاموں میں معاونت فرماتے تھے۔ اپنے محکمے میں وہ اپنی بلند کرداری، اصول پسندی اور ایمانداری کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد فجی میں بطور مبلغ خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصہ تک کراچی جامعہ کے امام بھی رہے۔

عبدالسلام صاحب نہایت نیک، عبادت گذار اور مخلص احمدی ہیں اور دارالسلام لاہور میں رہائش رکھتے ہیں۔



راجہ محمد بیدار صاحب کی تحریر "ایک مجاہد اور عاشقِ قرآن" سے ایک اقتباس:

جب خاکسار کو ۱۹۹۳ء میں لاہور بلایا گیا تو ہر روز بعد از نمازِ عصر ہم چار آدمی، محترم سردار علی خان صاحب، محترم قاضی عبدالاحد صاحب، محترم عبدالسلام صاحب اور احقر آپ کی خدمت میں بلا ناغہ حاضر ہوتے۔ بلکہ قاضی عبدالاحد صاحب سے آئندہ صبح کی نماز فجر میں تلاوت کرنے والی قرآنی آیات سنتے اور بعض دفعہ بڑے پیارے انداز میں بعض آیات کے معنی بیان فرماتے۔ اور آپ نے بڑی شفقت اور محبت سے اِن عاجز انسانوں کو چہار درویش کا خطاب عطا فرمایا۔ اِس طرح ہمیں آپ کا قرب نصیب ہوا۔

قاضی عبدالاحد صاحب اپنے مضمون بعنوان "حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب" (پیغامِ صلح نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء) میں اِن مجالس کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

لاہور آکر اِن کی ذمہ داریاں بوجہ امیر جماعت ہونے کے، بڑھ گئیں تو پھر یہ معمول ہوا کہ نمازِ عصر کے بعد کچھ وقت کے لیے دینی گفتگو ہوتی اور تلاوتِ قرآن ہوا کرتا تھا۔ یعنی قرآن کریم کا وہ حصہ جو نمازِ فجر میں پڑھا جاتا تھا اُس کی دہرائی ہوا کرتی تھی۔

چہار درویش کے علاوہ بعض دیگر احباب بھی اُس وقت تشریف لے آتے تھے جن کا استقبال آپ خندہ پیشانی سے فرماتے تھے۔

عامر عزیز صاحب اپنی تحریر "اب کہاں سے لائیں جو ہو تجھ جیسا کوئی" (پیغامِ صلح نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت امیر مرحوم کی زندگی کے آخری ایام میں، مَیں اُن کے پاس ہفتہ میں

ایک دِن ضرور ملنے جاتا تھا، تو وہ اکثر فرماتے تھے: ”یہ درویشوں کا ڈیرہ ہے یہاں روز آیا کرو“۔ وہ یہ الفاظ اِس قدر پیار اور دِل کی گہرائیوں سے کہتے تھے کہ ایک لمحے کے لیے یوں لگتا تھا کہ ساری زندگی اُن کے قدموں میں گذر جائے۔



اَوَ مَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَ جَعَلۡنَا لَهٗ
نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ

اور کیا وہ جو مُردہ تھا، پھر ہم نے اُسے زندہ کر دیا
اور اُسے روشنی دی جس کے ساتھ وہ لوگوں مین
چلے۔ (الانعام ۶:۱۲۲)

لوائے ما پنہِ ہر سعید خواہد بود
ندائے فتح نمایاں بنامِ ما باشد

ہمارا جھنڈا ہر سعید کی پناہ ہوگا
اور فتح نمایاں ہمارے نام کے تحت ہوگی